

# جانِ جاں تو جو ہے

راحت و وفا

پاکستانی پبلیکیشنز ڈاٹ کام



# جان جاں تو جو کہے

راحت وٹا

کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

پاکستانی پوائنٹ کوئی تجارتی ویب سائٹ نہیں ہے یہاں پر موجود تمام ناولز بالکل مفت ہیں۔ اس مشن کا مقصد صرف اردو ادب کی خدمت کرنا ہے تاکہ وہ لوگ جو وطن سے دور ہیں اور اردو کتب حاصل نہیں کر سکتے، وہ یہاں سے ڈائونلوڈ کر لیں۔ اگر آپ اردو لکھنا جانتے ہیں تو آپ بھی روز کا ایک صفحہ کمپوز کر کے اس مشن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے، سپر موڈز: زندگی، بسمہ، حبیب یا مینجمنٹ و قار سے رابطہ کریں، شکریہ

# جان جان تہ جہ کیے

حسب معمول صبح کے ساڑھے سات بجے تو میاں جی نے اخبار تہہ کرتے ہوئے شاہدہ بیگم کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا... وہ کچھ پریشان سی نظر آئیں تو میاں جی نے نگاہوں 'نگاہوں میں استفسار کیا...

”یہ ناجی جہاں جاتی ہے وہیں کی ہو جاتی ہے، کمبخت کو ذرا وقت کا احساس نہیں۔“ شاہدہ بیگم نے ڈائنگ روم کے دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے سارا غصہ ناجی پر نکال ڈالا۔ میاں جی مسکرا دیئے۔

”چہ، چہ“ بیچاری ناجی... بھی بیگم صاحبہ یہ ناجی پر آپ کس لیے بندوق تان کر بیٹھ گئیں۔ آپ کو تو اپنے لاڈلے فرحان اور چہیتی تانیہ کی ٹینشن ہے اس وقت... امی جان ابھی کچھ سے برآمد ہو کر اعلان جنگ فرمائیں گی اور...“

”افتخار! آپ موقع کی تلاش میں رہا کریں۔ آپ خود بھی ٹینشن میں ہیں۔“ شاہدہ نے دھیمے سے کہا جس کا مطلب یہی تھا کہ ڈاننگ روم سے ملحق کچن میں موجود امی جان اس کی بات نہ سن لیں۔

”میں تو حسب معمول امی جان کو سنبھال ہی لوں گا لیکن آپ اور بچے تو عتاب کا نشانہ بنیں گے۔“ وہ زیر لب مسکرا کر سرگوشی کے انداز میں بولے۔

”یہ بچے ابھی تک ناشتے کے لیے نہیں آئے۔“ اسی اثنا میں امی جان چائے کا فلاسک لیے آگئیں۔ میاں افتخار نے فوراً خود کو ناشتے کے لیے مصروف ظاہر کیا البتہ شاہدہ جزبز سی نظریں چرا گئیں۔

تمہارے لاڈ پیار نے بالکل ناکارہ کر دیا ہے، لو بتائو پونے آٹھ ہو رہے ہیں اور وہ دونوں اب تک نہیں آئے، بس تم دونوں ناشتہ کر کے اپنی اپنی راہ لو، دوبارہ کسی کے لیے ناشتہ نہیں بنے گا۔“ امی جان نے تحکمانہ انداز میں کہا اور اپنے لیے چائے کپ میں انڈیلنے لگیں۔

”جی بالکل بجا فرمایا آپ نے۔“ میاں افتخار نے ساس کی تائید میں بھرپور حصہ لیا۔ شاہدہ بیگم نے گھور کر انہیں دیکھا مگر کچھ کہہ نہ سکیں۔ خود بھی ناشتہ کرنے لگیں جبکہ امی جان کو تو موقع مل گیا۔

”بے جا لاڈ پیار نے بچوں کو کہیں کا نہیں چھوڑا، ہم نے بھی بچے پالے ہیں پر تمہاری طرح نہیں، ذرا آنکھ میں لحاظ ہے نہ شرم... زندگی کا کوئی قاعدہ قانون ہے ہی نہیں ان کی زندگی میں، فرحان ذرا سا بہتر ہے مگر تانیہ نے تو نہ سدھرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔“

”امی جان! ابھی بچے ہیں، ٹھیک ہو جائیں گے۔“ شاہدہ بیگم نے ماں کو دھیرے سے کہا۔

”ارے واہ! فرحان میاں نے خیر سے یونیورسٹی کا منہ دیکھ لیا اور تانیہ بھی یونیورسٹی جانے والی ہیں۔ بچے بچے کر کے تم نے ان کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ ورنہ بیٹھ کے رٹوں گی۔“ امی جان نے تڑخ کے شاہدہ بیگم کو خاموش کرادیا۔

”ناجی! ناجی!“ شاہدہ بیگم نے غصہ نکالنے کے لیے ناجی کو آواز دی۔ وہ بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گئی۔

”جی! جی بیگم صاحب۔“ ناجی بھاگتی ہوئی آئی تھی اس لیے پھولی ہوئی سانس کے درمیان بولی۔

”تمہیں، چھوٹے صاحب اور تانیہ بی بی کو بلانے کے لیے بھیجا تھا۔ کہاں مر گئی تھیں؟“ شاہدہ بیگم نے اسے لتاڑا۔

”جی، تانیہ بی بی نے ابھی اٹھنے سے انکار کر دیا ہے اور چھوٹے صاحب کمرے میں نہیں ہیں۔“

”ہیں! چھوٹے صاحب کمرے سے کہاں چلے گئے؟“

”ان کا کچھ پتہ چلتا ہے، دونوں مرضی کے مالک ہیں، رات گئے آتے ہیں اور کوئی پوچھتا تک نہیں۔“ امی جان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”امی جان! فرحان کسی کام سے گیا ہوگا۔“

”چلو یو نہی سہی، لیکن گھر میں بڑوں کو کسی گنتی میں تو شمار کر لیا کریں۔“

”شاہدہ! آفس سے دیر ہو رہی ہے... اٹھو...“ میاں افتخار نے مزید بحث میں الجھنے سے بیوی کو بچایا۔

”افتخار میاں! امی اور میری دوائیں ضرور لے کر آنا۔“

”جی بہتر...“

”آج پھر امی۔“ ناجی نے ہونٹ چبا کر کہا تو وہ چڑ گئیں۔

”ہاں! اور آج سارے برتن اسٹور سے نکال کر باہر رکھو۔“ وہ بولیں۔ ناجی

برا سامنہ بنا کر سیدھی میاں جی کے پاس آگئی۔



”میاں جی! خدا کے لیے اہلی نہ لانا“ یہ دیکھیں وہ پرانے بھاری بھاری برتن اہلی سے رگڑ کر دھونے سے میرے ہاتھ گھس گئے ہیں۔“

”بک بک بند کر، تجھے بھی ان دونوں سے سرچڑھا رکھا ہے، قیمتی برتن تیرے ہاتھوں سے اچھے ہیں، چل جا کے سب کمروں کی کھڑکیاں کھول، بستر سمیٹ۔“ انہوں نے ناجی کو کھری کھری سنائیں کہ وہ چپ چاپ کمروں کی طرف بڑھ گئی... اور وہ دونوں خاموشی سے آفس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے... دراصل میاں افتخار اپنے آفس جانے سے پہلے شاہدہ بیگم کو ان کے بینک چھوڑتے تھے... وہ قومی بینک میں سینئر بینک آفیسر تھیں۔ اپنی اعلیٰ قابلیت کے باعث ہر دل عزیز تھیں... میٹھے شائستہ لب و لہجے کی وجہ سے محکمے اور اسٹاف میں مشہور تھیں... یہ الگ بات تھی کہ گھر میں وہ ایک

ناکام ماں اور ناکام بیٹی کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہی تھیں ان کی امی زہرا بیگم کو ان سے حد درجہ شکایات تھیں اور دونوں بچے الگ نالاں رہتے تھے۔ ایسے میں میاں افتخار واحد سہارا تھے جو کہتے تو کسی کو کچھ نہیں تھے، بس

ان کی دلجوئی کی ہر ممکن کوشش ضرور کرتے تھے... زندہ دل اور خوش مزاج انسان تھے۔ ہر لمحے زیر لب مسکراتے رہتے، ان پر تو یہ الزام بھی عائد تھا کہ وہ گھر کی ملازمہ ناجی کے بھی چائو چونچلے اولاد کی طرح اٹھاتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ ہزار نخرے کرتی ہے۔ زیادہ بولتی ہے، وہ سرخم کر کے الزامات اپنے سر لے لیتے... بس کسی قسم کی مداخلت خانگی معاملات میں کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ زہرا بیگم کو کلی اختیارات حاصل تھے وہ اپنی مرضی اور پسند سے ان کا گھر چلا رہی تھیں... انہیں ان سے کبھی کوئی شکایت پیدا ہی نہیں ہوئی۔ شادی کے اکتیس سال ان کی فرمانبرداری کی مثال تھے وہ داماد نہیں بیٹا، بن کر انہیں اپنی والدہ کا مقام دیتے تھے... زہرا بیگم دل کی بری نہیں تھیں وضع دار پرانے خیالات کی مالک تھیں، علی گڑھ اسکول کی میٹرک پاس تھیں... سلجھی ہوئی معاملہ فہم خاتون تھیں بس نئے بے ہنگم لائف اسٹائل سے سخت متنفر تھیں... اپنے ورثے سے، اپنی روایات اور ثقافت سے بے پناہ لگاؤ رکھتی تھیں، یہی وجہ تھی کہ شاہدہ بیگم کے بچے ان سے چڑتے تھے۔ انہیں نانو کا قدیم شہر کے درمیان بنا ہوا یہ گھر بھی قطعاً پسند نہیں تھا...



فرحان کو بھی دبی دبی گھر سے، گھر کے گرد و نواح سے شکایت تھی لیکن زیادہ واویلا تانیہ مچاتی تھی... وہ اس گھر کو کھنڈر اور آسیبی محل کہتی تھی۔ لے دے کے اس کی تان گھر بیچنے پر ٹوٹی تھی، جس کے بعد گھر میں اچھا خاصا ہنگامہ ہوتا اور بڑی مشکل سے شاہدہ بیگم ماں اور بیٹی کو سمجھانے میں کامیاب ہوتیں... وہ جانتی تھیں کہ امی جان اپنا آبائی گھر کسی قیمت پر نہیں بیچیں گی... انہیں تانیہ کی پسند کا احترام تھا تو امی جان کی ضدی طبیعت سے بھی وہ پوری طرح واقف تھیں۔ وہ یہ ہر گز نہیں چاہتی تھی کہ امی جان کو کسی قسم کا صدمہ پہنچائیں۔ اس لیے ان کی یہ پوری کوشش ہوتی تھی کہ جب تک امی جان زندہ ہیں، اپنی پسند اور مرضی سے رہیں۔

شاہدہ بیگم نے ایک دن بھی سسرال میں رہ کر نہیں دیکھا تھا۔ میاں افتخار کو انہیں پسند کرنے کی سزا میں اپنا گھر، اپنے رشتے دار چھوڑنے پڑے تھے۔ موہنی سی صورت والی شاہدہ انہیں دیوانہ کر گئی تھیں اور انہوں نے زہرا بیگم کی یہ گھر دامادی والی کڑی شرط قبول کر لی... زہرا بیگم کو ان کی شکل میں

اطاعت گزار بیٹا مل گیا۔ جبکہ ان کا اپنا بیٹا زبیر احمد بالکل ساتھ والے گھر میں رہائش پذیر تھا... زہرا بیگم نے بیٹے کے حصے کا گھر اسے دے دیا تھا۔ بیٹی کے گھر میں وہ رہ رہی تھیں، گھر شاہدہ کے نام تھا مگر اسے بیچنے کا اختیاریہ الحال شاہدہ بیگم کو نہیں تھا... ویسے بھی وہ ملازمت کرتی تھیں۔ سارے گھر کی دیکھ بھال امی جان کر رہی تھیں، اس سہولت کے بدلے انہوں نے مکمل زبان بندی کر رکھی تھی... اس کے باوجود گھر میں کسی بد نظمی یا خرابی کے ہونے پر انہیں ہی قصور وار ٹھہرایا جاتا تھا۔

☆☆☆☆...

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی... اور دروازہ کھول کر کوئی اندر آگیا۔ سامعہ نے مصلے پر بیٹھے گردن گھما کر دیکھا۔

”او، سوری، سوری! تم نماز پڑھو، ہم پھر آجائے گا۔“ مسز جیری نے معذرتی انداز میں کہا تو وہ مسکرا کر مصلے سے اٹھتے ہوئے بولی۔



”ارے نہیں نہیں، مسز جیری آجائیں، میں تو ویسے ہی آنکھیں بند کر کے دیر تک مصلے پر بیٹھی رہتی ہوں، نماز کا وقت تو کب کا گزر چکا۔“

”ویسے تم سب سے زیادہ مصلے پر ہی پر سکون لگتی ہو۔“ مسز جیری ایزی موڈ میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ وہ ان کے سامنے والی کرسی پر آکر بیٹھ گئی۔

”سچ مچ، سب سے زیادہ سکون ملتا ہے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں گاڈ نے اپنے ذکر میں بہت خوشی چھپا کر رکھا ہے۔“

”کیسے آنا ہوا...؟“ اس نے ان سے آنے کی وجہ پوچھی... کیونکہ اس وقت تو اسپتال کا رائونڈ مکمل کر کے وہ کچھ دیر آرام کیا کرتی تھیں۔

”یہ بندھا ہوا سامان دیکھنے کے واسطے... تم نے ایک بار پھر جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے۔“ مسز جیری بہت سنجیدہ دکھائی دے رہے تھیں۔

”ہاں! تیسری اور آخری بار جانے کا فیصلہ۔“ اس نے بھی انتہائی سنجیدگی اور کچھ کچھ افسردگی سے جواب دیا۔

”کیا اب کی دفعہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔“ انہوں نے پوچھا۔ تو اس نے کچھ دیر تو لمبی سانس کھینچی اور کہا۔

”نہیں، کچھ نہیں سوچا، شاید کچھ سوچنے کو بچا ہی نہیں ہے۔“

”پہلے دو فریب کھانے کے باوجود، آنکھیں بند کر کے سامان باندھ لیا۔“

”مسز جیری! پہلی مرتبہ احسن حیات نے محبت کا یقین دلایا، اور...“

”ہا! احسن حیات کی محبت، کھلی آنکھ کا دھوکا، پہلی بیوی کا اسیر تم سے پیسے کے واسطے شادی بنایا۔“ مسز جیری نے اس کا جملہ چھین کر مکمل کر دیا۔

”تبھی تو جلدی لوٹ کر تمہارے پاس آگئی تھی۔“ وہ افسردگی سے بولی۔

”اور پھر لوٹ گئی تھیں، ڈاکٹر شہروز کی بڑنگ میں آکر، کیسے کیسے دھوکے نہیں دیئے اس نے... کھلم کھلا سینہ تان کر دوسرا شادی کیا اور تمہاری دولت



لے کر ملک سے بھاگ گیا۔“ مسز جیری کا غم وغصے سے چہرہ سرخ پڑ گیا۔

ایک دم ہی وہ اس کے ساتھ گزرے تلخ واقعات یاد کر کے غصے میں آگئیں... ان کا یہ انداز اظہار تھا اس بات کا کہ وہ اس سے کس قدر محبت کرتی ہیں۔

”مجھے یاد ہے میں پھر آپ کے پاس آگئی... آپ کا وجود ہمیشہ میرے لیے کشش ثقل بنا رہا... آپ کی رفاقت میرے سانس کے چلنے کا سبب بن رہی ہے۔“ وہ رنجیدہ ہو گئی۔

”سامعہ ڈارلنگ! اسی لیے تو فکر ہو رہا ہے۔ گاڈ کے واسطے اس تیسرے فیصلے پر غور کرو۔ فرحان بالکل نیا خون ہے۔ جلدی اپنے فیصلے سے بدل گیا تو...؟“ انہوں نے پر تشویش نگاہوں سے دیکھا تو

وہ ہولے سے مسکرا دی۔

”مسز جیری! اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہوگا، میں چھتیس سالہ مطلقہ ہوں اور وہ صرف اٹھائیس سال کا ہے...“

”تو وہ تمہارے واسطے کا ہے کو سوچتا ہے، محبت بھری باتیں بناتا ہے۔“

”وہ ایسا اپنی عمر کی ضرورتوں کے مطابق کرتا ہے اور میں اپنی عمر کے تجربے کے مطابق اس کا ہاتھ تھام رہی ہوں... شاید میں اب بھی ایک گھر کا خواب دیکھتی ہوں کوئی ضروری نہیں کہ فرحان کے بعد ملنے والا شخص بھی میرے لیے اپنے دل میں محبت محسوس کرے۔ وقت سرک رہا ہے، میں نے فرحان کی محبت پر یقین کر لیا ہے۔ آگے میری قسمت۔“

”قسمت سے ہی تو ڈر لگتا ہے، ہم ریٹائر ہو کے انگلینڈ چلا جائے گا اور تم اکیلا کیسے رہے گا؟“ وہ فکر مندی سے بولیں۔

”مسز جیری، آپ کی دعائیں میرے ساتھ رہیں گی، مجھے اللہ پر بھروسہ ہے اور فرحان کی محبت پر سو فیصد یقین... دراصل عورت مجبوری کا نام ہے، سہاروں کی تلاش میں ریت کی دیوار سے بھی ٹیک لگا کے آنکھیں موند لیتی ہے... بھول جاتی ہے کہ ریت تو ریت ہوتی ہے... میں بھی پھر آنکھیں موندنے لگی ہوں۔“



”سامعہ ڈارلنگ! کچھ بھی بولو، مگر فرحان کے واسطے اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلدی نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

”ایک سال کم نہیں ہے مسز جیری، فرحان نے میرے دل پر اثر کیا ہے، وہ شادی کرنے کا خواہشمند ہے، میں اس کے لیے اس سے شادی کر رہی ہوں۔“

”اور اس کا گھر والا سب لوگ کیا کہے گا؟“

”دیکھا جائے گا۔“

”یہ تو فرحان کہتا ہے، مسز جیری دیکھا جائے گا۔“ مسز جیری نے فرحان کی نقل اتاری۔

”بس مجھے اس پر تیسری اور آخری مرتبہ اعتبار کرنے سے مت روکو مسز جیری۔“ وہ ان کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اوکے، مائی ڈیئر! گاڈ تمہارا حفاظت کرے۔ تمہارا خواہش پورا کرے۔ ہم تمہارا شادی میں شرکت کرنے ضرور آئے گا۔ ساتھ میں پھول لائے گا۔“ مسز جیری کی آنکھیں بھیگ گئیں لہجہ رقت آمیز ہو گیا تو وہ ان سے لپٹ گئی۔

مسز جیری سامعہ نواز کے لیے شجر سایہ دار کی مانند تھیں۔ گرلز کالج کے ہوٹل میں آج سے سات سال پہلے جب اس نے قدم رکھا تھا تب پہلی شادی کا خاتمہ ہوا تھا، اس نے اس صدمے سے نکلنے کے لیے ملازمت اختیار کی تھی... بکھری بکھری سی جب وہ ہوٹل میں آئی تھی تب مسز جیری نے بڑی گرمجوشی سے اسے خوش آمدید کہا تھا۔

اس کا بھری دنیا میں کوئی نہیں تھا، چوہدری نواز کی وہ اکلوتی اولاد تھی، بیوی کے انتقال کے فوراً بعد ہی وہ گائوں چھوڑ کر شہر میں رہائش پذیر ہو گئے۔

سامعہ کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ اس نے ایم ایس سی میتھ کے امتحان میں یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ یونیورسٹی نے اسے جاب کی آفر کی مگر چوہدری نواز کو یہ منظور نہیں تھا۔ ان کو سامعہ نے بہت قائل کرنا چاہا مگر وہ راضی نہ ہوئے بلکہ



انہوں نے سامعہ کی شادی کے بعد گاؤں واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سامعہ کے لیے چوہدری نواز کے پاس احسن حیات کا رشتہ آیا، چوہدری صاحب نے سامعہ کو احسن حیات کے سامنے کر دیا۔ چند رسمی ملاقاتوں کے بعد سامعہ نے احسن حیات کے لیے ہاں کر دی۔ بڑی دھوم دھام سے شادی کر کے چوہدری نواز فارغ ہوئے مگر پیغام اجل آگیا۔ ہارٹ اٹیک کے باعث اسے تنہا چھوڑ گئے۔ تب احسن حیات جیسے لالچی کا بھید کھلا کہ اس کی پہلی بیوی موجود ہے دولت کے لالچ میں اس سے شادی کی گئی تھی۔ وہ اس صدمے پر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ احسن حیات نے دونوں ہاتھوں سے اس کی دولت سمیٹی۔ شہر کی کوٹھی بیچ ڈالی۔ زرعی رقبہ بھی کافی زیادہ فروخت کر دیا اور پھر بات طلاق پر ختم ہوئی۔ اس نے گاؤں سے پھر قدم شہر کی طرف اٹھائے۔ یہاں ہاتھ پاؤں مار کے، پہلے کالج میں عارضی سامی پر کام شروع کیا۔ پھر اعلیٰ کارکردگی اور مستقل ضرورت کے پیش نظر پرنسپل کے پکے آڈر کرا لئے۔ مسز جیری کی محبت میں اور کالج کی مصروفیت میں احسن حیات کے دیئے زخم کافی حد تک مندمل ہو گئے۔ تب ایک روز بخار کی دوا لینے ڈاکٹر شہروز کے پاس گئی تو وہ

لٹو ہو گئے۔ خوبصورت سامعہ کے سامنے دل پھینک کر کھڑے ہو گئے۔ وہ بہت عرصہ ٹال مٹول سے کام لیتی رہی۔ مگر اندر سے تو نسوانیت سے بھرپور جواں لڑکی شرمیلی انداز میں چٹکیاں لیتی رہی۔ پھر ملاقاتیں بڑھیں اور نتیجہ شادی نکلا۔ اس شادی کے موقع پر بھی گاؤں کی کچھ اور زمین فروخت کرنی پڑی کیونکہ ڈاکٹر شہروز متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اچھے گھر کا خواب لے کر پھر نئی زندگی شروع کی۔ تب ملازمت تو جاری رکھی لیکن ہوسٹل خیر باد کہہ دیا۔ مگر چھ مہینے بعد ہی ڈاکٹر شہروز نے اپنی اصلیت دکھادی، اپنی چچا زاد سے دوسری شادی رچالی اور سامعہ پر اچھا خاصا تشدد کیا۔ اس کا بہت سا روپیہ لے کر نئی بیوی کے ہمراہ ملک سے باہر چلے گئے اور وہ روتی سسکتی پھر ہوسٹل میں مسز جیری کے پاس آگئی۔

اور اب ایک بار پھر وہ ان سے رخصت ہو رہی تھی۔ ایک نئی دنیا، نئے گھر کے خواب کے ساتھ جارہی تھی، فرحان کی محبت پر اعتبار کر کے... فرحان جس نے ایک سال بھر پور محبت اور توجہ دے کر اس کا دل جیتا تھا، اسے



سنٹرل لائبریری کے پرسکون ماحول میں ملا اور اپنی تمام تر اپنائیت کے ساتھ اس کا ہم خیال بن گیا، اس لمحے سامعہ نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ایکسیوز می کہہ کر اس کے سامنے بیٹھنے کی اجازت لینے والا وجیہہ نوجوان اس کا ہم مزاج ہوگا۔ وہ فیض کی نسخہ ہائے وفا سامنے رکھے محو تھی، اس کے ہاتھ میں بھی احمد فراز کا شعری مجموعہ تھا اور نظریں کتاب کے صفحات پر مرکوز تھیں... اس نے کئی بار کتاب پڑھتے ہوئے سامعہ کی طرف بھی دیکھا، یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ اس سے سامعہ بھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی... وہ خفت سے مسکرایا اور بولا۔

”آپ میری وجہ سے ڈسٹرب تو نہیں ہو رہیں؟“

سامعہ نے ہولے سے مسکرا کے دھیرے سے جواب دیا۔

”نہیں، لائبریری میں بیٹھ کر مطالعہ کرنا ہر آدمی کا حق ہے۔“

”شکریہ۔“

”شکریہ کس بات کا، میں نے آپ پر کوئی احسان تو نہیں کیا۔“ وہ بولی تو اسے کوئی دوسری بات نہ سوچھی جلدی سے پوچھ بیٹھا۔

”آپ کو فیض پسند ہے شاید؟“

”کس حد تک، اس کے علاوہ ہر اچھا شاعر۔“

”ہیں بھی شاعری کی اچھی کتابیں ہی پڑھتا ہوں۔“

”اچھا کرتے ہیں۔“ اس نے شرارتاً کہتے ہوئے اسے یہ احساس دلایا کہ وہ شاید غیر ضروری بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔

”سوری ہیں آپ کو ڈسٹرب کیا ہے۔“

”آپ آرام سے شاعری پڑھیں میرے جانے کا وقت ہو گیا ہے۔“ اس نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

”آپ روز آتی ہیں۔“ وہ پوچھ بیٹھا۔



”تقریباً، کبھی نہیں بھی آتی، مجھے یہاں کا ماحول اچھا لگتا ہے، ورنہ کتاب تو کمرے میں بھی پڑھی جاسکتی ہے۔“ بک شلف میں کتاب واپس لگاتے ہوئے سامعہ نے کہا اور اس پر ایک نگاہ ڈال کر نکل آئی۔

پھر دو تین روز وہ لائبریری نہ جاسکی... لیکن جب گئی تو وہ کچھ دیر بعد وارد گیا، مسکرا کر اسی جگہ پر بیٹھ گیا جس پر پہلے دن بیٹھا تھا۔ وہ اٹھ کر اپنی پسند کی کتاب دیکھنے لگی، وہ بھی اس کے بالکل ساتھ کھڑے ہو کر خود بھی کتابوں پر نگاہ دوڑاتے ہوئے دھیرے سے بولا۔

”آپ تین روز کیوں نہیں آئیں؟“

سامعہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”میں نے آپ کو مس کیا۔“ وہ اسے حیرت میں ڈبکیاں کھاتا چھوڑ کر بولا۔

”لیکن کیوں؟“

”وجہ تو نہیں معلوم بس مس کرنے کو دل چاہا۔“

”حیرت ہے۔“ اس نے بڑی بڑی آنکھوں میں آیا تمسخر چھپاتے ہوئے کہا۔  
 ”کوئی حیرت کی بات نہیں، یہ حسین حادثہ کسی کے بھی ساتھ اور کبھی بھی پیش آسکتا ہے۔“

وہ ایک بار پھر احمد فراز کی کتاب ہاتھ میں لیے واپس جا بیٹھا اور وہ اس کی احقانہ سی بات کو جھٹک کے دوسری میز پر جا بیٹھی اور کتاب پڑھنے میں محو ہو گئی کچھ دیر وہ پریشان سا ہونٹ چباتا رہا اور پھر ایک چھوٹے سے کاغذ پر کچھ لکھ کر اس کے پاس آیا اور کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس پر موٹے حروف میں Sorrey لکھا تھا... اس کے جواب سے پہلے ہی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا۔ وہ ہولے سے مسکرا کر پھر کتاب پر جھک گئی۔

پھر کالج کی مصروفیت میں وہ اسے بھول بھال گئی۔ لیکن مال روڈ پر شاپنگ پلازہ سے نکلتے ہوئے سفید گاڑی سامنے آگئی۔ تو وہ ٹھٹکی۔

”آپ کہاں کھو گئی تھیں؟“ وہ بہت حق جما کر سامنے کھڑا ہو گیا۔



”ایکسیوز می! آپ کی بے تکلفی میرے لیے تشویش کا باعث ہے۔“ وہ کچھ سختی سے بولی تو اس نے قطعاً برا نہ منایا۔

”اور تکلف میرے لیے صدمے کا باعث ہے۔“ وہ بولا۔

”پلیز! آپ وہ روپ نہ دکھائیں جو کھلنڈرے نوجوان دکھاتے ہیں۔ کیونکہ میں خاصی میچور ہوں۔“ اس کا لہجہ مزید سخت ہو گیا۔

”آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں آپ سے ملتے رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے غلط نہ سمجھیں۔“ وہ خاصی پر اعتماد نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ تو ہ کندھا جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔

ایسا بار بار ہونے لگا۔ کالج کے بعد وہ اکثر کہیں نہ کہیں نکل جاتی تھی اور اب اسے وہ ہر جگہ ہی مل جاتا۔ کافی دن وہ اسے لوفر، فلرٹ سمجھ کر جھڑکتی رہی۔ پھر شائستگی سے سمجھایا بھی مگر وہ نہ سمجھا، اس پر تو جیسے کوئی جادو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ اسے اپنے دل پر اختیار نہیں رہا تھا۔ جب کہ سامعہ نے اپنی کہانی سنا کر اسے کنٹرول کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ مگر وہ اور زیادہ

خیال رکھنے لگا۔ وہ انکار کرتی رہتی وہ ملنے چلا آتا۔ پھر اسے ہو سٹل کے باہر کھڑا رکھنے سے بہتر یہ لگتا کہ اس کو باہر ہی مل لیا جائے۔ یہ ملاقاتیں جتنی بڑھتی گئیں اتنا ہی وہ ایک دوسرے پر کھلتے چلے گئے سامعہ کے دل کی دھڑکنیں پھر سے

شور مچانے لگیں۔ فرحان کی آنکھوں میں جھلملاتے محبتوں کے دیئے اس کے دل میں نئی امنگ پیدا کرنے لگے تھے وہ اسے باز رہنے کے لیے منہ کھولتی تو زبان گنگ ہو جاتی۔ وہ اسے بے بس دیکھ کر مسکرا کر کہتا۔

”یہ میرے پیار کا جادو ہے۔“

وہ سٹپٹا جاتی۔ کچھ نہ کہہ سکنے کے باعث گھنی لمبی پلکیں جھپکانے لگتی۔ ادا س سی زردی چہرے پر پھیل جاتی۔

”افسردہ کیوں ہو جاتی ہو...؟“ وہ پوچھتا۔

”اپنی ذات پر غور کرتی ہوں تو حقیقت دامن تھام لیتی ہے۔ تمہارے اور میرے درمیان کچھ بھی قدر مشترک نہیں۔“



”ایک قدر مشترک کافی ہے سامعہ!“ وہ پر اعتماد لہجے میں بولتا۔

”وہ کیا...؟“

”کہ ہم انسان ہیں، باقی سب باتیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔“ وہ اس کو اطمینان فراہم کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا لیکن اس کا دل ہچکولے کھاتا رہتا۔ وہ اس حقیقت سے کیسے نظریں چراتی جو تاریک سائے کی مانند اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ ہر چیز کا تو تفاوت تھا۔ عمریں بڑا ہونا، پہلے سے دو شادیوں کا ہونا اتنا سنگین گناہ تھا جس کی معافی معاشرے میں ملنی مشکل تھی۔ فرحان پورے کا پورا سچ تھا لیکن کیا وہ معاشرے کے، خاندان کے تند و تیز طوفان کا سامنا کر سکے گا؟ یہ سوچ دامن گیر تھی۔ جبکہ فرحان نے سچ مچ بتادیا تھا کہ اسے ماں کی دبی دبی سختی اور نانو کی کھلم کھلا جنگ کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس نے یہ بھی بتادیا کہ بچپن ہی میں اس کو ماموں زاد زر تاشیہ سے منسوب کر دیا گیا تھا، جس میں سو فیصد مرضی نانو کی اور پچاس فیصد ماما کی تھی، باقی بابا تو کسی معاملے میں اپنی رائے ہی نہیں دیتے۔ لہذا یہ فیصلہ مسائل پیدا

کرے گا۔ ”تمہاں دیکھا جائے گا۔“ آخر میں اس نے یہ کہہ دیا مگر وہ اپ سیٹ ہو گئی کیونکہ یہ اتنا آسان کام بھی نہیں تھا۔ فرحان نے اپنے گھریلو حالات کا جو نقشہ کھینچا تھا اس میں ایڈجسٹ ہونا خاصا مشکل تھا۔ وہ جس حیثیت اور مقام پر تھی اس پر زر تاشیہ کی فتح یقینی تھی۔ وہ ہفتوں ڈسٹرب رہی۔ خود کو سنبھالا اسے سمجھایا، مگر وہ مصر تھا کہ ”تمہارے سنگ ہی زندگی بسر کرنی ہے۔“ وہ کئی روز اس سے ملی بھی نہیں لیکن جب اس نے بتایا کہ وہ تیز بخار میں شدید سردی میں ہوسٹل کے باہر ہی رات گزار دے گا تو وہ کندھوں پر سیاہ شال ڈال کر باہر آگئی۔ متانت سے ہولے ہولے قدم اٹھا کر اس کے قریب آئی تو وہ کھل اٹھا۔

”کیوں کانٹوں پر گھسیٹ رہے ہو...؟“

”میں تو پھولوں کی دنیا میں لے کر جانا چاہتا ہوں۔“

”یہ ممکن نہیں، تمہارے سامنے فیوچر ہے، تمہارے ماں باپ کے ارمان ہیں، زر تاشیہ ہے میرا تمہارا کوئی جوڑ نہیں۔“



”سامعہ! شادی شدہ عورت سے شادی جرم نہیں ہے، تم میری پسند ہو، پلیز یقین کرو آخری بار زندگی پر بھروسہ کرو۔“ اس نے پہلی بار اس کا سفید سرد ہاتھ تھام کر بہت قریب ہو کر کہا تو وہ سانس کی گرمی محسوس کر کے ذرا سا پرے ہو گئی۔ کچھ نہ کہہ سکی۔

وہ رات اس نے کروٹیں بدلتے گزار دی، فیصلہ مشکل تھا۔ انکار میں دکھ اور تنہائی تھی، اقرار میں زندگی اور امنگیں، جو آج تک دل میں ہی تھیں کسی کے شانے پر زلفیں پھیلا کر دکھ سکھ بانٹنی اور کسی کی بانہوں میں سمٹنے کو جی ترستا تھا، فرحان کے بعد کسی اور کی تمنا نہیں کی جاسکتی تھی۔

صبح تک دل اور دماغ کی کشمکش نے فرحان کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ اب وہ دونوں زمانے سے ٹکر لینے جا رہے تھے۔ چھپ کر شادی کرنے...

...☆☆☆...

میاں ستار کو کاکھانسی کا شدید دورہ پڑا تھا۔

رفیعہ نے عجلت میں پکڑا آٹے کا پیڑا پرات میں ڈالا اور ان کے قریب پہنچ گئیں۔ ان کی کھانسی پر عادل اپنے حواس بحال کر کے اوپر کمرے سے نیچے بھاگا۔ روٹین میں تو وہ دن کے گیارہ بجے سو کر اٹھتا تھا کیونکہ رات دیر تک ہوم ٹیوشن لے کر آتا تھا۔ گیارہ بجے کے بعد کوئی مہینہ ہو گیا تھا ملازمت تلاش کرتے۔ جس کا ملنا ہر گزرنے والے دن کے ساتھ ناممکن بنتا جا رہا تھا۔ میاں ستار کی کھانسی کے اضافے کی بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ انہیں سانس کی تکلیف تھی جب کسی بات پر غصہ کرتے تو سانس اکھڑنے لگتی۔ آج بھی وہ کافی غصے میں تھے۔ رفیعہ نے جلدی سے سہارا دے کر بٹھایا۔ پیٹھ تھپتھپائی تو وہ چلائے۔

”چھوڑ... چھوڑو... چھوڑ دو مجھے۔“

”کیوں غصہ کرتے ہو؟“ رفیعہ نے دھیرے سے کہا... انہیں پانی کا گلاس دیا...

انہوں نے ایک گھونٹ لے کر گلاس چار پائی کے پاس رکھی میز پر پٹخا

اور بولے۔



”اور“ اور کیا کروں؟ تمہارے لاڈلے سے تو کچھ ہوتا نہیں... نوکری ملے گی نہیں اور اسٹور پر یہ بیٹھے گا نہیں۔“

”ابا! میں پر امید ہوں مل جائے گی نوکری۔“ عادل نے جلدی سے کہا۔

”ہنہ! پر امید... آٹھ دس ہزار کی نوکری مل بھی گئی تو کونسا تیر مار لے گا۔ میاں افتخار صاحب کی لاڈلی آٹھ دس ہزار کی نوکری میں تو اس گھر میں آنے سے رہیں۔ ان کا اونچا دماغ جانتے ہونا، تم۔“

”جانتا ہوں، آپ کو ان کی منت کرنے کی ضرورت نہیں، ان کا اونچا دماغ ہے تو خود ارہم بھی ہیں۔“

”زبان چلاتا ہے“ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے رفیعہ، زیادہ پڑھ لکھا کر کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اسٹور بند پڑا ہے، میری طبیعت اس قابل نہیں... کیسے چلائو گی گھر...؟“ وہ شدید غصے سے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولتے چلے گئے۔

”آپ آرام کرو، چل ہی رہا ہے گھر... عادل بھی اپنی سی کوشش کر رہا ہے، ایم اے کا نتیجہ آئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟“ رفیعہ نے شوہر کو سمجھا کر عادل کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔

”ہنہ! دیکھتی جاؤ اور کتنا وقت ضائع کرتا ہے۔“ رفیعہ نے وہاں سے اٹھنے میں عافیت سمجھی۔ ان کو شوہر کی اس بات سے ہی چڑ تھی کہ وہ بیٹے پر اعتماد نہیں کرتے۔ فرمانبردار، خیال رکھنے والے بیٹے سے بھی شاکی رہتے تھے کبھی کبھی وہ زبان ہلا کر سمجھانے کی کوشش کرتیں۔ اکثر و بیشتر خاموشی اختیار کر لیتیں... پھر سانس کی بیماری بھی بہت پرانی ہو گئی تھی، اس کی وجہ سے وہ زیادہ چڑ چڑے اور بد مزاج ہو گئے تھے۔

ان کے مقابلے میں میاں افتخار ان کے چھوٹے بھائی بہت دھیمے اور سلجھے ہوئے مزاج کے تھے۔ وہ جب بھی ملنے آتے تو میاں ستار جلی کٹی ہزار باتیں سناتے مگر وہ دھیرے دھیرے جواب دیتے اور مسلسل مسکراتے رہتے۔ عادل سے اپنی بیٹی کا رشتہ انہوں نے اپنی مرضی سے طے کیا تھا، اس وقت بچے

آٹھویں نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ حالانکہ میاں افتخار کو اس رشتے پر بیوی شاہدہ کو راضی کرنے پر کافی وقت لگا تھا تب بھی وہ اس لیے راضی ہو گئی تھیں کہ گورا چٹا بھوری آنکھوں والا عادل انہیں اچھا لگتا تھا، اپنی گندمی رنگ والی تانیہ کے لیے عادل جیسے شہزادے کا انتخاب قابل قبول تھا۔ دوسری طرف اپنے بھائی کی بیٹی سے فرحان کا رشتہ طے ہونے کی وجہ سے بھی وہ شوہر کے سامنے چپ ہو گئی تھیں۔ یوں اپنے تینوں طرف انہوں نے رشتے مضبوط رکھنے کی کوشش کی تھی۔ ماں اور بھائی کو راضی کیا تو جیٹھ جیٹھانی اور شوہر کو بھی خوش کر دیا۔ اب عادل کی تعلیم مکمل ہونے پر اس کی اچھی ملازمت کا وہ بھی بے چینی سے انتظار کر رہی تھیں۔ شوہر کو سمجھا بجھا کر بھیجتی تھیں جب وہ عادل کا ذکر کرتے تو میاں ستار اور رفیعہ پریشان ہو جاتے۔ مگر عادل کی اپنی خود سر ضدی طبیعت تھی وہ اس بات پر سخت غصے ہوتا کہ اس صلاحیتوں پر اعتماد کیوں نہیں کیا جا رہا۔؟ اس سلسلے میں جب بھی میاں ستار یا میاں افتخار بات کرتے تو وہ پوری کوشش کرتا انہیں مطمئن کرنے کی، مگر میاں

ستار کا مزاج ایسا تھا کہ دونوں میں بحث چھڑ جاتی۔ ایسے میں رفیعہ ہمیشہ شوہر کو سمجھانے کی کوشش کرتیں۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر میاں ستار بڑی دیر تک ان دونوں کے خلاف بڑ بڑاتے رہے۔ عادل تیار ہو کر بنا ناشتہ کئے گھر سے نکل گیا اور رفیعہ دکھی سی ہو کر کچن کے کام کاج میں مصروف ہو گئیں۔

☆☆☆☆...

دبیز میک اپ کی تہہ جماتے ہوئے وہ اچانک شیشے میں سے پشت پر کھڑے زبیر احمد کو دیکھ کر چونکیں۔

”خیر تو ہے میرے سر پر کیوں کھڑے ہو گئے؟“

”انتظار کر رہا تھا کہ کب آپ کا میک اپ مکمل ہو اور کب میں بات کروں۔“

”بہانے بہانے سے آپ کو میرے میک اپ کو برا بھلا کہنا ہے۔“



”یہ تو بہت پرانی بات ہو گئی نرگھس بیگم، آپ پہلے دن والی نرگھس ہی ہیں،  
نہ آپ بدلی ہیں اور نہ میں، آپ کو بدلنے کی اب کوشش کرتا ہوں۔“ زبیر  
احمد نے جل کر کہا اور بیڈ کے کنارے پرٹک گئے۔

”مگر جلتے کڑتے تو رہتے ہو، اماں، بہنا کے اشاروں پر چلتے ہوئے، نہ انہیں  
کبھی میں اچھی لگی اور نہ تمہیں۔“ نرگھس نے باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا۔

”بس، بس ہو گئیں شروع، ان دونوں کو تو تم نے آتے ہی دیوار پیچھے دھکیل  
دیا تھا، وہ تمہارا ذکر بھی نہیں کرتیں اور تمہارے اندر سے بدگمانی نکلتی  
نہیں۔“

”اچھا، اچھا مجھ میں سو ہزار کیڑے ہیں، کیوں بیاہ لائے تھے مجھے...؟“ نرگھس  
نے چلا کر کہا اور سرخ لپ اسٹک کی تہہ ہونٹوں پر جمانے لگیں۔

”بیاہ لانے کی سزا کاٹ رہا ہوں اور اب دھیرے بولا کرو، جوان بیٹی گھر میں  
ہے، مگر تمہیں ذرا بھی احساس نہیں۔“ زبیر احمد نے دبے لہجے میں سختی سے  
کہا۔

”تو سزا ختم کرلو، نکال باہر کرو مجھے، یہی تو تم چاہتے ہو، تمہاری ماں بہن  
چاہتی ہیں۔“ میک اپ مکمل کر کے وہ ان کی طرف پلٹیں۔

”مت بہتان لگایا کرو، اپنے کرتوت دیکھو، کوئی چیز گھر میں جگہ پر نہیں۔ بے  
ترتیبی ہی بے ترتیبی ہے۔ دیکھا کرو شاہدہ باجی کا گھر آئینے کی طرح چمکتا  
ہے۔“

”جی ہاں! تمہاری اماں کو انہوں نے ملازم جو رکھا ہوا ہے، بڑی بی بی کے  
گھر کی چاکری کر سکتی ہیں، بیٹے کے گھر کی نہیں۔“ وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔

”تم سے بات کرنا فضول ہے، میں جا رہا ہوں۔“ وہ غصے سے اٹھے۔

”مجھے افشین کی طرف چھوڑتے جانا۔“

”چلی جاؤ رکشے پر، مجھے آفس سے دیر ہو رہی ہے۔“

”کیوں جائوں رکشے پر، تمہارے ساتھ ہی جائوں گی۔“ وہ سینہ تان کر آگے آگے چلنے لگیں تو زبیر احمد خون کے گھونٹ بھر کے رہ گئے۔ حالانکہ وہ اس وقت زرتاشیہ کے حوالے سے بات کرنا چاہتے

تھے مگر نرگھس ہمیشہ کی بے پروا، نمائش پسند خاتون تھیں۔ ہر وقت اپنے بنائو سنگھار میں مصروف، گھر سے باہر جانے کو ہر گھڑی تیار... گھر اور گھریلو معاملات سخت ابتر حالت میں رہتے۔ الٹا سیدھا جلابھنا کھانا ملازمہ بنا کر چلی جاتی، وہی کھانا پڑتا۔ باقی بھی حالات بہت خراب تھے۔ گندا گھر، بے ترتیب سامان... زبیر احمد جیسے نفاست پسند آدمی کے لیے بہت تکلیف کا باعث تھا۔ انہیں بیٹی کی فکر لاحق تھی۔ زرتاشیہ ماں کی طرح بے پروا اور پھوہڑ تو نہیں تھی لیکن اور کچھ عادات اس میں ماں والی ضرور تھیں... مثلاً بن ٹھن کے رہنا، میک اپ کرنا اسے بھی پسند تھا۔ بس اپنا کمرہ صاف ستھرا رکھتی تھی۔

پڑھائی لکھائی کا شوق تھا۔ اچھے نمبروں سے بی ایس سی کیا۔ اب وہ یونیورسٹی میں داخلہ لینا چاہتی تھی جبکہ زبیر احمد کا خیال تھا کہ فرحان کی تعلیم مکمل ہو چکی

ہے، اب زرتاشیہ کی شادی کر دی جائے... وہ دل ہی دل میں بیوی کے سرد رویے کی وجہ سے خوفزدہ سے تھے۔ دل کے مریض تھے اپنی زندگی میں بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ ویسے بھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ فرحان جیسا ہیرا ان کے ہاتھ سے نکلے۔ زرتاشیہ کی پسندیدگی بھی ان پر واضح تھی۔ اس لیے وہ ہر صورت شادی جلد از جلد کرنا چاہتے تھے۔ یہی بات انہوں نے اماں جان سے بھی کہی تھی۔ وہ بیٹی کی بلائیں لیتے ہوئے خوش ہو گئیں اور شاہدہ سے، میاں افتخار سے بات کرنے کو کہا۔ یہی بات وہ نرگھس سے کرنا چاہتے تھے مگر وہ ہمیشہ کی لاابالی بد مزاج تھیں۔

اپنی سہیلی افشین کے ہاں جانے کی تیاری میں تھیں۔ اب تو انہیں افسوس ہو رہا تھا کہ کیوں بلاوجہ اس وقت گھر آئے اور کیوں بات کرنے کا سوچا۔ نرگھس تو رات دن میں کسی بھی وقت اچھے اور خوشگوار موڈ میں بات نہ کرتی تھی، نہ کرنے دیتی تھی۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ دل ہی دل میں کڑھتے رہے۔ چہرے پر بے شمار ناپسندیدہ شکنیں نمایاں تھیں جن کی نرگھس کو نہ پروا



تھی اور نہ احساس... وہ تو الگ ہی دنیا کی باسی تھی۔ حالانکہ اماں جان کے رشتہ داروں کی بیٹی تھی، پھر بھی کبھی اس نے رشتہ داری کے تقاضے نبھانے کی ضرورت نہ سمجھی بلکہ الٹا اماں جان اور شاہدہ سے سخت متنفر رہتی تھیں۔

زرتاشیہ کے رشتے پر بھی وہ تو دل سے خوش نہیں تھیں۔ بس اس ایک معاملے پر انہیں شوہر کی ماننی پڑی تھی... شاید بیٹی کی پسند کا احساس بھی تھا جو اب تک یہ رشتہ قائم تھا۔ ورنہ دبے دبے لفظوں میں کئی بار اپنے بھتیجے افراسیاب کی تعریفوں کے پل باندھنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتی تھیں... جس پر زبیر تلملاتے تھے اور ہونٹ سی کے رہ جاتے تھے...

...☆☆☆...

ناجی نے ناگوار خاطر اسٹور کا دروازہ کھولا اور لائٹ آن کی۔

تاہم پیتل کے برتنوں سے بھرا یہ اسٹور ہر ہفتے کھولنا، تمام برتن باہر نکال کے دھونے، اہلی کے رس سے مانجھنے اور دھوپ میں خشک کرنے کے لیے رکھنا اس کی کڑی ڈیوٹی تھی۔ شام ہونے سے پہلے تمام برتن واپس اسٹور میں

رکھنے کے بعد وہ جی بھر کے برتنوں کو کوستی بڑی بیگم کو برا بھلا کہتی مگر آج اسٹور کا دروازہ کھولنے سے پہلے ہی اس کا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ اس لیے برتن اٹھا اٹھا کر اسٹور سے باہر پٹخنے لگی۔ برتنوں کا شور سن کر بڑی بیگم ہانپتی کانپتی باورچی خانے سے نکل کر بھاگی آئیں۔

”ہیں، ہیں ارے کم بخت یہ کیا کر رہی ہے؟“

”دیکھ تو رہی ہیں برتن دھونے کے لیے اسٹور سے نکال رہی ہوں۔“ ناجی نے تڑک کر بتایا۔

”اری موئی! یہ برتن نکال رہی ہے یا غصہ...؟“ وہ غصے سے بولی۔

”آپ کو جو بھی سمجھ میں آئے، بس ایک طرف ہو جائیں۔“ ناجی نے ان کا غصہ نظر انداز کرتے ہوئے برتن پٹخنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

”اری باؤلی ہو گئی ہو، کتنے قیمتی برتن ہیں جانتی ہو۔“

”جی ہاں! اسی لیے اسٹور میں سڑ رہے ہیں۔“

”اچھا بس! تیرے منہ میں بھی شاہدہ کے بچوں کی زبان آگئی ہے، احتیاط سے برتن اٹھا۔“ بڑی بیگم نے تننتا کے کہا۔

”آپ مانیں یا نہ مانیں کہتے تو وہ ٹھیک ہی ہیں۔ یہ پرانے برتن اب بیچ ہی دیں۔“ ناجی کی دل میں آئی بات زبان سے پھسل پڑی تو گویا بھونچال آگیا۔

”نوج! تیرے منہ میں خاک، آج پرانے برتن بیچ دو، کل مجھ بڑھیا کو پرانا کہہ کر کباڑیئے کو دلوادینا۔“

”ارے نہیں نہیں، تو بہ تو بہ بڑی بیگم ایسے کیسے ہو سکتا ہے جی۔“ ناجی گھبرا گئی۔

ہونے کو سب ہو سکتا ہے، مگر میں ایسا ہونے نہیں دوں گی، یہ کل کے بچے مجھے کیا بدلیں گے؟“ وہ سینہ ٹھونک کر بولیں۔ تو ناجی ہکلائی۔

”بالکل، بالکل!“

”اچھا! چل اب کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہے، اٹھا برتن حوض پر لے کر چلو۔“

”لے جاتی ہوں پر امی تو نہیں ہے۔“

”پتہ ہے مجھے، آجائے گی امی بھی۔“

”ہیں میاں جی کو فون کر دوں۔“ ناجی نے پوچھا۔

”کیوں؟ فون مفت میں ہوتا ہے کیا۔ خوب شاہدہ اور میاں افتخار نے تمہیں ڈھیل دے رکھی ہے۔ خوب بدھو بنائو دونوں کو، وہ ہیں ہی اسی لائق، وکالت کرتے ہیں تمہاری، کوئی کام وقت پر تم سے ہوتا

نہیں، آدھا دن گزر گیا صفائی ستھرائی کچھ نہیں ہوئی۔“ وہ ایک سانس میں بولتی چلی گئی۔



”صبح سے ایک منٹ کی فرصت نہیں ملی قسم لے لیں۔ سارے بند کمرے کھول کے صاف کئے ہیں صوفوں کے کشن بدلے ہیں، بیڈ کی چادریں بدلی ہیں، غسل خانے تو شیشے کی طرح چمکا دیئے ہیں۔“

”کسی کمرے میں ٹیوب لائٹ یا بلب تو جلتا نہیں رہ گیا۔ تیری بدحواسی سے واقف ہوں میں۔“

”بندہ بشر ہوں جی! ہزار کام ایک اکیلی جان، اس پر بھی کوئی خوش نہیں۔“

ناجی سے برا سا منہ بنا کر کہا۔

”یہ نے ہزار بار دوسرا ملازم رکھا، پر تم رہنے نہیں دیتیں۔“

”جی! میں، میں نہیں رہنے دیتی۔“ ناجی حیرت زدہ رہ گئی۔

”اچھا اب حیرت چھوڑو برتن واپس اسٹور میں رکھو کل نکال لینا۔ میاں افتخار تو اہلی شام کو ہی لے کر آئیں گے۔“

”جی! واپس اسٹور میں، رہنے دیں بہت بھاری ہیں انہیں کچھ نہیں ہوتا۔“

”پھر غلط بات، تم جانتی ہو چیزیں دائیں بائیں پڑی ہوئی مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔“

”جی اچھا...“ ناجی نے مریل سی آواز میں کہا... وہ ذرا سا آگے بڑھیں اور پھر پلٹ کر آگئیں۔

”یہ تانیہ بی بی کہاں ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”خرم صاحب کے ساتھ گئی ہیں، ان کے کمرے کی صفائی کرنی ہے۔“

”اس کا تو ذکر ہی نہ کرو، کہیں جائیں، کسی کے ساتھ جائیں، ماں باپ نے آزادی دے رکھی ہے، شاہدہ کو رات دن یہی سمجھاتی ہوں کہ اولاد کو لگام دو، روئیں گے میاں ستار سر پکڑ کر...“ انہوں نے غائبانہ میاں ستار کے لیے کہا۔

”شاہدہ بی بی! بہت سمجھاتی تو ہیں، پر تانیہ بی بی غصیلی ہیں۔“

”خاک سمجھاتی ہیں شاہدہ بی بی۔ ہر کام میں من مانی کرتی ہیں“ باپ پوچھتا ہے اور نہ ماں، یہ جانے خرم صاحب کہاں سے آکودے ہیں۔“

”کلاس فیلو ہیں تانیہ بی بی کے۔“ اس نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں بتایا۔

”ہنہ! بھاڑ میں جائے“ فرحان میاں آئے کہ نہیں۔“ انہیں گویا ایک دم یاد آگیا۔

”ابھی تو نہیں آئے۔“

”اس لڑکے نے بھی حد کر دی ہے“ یہ بھی پکا مینا ہے، اسے بھی کوئی پوچھنے والا نہیں۔“ وہ بڑ بڑاتی ہوئی آگے بڑھ گئیں اور ناجی لمبی سانس بھر کے دوبارہ سے برتن اسٹور میں رکھنے لگی۔

...☆☆☆...

نارنجی ساڑھی میں وہ دھیمی سی مسکان لپ اسٹک زدہ ہونٹوں پر سجائے اور نگاہیں جھکائے فرحان کے برابر صوفے پر بیٹھی تھی۔ فرحان کا گہرا دست ایاز

اور مسز جیری سامنے والی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ ایاز کی بیوی صائمہ کافی بنا کر لائی تو انہیں خاموش دیکھ کر بولی۔

”کمال ہے، کیا سوچ رہے ہیں سب؟“

”سوچنے کا ہی تو مرحلہ شروع ہو گیا ہے اب بیگم صاحب۔“ ایاز نے بیوی کو مخاطب کیا۔

”اب کیا سوچنا“ جو ہونا تھا ہو گیا۔ میرا خیال ہے بہت اچھا ہوا ہے فرحان کے لیے سامعہ بھابی سے بڑھ کر کوئی لڑکی سجتی ہی نہیں۔“ صائمہ نے کافی کا ایک مگ سامعہ کی طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

”تم نہیں جانتیں ایک بلا کو اور اچھا ہوا یا برا مگر اس کو سنبھالنے کے لیے بڑا وقت اور بڑا صبر کرنا ہوگا۔“ ایاز نے کافی کی چسکی لی... تو فرحان اور سامعہ نے مضطرب سی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔



”کوئی بات نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ویسے بھی تم جیسے دوست اور پیاری سی صائمہ بھابی کے ہوتے ہمیں فکر کی کیا ضرورت ہے...؟“ فرحان نے بڑی ہمت سے مسکرا کر کہا... تو صائمہ نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔

”جی ہاں! ہم ہر وقت آپ کے ساتھ ہیں، آپ بالکل نہ گھبرائیں۔“

”ہمارے ساتھ سے زیادہ اس کو گھر والوں کے ساتھ کی ضرورت ہے، کیوں مسز جیری...؟“ ایاز نے مسلسل متفکر سی خاموشی سے مسز جیری کو مخاطب کیا تو وہ چونکیں۔

”تم ٹھیک بولتا ہے ینگ مین، مگر...“

”نو، نو مسز جیری آپ ہمت نہ چھوڑیں، ورنہ میرا وجود کھوکھلا پڑ جائے گا۔“ صائمہ نے جذباتی انداز میں آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ پکڑے اور رقت آمیز لہجے میں بولی۔ تو انہوں نے جھلملاتی آنکھوں سے اسے دیکھا، پیشانی چومی اور بولیں۔

”تھینک یو مسز جیری۔“ صائمہ نے ان کے ہاتھ چوم لیے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”صائمہ اور فرحان مسز جیری کو رخصت کرنے کے لئے ایاز اور صائمہ گیٹ تک گئے۔“

”میرا خیال ہے، تم کمرے میں آرام کرو۔ میں گھر جاتا ہوں، کوشش کروں گا آج ہی واپس آنے کی... لیکن اگر نہ آسکوں تو پلیز سوچنا۔“ فرحان نے اس کے سچے سنورے حسین سراپا پر بے قرار نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ صائمہ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ اسی وقت ایاز اور صائمہ واپس آگئے۔ فرحان نے ایاز کو بھی وہی کچھ کہا تو وہ چپ ہو گیا۔ مگر صائمہ بول پڑی۔

”فرحان بھائی! یہ آپ کی شادی کی رات ہے اور آپ جارہے ہیں۔“

”سمجھا کرو، اس کا جانا بہتر ہے، صبح سے غائب ہے، رات کے آٹھ بج رہے ہیں، جائے گا تو آئے گا۔“ ایاز نے براہِ راست بیوی کو کہا۔

”جانا اور دن بھر کی غیر حاضری کا حساب دینا ہی تو قیامت لگ رہا ہے۔“ فرحان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ تو ایاز نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”ہمت سے کام لو، تم اپنے بابا سے دل کی بات کرنا وہ تمہارا ساتھ یقیناً دیں گے۔“

”کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتا، کیونکہ بابا کسی قسم کے افیر میں انوالو نہیں ہوتے،“ ماما اور نانو کی مرضی چلتی ہے بلکہ نانو ہی کی مرضی... ماما مجھے اور تانی کو فیور بہت کرتی لیکن نانو کا حکم بھی نہیں ٹالتیں۔ خیر دیکھتا ہوں کیا کرنا ہے...؟“ فرحان یہ کہہ کر مزید کوئی بات کئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔

صائمہ نے سامعہ کا ہاتھ تھاما اور اسے اس کے سچے سچائے کمرے میں چھوڑنے کے لیے چل دی۔

...☆☆☆...

حسب معمول بینک میں کام کی زیادتی کے باعث شاہدہ کو افتخار صاحب کو دیر سے پک کرنے کے لیے کہنا پڑا۔ میاں افتخار یہ سن کر خود بھی دفتری کاموں میں مگن ہو گئے... ساڑھے آٹھ بجے شاہدہ کی مس بیل پر وہ جلدی سے گاڑی کی چابی اٹھا کے نکلے اور ٹھیک نو بجے وہ دونوں گھر میں داخل ہوئے۔ اس وقت فرحان کی گاڑی پورچ میں کھڑی دیکھ کر اپنے کمرے میں گئے۔ شاہدہ کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر دباتے ہوئی وہ بیڈ پر گر سی گئیں۔ ناجی نے تھوڑا سا دروازہ کھول کے دیکھا اور الٹے قدموں لوٹ گئی۔

”آج امی جان کہاں مصروف ہیں؟“ میاں افتخار کپڑے تبدیل کر کے واش روم سے نکلتے ہوئے بولے۔

”کہیں کسی کام میں مصروف ہوں گی۔“ شاہدہ نے سر درد کی شدت ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا، ناجی ٹرے میں چائے رکھے اندر آگئی۔

”جیتی رہو، بڑے صحیح وقت پر چائے لائی ہو۔“



”جی ہاں! اب بمباری بھی صحیح وقت پر ہوگی۔“

میاں افتخار نے ذرا سا راز دانہ انداز میں جھک کر پوچھا۔

”توپ کا رخ اسی طرف ہے کیا؟“

شاہدہ نے گھور کر میاں افتخار کو دیکھا۔

”افتخار۔“

”جی جان افتخار! بمباری سے تو ہم سب کو ہی ڈر لگتا ہے نا۔“ انہوں نے اس قدر معصومیت سے کہا کہ شاہدہ مسکرا دیں۔

”اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے، ناجی کو باتیں بنانے کی عادت ہے۔“

”عادت وادت کوئی نہیں ہے، ابھی آئیں گی اور پوچھیں گی یہ بے وقت چائے کیوں بنی؟ کھانے کا وقت کہاں ضائع کیا...؟“ وغیرہ وغیرہ۔ ناجی نے اچھی خاصی بڑی بیگم کی نقالی کی تو میاں افتخار زیر لب مسکرا دیئے اور چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بولے۔

”شاہدہ جی! ناجی کہہ تو سچ رہی ہے، جلدی سے چائے ختم کر لو تاکہ امن عامہ کو نقصان نہ پہنچے۔“

”آپ بھی ناجی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں، کچھ نہیں ہوتا، کچھ کہیں گی تو میں سنبھال لوں گی۔“

”اجی! خاک سنبھال لیں گی آپ! آج تک ان تانبے پیتل کے برتنوں اور بابا آدم کے زمانے کے صندوق، بکسوں سے تو نجات دلا نہ سکیں۔“ میاں افتخار نے دانستہ ناجی کو ستانے کے لیے دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”افتخار! دھیرج... اف تو بہ امی نے سن لیا تو تیسری عالمی جنگ چھڑ جائے گی۔“ شاہدہ نے سنجیدگی سے کہا...

”جنگ چھڑے یا فساد ہو، آپ دونوں سن لیں ہم کام چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ہم پرانے برتن مانجھ مانجھ کر ضائع ہونا نہیں چاہتے۔ ابھی ہم نے دیکھا ہی کیا ہے؟“ ناجی کے تو سچ مچ سب زخم

ہرے ہو گئے۔ باقاعدہ رقت بھری آواز میں بولتی چلی گئی۔

”ارے کم عقل لڑکی! اتنے نادر نایاب برتن دیکھنے کے بعد بھی کچھ اور دیکھنے کی حسرت باقی ہے... امی جان کا چاندی کا پاندان ہی جس نے دیکھ لیا سمجھو اس کے بخت جاگ گئے...“ میاں افتخار نے چائے کا آخری گھونٹ بھر کے انتہائی سادگی سے کہا... شاہدہ نے گھورا۔

”ہم تو بد قسمت ہی اچھے، ہم سے ہر ہفتے اسٹور سے بھاری بھاری سو ڈیڑھ سو برتن نکال کر امی کے پانی سے نہیں چمکائے جائے... صندوقوں اور بکسوں کے کپڑے استری کر، کر کے نہیں بدلے جاتے۔“ ناجی نے ہاتھ نچا کر کہا۔

”ناجی! بار بار کیوں ایک ہی بات کئے جاتی ہو، ابھی تک امی جان کا مزاج نہیں سمجھیں بچپن سے اس گھر میں ہو۔ تقریباً پندرہ سولہ سال ہو گئے ہیں۔“

شاہدہ نے ذرا سی سختی سے کہا، تو میاں افتخار مسکرائے بنا نہ رہ سکے۔

”اور ہاں! حوصلہ رکھو اور پندرہ سولہ سال بھی ایسے ہی گزریں گے، کیونکہ امی جان ماشاء اللہ پوری طرح فٹ اور ہٹ ہیں۔“

”افتخار! خدا کا خوف کریں یہ آپ امی جان کے لیے کہہ رہے ہیں۔“

”بھئی میں تو امی جان کی صحت پر رشک کر رہا ہوں، ستر سال میں بھی آپ کو اور ہمیں پیچھے چھوڑتی ہیں، ہم اور آپ ٹھہرے شوگر اور بلڈ پریشر کے مریض۔“

”اللہ انہیں سلامت رکھے (آمین)۔“ شاہدہ نے خلوص دل سے ماں کی دراز عمری کی دعا کی۔

”سنا تم نے ناجی! چلو اب ہمت پکڑو، یہ سوچ کر برتن چمکاتی رہو کہ وہ وقت بھی آئے گا جب یہ تمام پرانے برتن بخش دیئے جائیں گے۔“ میاں افتخار نے ایک بار پھر ناجی کو چھڑا تو وہ منمنائی۔

”میاں جی! ہمیں نہیں چاہئیں۔ اکیلے ہم سے اتنا کام نہیں ہوتا... پھر بھی ڈانٹی ہیں۔“

”ناجی! بڑھاپا بہت بڑی شکست اور کمزوری کا نام ہے، اس میں کچھ لوگ بڑی بیگم جیسے اپنے تحکم اور رعب سے فتح یاب ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ



امی جان کی مجبوری اور ضرورت ہے۔“ پہلی مرتبہ اتنی دیر میں میاں افتخار نے سنجیدگی کا مظاہرہ کیا...

”ارے میاں، کس کی مجبوری اور ضرورت کی بات کر رہے ہو؟“ عین اسی وقت بڑی بیگم آگئیں۔ ناجی تو گھبرا گئی... انہوں نے پہلے ناجی کو دیکھا اور پھر چائے کے خالی برتنوں کو...

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”چائے... چائے لے کر آئی تھی۔“ ناجی نے کہا اور جلدی سے ٹرے اٹھالی۔

”بے وقت کی چائے کس خوشی میں، صرف کام سے بچ کر باتیں بگھارنے کے لیے۔“ انہوں نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

”امی جان! چائے لانے کو میں نے کہا تھا... دراصل شاہدہ کے سر میں بہت درد تھا۔“ میاں افتخار نے جلدی سے بات سنبھالی۔

”درد تو ہوگا، سارا دن بھوکے پیاسے گھر سے باہر کام کرتے رہو۔“

”کیا کریں کام جو کرنا ہوا؟“ شاہدہ نے دھیرے سے جواب دیا۔

”بس کام ہی کرتی رہو، بچے ہاتھ سے نکلے جارہے ہیں، صاحبزادے ابھی دن بھر کی مصروفیت کے بعد آئے ہیں، تانی بی تو شام ہوتے ہی تیار ہو کے گئی تھیں... کون پوچھے کہ کہاں جا رہی ہیں؟“ بڑی بیگم نے اچھے خاصے غصے میں نرمی شامل کرتے ہوئے بتایا۔ شاہدہ نے فوراً افتخار کی طرف دیکھا اور نظریں چراگئیں۔

”چلو ناجی، یہ برتن لے جاؤ۔“ شاہدہ نے موضوع بدلنے کی خاطر ناجی کو ہی مخاطب کیا۔

”کھانے کے وقت چائے واہ بھی...!“ انہوں نے پھر لتاڑا۔

”چائے کے ساتھ بسکٹ بھی لیے ہیں امی جان...!“ میاں افتخار نے بتایا تو وہ اور زیادہ فارم میں آگئیں۔

”ناجی! بسکٹ نکال کر مرتبان اچھی طرح بند کیا تھا۔“

”جی! کیسے بھول سکتی ہوں...؟“

”چلو اب جائو“ یہ برتن دھو کر کچن بند کر دو، اب کسی کے لیے کھانا وانا نہیں لگے گا۔“ انہوں نے تحکم سے با آواز بلند ان دونوں کو سمجھایا۔ میاں افتخار تھوک نکل کر بھوک برداشت کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔

”ناجی! یہ امی جان کی دوائیں، پان اور املی لیتی جائو۔“ شاہدہ نے کہا۔

”جیتے رہو افتخار میاں!“ بڑی بیگم نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”بس آپ خوش رہا کریں۔“ میاں افتخار نے مسکرا کر کہا۔

”ارے میاں! کوشش تو کرتی ہوں پر تمہارے بچوں نے پریشان کر رکھا ہے“

تم دونوں کی طرح آنکھیں بند کر لوں تو امن میں رہوں، مگر میں ایسا کر

نہیں سکتی۔ حد سے بڑھی ہوئی آزادی اور خود مختاری لے ڈوبے گی انہیں...

میرے پوچھنے پر تو ہزار سلوٹیں ڈالتے ہیں پیشانی پر... جوان جہان پچی ہے پر

اس موٹے خرم کے ساتھ غائب رہتی ہے، کیا جواب دو گے اپنے بڑے بھیا

کو...“ بڑی بیگم نے دل کی بھڑاس نکالی تو شاہدہ نے منمننا کر کہا۔

”اللہ رحم کرے امی جان! خرم تانیہ کا کلاس فیلو ہے، بہت امیر پڑھے لکھے

گھرانے سے تعلق ہے۔“

”ارے کونسی کتاب میں لکھا ہے کہ امیر پڑھے لکھے گھر کے لڑکے پرانی بچیوں

کے ساتھ سیر سپاٹے کریں، اس بیچارے عادل سے تو سیدھے منہ بات نہیں

کرتیں تانی جی، حالانکہ پتہ ہے کہ اس سے منسوب ہیں۔ تم کیسی ماں ہو اللہ

جانے۔“

”امی جان! آپ بالکل درست فرما رہی ہیں میں کروں گا تانیہ سے بات۔“

میاں افتخار کچھ سنجیدہ ہو گئے جو کہ شاہدہ بیگم کے لیے کچھ پریشان کن تھا۔ وہ

جھٹ حمایت میں بولیں۔

”امی جان! جوان اولاد سے سختی بھی تو نہیں کر سکتے۔“

”واہ بھئی واہ! خوب کہی، انجام پر نظر رکھو پھر۔“ وہ تڑک کر بولیں۔

”میرا خیال ہے اس وقت میرے سر کا درد بڑھ گیا ہے۔“ شاہدہ نے بیزاری

سے کہا تو بڑی بیگم سمجھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔



”دیکھو! میاں افتخار! اولاد کو اسی رستے پر ہی نہیں ڈالنا چاہئے جہاں سے بھول کا سفر شروع ہوتا ہے۔ ارے کھلاؤ سونے کا نوالہ پر دیکھو شیر کی نظر سے۔“

”آپ بے فکر ہو جائیں، آج میں بات کرتا ہوں۔“ میاں افتخار نے بمشکل تمام انہیں تسلی دے کر رخصت کیا۔ شاہدہ نے تکیے میں سر دے کر آنکھیں موند لیں۔ میاں افتخار نے رحم بھری نظروں سے انہیں دیکھا اور کمرے کی لائٹ آف کر کے باہر نکل آئے۔

...☆☆☆...

جوں جوں وقت کی سوئیاں آگے کی طرف رینگ رہی تھیں فرحان کے دل کی دھڑکنیں بے تاب سے سر پٹخ رہی تھیں... جو شیلے جذبات چٹکیاں لے رہے تھے جس رات کے خواب گذشتہ پندرہ دن سے وہ دیکھ رہا تھا، وہ جاں گسل لمحات میں بدلتی جا رہی تھی... نارنجی ساڑھی میں دودھیا بدن کے جلوے نگاہوں میں گھوم رہے تھے... دل مچلا کہ اس وقت دوڑ کے جائے اور سامعہ

کو بانہوں میں بھر کے رفاقت کے حسیں احساس سے سرشار کر دے... مگر وہ بے بس تھا۔

”مجبور تھا۔“

”مشکل میں تھا...“

کمرے کی تنہائی میں کوئی اس کا مسئلہ جاننے والا نہیں تھا... جواں دھڑکنوں کا شور تھا دل کی بے کلی تھی، ایسے میں جیسے کھڑکی کے رستے نارنجی پیرہن میں باد صبا بن کر وہ اس کے احساس کو چھو گئی... سیاہ زلفوں کے بیچ مسکراتا چہرہ، اس کی نگاہوں کی زد میں آگیا۔ وہ اس کو بانہوں میں سمیٹنے کے لیے آگے بڑھا... مگر چھم سے وہ دور ہو گئی۔ وہ اور آگے بڑھا، وہ اور دور ہو گئی... پھر اس کے ہاتھ میں نارنجی ساڑھی کا پلو آگیا۔ منت دل کش نے کام کیا... بے خودی میں وہ اس سے لپٹ کر سچ مچ نیند کی وادیوں میں پہنچ گیا۔

”مگر...“

خواب تو خواب ہوتا ہے... اسے میاں افتخار کے ہاتھ کی انگلیوں کے احساس نے جگا دیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تو میاں افتخار نے عینک کے شیشے کے پیچھے سے بھی اس کے چہرے پر پھیلی بے چینی اور آنکھوں سے اڈتا نشہ دیکھ لیا۔ دو متضاد چیزیں اور ساتھ ساتھ وہ متعجب سے ہوئے۔

”بابا! آپ اس وقت۔“

”ہاں یار! ویسے خیر ہے، ابھی رات کے گیارہ بجے ہیں اور آپ سو گئے۔“

”وہ“ دراصل بہت تھکا ہوا تھا۔“ وہ ہکلا یا۔

”مجھے تو آپ کی طبیعت خراب معلوم ہو رہی ہے۔“ انہوں نے بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں، طبیعت ٹھیک ہے بس ذرا...؟“ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا تو وہ ٹھٹھکے۔

”فرحان یار! کچھ الجھے الجھے سے ہو، کیا ہے ذرا ذرا...؟“

”جی! وہ بس کچھ نہیں۔“ آنکھوں سے خمار معدوم ہو چکا تھا، حقیقت کی دنیا میں وہ سخت مضطرب ساہی تو تھا۔ کچھ دیر پہلے کسی سہارے، کسی ساتھی اور غمگسار کی تلاش میں تھا اب جبکہ بابا اس کے سامنے تھے تو زبان ساتھ نہیں دے پار ہی تھی۔ بے اختیار ہی اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

”فرحان! اتنی صبح کہاں گئے تھے اور سارا دن کہاں رہے...؟“ بابا نے بات کا رخ اس کی سہولت کی وجہ سے موڑ دیا۔

”جی! دوست کے ساتھ تھا، ضروری کام تھا۔“ اس کی ہمت نے پھر بھی ساتھ نہ دیا۔

”یار! بات یہ ہے کہ آپ پریشان ہو، بتانا چاہو تو ٹھیک ورنہ ہم تو رعب ڈالنے والے باپ نہیں۔“ بابا نے مسکرا کر کہا اور اٹھنے لگے تو وہ چند

ساعت انہیں مدیکھتا رہا پھر تیزی سے گھٹنوں کے بل ان کے پیروں کی طرف فرش پر بیٹھ گیا۔ وہ سمجھ گئے کہ فرحان کا سچ مچ کچھ مسئلہ ہے۔

”بابا! پراس کریں آپ میرا ساتھ دیں گے۔“ وہ ایک دم بولا۔



”میرے لیے آج آپ بالکل نئے فرحان ہو، بات کیا ہے، جو ماں سے بھی نہ کہہ سکے۔“

”بابا! ماما اور نانو میرا قطعاً ساتھ نہیں دیں گی اس لیے صرف آپ سے امید ہے۔“ وہ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے بڑے رسان سے بولا۔

”اگر ایسی بات ہے تو یار کہہ دو، کیوں کڑھ رہے ہو...؟“ بابا سخت بے چین ہو گئے۔

”بابا! میں نے شادی کر لی ہے، ایک لڑکی سے...“ وہ تیزی سے کہہ گیا۔ تو میاں افتخار رکے اور پھر ہنسنے لگے۔

”یار! شادی تو لڑکی سے ہی کرنی تھی، کونسی نئی بات ہے۔“ باپ کا پر مزاح مزاج ذہن میں لا کر وہ بنا حیرت کے بولا۔

”بابا! مذاق کی دنیا سے باہر آکر سوچیں، میں نے ایک مطلقہ سے شادی کی ہے، وہ بھی آپ لوگوں کو بنا بتائے۔ اب کیا ہوگا یہ بتائیں...؟“

”اب دھماکا ہوگا، اس گھر کے درو دیوار لرز اٹھیں گے، قیامت آجائے گی، آپ کی نانو عذاب بنادیں گی ہماری زندگی، زر تاشیہ کا کیا ہوگا؟“ وہ کسی چابی کے کھلونے کی مانند چل کر کمرے کے وسط میں کھڑے ہو گئے، انہوں نے جو خوفناک منظر کشی کی وہ پہلے سے اس کے بارے میں سوچ چکا تھا۔

”بابا! آئی ایم سوری، میں سامعہ سے بہت محبت کرتا ہوں۔“

”یار بادشاہ! یہ ٹھیک ہے مگر اب کیا ہوگا یہ سوچو، میرا تو دماغ تم نے بھک سے اڑا دیا ہے۔“

”آپ کچھ کریں، میں ہر صورت سامعہ کو یہاں لانا چاہتا ہوں۔“ وہ جذباتی ہو کر ذرا سا اونچا بولا تو وہ گھبرا گئے۔

”دھیرج! کسی نے سن لیا تو ابھی بھونچال آجائے گا، آپ کی ماما کی ویسے ہی طبیعت خراب ہے... آپ دھیرے دھیرے ساری بات مجھے بتائو، پھر کچھ کریں گے... مگر صبر سے، تحمل سے کچھ ہوگا۔“ وہ بیڈ پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ

گئے اور فرحان نے دروازہ لاک کر کے ان کے قریب بیٹھ کر ساری کہانی کہہ ڈالی۔

میاں افتخار کے چہرے پر کچھ خاص بات نہیں محسوس ہو رہی تھی۔ وہ بڑے نارمل انداز میں بڑی سے بڑی مشکل سے مشکل بات تحمل سے سننے اور کرنے کے عادی تھے۔ اس وقت بھی انہوں نے اس کی پوری بات بڑے سکون سے سنی تھی اور بات ختم ہونے کے بعد سکون سے ہی کہا۔

”بیٹا جی! اس مسئلے کا حل صبر و تحمل میں ہے، مجھے سوچنے دو، اس بچی کو کیسے اس گھر میں لانا ہے، یہ سوچتے ہیں، مشکل بہت ہے پرنا ممکن نہیں۔ اسے تسلی دو، فی الحال کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور اب زیادہ دیر کے لیے گھر سے غائب نہ ہونا۔“

”بابا! سامعہ بہت اچھی ہے، بہت دکھ اٹھائے ہیں اس نے۔“ اس نے بیوی کی وکالت شروع کی تو وہ مسکرا دیئے۔

”بس، بس میری جان یہ بتانے سے اس کی حیثیت میں فرق تھوڑا آئے گا، بس وہ آپ کی عزت ہے تو ہماری عزت ہے پریشان نہ ہو۔ اب آرام سے سو جاؤ... شاباش...“ وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلے گئے اور وہ سامعہ کے تصور سے باتیں کرنے لگا۔

”سامعہ جان! تھوڑا سا انتظار، پھر ہم تم ہوں گے، سب مشکلیں ختم ہو جائیں گی، محبت بھرے سب ارمان پورے ہوں گے۔ بس تھوڑا سا صبر، مجھے پتہ ہے تم بستر پر کروٹیں بدل رہی ہو گی، تم نے سونے کا لباس پہن لیا ہو گا، بندیا، بالی سب اتار دی ہوں گی، اداس بانہوں میں آنچل لیے بھیگی پلکوں سے سہاگ رات کے گزرتے پل گن رہی ہو گی۔ مجھے معاف کردو میں تمہیں آج کی رات تنہا چھوڑ کے آگیا۔ پر کیوں آگیا یہ تو جانتی ہو تم، سو جاؤ، میرے تصور سے لپٹ کے سو جاؤ... محبت کا سب قرض اتار دوں گا۔ آج کی رات کے ہر پل کا حساب دوں گا۔ سو جاؤ...“ وہ کافی دیر اس سے باتیں کرتا رہا اور پھر جانے کس پہر سو گیا۔

...☆☆☆...

ہزار ہا کوشش کے باوجود وہ ایک پل کو بھی نیند کا احساس اپنے قریب نہ لاسکی۔ کروٹیں بدلتے رات صبح ہیں بدل گئی... بوجھل سرخ آنکھوں میں۔

رتجگے تھے...

تھکن تھی...

اضطراب تھا...

انتظار ہی انتظار تھا...

مگر افسوس اور پچھتاوا نہیں تھا... رات بھر مسز جیری کی خدشات بھری باتیں کانوں میں گونجتی رہی، فرحان کے لیے ان کے دل میں شکوک و شبہات تھے، مگر نہیں معلوم کہ وہ اس قدر میٹھی سرد مٹی سے کیوں گوندھی گئی کہ اس کی آنکھوں میں نہ آنسو تھے، نہ لبوں پر آہیں تھیں اور نہ سسکیاں۔ فجر کی نماز پڑھ کے وہ کمرے سے باہر نکل کر لان میں آگئی... باہر موسم خنک اور

خوشگوار تھا، آنکھوں کی جلن کو، بدن کی حرارت کو کافی سکون سا محسوس ہوا... نرم شبنم زدہ گھاس پر بڑی دیر ٹہلتی رہی... فرحان کو سوچتی رہی، اس سے سرگوشیاں کرتی رہی۔ فرحان ایک پوری سچائی اور طاقت تھا۔ اس کے لیے ذرا دیر کو بھی وہ بدگمان نہیں ہو سکی تھی، ہلکا سا اجالا پھیلا تو ہا کر نے اخبار گیٹ سے اندر پھینکا... وہ اخبار اٹھانے کے لیے بڑھی مگر اس سے پہلے چوکیدار نے اخبار لا کر اسے دے دیا... وہیں لان میں پڑی کرسی پر ٹک کر اخبار پڑھنے لگی... کچھ ہی دیر بعد صائمہ کی شوخ آواز آئی... وہ اسی طرف آرہی تھی۔

”اچھی خاصی خنکی ہے آپ باہر کیوں آگئیں؟“

”موسم اچھا لگا...“ وہ مسکرائی۔

”رات کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی، ایک مرتبہ دل چاہا کہ آپ کے کمرے میں جائوں، پھر ایاز نے منع کر دیا۔“



”پریشانی کیسی؟ آرام سے سو گئی تھی۔“ اس نے اس سلیقے سے جواب دیا کہ صائمہ نے اس کی بات پر یقین کر لیا، حالانکہ رات بھر وہ دونوں میاں بیوی اس کے لیے حد درجہ فکر مند رہے تھے۔

”آپ بہت گریٹ ہو سامعہ بھابی، میں آپ کی جگہ ہوتی تو رو کر برا حال کر لیتی۔“ صائمہ نے کہا تو وہ ہولے سے مسکرا دی۔

”ابھی تو فرحان کو اعتبار کا یقین دلانے کی صرف ایک رات گزری

ہے، میں نے فرحان کے لیے کیا ہی کیا ہے؟ جو اس نے کیا ہے اس کی پاداش

میں جانے وہ کیا کیا صدمے جھیلے گا؟ مجھے پتہ ہے فرحان نے رات کیسے

گزاری ہوگی؟ اور جانے کیا کیا سوچا ہوگا؟

”ہاں! لیکن اللہ بہتری کرنے والا ہے، چلو اندر چلیں، میں ناشتہ بنواتی

ہوں۔“ صائمہ نے اس کا سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے اس کا حوصلہ

بڑھایا۔

”میں بھی آپ کی مدد کرتی ہوں۔“

”اوں ہنہ! ابھی نہیں، ہمارے دولہا میاں آکر ڈانٹیں گے، ولیمہ تو ہولینے دو۔“ صائمہ نے شرارت سے کان کے قریب جا کر کہا تو سامعہ گلابی پڑ گئیں۔

پھر دونوں اندر کی طرف آ گئیں۔ صائمہ کچن کی طرف مڑ گئی اور وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ موبائل فون بج رہا تھا، اس نے لپک کر اٹھایا۔ دوسری طرف فرحان تھا۔

”ہیلو...“ اس نے بے تابی سے کہا۔

”جی جناب! کہاں تھیں آپ اتنی دیر سے فون ملارہا ہوں۔“ فرحان کی دبی دبی آواز ہوئی۔

”وہ میں باہر تھی، آپ سنائیے کیسے ہو؟“ اس نے اس انداز میں پوچھا کہ

فرحان کا دل خوشی سے بھر گیا۔ ورنہ وہ تو سوچ رہا تھا کہ فون ملاتے ہی

سامعہ رونا دھونا شروع کر دے گی، گلے شکوے کرے گی...

”یو آر گریٹ سامعہ!“ وہ خوشی سے بولا۔

”کیوں کیا ہوا...؟“

”کچھ نہیں، دل چاہ رہا ہے اڑ کر آجائوں اور تمہیں بانہوں میں چھپا لوں۔“

”ہش ایسی باتیں فون پر نہیں کرتے۔“ وہ شرارت سے بولی۔

”آج نہیں سکتا تو فون پر ہی کہوں گا۔“

”چلیں جب بھی آئیں گے انشاء اللہ۔“

”ہاں شام سے پہلے آؤں گا، بس اس وقت ماما اور بابا ناشتہ کر رہے ہیں،“

کوشش کروں گا جلدی آؤں۔“ اس نے انتہائی دھیرے سے کہا اور فون ایک

دم بند کر دیا۔

سامعہ چند لمحے فون کو ہاتھ میں پکڑے گھورتی رہی اور پھر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر

رکھ کر ذرا دیر کو بیڈ پر دراز ہو گئی... مگر کچھ ہی دیر بعد ملازمہ نے ناشتہ

کے لیے آکر اطلاع دی تو وہ اٹھ کر اس کے ہمراہ باہر آ گئی۔

...☆☆☆...

ڈیوٹی پر جانے سے پہلے شاہدہ بیگم کو بڑی بیگم کی خوشمگس نگاہوں کا مطلب

سمجھ تانیہ کے کمرے میں آنا پڑا۔ وہ ناشتہ کی میز پر نہیں تھی، اس لیے انہیں

میاں افتخار کو خاصی طنزیہ باتوں کا سامنا کرنا پڑا... وہ تو فرحان میز پر موجود تھا

ورنہ اور زیادہ حالات خراب ہوتے۔ تانیہ کے کمرے سے میوزک کے ساتھ

اس کے گنگنانے کی آواز آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ جاگ رہی ہے...

انہوں نے دروازے پر دستک دی۔

”یس، کم ان... اندر سے تانیہ کی آواز آئی تو شاہدہ بیگم اندر داخل ہو گئیں...

سب سے پہلے انہوں نے ڈیک کا گلا دبایا پھر کچھ سنجیدگی سے بولیں۔

”متانی! رات اتنی دیر سے گھر آنے لگی ہو۔“

”ماما! خرم کو لانگ ڈرائیو کا کریز ہے، اومائی گاڈ گاڑی چلاتا نہیں اڑتا ہے۔

سچ ماما ہوا میں اڑتا ہے۔“ تانیہ نے ماں کی سنجیدگی کو بھی ہوا میں اڑا دیا۔

”کچھ بھی سہی، آزادی کی بھی حد ہوتی ہے، خرم، خرم سنتے ہوئے کان پک گئے ہیں، آپ کو خرم کا مقام پتہ ہونا چاہئے کیونکہ عادل کا کوئی مقام پہلے سے موجود ہے۔“

”بس، بس، اما، یاد دہانی نہ کرائیں، مجھے پتہ ہے کہ میرے گلے میں عادل کے نام کی تختی لٹکائی ہوئی ہے... مگر میں بے زبان جانور بھی نہیں ہوں یہ بھی یاد رکھیے آپ سب...“ وہ گردن اکڑا کر، بالوں کو جھٹک کر بولی۔

”یہ فیصلہ آپ کے بابا نے کیا ہے۔“ شاہدہ بیگم نے نرمی سے کہا۔

”بابا کی بات نہ کریں، سب فیصلے اس گھر میں نانو کی مرضی سے ہوتے ہیں اور آپ چپ چاپ تماشا دیکھتی ہیں۔“ تانیہ کے لہجے میں تیزی کے ساتھ ساتھ احتجاج بھی تھا۔ شاہدہ بیگم کو جس نے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

”آپ کو کیا ہوتا جا رہا ہے؟ گھر کی ہر بات بری لگنے لگی ہے۔“

”چھوڑیں، اما، چھوڑیں، آپ جائیں آپ کو دیر ہو رہی ہے اس پرانی حویلی میں صرف نانو سانس لیتی ہیں، آپ سمیت حنوط شدہ میاں میں۔“

شاہدہ بیگم کو تائو آگیا۔

”بولتے ہوئے بالکل بھول جاتی ہو کہ میں آپ کی اما ہوں۔“

وہ بڑی دیر طزیہ نظروں سے انہیں دیکھتی رہی اور پھر وارڈ روب سے اپنے کپڑوں کا انتخاب کرتے ہوئے بولی۔

”کون بھولا ہے اور کون نہیں... یہ بحث جانے دیں، آپ صرف نانو کی اکلوتی دبو بیٹی ہیں اور بس۔“

شاہدہ بیگم نے ایک نگاہ وال کلاک پر ڈالی اور پھر اس کی پشت پر آکر بولیں۔

”تانیہ! آزادی اور خود سری کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کسی کو خاطر میں نہ لائیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کو اور فرحان کو فیور کیا ہے۔“

”آپ نے ہمیشہ نانو کی ڈھال کا کردار ادا کیا ہے۔ زمانہ کہاں سے کہاں چلا

گیا، نانو کی سوئی آج بھی ہزار سال پہلے کے زمانے پر اٹکی ہوئی ہے، یہ نہ

کرو، وہ نہ کرو، ایسا نہیں ہوگا، ویسا نہیں ہوگا، یہاں کیوں گئیں، وہاں کیوں



گئیں، ہنہ!“ اس نے اچھی خاصی اداکاری کی اور کپڑے لیے واش روم میں گھس گئی۔ شاہدہ بیگم کا سر چکرا گیا۔ غصہ انہیں کم آتا تھا مگر اس وقت وہ متمتا اٹھیں۔

”بزرگوں کی نقل اتارتے شرم آنی چاہئے“ بچوں کو روکنا ٹوکنا ان کی محبت ہوتی ہے۔“ انہوں نے واش روم کے دروازے پر خاصی بلند آواز میں کہا۔

”خرم کے ساتھ آنے جانے پر ان کی پابندیاں میں بھی برداشت نہیں کر سکتی، اس پرانی حویلی کے نیم تاریک سیلن زدہ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے پر یہ سننا پڑتا ہے... اتنی چائے کیوں پی؟ قالین پر جوتے کون لے کر آیا؟ کشن اپنی جگہ سے کیوں ہلے؟ اے سی کیوں چلایا؟“ وہ اندر سے بھی تند لہجے میں بولتی چلی گئی۔

”ان ساری باتوں میں کچھ بھی غلط نہیں۔“ وہ تحمل سے بولیں۔

”چھوڑیے بس۔“

”اوکے! آپ سے تفصیلی بات کروں گی فرصت میں۔“ شاہدہ بیگم نے اپنے مخصوص نرم دبے دبے لہجے کی طرف لوٹتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل آئیں۔ دراصل میاں افتخار گاڑی نکال کر گاہے بگاہے ہارن بجا رہے تھے... وہ خاصی ڈسٹرب سی باہر نکلیں۔ اپنے کمرے کی کھڑکی سے فرحان نے بغور ان کا جائزہ لیا اور پھر کچھ نادم سا ہو کر تیار ہونے لگا۔ وہ کافی دیر سے ان دونوں کے جانے کا انتظار کر رہا تھا اب نانو کے سوا کوئی پوچھ گچھ کرنے والا نہیں تھا۔ ان سے کونسا بہانہ بنانا تھا یہ اس نے سوچ رکھا تھا۔

گاڑی کا ہارن مسلسل بج رہا تھا...

بڑی بیگم چالیہ دھوتے ہوئے زور سے چلائیں...

”ناجی! ناجی! ہائے“ ارے توبہ ہے بھی کون ہے یہ بد تہذیب، ذرا دیکھنا تو۔“ مگر باورچی خانے کی دیوار سے لگی ناجی نے ان کی آواز پر کان نہیں دھرے۔ ہارن مسلسل بج رہا تھا، کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ خود دوپٹے کے پلو سے ہاتھ صاف کرتی ہوئیں باہر نکلیں۔

ناجی انہیں دیکھ کر سٹپٹائی۔

”ارے جا کر دیکھو کون ہے؟ جسے شرفا کے طور طریقے چھو کے بھی نہیں گزرے، سارا محلہ سر پر اٹھالیا ہے، ٹیٹیں لگا رکھی ہیں۔“ وہ ڈپٹ کر بولیں۔ ناجی کے گیٹ سے جھانکنے سے پہلے تانیہ ٹک ٹک کرتی آگئی۔ اس کے ایک ہاتھ میں پرس اور دوسرے ہاتھ میں فائل تھی۔

”کیوں شور مچا رہی ہیں آپ۔“ اس نے تیکھے تیور کے ساتھ پوچھا۔

”ارے لڑکی! شور میں مچا رہی ہوں یا باہر بد تہذیب۔“

وہ جل گئی۔

”بس، بس نانو! ساری تہذیب تو آپ کی اس حویلی میں ہاتھ باندھے کھڑی رہتی ہے، گاڑی کا ہارن دینے والا خرم ہے، سن لیا آپ نے... آپ کی تنگ سی گلی میں ایک گاڑی آجائے تو دوسرا قریب سے نہیں گزر سکتا۔ اس لیے وہ ہارن دے کر مجھے بلارہا ہے۔“ وہ ہاتھ نچا کر بولی۔ اسی اثنا میں فرحان جانے

کے لیے تیار ہو کر وہیں آگیا۔ اسے دیکھ کر بڑی بیگم زور سے اس سے مخاطب ہوئیں۔

”لو، سنو فرحان میاں! اب گلی کے تنگ ہونے کے طعنے بھی ملنے لگے... یہ نہیں کہتیں کہ ہارن بجا کر محلے والوں کا سکون تباہ کرنا بری بات ہے۔ میں پوچھتی ہوں کہ یہی خوبی ہے اس خرم شہزادے میں، شرفا کے بچے ایسے ہوتے ہیں اور اس کا ہمارے گیٹ پر ہارن دینے کا کیا حق بنتا ہے؟

”تانیہ! یہ کونسا انداز ہے؟“ فرحان نے کچھ سختی سے پوچھا۔

”بھائی! آپ نہیں جانتے بس۔“ وہ پائوں پٹختی ہوئی چلی گئی، فرحان نہ اسے روک سکا، نہ ڈانٹ سکا۔ بڑی بیگم مزید سیخ پا ہو گئیں۔

”دیکھ لیا بچے! یہ کل کی بچی سب کو آنکھیں دکھاتی ہے، شاہدہ کی بے جاطر فداوری کا نتیجہ ہے، میرا کیا ہے، بہت پچھتائیں گے دونوں۔ اولاد ہی عزت کراتی ہے اور اولاد ہی بے عزتی کراتی ہے۔ کیا گزرے گی میاں عادل کے دل پر جب ان کو لے گئے۔ گز بھر لمبی زبان ہے۔“

فرحان ان کی بات سن کر نظریں چرا گیا۔ اس کے اپنے اندر جیسے کسی نے زور سے چٹکی کاٹ لی۔ وہ فقط اتنا کہہ سکا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں، میں بابا سے بات کروں گا۔“

”ارے چھوڑو بابا کو، وہ تو ساری زندگی شاہدہ کے سامنے ایک لفظ نہ کہہ سکا۔“ وہ جھلا کر بولیں اور قریب کھڑی ناجی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”ناجی! کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہے، چل سب کی الماریوں سے کپڑے نکال کر دھوپ میں ڈال، ہر ہفتے کپڑوں کو دھوپ لگانا ضروری ہوتا ہے، مگر تمہاری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔“

”آگئی ہے اچھی طرح۔“ ناجی کڑوی نظروں سے گھورتے ہوئے کمروں کی طرف بڑھ گئی اور فرحان نے جلدی سے نکل جانے کے لیے قدم اٹھایا۔

”یہ تم کہاں جا رہے ہو بن ٹھن کے؟“ بڑی بیگم نے پوچھا، تو وہ ٹھٹکا۔

”جی، وہ دوست کی طرف جا رہا ہوں، بیمار ہے۔“ اس نے جھوٹ بولا۔ اس سے پہلے کہ بڑی بیگم کچھ اور کہتیں، ادا سے بال لہراتی زر تاشیہ اسی طرف آ گئیں۔ بڑی بیگم نے محبت سے اس کی پیشانی چومی۔

”دادو! مجھے بک شاپ جانا ہے، فرحان سے کہئے مجھے ساتھ لے جائیں۔“  
شرمیلیں نظریں جھکاتے ہوئے بولی تو بڑی بیگم سے پہلے فرحان بول پڑا۔  
”میرے پاس وقت نہیں ہے۔“

”اے ہے! وقت بھی کہیں سے خریدنا پڑتا ہے کیا، لے جاؤ بچی کو، اب یہ تو تمہارے ساتھ ہی جاتی ہے، کوئی خرم ورم تو نہیں آتے۔“ انہوں نے طنز کیا، فرحان کو غصہ آگیا کہ نانو نے تانیہ کی وجہ سے ایسا کیا۔

”یہ بھی بلا لیں کسی خرم کو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

”ہاں! جانتی ہوں تمہارے عزائم بھی کچھ اچھے نہیں، کن ہوائوں میں ہو یہ بھی پتہ چل جائے گا۔“ انہوں نے خاصے غصے سے کہا تو فرحان پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔ زر تاشیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ بڑی بیگم کچھ ملول سی ہو گئیں۔



”زر تاشیہ! دل پر مت لو، اس کی تو عادت ہے، ہر وقت اکھڑا اکھڑا سا رہتا ہے۔ تمہاری پھوپھو نے دونوں بچوں کو بگاڑ کے دو کوڑی کا بنا دیا ہے۔“

”میں جارہی ہوں، رکشے پر چلی جاؤں گی۔“ زر تاشیہ نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”نرگس اور تمہارے پاپا کہاں ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”مما سو رہی ہیں اور پاپا آفس چلے گئے ہیں۔“

”مما ابھی تک سو رہی ہیں۔“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

”دادو! کوئی نئی بات ہے کیا...؟“ زر تاشیہ نے ان سے زیادہ تعجب سے پوچھا۔

”ارے نہیں بچی، نرگس تو سدا کی ایسی ہی ہیں، خیر تم نے ناشتہ کیا؟“

”پاپا کو ناشتہ بنا کر دیا تھا تو خود بھی کر لیا تھا۔“

”چلو پھر میرے کمرے چل کر بیٹھو۔“

”نہیں... میں جارہی ہوں...“ وہ رنجیدہ خاطر سی یہ کہہ کر وہاں سے آگئی۔ فرحان اس سے ایسے ہی کیوں مخاطب ہوتا ہے؟ یہ سوال اسے دکھی کر رہا تھا۔

گھر پہنچ کر وہ سیدھی اپنے کمرے میں بند ہو کر صرف فرحان سے متعلق ہی سوچتی رہی۔ بچپن سے جس کے سپنے دیکھ کر جوان ہوئی تھی اس نے بھول کر بھی کبھی التفات نہیں برتا تھا۔ وہ اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپا تھا جبکہ اس کی ذرا سی بھی حیثیت نہیں تھی اس کے نزدیک... بس وہ اس امید پر سکون تھی کہ وہ فرحان سے منسوب ہے، یہ گھر کے بڑوں کا فیصلہ ہے، اسے کوئی نہیں بدل سکتا، حالانکہ ممّا اسے جتلاتی رہتی تھیں، فرحان اور پھوپھو شاہدہ کے خلاف بدظن کرتی رہتی تھیں مگر وہ معصوم سی لڑکی اپنی دادو، پھوپھو اور سب سے بے پناہ محبت کرتی تھی... بے شمار سپنے اس کی جھیل سی آنکھوں میں بھرے تھے۔

بیڈ پر پائوں پھیلائے وہ کسی گہری سوچ میں غلطاں تھی۔ فرحان بلا جھجک کمرے میں داخل ہوا تو وہ چونکی اور جلدی سے اٹھنے لگی۔ فرحان نے جلدی سے اس

کے سفید نازک پیروں پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ خود اسی حالت میں وہیں بیٹھ گیا۔ سامعہ نے کسمسا کر پیروں پر سے اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی مگر دباؤ زیادہ تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”اچھا نہیں لگ رہا کیا؟“ اس نے شریر نظروں سے دیکھا تو وہ گلابی پڑ گئی۔ ”آپ کی جگہ یہاں ہے، قدموں میں نہیں۔“ سامعہ نے اپنے پہلو کی طرف اشارہ کیا تو وہ اچھل کر اس کے برابر پہنچ گیا۔

”یہ لیجیے جناب! ہم تو حکم کے بندے ہیں۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”کیا کر رہے ہو؟ دروازہ کھلا ہے پلیز سمجھا کرو۔“

ڈھیر سارا وقت دبے پائوں سرک گیا۔ وہ دونوں ہی خود سپردگی کے عالم میں تھے اور جانے کتنی دیر مدہوشی کا سفر جاری رہتا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سامعہ تو بوکھلا گئی۔ فرحان نے اسے چپ کر کے اونچی آواز میں پوچھا۔

”کون؟“

”حضور بندہ غلام حاضر خدمت ہے۔“ باہر سے ایاز کی آواز آئی۔

”غلام کے لیے حکم ہے کہ ابھی تخلیہ چاہیے۔“ اس نے شرارت سے جوابا کہا تو سامعہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”اوکے بادشاہ سلامت ٹھیک ہے۔“ ایاز کب چوکنے والا تھا یہ کہہ کر چلا گیا۔ سامعہ تو حیا سے پانی پانی ہو گئی مگر فرحان کو روکنا یا سمجھانا اس کے بس میں نہیں تھا۔ بس کچھ دیر بعد فقط اتنا کہہ سکی۔

”فرحان! اس قدر نہ چاہو کہ میرا دم نکل جائے۔“

اسے حیرت ہوئی اس کا ایک دم متغیر سا ہوتا چہرہ نظروں کے سامنے لا کر دیکھا اور بولا۔

”کس خوف کے پنجرے میں ہو۔ میری چاہت پر بدگمان سی ہو۔“

”خوف تو ہے، آخر آپ کو بہت تلخ حقائق کا سامنا کرنا ہے۔“

”ہاں لیکن جب سامنا کرنا پڑا تو اس وقت دیکھا جائے گا۔“

”خطرات سے پہلے منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔“

”کم آن۔ سارے موڈ کا مزا کر کرنا نہ کرو۔ بابا کو سب بتا دیا ہے۔ انشاء اللہ بہتری کا راستہ نکلے گا۔“ اس کے سرد ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے کہا تو وہ کچھ بہل گئی ورنہ مسلسل پریشان کن خیالات کی زد میں تھی۔ کشتیاں جل چکی تھیں۔ پیچھے کچھ نہیں تھا۔ آگے بہت بڑی آزمائش تھی۔ ایسے میں صرف فرحان پر ہی بھروسہ تھا۔

”یہ بتائو کچھ چاہیے۔ میں لے آؤں گا۔“ ایک دم اس نے پوچھا تو وہ چونکی۔

”نہ... نہیں۔ بس کل سے میں کالج جانا چاہتی ہوں۔“

”کیا؟ کل سے... کل ہماری شادی کا تیسرا دن ہے۔ اتنی جلدی...؟“ فرحان نے حیرت سے کہا۔

”تو کیا ہوا؟ یہاں بور ہونے سے تو بہتر ہے۔“

”ابھی سے ہمت ہار دی کیا؟“ فرحان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے ہی کہہ دیا۔“

”کچھ دن صبر سے کام لو ورنہ تمہاری کولیگز ہی پوچھ پوچھ کے جان لے لیں گی۔ ہفتہ دس دن گزار لو۔ اس دوران بابا کوئی راستہ نکال لیں گے۔“

اس کی سمجھ میں فرحان کی بات آ گئی۔ کہہ تو وہ سچ رہا تھا۔ سب کرید کرید کر پوچھیں گی تو وہ سسرال کے بارے میں کیا بتائے گی؟ کیونکہ اس کے بارے میں تو وہ خود بھی کچھ نہیں جانتی تھی۔ بس سب کچھ قسمت پر چھوڑ رکھا تھا۔ اللہ کے سہارے فرحان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔



میاں ستار سو چکے تھے۔ رفیعہ بیگم نے دھیرے سے پیر چارپائی سے اتارے... بڑی دیر سے وہ میاں کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے عادل آیا تو وہ اسے کھانا دینے کی غرض سے اٹھیں مگر میاں ستار جاگ گئے اور آدھی آنکھیں کھول کے ان کی طرف دیکھا۔

”میں عادل کو کھانا دے کر آتی ہوں۔“

”ہاں ہاں۔ جائو آگئے ہیں گلفام روٹیاں توڑنے۔ آج بھی ایک ہی جواب دیں گے کہ نوکری نہیں ملی۔“ وہ جل بھن سی گئیں۔ پیشانی پر ناگوار سلوٹیں آئیں مگر ضبط کر گئیں۔

”رفیعہ! تمہاری ڈھیل نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ نوکری کے بہانے آوارہ گردی کر کے آجاتا ہے۔“ ان کی خاموشی پر بھی چوٹ کیے بغیر وہ رہ نہ سکے۔ وہ پھر بھی کچھ کہے بغیر عادل کے لیے کھانا لے کر اس کے کمرے میں آگئیں۔ انہیں دیکھ کر وہ بستر سے اٹھ بیٹھا مگر موڈ خراب تھا۔

”کیا بات ہے الجھے الجھے سے ہو؟“ انہوں نے پیار سے اس کے خوب صورت بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

”کچھ نہیں امی بس ویسے ہی سر بھاری بھاری سا ہے۔“

”کوئی وجہ تو ہوگی۔“

”ہنہ مگر نوکری نہ ملنے کی وجہ نہ سمجھئے گا۔“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔

”تو اور کیا وجہ ہے؟“ انہوں نے پیار سے نوالہ بنا کر اس کے منہ میں دیا۔

”وجہ ہے ابا کی نک چڑھی بھتیجی تانیہ افتخار۔“ وہ چبا چبا کر بولا۔

”ہیں۔ کیا تم چچا کے گھر گئے تھے؟“

”توبہ کریں۔ مجھے کوئی شوق نہیں ان کے گھر جانے کا۔“ وہ نوالہ چبا کر نگلتے

ہوئے جلدی سے بولا۔

”بری بات ایسے نہیں کہتے۔ بیٹے یہ اپنے رشتے ہیں۔“ رفیعہ نے ہمیشہ کی

طرح اس کی تربیت کی۔

”امی! آپ نہیں جانتیں۔ محترمہ کو اپنے اوپر بہت غرور ہے۔ کسی خرم صاحب کے ساتھ آئیں کریم کھا رہی تھیں۔ بڑی طنزیہ نظروں سے مجھے گھور کر دیکھا اور قریب سے یہ کہہ کر گزر گئیں۔“

”لوگوں کو اپنی اوقات یاد نہیں رہتی... ہے نا امی واقعی ہمیں اوقات یاد رکھنی چاہیے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”چھوڑو، نادان ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ رفیعہ نے دانش مندی سے اس کے ذہن کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”جی نہیں۔ کچھ نہیں ٹھیک ہونے والا۔ اس سانولی کے مزاج ساتویں آسمان پر ہیں۔ بلاوجہ آپ نے میرا سر اس کے سامنے جھکایا ہوا ہے۔“ وہ تلخ لہجے پر قابو نہ پاسکا تو رفیعہ بھی اس کو حق بجانب جان کر کچھ چپ سی ہو گئیں۔ انہیں بھی تانیہ کی تند مزاجی پسند نہیں تھی۔ اس کا غرور سے تنا ہوا سر اور قید و بند سے آزاد زبان پر ناپسندیدگی کا اظہار کئی بار وہ میاں افتخار سے کر چکی تھیں۔ جس کا جواب وہ زندہ دلی سے قہقہہ لگانے کے بعد فقط اتنا کہتے۔

”بھابی! نک چڑھی چڑیل اسی لیے تو عادل دیو کے حوالے کی ہے۔ یہ ہی ٹھیک کرے گا اسے۔“

یوں بات ہنسی مذاق میں آئی گئی ہو جاتی۔

”آپ کیا سوچنے لگیں۔ میں نے کھانا بھی کھا لیا۔“ عادل نے آخری نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے انہیں چونکایا۔

”بس کچھ الجھن سی ہے۔ چاہتی ہوں افتخار اور شاہدہ سے کھل کے بات کروں مگر تمہاری نوکری آڑے آ جاتی ہے۔“

”میری نوکری میرا مسئلہ ہے اس سے بات کا کیا تعلق ہے؟“

”تعلق ہے۔ شادی کی بات کروں گی۔“

”ابھی آپ ایسا سوچیں بھی نہیں۔ بس چپ چاپ دیکھتی جائیں۔ تانیہ بی کیا رنگ دکھاتی ہیں۔“ وہ یہ کہہ کر ہاتھ دھونے کے لیے کمرے سے باہر نکل

گیا۔ رفیعہ کو میاں ستار کے کھانسنے کی آواز آئی تو وہ بھی جلدی سے باہر آ گئیں۔

عادل کمرے میں آ کر اپنی رائٹنگ ٹیبل کے سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ پہلی مرتبہ تانیہ اس کے ذہن پر طاری تھی۔ اس سے پہلے بھی وہ ایسی ہی تھی۔ بالکل اسی طرح پیش آتی تھی مگر اس نے کبھی اس کے بارے میں اتنا نہیں سوچا تھا۔ آج تو پچھلے چار گھنٹے سے وہ اسے ڈسٹرب کر رہی تھی۔ نہیں معلوم غصے سے یاد آ رہی تھی یا اپنائیت سے... اس کی سانولی سی صورت پر اس کے لیے بیگانگی اور حقارت تھی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں طنز کی تیزی تھی... مگر پھر بھی کچھ ایسا تھا کہ اس نے دوبارہ پلٹ کر بھی اسے دیکھا۔ ٹی پنک شرٹ اور سی گرین شلوار میں دوپٹے سے آزاد بانہیں لہراتی ہوئی وہ اس نوجوان کے ساتھ جا رہی تھی۔ ایک بار اس کا دل چاہا کہ دوڑ کر جائے اور اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے ساتھ چلائے مگر ایسا نہ کر سکا... پھر دل چاہا کہ اس کی طرف تو دیکھنا بھی گوارا نہیں۔ یہ سوچ کر بھی دل کو

سکون نہ ملا۔

”تانیہ بی۔ تم لاکھ دامن بچا کر چلو۔ وقت کے فیصلے کے مطابق تم مجھ سے منسوب ہو اور میں خود اپنی مرضی سے تمہیں آزاد کروں تو کروں، تمہاری مرضی سے تو تمہیں ایک ساعت کی آزادی بھی نہیں دوں گا۔ تم نے عادل کے ارادے کی قوت کو لکرا رہے۔ دیکھتے ہیں کس کی کیا اوقات ہے...؟“ اس نے مضبوط لہجے میں تانیہ کو مقابل سمجھ کر کہا۔ گویا وہ اس کے روبرو ہو جیسے۔ ایک انوکھا فیصلہ اس قدر اچانک ہو گیا۔ اس کا دل طمانیت سے بھر گیا۔ ایک دم ہی زندگی بہت زیادہ خوب صورت سی لگنے لگی۔ زندگی کا مقصد اور زیادہ واضح ہو گیا۔ کچھ دیر پہلے تک تانیہ کے لیے کسی خاص جذبے کا احساس نہیں تھا۔ اب وہ اس کا مشن بن گئی تھی جسے ہر ممکن طور پایہ تکمیل تک پہنچانا تھا۔

...☆☆☆...



آخری فائل بند کر کے رکھنے کے بعد زبیر احمد نے لمحے بھر کو آنکھیں موند کر، کرسی کی پشت سے سر ٹکایا۔ کچھ آرام سا محسوس ہوا مگر کمرے میں داخل ہوتی نرگھس یہ دیکھ کر جل گئیں۔

”بہت خوب۔ اپنے دفتری کام اور آرام دونوں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ عینک لگائی اور اٹھ کر بیڈ پر دراز ہو گئے۔ نرگھس کو اور زیادہ برا لگا۔

”میں آپ سے مخاطب ہوں زبیر احمد۔“

”میرا خیال ہے آپ مخاطب نہیں بلکہ جلی کٹی سنا رہی ہیں۔“ انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”ڈرائنگ روم کا اے سی خراب ہو گیا ہے۔“

”ہو جائے گا ٹھیک۔“

”جن بھوت کریں گے۔ بھئی مکینک بلوائو۔“ وہ چلائی۔

”ابھی الہ دین کا چراغ رگڑوں۔ چھری تلے سانس بھی لے لیا کرو۔ ٹھیک ہونے میں وقت لگتا ہے۔“ وہ بھی غصے سے سرخ پڑ گئے۔

”کل میری فرینڈز آ رہی ہیں۔ میں نے لنچ پر انوائٹ کیا ہے۔ صبح تک ٹھیک ہو جانا چاہیے۔“ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”نرگھس! جانتی ہو گھر کتنی مشکل سے آباد ہوتے ہیں۔ انہیں برباد کرنے میں منٹ نہیں لگتا۔“ وہ خاصے ضبط کے ساتھ بولے۔

”دھمکیاں دینے لگے ہو۔ برباد مرد کرتے ہیں، عورت آباد کرنے آتی ہے۔“ وہ گردن اکڑا کر بولی۔

”جائو اپنا کام کرو۔ مت میرے صبر کو آزمایا کرو اور ہاں اس گھر میں کھانے کو کچھ ہے تو بتا دینا۔“ وہ بیزاری سے بولے۔

”کچھ نہیں۔ میں گھر نہیں تھی، ملازم آپ نے کوئی رکھا نہیں ہے۔ باہر سے کچھ لے آؤ۔“ وہ یہ ڈائری سنا کر پٹ پٹ کرتی باہر چلی گئی اور زبیر احمد

نے بمشکل تمام اپنے آپ کو کنٹرول کیا اور پھر اٹھ کر زرتاشیہ کے کمرے میں

آگئے لیکن وہ کمرے میں نہیں تھی۔ وہ دوبارہ کمرے سے نکل کر باہر آئے تو ناجی بڑی بیگم کا پیغام لے آئی۔ انہوں نے بلایا تھا۔ وہ اسے بھیج کر خود بھی جانے والے تھے کہ زرتاشیہ آگئی۔

”پاپا۔“

”جی پیٹا۔“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”پاپا! کھانا کھالیں پھر کہیں جائیں۔“

”نہیں پیٹا پہلے آپ کی دادو کی بات سن آئوں پھر آ کر کھاتا ہوں۔“

”چلیں میں بھی چلتی ہوں۔“

”میرا خیال ہے بعد میں جاننا۔ جانے اماں جان کو کیا بات کرنی ہو۔“ وہ کچھ سوچ کر بولے۔

”ہونہہ چوری کھلانی ہوگی۔ شیشے میں اتارنا ہوگا۔“ نرگھس نے پیچھے سے آ کر زہر آلود لہجے میں کہا تو وہ دونوں ہی ناگوار نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے چل دیے مگر نرگھس کی تیز آواز نے پھر زبیر احمد کا راستہ روکا۔

”سنو۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔ بیٹے کو ہی کیوں بلایا ہے؟ زرتاشیہ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ زبیر احمد زرتاشیہ کی وجہ سے خون کا گھونٹ بھر کے آگے آگے چل دیے۔ پیچھے نرگھس تھی۔

بڑی بیگم اپنے کمرے میں تھیں۔ ان کے پاس شاہدہ بیگم تھیں۔ زبیر احمد کے پیچھے نرگھس کو دیکھ کر بڑی بیگم کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”ارے بیوی۔ زبیر احمد تمہارا زر خرید نہیں ہے۔ کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دیا کرو۔ میں نے صرف اسے بلایا تھا۔“ بڑی بیگم کی کھری کھری باتیں نرگھس کو حد درجہ ناپسند تھیں۔ اس وقت بھی وہ آپے سے باہر ہو گئیں۔

”بس بس اماں جان! بہت تذلیل کر لی آپ نے میری۔ بیٹے کا سر سہلاتی ہو اور بہو کے لیے زہر بھرا ہے۔ اگر زبیر احمد سے تعلق رکھنا ہے تو مجھے بھی برداشت کرنا ہے ورنہ میں دیکھتی ہوں زبیر کیسے یہاں آتے ہیں؟“

نرگھس بھابی! کیا ہو گیا ہے آپ کو ایسی کوئی بات نہیں ہے دراصل...“

”بس بس رہنے دو دراصل کو۔“ نرگھس نے تڑخ کر شاہدہ بیگم کا جملہ چھینا۔

”نرگھس! چپ ہو جائو ورنہ یہاں سے چلی جائو۔“ زبیر احمد نے دانت بھیج کر کہا۔

”ہاں ہاں۔ ٹھیک ہے میں چلی جاتی ہوں۔ میرا شوہر ہی میرا نہیں ہے۔“

نرگھس نے روتے ہوئے کہا اور تیز تیز قدموں سے چلی گئی۔ کمرے میں کچھ دیر خاموشی رہی اور بڑی بیگم نے ہی خاموشی توڑی۔

”بیٹا مجھے معاف کر دینا۔ نرگھس میرا انتخاب تھی۔ جانے کون سا گناہ سرزد ہو گیا ہے۔“ بڑی بیگم حد درجہ افسردگی اور پشیمانی سے بولیں۔

”اماں جان! آپ کیوں دکھی ہو رہی ہیں۔ ستائیس سال میں اسے برداشت کرنے کی عادت سی ہو گئی۔ آپ کہیے کیا کہنا ہے؟“ زبیر احمد نے ماں کے ہاتھ تھام کر کہا۔

”بڑے دنوں سے سوچ رہی تھی کہ تم اور شاہدہ مل بیٹھ کر بچوں کے بارے میں فیصلہ کرو۔ زرتاشیہ اور فرحان کی بات کر رہی ہوں۔“ بڑی بیگم نے کہا۔

”جو فیصلہ آپ نے کیا تھا میں اس پر قائم ہوں۔“ وہ بولے۔

”فیصلے پر قائم ہونے سے بات نہیں بنتی۔ اب آگے کی بات کرو۔ شادی کا پروگرام بنائو۔“

”لیکن اماں اس کے لیے پہلے فرحان سے پوچھنا ہوگا۔ وہ ہائر اسٹڈیز کے لیے باہر جانا چاہتا تھا۔“ شاہدہ بیگم نے کہا۔



”جانا چاہتا ہے یا نہیں یہ بعد کی بات ہے۔ شادی کے بعد بھی جا سکتا ہے۔ بلاوجہ بچوں کو فرار کا راستہ نہ دکھایا کرو۔“ بڑی بیگم نے بیٹی کی سرزنش کر دی۔

”آپ نہیں سمجھتیں بچوں سے پوچھنا بھی ضروری ہے۔“ شاہدہ نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

”شاہدہ! یہ بچوں کی طرف داری کرنا چھوڑ دو۔ بھی رشتہ طے ہے کیا پوچھنا؟“ بڑی بیگم زچ ہو کر بولیں۔

”اماں جان! افتخار بھائی سے بات کی آپ نے؟“ زبیر احمد نے دانستہ بات کا رخ بدلا۔

”اس موضوع پر تو نہیں کی لیکن انہیں اس بات پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“

”پھر بھی پہلے آپ افتخار بھائی سے بات کریں پھر جو فیصلہ ہو میں زرتاشیہ کی شادی میں تاخیر نہیں کروں گا۔“ زبیر احمد نے دوسرے لفظوں میں اپنا حتمی

بیان سنا دیا جب کہ شاہدہ بیگم اس بات پر نہ خوش ہوئیں اور نہ ہی افسردہ... بس چپ سی ہو گئیں۔ ان کے بچے تو خود سر ہیں خاص کر تانیہ تو ٹیڑھی کھیر تھی۔ اس کو سمجھانا بہت مشکل کام ہے۔

”میاں افتخار ہیں کہاں؟“ بڑی بیگم نے پوچھا۔

”ان کے دوست حج کے لیے جا رہے ہیں۔ انہیں ملنے گئے ہیں۔“

”رات کو خود بات کر لینا۔ سچ پوچھو تو مجھے تمہارے بیٹے بیٹی سے خوف آتا ہے۔ جانے منہ پھاڑ کے کب کیا کہہ دیں... اس لیے جلدی کرو اور ہاں کیا نام ہے اس بچے کا...؟“ وہ ذرا یاد کرنے کو رکیں۔

”عادل...“ شاہدہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

”ہاں۔ عادل اس کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ میاں ستار اور رفیعہ سے کہو کہ جتنی جلدی ہو سکے تانیہ بی کو لے جائیں ورنہ یہ رشتہ قائم رہنا مشکل ہے۔“ بڑی بیگم نے کھلے لفظوں میں بہت کچھ کہہ ڈالا۔ بھائی کے سامنے اپنی بیٹی کی برائی

سن کر شاہدہ بیگم کچھ خفا خفا سی اٹھ کر چلی گئیں جب کہ بڑی بیگم نے تانیہ کا ذکر جاری رکھا۔

”لڑکی کو اس قدر آزادی دے رکھی ہے کہ اللہ کی پناہ۔ شاہدہ اچھی ماں نہ بن سکی۔ پہلے تو یہ بیل منڈھے چڑھتی نہیں۔ اگر چڑھ بھی گئی تو دور تک چلنی مشکل ہے۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے بہت نیک اور سلجھا ہوا۔“

”اماں جان! ابھی نا سمجھ ہے ٹھیک ہو جائے گی۔“ زبیر احمد نے بھانجی کی طرف داری کی۔

”کوئی نا سمجھ نہیں ہے۔ سب سمجھتی ہے اس کا بس چلے تو زمین آسمان ایک کر دے۔“ بڑی بیگم نے ہاتھ نچا کر کہا۔ زبیر احمد چپ ہو گئے۔

پھر کافی دیر وہ ماں سے دکھ سکھ بانٹتے رہے۔ عصر کی اذان سنائی دی تو وہ اٹھ کر گھر کے لیے گئے۔

...☆☆☆...

فائیو اسٹار ہوٹل میں پر تکلف ولیمے کا انتظام کیا گیا تھا۔ فیملی ہال میں بڑی ٹیبل بک تھیں۔ ایاز، صائمہ، مسز جیری، سامعہ، فرحان اور میاں افتخار کھانے کے دوران دلچسپ باتیں کر رہے تھے۔ سامعہ کی خوشی دیدنی تھی۔ میاں افتخار نے اچانک فرحان کو فون کر کے آنے کی اطلاع دی تھی اور ٹھیک بیس منٹ بعد وہ ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ بنارسی شیفون ساڑھی میں سادہ سادہ سی تیاری کے ساتھ سامعہ انہیں

بہت پسند آئی۔ اسے گلے لگا کر پیشانی چوم کے ڈھیر ساری دعائیں دیں۔ فرحان کو خوب پیار کیا۔ اور پھر بڑی اپنایت سے قیمتی کنگن سامعہ کی دونوں کلائیوں میں پہنائے۔ سامعہ کی خوشی سے پلکیں بھیگ گئیں۔ ایسے میں مسز جیری نے اسے پیار سے تھپکی دی۔ وہ جو دل ہی دل میں سامعہ کے لیے فکر مند تھیں۔ میاں افتخار کا مشفقانہ رویہ دیکھ کر مطمئن سی ہو گئیں۔ میاں افتخار کی آمد ہی سامعہ کے لیے بڑی ڈھارس تھی جب کہ میاں افتخار نے دو تین روز میں ہی اسے گھر لے جانے کی تسلی بھی دے دی۔

کھانا کھاتے گپ شپ لگاتے رات کے بارہ بج گئے تو میاں افتخار نے فوراً میز چھوڑ دی۔

”اب اجازت ورنہ ہم پر گھر کا دروازہ بند ہو جائے گا۔“ وہ مسکرا کر بولے تو سب مسکرا دیے۔

”میں بھی چلتا ہوں۔ میرے لیے بھی یہی قانون لاگو ہے۔“ فرحان بھی تیار ہو گیا۔

”آپ سامعہ کو چھوڑ کر اپنی گاڑی پر آنا۔ میں اس وقت تک پہنچ کر آپ کے لیے گیٹ کھلا رکھوں گا۔“ میاں جی نے کہا اور سامعہ کے سر پر ہاتھ رکھ کے سب کو خدا حافظ کہہ کر ہال سے نکل گئے۔

”ایسا کرو آپ بھی جائو۔ بھابی ہمارے ساتھ چلی جائیں گی۔“ ایاز نے مشورہ دیا۔ مشورہ مناسب تھا۔ وہ سامعہ سے نظروں نظروں میں اجازت لے کر رخصت ہو گیا۔ اس کے پیچھے ہی مسز جیری چلی گئیں اور سب سے آخر میں وہ تینوں باہر نکلے۔ ایاز بل کلیئر کرنے کے لیے کاونٹر پر گیا تو ششدر سا

واپس آیا۔ بل تو میاں افتخار ادا کر کے جا چکے تھے۔ ایاز نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے یہ بات بتائی تو صائمہ خوش ہو گئی۔

”کتنے اچھے ہیں میاں جی۔ سامعہ بھابی اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”ہاں۔ فرحان کے ساتھ میاں جی کا ووٹ آپ کے لیے ہے۔ دھیرے دھیرے سب اچھا ہو جائے گا۔“ ایاز نے بھی صائمہ کی تائید کی۔

”ایاز بھائی! میں فرحان اور میاں جی مایوس نہیں کروں گی۔ اس گھر کو اپنی جنت سمجھوں گی اور جنت آسانی سے نہیں ملتی۔ اس کے لیے بہت صبر کرنا پڑے گا۔ بہت قربانیاں دینی ہوں گی۔“ سامعہ نے ٹھہر ٹھہر کے بات مکمل کی۔

”اللہ کرے آپ کو صبر نہ کرنا پڑے اور نہ قربانیاں دینی پڑیں۔“ ایاز نے دعائیہ انداز میں کہا تو صائمہ نے خلوص دل سے آمین کہا۔

”آپ ملے تو ہوں گے فرحان کی ماما سے۔“ سامعہ نے ایاز سے پوچھا۔



”ہاں بہت دفعہ۔ میں اس کی پوری فیملی سے ملا ہوں۔ بلکہ اکثر ہی جانا ہوتا ہے۔ اب تقریباً دس پندرہ دن سے نہیں گیا۔“ ایاز نے بتایا۔

”سامعہ بھابی کے لیے کون مشکل پیدا کر سکتا ہے؟“ صائمہ نے شوہر سے پوچھا۔

”فرحان کی ماما تو بہت ٹھنڈے مزاج کی خاتون ہیں۔ فرحان سے بہت پیار کرتی ہیں۔ شاید وہ معاف کر دیں مگر اصل مسئلہ اس کی نانو کا ہے۔ وہ بہت ضدی اور تحکمانہ فطرت کی مالک ہیں پھر شاید وہ اس معاملے میں اپنی بیٹی کو بھی ناپسند کریں۔ دراصل اپنی پوتی کا متاثر ہونا وہ کیسے قبول کریں گی۔“

خاصی طویل بات کر کے ایاز نے اس کا خیال جاننے کے لیے ذرا سا پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”یہی پریشانی یقیناً فرحان کو بھی ہے۔ اس صورت حال میں تو کچھ بھی ممکن ہے ایاز بھائی۔“ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اسی اثنا میں گاڑی گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئی اور وہ منتشر سوچوں میں غلطاں اپنے کمرے کی

طرف چل دی مگر دل تو جیسے فرحان کے پہلو سے لپٹ کر چلا گیا تھا۔ ایک دم ہی بے قراری بڑھ گئی اور بیکل سی کمرے میں چکر لگانے لگی۔ کس قدر صبر اور برداشت کا حوصلہ تھا اس میں کہ زندگی کی نانو بیچ بھنور میں پھنسی تھی۔ نہ ڈوبنے کا یقین تھا نہ ساحل مراد تک پہنچنے کی آس... بس آنکھیں موند کے کشتی میں سوار ہو گئی تھی۔ پہلے دو بازیاں ہار کے تیسری کے لیے فیصلہ کرنا کچھ آسان نہیں تھا مگر جانے کہاں سے فرحان کی محبت نے نقب لگائی اور اس کی خاطر وہ اپنا آپ تیسری بار دائو پر لگا بیٹھی۔

گھڑی کی سوئیاں ٹک ٹک کر کے آگے کا سفر طے کر رہی تھیں اور وہ سونے کے وقت میں جاگ رہی تھی۔ یہ امید تھی کہ فرحان بھی اس کے بغیر کروٹیں بدل رہا ہوگا۔ اسے شدت سے یاد کر رہا ہوگا۔

کافی دیر وہ اسی قسم کے خیالات میں الجھی رہی۔ نیند تو آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بے چین سی کمرے کی کھڑکی کھول کے باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ چھوٹے سے سرسبز لان پر اس سے پورے چاند کا عکس نمایاں تھا۔ دودھیا سی

روشنی میں لان کی خوب صورتی خواب ناک سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا دل بہل سا گیا۔ کچھ اور سوچنے والی تھی کہ موبائل فون نے اپنی طرف متوجہ کر دیا۔ وہ لپک کر اسے اٹھانے آئی۔ فرحان کا فون تھا۔ وہ خوشی سے کھل اٹھی۔

”جانِ فرحان! میرے فون کا انتظار کر رہی تھیں نا۔“

”آپ کو کیسے پتہ چلا؟“ وہ شرما سی گئی۔

”میرے دل میں تمہارے وجود نے اپنا احساس دھڑکن بنا دیا تھا۔ دل دھڑکا اور میں جان گیا۔“ اس کی مخمور آواز آئی۔

”بس بس اتنے رومانٹک ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”چلیے آپ بتائیے کتنے رومانٹک ہونے کی ضرورت ہے؟“ وہ اڑ گیا۔

”مجھے نہیں پتہ۔ یہ بتائیے گھر میں تو خیریت تھی نا میرا مطلب بابا اور

آپ۔“

”ہم دونوں ہی ساتھ ساتھ پہنچے تھے۔ نانو کی شاید طبیعت کچھ خراب ہے۔ وہ کمرے سے نکلی نہیں۔ بابا اپنے کمرے میں گئے۔ نہیں معلوم کہ ماما کا موڈ کیسا تھا؟“ فرحان نے مختصراً بتایا۔

”بابا! سب سنبھال لیں گے نا۔“ اس نے ڈرے ڈرے لہجے میں پوچھا۔

”کم آن ڈارلنگ! اس وقت تو یہ خوف ناک باتیں نہ کرو۔ اچھی اچھی باتیں کرو۔ مثلاً یہ بتائو مجھے مس کر رہی ہو۔ تمہیں میری کمی محسوس ہو رہی ہے۔ میں پاس آ جاؤں تو کیسا ہو۔۔۔؟“ وہ شوخ ہو گیا۔

”اے ہش۔ بس اب چپ کر کے سو جائیں۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”ویسے تم بور ہو۔ پیار ویاں تمہارے بس کا روگ نہیں سوچنا پڑے گا۔ وہ زرتاشیہ اس کی تو عادت ہے اس وقت بھی اپنے کمرے کی کھڑکی سے میرے کمرے کی طرف دیکھ رہی ہوگی۔“ اس نے ستانے کی خاطر کہا مگر اس پر الٹا اثر ہوا۔

”بہت بری بات ہے۔ آپ اس محبت کرنے والی کا مذاق اڑا رہے ہیں۔“

”تو تم محبت نہیں کرتیں بولو بتاؤ...؟“ وہ پھر سر ہو گیا۔

”فرحان! کیا چھوٹے سے بچے بن جاتے ہو۔ اب فون بند کر کے سو جاؤ۔“  
اس نے موضوع ہی بدلنے کی کوشش کی تو وہ پھر بھی نہیں ٹلا۔

”سامعہ پلیز! بتاؤ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں؟“

”فار گاڈ سیک فرحان! اگر نہ کرتی تو شادی کیسے ممکن تھی۔ بلاوجہ کی ضد کرنے لگتے ہو۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”ہو سکتا ہے کہ...“

”پلیز! ہو سکتا ہے کہ چکر میں نہ پڑیں۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔ آپ بھی سو جائیں۔“

”اوکے میں صبح موقع ملتے ہی آؤں گا۔“

”اوکے شب بخیر۔“ اس نے خوش دلی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

...☆☆☆...

میاں افتخار بڑی دیر سے اخبار کی اوٹ سے شاہدہ کے چہرے کو پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے... وہ خاصی چپ چاپ سی تھیں۔ فرحان بھی ان کی طرف بار بار چور نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ناشتے کے بعد آج اس لیے فراغت تھی کہ اتوار کا دن تھا مگر اس وقت بھی تانیہ کمرے میں سوئی ہوئی تھی۔ بڑی بیگم اسے سوتا دیکھ کر سیدھی وہیں چلی آئیں اور شاہدہ پر برس پڑیں۔

”لاڈلی کی بھی کچھ خبر لے لیا کرو۔ گھوڑے گدھے سب بیچ کر سوئی ہے۔ اگلے گھر بھی جانا ہے اسے۔“

شاہدہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ میاں جی نے فوراً موقع کی نزاکت کو سمجھ کر انہیں مخاطب کیا۔

”اماں جان! آپ کے لیے میں نے انڈیا سے پان منگوائے ہیں۔“

”جیتے رہو مگر اولاد کی تربیت پر توجہ دو۔ خود سوچو تانیہ کس ڈگر پر چل رہی ہے...“ انہوں نے پھر اصل موضوع نہ چھوڑا۔ شاہدہ کو بس چپ سی لگ گئی تھی۔ اٹھ کر جانا چاہتی تھیں کہ وہ بولیں۔



”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

”جی۔ اماں بالکل ٹھیک ہے۔“ اس نے دھیرے سے جواب دیا۔

”تو پھر بیٹھو۔ یہ بتاؤ افتخار سے بات کی تم نے؟“

”جی۔ کون سی بات؟“ وہ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولیں۔

”بہت خوب۔ ارے شاہدہ رات بھر میں بھول گئیں۔ میں نے فرحان اور

زرتاشیہ کی بات کرنے کو کہا تھا۔“ وہ بلند آواز میں بولیں۔ میاں افتخار اور فرحان ٹھٹکے۔

”آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ آپ خود بات کر لیں۔“ وہ کچھ بیزاری سے کہہ گئی۔

”چلو۔ ہم کر لیتے ہیں۔“ وہ راضی ہو گئیں مگر عین اسی وقت ناجی آگئی اور بولی۔

”بڑی بیگم صاحبہ! اسٹور سے کتنے کھیس نکالنے ہیں اور کون کون سے نکالنے ہیں؟“

”ارے ابھی کھیس نکالے ہی نہیں کب نکالے گی؟ کب دھوئے گی اور کب سوکھیں گے؟“ وہ اس پر خفا ہوتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میاں جی نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ چلی گئیں تو انہوں نے فرحان کو بھی جانے کا اشارہ کر دیا۔ اس کے بعد دونوں اپنے کمرے میں آ گئے۔

شاہدہ کمرے میں بھی چپ چاپ ایک میگزین اٹھا کر صوفے پر بیٹھ گئیں تو میاں افتخار بولے۔

”کیا بات ہے چپ چپ ہو؟“

”کچھ نہیں۔ بس تھکن سی ہے۔“ وہ ٹال گئی۔

”یہ فرحان اور زرتاشیہ والا کیا مسئلہ ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”اماں جان کا خیال ہے فرحان کی تعلیم مکمل ہو چکی ہے۔ اب اس کی شادی کر دینی چاہیے۔“

”ہاں کہتی تو ٹھیک ہیں مگر...“ وہ رک سے گئے۔

”مگر کیا...؟“

”مگر یہ کہ ہم تانیہ اور فرحان کی شادی ایک ساتھ کریں گے۔“ وہ ہکلائے۔

”تانیہ کی تو بات ہی نرالی ہے۔ جانے کیا ہو گیا ہے اسے... مجھے اسی کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ سب کچھ بدلنا چاہتی ہے۔ اماں جان اور اس کی تو ہر وقت ٹھنی رہتی ہے۔“ شاہدہ نے موقع ملتے ہی دل کا تھوڑا سا بوجھ کم کر لیا۔

”ارے یہ معمول کی باتیں ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔“ انہوں نے یکسر نظر انداز کر دیا۔

”پھر کیا خیال ہے فرحان کی شادی سے متعلق؟“

”کہا تو ہے کہ اتنی جلدی نہیں۔ عادل کی نوکری لگ جائے پھر ساتھ ہی کریں گے۔“ وہ پھر جلدی سے کہہ گئے۔

”اماں جان نہیں مانیں گی۔“

”بھئی بچوں کے مستقبل کی بات ہے۔ میں کیسے فیصلہ کروں؟“ وہ ٹال مٹول سے کام لے رہے تھے۔ شاہدہ نے غور سے انہیں دیکھا۔

”افتخار! یہ فیصلہ تو بہت پہلے اماں جان کر چکی ہیں۔“

”تو پھر جو چاہیں کریں۔ میں کیا بتاؤں؟“ وہ زچ ہو کر بولے۔

”میں خود فرحان سے بات کروں گی۔“

”جو جی میں آئے کرو۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ الجھن کا شکار ہو گئے۔

”مشکل تو میری ہے کہ میں کس کو کہوں؟“ شاہدہ روہانسی ہو کر بولیں۔

”میں کیا بتاؤں؟“ وہ دھیرے سے بولے۔

”سب اپنی مرضی کرتے ہیں۔ میں ہی سب کا خیال کروں۔“ وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تو میاں افتخار ہونٹ چباتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ مضطرب سے ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ان کی نگاہوں میں معصوم سی سامعہ کا چہرہ آگیا جس گھر کی خوشی دینے کی کوشش میں وہ لگے ہوئے تھے مگر یوں نئی الجھن سامنے آئے گی یہ انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ٹہلتے ہوئے وہ کچھ سوچ رہے تھے۔ جس کا علم نہ اماں جان کو تھا اور نہ ہی شاہدہ کو... سامعہ اور فرحان کی خوشیوں کے وہ واحد امین تھے۔

”سامعہ کو اس گھر میں آنا ہے مگر کیسے؟“ یہ سوچ سوچ کر وہ بڑی دیر پریشان ہوتے رہے کیونکہ یہ اتنا آسان کام نہیں تھا۔

...☆☆☆...

”میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آپ مجھ سے ایوانڈ کیوں کر رہے ہو؟“ اس کے روبرو ہوتے ہوئے زرتاشیہ میں جانے آج کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ وہ پورا منہ کھول کے پوچھ بیٹھی۔

فرحان نے حیرت سے سرمئی شلوار سوٹ میں نرم و نازک سی زرتاشیہ کو غور سے دیکھا۔ وہ اس کے کمرے میں، بالکل اس کے قریب تھی۔

”کچھ مت سوچیے۔ میں نے کچھ غلط نہیں کہا۔“ اس کی نظروں کا زاویہ دیکھ کر وہ خود بخود صفائی دینے لگی۔

”میں نے کب کہا ہے کہ تم نے غلط کیا ہے؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”یہی تو بات ہے کہ آپ کو مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔“ وہ اس کی لا تعلقی پر چڑ گئی۔

”میں سمجھا نہیں مطلب سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ اس نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا تو وہ گرڑ بڑا سی گئی۔

”آپ اس قدر لا تعلق رہ کر کیا کہنا چاہتے ہیں؟“

”پھر وہی بات‘ جانے تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“ وہ اس کے سوال پر سوال کر بیٹھا۔

”میں آپ کی کچھ لگتی ہوں۔ آپ کو میں تلاش کرتی ہوں اور آپ کئی کتراتے ہیں۔ بچ کر نکل جاتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔ آنکھوں میں اضطراب تھا۔ فرحان کے لیے وہ بالکل نئی

زرتاشیہ تھی۔ وہ تو شرمیلی سی کم گو زرتاشیہ کو جانتا تھا۔

”لگنے سے تمہاری مراد جو بھی ہے۔ اس کے لیے فقط اتنا کہ سب کچھ دائروں میں قید کرنے سے نہیں بدلتا جو تم کہنا چاہتی ہو۔ اس کی بازگشت آج کل میرے گھر میں سنی جا رہی ہے مگر زرتاشیہ یہ پوری سچائی اور مکمل حقیقت نہیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی جانے وہ کتنا کچھ کہہ گیا مگر اس کی ذہنی استطاعت سے شاید دور رہا۔

”پوری سچائی اور مکمل حقیقت کیا ہے؟“ وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔ فرحان کو اس کی معصومیت پر ڈھیر سارا پیار آیا۔ دل چاہا کہ سب کچھ واضح طور پر بتا دے لیکن یہ مناسب نہیں تھا اس لیے نظریں جھکا لیں۔

”بتائیے نا فرحان! آپ مجھ سے لا تعلق کیوں رہتے ہیں؟“

”میرا خیال ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آرام کرو اور ہاں ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔“

”آپ کو میں بیمار نظر آ رہی ہوں کیا؟“ وہ طنزیہ بولی۔

”زرتاشیہ پلیز! کیوں آج اس طرح بی ہیو کر رہی ہو؟“ اس نے ایک دم ہی نرمی سے پوچھا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”مجھے سوچنے کے لیے بچپن سے آپ کا نام دیا گیا۔ میں سوچتے سوچتے کہاں تک سفر کر گئی ہوں۔ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا اور...“



”اور کسی کو بھی یہ اندازہ نہیں ہو سکتا کہ کون کب... کون سے پروں کے ساتھ کون سا سفر، کہاں تک طے کر گیا...“ وہ جانے کہاں سے کہاں عالم محویت میں پہنچ گیا جہاں سامعہ اس کا ہاتھ تھامے اس کی شریک سفر تھی۔

”مجھے یہ پتہ ہے کہ میرے نام کے ساتھ آپ کا نام لیا جاتا ہے۔ یہی کافی ہے میرے لیے۔“ وہ یہ اطلاع فراہم کر کے چھلاوے کی مانند کمرے سے نکل گئی۔ فرحان چند لمحے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔

”زرتاشیہ میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔“ اس نے خود سے کہا۔ ”مگر یہ تبدیلی نہیں آنی چاہیے تھی۔“

ظاہر ہے اس طرح کی تبدیلی کی اب جگہ تھی اور نہ گنجائش... فرحان کی کشتی تو کنارے جا لگی تھی۔ زرتاشیہ سے منسوب ہونے کے باوجود سامعہ کی آمد سے وہ اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔ آناً فاناً سامعہ کی شخصیت کے سحر نے اسے قید کر لیا۔ اسے پتھر کا بنا دیا۔ وہ جتنا سامعہ کے لیے کم سوچنا چاہتا زیادہ اور زیادہ سوچتا چلا جاتا۔ اسے اس کی طلسماتی قید سے آزاد ہونے کی کوئی

تمنا اور آرزو نہیں رہی تھی۔ اپنی اس قید پر وہ خوش اور مسرور ہوتا رہا۔ دن رات کی خبر نہ رہی۔ اس دوران شاید زرتاشیہ زیادہ نظر انداز ہوئی۔ اس سے پہلے تو وہ ہلکی پھلکی بات چیت کر لیتا تھا۔ مسکرا کر کسی بات کا جواب بھی دے دیتا تھا۔ اسے اچھی سی کتاب لا کر دیتا تھا بلکہ اکثر و بیشتر اس کی پینٹ کی جیب سے اس کی فیورٹ چاکلیٹ بھی برآمد ہوتی تھی مگر ایسا کرتے ہوئے بھی اس نے کبھی زرتاشیہ سے زیادہ کھلنے کی کوشش نہیں کی تھی یا یہ اس کا مزاج نہیں تھا۔ اسی لیے یونیورسٹی میں وہ اکھڑ اور مغرور مشہور تھا۔ بہت لیے دیے رہتا تھا۔ اس وجہ سے زرتاشیہ کو اطمینان سا تھا مگر اب اچانک اس میں، اس کی تلاش کی جو آگ بھڑکی تھی اس پر خود فرحان متحیر تھا۔ کافی دیر وہ یہ سوچتا ہی رہا کہ زرتاشیہ کو کیسے فیس کرے گا... اور زرتاشیہ کا کیا ہوگا؟ شاید آج سے پہلے اس کے لیے اس نے ایسا نہیں سوچا تھا۔ آج سوچ کر ذہن بھاری ہو گیا۔ اوندھے منہ بستر پر گر کر آنکھیں موند لیں مگر چند لمحے ہی گزرے تھے کہ اس کے بالوں میں کسی نے انگلیاں پھیریں تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ماما اس کے سرہانے بیٹھی تھیں۔

”آپ...“

”زرتاشیہ کو کیا کہا ہے وہ روتی ہوئی گئی ہے۔“ شاہدہ نے دھیمے سے پوچھا۔

”مک... کچھ بھی نہیں۔ مجھے کیا کہنا تھا۔“ وہ ہکلا یا تھا۔

”وہ اتنی پیاری، اتنی معصوم سی بچی ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر پریشان ہو گئی۔“

”مگر ماما! میں نے کچھ نہیں کہا۔“ وہ یقین دلانے کے لیے ذرا سی اونچی آواز میں بولا۔

”بس اسے کچھ کہنا بھی نہیں۔ وہ مجھے بہت عزیز ہے۔“

”مجھے معلوم ہے وہ آپ کے بھائی کی بیٹی ہے۔“ نجانے کیوں فرحان کے منہ سے طنزیہ جملہ پھسل گیا۔ شاہدہ چونک سی گئیں۔

”کیا نہیں کرتی میں آپ لوگوں کے لیے مگر ایک منٹ میں آپ سب میری عزت کا بوریا بستر باندھ کر میرے کندھوں پر رکھ دیتے ہیں۔ ذرا بھرم نہیں رہنے دیتے۔“ وہ بہت افسردگی سے بولیں۔

”معاف کرنا ماما! ہمار مرضی سے کچھ نہیں کرتیں۔ سب کام، سب چیزیں نانو کے راستے ہم پر مسلط کی جاتی ہیں۔ یہ زرتاشیہ بھی نانو اور آپ کی مرضی سے ہیں۔“ وہ ایک دم ہی منہ پھٹ ہو کے کہہ گیا۔

”یہ کیا کہتے رہتے ہو آپ اور تانیہ۔ پہلے کچھ آپ لوگوں کے لیے نہیں کیا؟“ وہ غم و غصے سے دبے دبے لہجے میں چلائیں۔

”ماما! کیا ہے مگر نانو کی مرضی سے، چھپتے چھپاتے ڈرتے ڈرتے۔ تانیہ بھی یہی کہتی ہے نا... تو اس وجہ کو سمجھیں پلیز خفا مت ہوں۔“ وہ کچھ پیار سے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا مگر وہ وہاں اور کچھ دیر بیٹھ نہ سکیں۔ آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر باہر چلی گئیں۔ جو صدمہ ان کو اندر ہی اندر چاٹ رہا

تھا، اس کے بارے میں کوئی فکر مند نہیں تھا۔ سب کو ان سے ہی شکایت تھی۔ اپنی ذات کا یہ نامکمل سا

احساس رات دن ان کو ستاتا تھا مگر لبوں پر دھیمی مسکان اور کم گویائی نے پردہ ڈال رکھا تھا جسے سرکا کر ان کی ذات میں جھانکنے کی کسی کو فرصت نہیں تھی۔

...☆☆☆...

شہر سے دور سیاہ چمکیلی سڑک پر گاڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ وہ اسے گاڑی آہستہ چلانے کی ہدایت کر رہی تھی لیکن وہ کب سن رہا تھا۔ ان کے قریب سے اکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ ذرا دیر کو وہ رفتار پر کنٹرول کرتا اور پھر گاڑی اڑانے لگتا۔ تانیہ کے چیخنے چلانے پر وہ منہ سے سیٹی بجاتا رہا... پھر ایک دم ایک جگہ اس نے جھٹکے سے گاڑی روک دی۔

”ہاں۔ اب بولو کیا کہہ رہی تھیں تم؟“ وہ مسکرا کر بولا تو وہ بگڑی۔

”اتنی دور پوچھنے کے لیے لائے ہو؟“

”کیوں یہ جگہ پسند نہیں آئی؟ دیکھو کتنا دلکش منظر ہے... کتنا سکون ہے؟ شہر کے سب ہنگامے پیچھے رہ گئے... پرندے کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔“

خرم کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

”اوگاڈ! خرم تمہیں اندازہ ہے کہ ہم کتنی دور آ گئے ہیں۔ شام ڈھل رہی ہے۔ گھر واپسی تک رات ہو جائے گی۔ مشکل سے بہانہ بنا کر آئی ہوں۔ نانو کو کیسے فیس کروں گی؟“ تانیہ جھلا کر بولتی چلی گئی۔ وہ انتہائی دلچسپ نگاہوں سے اسے دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

”یار! آج ایک بات تو بتاؤ؟“

”پوچھو؟“ وہ بھولپن سے بولی۔

”سچ سچ بتاؤ۔ تمہاری نانو بندے وندے کھاتی ہیں، خون پیتی ہیں کیا؟“ اس نے قطعاً سادگی سے پوچھا تو وہ ہنس پڑی۔

”بکومت۔“

”ہر وقت نانو نانو... ان کے بارے میں سوچتا ہوں تو کوئی سخت گیر ظالم وجابر بادشاہ ذہن میں آتا ہے حالانکہ دیکھنے میں صاف ستھری، وضع دار، طرح دار پڑھی لکھی خاتون لگتی ہیں۔“

”جی ہاں۔ علی گڑھ کی میٹرک پاس ہیں۔ بظاہر ایسی ہی لگتی ہیں مگر انتہائی ڈومینٹک پرسنالٹی۔“ وہ ترشی نہ چھپا سکی۔

”تو رہنے دو ہم انہیں کیوں ڈسکس کریں۔“

”خیر چھوڑو کوئی اور بات کرو۔“

”میں ہفتے دس دن تک اسلام آباد چلا جائوں گا۔ ڈیڈ نے کہہ دیا ہے کہ بزنس سنبھالو۔ مام بھی یہی چاہتی ہیں کہ اب کاروبار سنبھالوں، نوکری تو کرنی نہیں ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیا...؟ تم چلے جاؤ گے اور میں کہیں بھی نہیں...“ وہ دکھ سے چلائی۔

”تم تو میری ذات کی باؤنڈری ہو چاروں طرف سے محفوظ۔ کڑیے! وہ کیا نام ہے تمہارے دل جگر کا... ہاں عادل۔“ وہ تمسخرانہ انداز میں بولا تو وہ برا مان گئی۔

”ابھی میں نے عادل کے لیے ایسا کچھ نہیں سوچا۔“

”تو سوچو ڈارلنگ۔ میں منع نہیں کرتا کیونکہ ہم صرف دوست بن کر رہ سکتے ہیں۔“

”اب اتنے آزاد خیال بھی نہ بنو۔ میں خود فیصلہ کروں گی۔“

”جیسے تمہاری مرضی لیکن وہ اینگری ینگ مین مجھے بڑا جی دار لگا ہے۔“ وہ یہ بتا کر خوب ہنسا۔

”وہ میرے گھر والوں کی پسند ہے۔ میرا فیصلہ محفوظ ہے۔“ وہ تنتنا کر بولی۔

”پاگل لڑکی! تمہیں کس نے روکا ہے جو چاہو فیصلہ کرو بس مجھے اطلاع کر دینا۔“



”مجھ پر کوئی مرضی مسلط نہیں کر سکتا۔ میں کروں گی ماما سے بات۔ عادل کا طوق تو میں اتار کے ہی رہوں گی۔“

”چلو واپس چلیں ورنہ تمہاری نانو شہر میں منادی کرا دیں گی۔“

”اوکے واپس چلتے ہیں۔“ وہ مسکرا کے چل دی۔

”ویسے یار تانی! وہ تمہارے حق سے دستبردار ہونے والا لگتا نہیں اور اس کو تمہاری فیملی سپورٹ بھی حاصل ہے۔“ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ بولا۔

”یہی تو مسئلہ ہے لیکن ابھی میں نے اس مسئلے کو لفٹ نہیں دی۔ دیکھا جائے گا۔“

وہ ایک دم ریلیکس ہو گئی۔ خرم نے پھر گاڑی اڑانی شروع کر دی۔ وہ سارے راستے چپ چاپ باہر بھاگتے دوڑتے مناظر کا نظارہ کرتی رہی۔

...☆☆☆...

رات جس بات کو مصلحتاً شاہدہ نے برداشت کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہی تھی کہ وہ اماں جان کو تنقید کا موقع نہیں دینا چاہتی تھیں۔ تانیہ کا دیر سے گھر آنا انہیں سخت ناگوار گزرا تھا اور وہ اس وقت صرف اسے

کمرے میں جاتا دیکھتی رہ گئیں۔ میاں افتخار ٹی وی کی اسکرین پر نظریں جمائے حالات حاضرہ کا پروگرام دیکھنے میں محو تھے۔ انہوں نے کسی طرح کا تاثر نہ دیا۔ اس لیے وہ چپ رہیں۔ ویسے بھی ان کا مزاج نہیں تھا غصہ اور سختی کرنا۔ لیکن صبح فجر کی نماز پڑھ کر صحن میں ٹہلنے کے بجائے وہ اس کے کمرے میں آ گئیں۔ وہ بیڈ پر آڑی ترچھی سوئی ہوئی تھی۔ کمرے میں بے ترتیب چیزیں پھیلی ہوئی تھیں۔ الارم زور زور سے چیخ چیخ کر اسے جگانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ بے سدھ سوئی ہوئی تھی۔

”تانیہ تانیہ!“ انہوں نے پکارا تو وہ ہلکا سا کلبلائی پھر سو گئی۔ انہوں نے اس کے سرہانے بیٹھ کر پھر پکارا۔

...☆☆☆...

”تانیہ! تانیہ یہ الارام کس کے لیے لگایا تھا۔ میرے لیے یا نانو کے لیے۔“

”اوہ الارام بول چکا۔“ وہ ایک دم اچھل کے بیڈ سے اٹھی اور وال کلاک پر نظر ڈالی۔

”اتنی جلدی کیا ہے؟ یونیورسٹی تو تم لیٹ جاتی ہو۔“

”وہ ماما! یونیورسٹی سے پہلے خرم کو ملنا تھا۔ او گاڈ لیٹ ہو گئی۔ اب تو وہ جا چکا ہوگا۔“

”کیا مطلب؟ کیوں ملنا تھا؟“

”ماما پلیز! اس طرح نہ پوچھیں۔ دراصل ہم نے اکھٹے جوگنگ کا پروگرام بنایا تھا اور پھر یونیورسٹی مگر...“

”مگر یہ فضول آئیڈیا ہے۔ اسے ذہن سے نکال دو۔ خرم کے ساتھ جوگنگ کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔“ شاہدہ نے سنجیدگی سے سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ پھر گئی۔

”مضحکہ خیز... کیوں؟ وہ میرا کلاس فیلو ہے۔ میرا دوست ہے۔“

”تانیہ! حد سے تجاوز نہیں کرتے۔ لڑکوں سے دوستیاں اچھی نہیں سمجھی جاتیں۔“ انہوں نے ڈانٹ کر کہا تو وہ چلا اٹھی۔

”جانتی ہوں میں یہ شاہدہ افتخار کی زبان نہیں۔ یہ نانو کی بیٹی کی آواز ہے جو اس پرانی حویلی میں رہتی ہے۔ اتنی پرانی سوچ ایک بینک آفیسر کی نہیں ہو سکتی۔“

”تانیہ! تانیہ! بینک آفیسر ہوں ساتھ میں آپ کی ماں ہوں۔ آپ کے اچھے برے سے مجھے مطلب ہے۔“ وہ بھی خاصی برہمی سے بولیں۔

”پلیز ماما! آپ صرف اپنے اور نانو کے لیے سوچا کریں۔ مجھے اور فرحان بھائی کو ہمارے حال پر چھوڑ دیں۔ جوگنگ کرنا کوئی جرم نہیں۔ لوگوں کے لان اتنے بڑے ہوتے ہیں کہ وہ صبح کا آغاز اپنے لان سے کرتے ہیں مگر ہماری حویلی میں تو کمرے، اسٹور اور صحن برآمدے ہیں بس۔“ وہ طنز سے ہنستی ہوئی بولتی چلی گئی۔

”جو گنگ کی آپ کو ضرورت ہی کیا ہے دہلی پتلی اسمارٹ ہو۔ دوسروں کے گھر نہیں جھانکتے، شکر کیا کرو کہ اتنے بڑے گھر میں رہتے ہیں۔“

”میرا دم گھٹتا ہے اس کھنڈر میں جسے آپ گھر کہہ رہی ہیں۔ آخر اسے بچ کر کسی پوش ایرے میں کیوں نہیں رہ سکتے؟“ وہ جھنجھلائی۔

”خدا کے لیے آواز بند کرو۔ اماں جان نے سن لیا تو قیامت آ جائے گی۔ ایسا سوچنا بھی نہیں۔“ شاہدہ نے دانت بھیج کر اسے سرزنش کی۔

”تو پھر میں اپنی مرضی سے جیوں گی۔“

”رات خرم کے ساتھ کہاں تھیں... اتنا لیٹ آنے پر مجھے بہت غصہ آیا۔“ انہوں نے پوچھا۔

”لانگ ڈرائیو پر تھے اور کچھ...؟“ وہ انتہائی لاپرواہی سے بولی۔

”تنانیہ! سمجھنے کی کوشش کرو۔ آزادی کا مطلب یہ نہیں کہ تم کسی کو خاطر میں نہ لائو۔ یونیورسٹی میں پڑھتی ہو، سمجھ دار ہو، خرم کے ساتھ اتنا فاصلہ رکھو جتنا ہمارے معاشرے میں رکھا جاتا ہے۔“

”ہونہہ۔ معاشرہ پلیز! مجھے یونیورسٹی کے لیے تیار ہونا ہے۔“ وہ ان کی ہر نصیحت اسی طرح ہوا میں اڑاتی تھی۔

”اوکے۔ جلدی سے تیار ہو کے آجاؤ۔ ناشتہ لگنے والا ہے۔“ انہوں نے نرمی سے کہا۔

”معلوم ہے مجھے قیدیوں کو کب ناشتہ کرنا ہے، کب کھانا ہے...“ اس نے تمسخر اڑایا۔

”تنانیہ! ایسے نہیں سوچتے۔ میرا خیال کر لیا کرو۔ میں نے آپ کے لیے کیا نہیں کیا...؟“ وہ افسردگی سے بولیں۔

”ٹھیک ہے ماما پلیز! آپ اب جائیں مجھے دیر ہو جائے گی۔“ اس نے کہا اور وارڈروب سے کپڑے نکال کر واش روم میں گھس گئی۔ شاہدہ خاموشی سے

باہر آ گئیں۔ سوچ کر کیا گئی تھیں ہوا کیا...؟ تانیہ کی خود سری میں اضافہ ہوا تھا۔ وہ بہت ڈر محسوس کر رہی تھیں۔ ہر بات پر اعتراض، ہر چیز پر تنقید... جانے کتنی اونچی اڑان تھی اس کی... کیا کرنے والی ہے؟ وہ پریشان ہو کر اس کے کمرے سے آئی تھیں... مگر اپنی پریشانی باہر کسی کو بھی بتا نہیں سکتی تھیں... اس لیے چپ چاپ ڈیوٹی پر جانے کے لیے تیار ہونے لگیں۔

...☆☆☆...

زبیر احمد دفتری کاموں میں اس قدر مصروف ہوئے کہ انہیں اے سی کے لیے مکینک بھجوانا بھول گیا۔ جب یاد آیا تو دن کا ایک بج رہا تھا۔ یہ تو مہمانوں کی آمد کا وقت تھا۔ وہ خاصے پریشان ہوئے مگر دیر ہو چکی تھی۔ اب کچھ بھی جلدی سے نہیں ہو سکتا تھا۔ لہذا وہ چپ چاپ کام میں مصروف ہو گئے لیکن شام چار بجے جب وہ گھر پہنچے تو صرف روتی ہوئی زرتاشیہ گھر میں موجود

تھی۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ ان سے لپٹ کر وہ اور زیادہ رونے لگی۔

”کیا بات ہے بیٹے کیوں رو رہی ہو؟“

”پاپا! ممانے آپ کو مہمانوں کے سامنے بہت برا بھلا کہا اور پھر بیگ میں سامان رکھ کے پنڈی چلی گئی ہیں۔“ زرتاشیہ نے روتے ہوئے بتایا۔

”اوکے۔ اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ کوئی نئی بات تو نہیں ہے بیٹا؟“  
زبیر احمد نے مسکرا نے کی ناکام کوشش کی۔

”پاپا! وہ اپنی فرینڈز کے سامنے ایسا نہ کرتیں۔ سارا کھانا بھی ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ آپ نے اے سی کیوں نہیں ٹھیک کرایا؟“ وہ پوچھ رہی تھی۔ زبیر احمد صرف طویل سانس بھر کے مختصر اُ بولے۔

”بیٹا! اے سی تو محض بہانہ تھا۔“

”پاپا! آج مجھے خود سے نفرت ہو رہی ہے۔“



”ارے نہیں میری جان۔ اگر ایسے واقعات کا میں اثر لیتا تو کب کی میری چھٹی ہو گئی ہوتی۔ بس سمجھ لو آپ کی ماما کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے۔ برداشت کی عادت ڈالو۔“ انہوں نے اسے گلے لگا کر پیشانی چوم کر سمجھایا۔

”پپا! آپ کپڑے چنچ کیجیے۔ میں نے خود آپ کے لیے کچھ بنایا ہے“ لے کر آتی ہوں۔“

”ارے نہیں بیٹا! آج ہم باہر جا کر کھانا کھاتے ہیں۔ جلدی سے کپڑے چنچ کر کے آؤ کوئی۔“ انہوں نے چٹکی بجا کر اس کا دل بہلانے کو کہا۔ وہ روتے روتے مسکرا دی۔

”آپ بھی فریش ہو جائیں۔ میں پانچ منٹ میں آتی ہوں۔“

”اوکے۔“ وہ اس کی خاطر خوش ہو گئے مگر وہ جاتے جاتے پھر پلٹ کر آئی۔

”پپا! ماما کو فون کر کے خیریت ہی پوچھ لیں۔“ بیٹی تھی ماں کے لیے دل تڑپ رہا تھا۔ زبیر احمد کے چہرے پر ملال سا پھیل گیا۔ اس کو دل برداشتہ نہ

کرنے کی خاطر جیب سے موبائل فون نکال کر نمبر ملایا مگر نرگھس نے فون بند کر رکھا تھا۔

”سوری بیٹا! فون پاور آف ہے۔“ انہوں نے دھیمے سے لہجے میں کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیے۔ ایک بار پھر زرتاشیہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔ وہ اپنے پپا کو غمگین اور اداس دیکھتے ہوئے بچپن سے جوانی میں داخل ہوئی تھی۔ اس

کے گریس فل پپا ہر وقت مغموم سے رہتے تھے۔ اس نے بہت کم انہیں مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ بہت کم ماما کے ساتھ خوشگوار موڈ میں دیکھا تھا۔ وہ آج تک نہیں سمجھ سکی تھی کہ ماما کو پریشانی کیا ہے... اونچے لمبے باوقار،

خوش شکل پپا سے انہیں شکایت کیوں رہتی ہے... سب ضرورتیں پوری کرنے کے بعد بھی نہ انہیں وقت پر اچھا کھانا ملا اور نہ آرام... رات دن اٹھتے بیٹھتے ماما کے طعنے تشنہ سنتے دیکھا مگر صبر اور ضبط کی انتہا تھی کہ بہت کم

پلٹ کر جواب دیتے تھے۔ بسا اوقات تو اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ ماما کی نافرمانی کر کے حد ادب کی دیوار پھلانگ جائے مگر پھر پپا کے صبر اور حوصلے

کو دیکھ کر صبر اور حوصلے سے کام لیتی۔ دراصل وہ خود بھی ماں کے مقام اور مرتبے سے واقف تھی۔ ماما سے اسے یہی شکایت تھی کہ وہ پیپا کا خیال نہیں رکھتیں ورنہ ماں کسے بری لگتی ہے... اس وقت بھی وہ انہیں بہت مس کر رہی تھی۔ بظاہر وہ خوش ہو کر باہر کھانا کھانے جا رہی تھی مگر اندر سے ماں کے لیے اداس اور دکھی تھی۔ بس اداکاری کر رہی تھی تاکہ پیپا کا دل بہل جائے۔ وہ کھانا کھا لیں۔ شاید وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو فریب دے رہے تھے۔

جب وہ تیار ہو کر باہر آئی تو زبیر احمد بھی ہلکے پھلکے شلوار سوٹ میں تیار تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر مسکرائی تو وہ خوش ہو گئے پھر سارے راستے گاڑی میں وہ ان سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی... دادو، پھوپو، تانیہ کا ذکر کرتی رہی۔ ایک مرتبہ فرحان کا نام زبان پر آیا تو وہ گڑبڑا گئی۔ پیپا مسکرائے اور بولے۔

”فرحان تو فرحان ہے۔ اس کی تو کیا تعریف کی جائے...“ وہ جھینپ سی گئی۔ وہ اس کی اس شرمساری پر قہقہہ لگا کر ہنسنے اور پھر بڑی دیر فرحان سے

متعلق اس سے سوال جواب کرتے رہے۔ انہیں خوشی تھی کہ زرتاشیہ کو فرحان ہر طرح سے پسند ہے۔ اس کی خوشی اور پسند پر وہ بہت خوش اور مسرور ہو کے گاڑی چلاتے رہے۔ بیٹی کے مستقبل کا بڑا بوجھ تھا ان کے دل پر جو کہ آج کافی حد تک اتر گیا تھا۔ فرحان ان کی بھی پسند تھا۔

...☆☆☆...

صحن میں خوب اچھی طرح پانی چھڑکنے کے بعد پنکھا چلایا۔ کرسیاں سیدھی کیں تو باورچی خانے سے بڑی بیگم کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ جلدی سے ان کے پاس پہنچ گئی۔

”ارے سب کو چائے کے لیے بلایا کہ نہیں؟“

”شاہدہ بیگم صاحبہ تو آرہی ہیں۔ میاں جی نہا رہے ہیں۔ فرحان صاحب کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہے ہیں اور تانیہ بی بی نے کمرے میں چائے لانے کو کہا ہے۔“ ناجی نے ربوٹ کی طرح سب کہہ ڈالا۔

”ہیں۔ کمرے میں کیوں...؟ تانیہ کو کہو کہ اے سی بند کر کے باہر آئیں۔ یہ اے سی بند کرنے کا وقت ہے۔“ بڑی بیگم نے کراری آواز میں کہا۔ ناجی حکم سن کر اٹے قدموں لوٹ گئی۔ بڑی بیگم، پکوڑوں کے ساتھ اہلی کی چٹنی ٹرے میں رکھ کے باہر آئیں تو صرف شاہدہ ہی ابھی تک آئی تھیں۔

”یہ سب کو روز نیا سبق پڑھانا پڑتا ہے۔ یہ چائے کا وقت ہے تو سب کیوں نہیں آ رہے؟“

”ارے واہ گرما گرم پکوڑے۔“ میاں جی نے اسی وقت آکر ان کے ہاتھ سے ٹرے لیتے ہوئے کہا۔

”دراصل آج جس بہت ہے۔ صحن میں پانی ڈالنے کے بعد تپش سی نکل رہی ہے۔“ شاہدہ نے کسی حد تک تانیہ کو کاؤنٹر کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی بڑی بیگم تھیں جھٹ بولیں۔

”شاہدہ! یہ جس اور تپش کوئی کھاتی نہیں ہے۔ ہر چیز کی عادت ہونی چاہیے۔“

موئے اے سی نے جسموں کو گلا کر رکھ دیا ہے۔ بجلی کا بل آتا ہے تو چودہ

طبق روشن ہو جاتے ہیں۔“ شاہدہ نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ میاں افتخار نے لقمہ دیا۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں اماں جان۔ اے سی نری بیماری ہے۔ پیسہ بھی ضائع ہوتا ہے اور صحت بھی۔ نئی نسل تو بالکل نکمی ہو گئی ہے۔“

”ہاں اپنے ہی بچے دیکھ لو۔ اب تک کمرہ بند کیے پڑے ہیں۔“ انہیں فوراً موقع مل گیا۔ شاہدہ نے میاں افتخار کو گھورا۔ وہ مسکرا دیے۔

”ناجی! ناجی! کم بخت جہاں جاتی ہے وہیں کی ہو جاتی ہے۔ باورچی خانے سے چائے تو اٹھالا۔“ انہوں نے ناجی کو آواز دے کر کہا۔

ناجی پلک جھپکنے میں چائے کی ٹرے لے آئی۔ دوسری طرف سے فرحان سجا سنورا آ گیا۔ میاں جی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ وہ باپ کا مطلب سمجھ گیا تو دھیرے سے مسکرا دیا۔

”ماشاء اللہ میرے گلفام کی تیاری بہت خاص ہے آج۔“ شاہدہ سے پہلے بڑی بیگم نے بغور دیکھتے ہوئے کہا تو فرحان ٹھٹکا اور فوراً ٹال گیا۔

”نانو! آج ایاز نے ڈنر پر بلایا ہے۔ بس وہیں جا رہا ہوں۔“

”ہیں۔ شام چھ بجے ڈنر کے لیے جا رہے ہو؟“ بڑی بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”جی۔ وہ ایک اور دوست کو ساتھ لیتے ہوئے جانا ہے۔“ فرحان نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

”اے میاں! تمہاری تم جانو۔ ہماری سمجھ میں تو تم دونوں بچوں کی کہانیاں آتی نہیں۔“ انہوں نے کہا تو شاہدہ کو کچھ اچھا نہیں لگا۔ وہ چائے کا کپ منہ کے قریب لاتے ہوئے ناگواری کو چھپا گئیں۔

”ٹھیک ہے مجھے اجازت...“ فرحان اٹھ کھڑا ہوا تو میاں جی بھی جھٹ ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔

”یار! میں ساتھ چلتا ہوں۔ راستے میں ضروری کام ہے۔ گاڑی مسنگ کر رہی ہے۔“

”مگر آپ میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جا رہے ہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ فرحان سے پہلے شاہدہ نے میاں افتخار کو گھور کے کہا۔

”مگر وہ گاڑی...“

”فرحان کو ایاز کی طرف اتار دیں۔ واپسی پر یہ کسی دوست کے ساتھ آ جائے گا۔“ شاہدہ نے کہا تو فرحان اور میاں افتخار پریشان سے ہو گئے۔

”میں ٹیکسی پر چلا جاتا ہوں۔ یہ لیں بابا گاڑی کی چابی۔“ فرحان نے جلدی سے جیب سے چابی نکال کر دی۔

”کیوں ٹیکسی پر کیوں؟ ہم چھوڑ جائیں گے۔“ شاہدہ نے کچھ پیار سے کہا۔

”ہاں۔ یار فکر نہ کرو۔ چلے بیگم صاحبہ تیار ہو جائیں۔“ میاں افتخار نے دائیں آنکھ دبا کر اسے بے فکر کیا۔ شاہدہ چائے ختم کر کے اٹھ کے اندر چلی گئیں۔

”افتخار میاں! بس آٹھ بجے تک آ جانا۔ کھانا لگ جائے گا۔“ بڑی بیگم نے اٹھتے ہوئے انہیں یاد دلایا۔ میاں افتخار نے اثبات میں گردن ہلا کر انہیں یقین



دلایا۔ وہ چلی گئیں تو فرحان اور میاں افتخار دونوں تنہا رہ گئے۔ فرحان فوراً ان کے پاس ہو کر بولا۔

”بابا! آپ بھی بس! سمجھتے نہیں ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہے کہ...“

”اوائے جانِ بابا! مجھے پتہ ہے آپ بے فکر ہو کر جائو۔ آپ کو ایاز کے گھر چھوڑنا ہے اور بس...“ انہوں نے ہنس کر کہا۔

”اگر گڑ بڑ ہو گئی تو...؟“ وہ ڈرا ڈرا بولا۔

”یار کام بہادروں والا کیا ہے اور ڈر بزدلوں کی طرح رہے ہو۔“

”بابا آپ کچھ کریں نا۔ وہ منت آمیز لہجے میں بولا۔

”یار کریں گے ذرا صبر کرو۔ سب ٹھیک کریں گے۔ اچھا اب دور ہو کر بیٹھو

آپ کی ماما آ رہی ہیں۔“ انہوں نے اس کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔ وہ جلدی سے

سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور پھر جوں ہی شاہدہ تیار ہو کر آئیں تو وہ دونوں

اٹھ کھڑے ہوئے۔

...☆☆☆...

”آج تو بھانڈا پھوٹے پھوٹے رہ گیا۔“ فرحان نے سامعہ کی گود میں سر رکھ کے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بتایا۔

”خدا خیر۔ ایسا کیا ہو گیا؟“ سامعہ کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”بابا اور ماما گیٹ پر چھوڑ گئے ہیں؟“

”کیوں آپ کی گاڑی کو کیا ہوا؟“

”میری گاڑی بابا کے پاس ہے۔ مجھے آنا تھا اور بس۔“

”اس طرح خطروں سے کب تک بچیں گے؟“

”جب تک ممکن ہوا۔“ وہ خمار آلود لہجے میں بولا۔

”فرحان! میں نے ایک مہینے کی چھٹی کی درخواست جمع کروائی ہے۔“

”اچھا کیا بلکہ استغفیٰ ہی دے دو۔“ اس کے ریشمی بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا  
تو وہ ذرا پرے ہونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

”پلیز! ٹھیک ہو کر بیٹھیں۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہے۔“

”تو بند کر دو۔“

”جی نہیں۔ صائمہ بھابی یا ایاز بھائی آنکے تو وہ کیا سوچیں گے؟“

”یار۔ وہ بھی تو کمرہ بند کرتے ہوں گے پھر بھلا ہمارے لیے کیوں سوچیں گے؟“

کافی دیر گزرنے کے بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو جلدی سے دونوں  
دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

”یس۔“

”بی بی پوچھ رہی ہیں کافی یا چائے کیا پیسے گے؟“ ملازمہ نے نہایت ادب  
سے نظریں جھکا کر پوچھا تو فرحان کو اس کی معصومیت پر ہنسی آگئی۔

”اویئے اللہ کی بندی۔ آنکھیں کھول کر بات کرو۔“

”جی جی...“ وہ گھبرا گئی۔

”گلزاری! کافی مگر مزے کی۔“ سامعہ نے اسے مشکل سے نجات دی۔ وہ  
جلدی سے باہر نکلی تو فرحان ہنسنے لگا۔

”سامعہ! ہمارے گھر ناجی ہے۔ اف توبہ آفت کی پرکالا۔ اس کی جگہ وہ ہوتی تو  
آنکھوں آنکھوں میں سب سمجھ جاتی۔ نانو کی اور اس کی جب جنگ چھڑتی ہے  
تو مزہ آ جاتا ہے۔“ اس نے غائبانہ طور پر ناجی کے بارے میں بتایا۔ سامعہ  
سن کر مسکرائے لگی۔

”وہ نانو کے قاعدے قانون سے سخت چڑتی ہے اور نانو کے پرانے برتن،  
صندوق تو اسے زہر لگتے ہیں۔ ہر روز ان پر لڑائی ہوتی ہے۔“ اس نے مزید  
بتایا۔

”ایک ہی ملازمہ ہے؟“ سامعہ نے پوچھا۔

”ہاں۔ ایک ہی ٹکی ہوئی ہے۔ ہر روز جانے کا کہتی ہے مگر بابا کی باتوں سے بہل جاتی ہے۔ نانو کے ساتھ ہر نوکرانی نہیں رہ سکتی۔ وہ لافانی کردار ہیں۔ ناجی ان کو سمجھتی ہے۔“ وہ مزے لے لے کر بتا رہا تھا جب کہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

”ارے ارے کہاں کھو گئیں؟“ اس نے چٹکی بجائی تو وہ چونکی۔

”کہیں نہیں۔ بس آپ کی نانو کے بارے میں سوچ رہی تھی۔“

”نانو کے لیے سوچنا نہیں بلکہ عمل کرنا ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”کیا مطلب...؟“ وہ نہ سمجھی۔

”مطلب یہ کہ بس ان کے حکم نامے پر عمل پیرا ہوگی تو عافیت ہی عافیت ہے ورنہ...“

”ورنہ کیا...؟“ وہ سچ مچ ڈری ہوئی تھی۔

”ورنہ بہت کچھ... اب کیا کیا بتائوں؟“

”فرحان! تانیہ کیسی ہے؟“

”تانیہ! بارود ہے۔ ایک دم خود سر، ضدی، ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دینے والی اور نانو کے ساتھ ہر گھڑی ڈٹ کر مقابلہ کرنے والی۔ ماما کی بے حد لاڈلی ہے۔ بابا بھی اس کی ہر فرمائش پوری کرتے ہیں مگر وہ

بہت بد تمیزی کرتی ہے۔ بس اس کا مزاج ہی ایسا ہے۔“ اس نے ایک ہی سانس میں تانیہ کی خاکہ نگاری کر دی۔

”میرے لیے کیسی ثابت ہوگی؟“

”کس کس کا بتائوں؟ سمجھ لو کہ تمہیں حالت جنگ میں رہنا ہے۔ کیسے اور کس طرح یہ بابا بتائیں گے۔“ اس نے معصومیت سے کہا تو ڈری ڈری سی سامعہ کو ہنسی آ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا۔ گلزاری ٹرے میں گرما گرم شامی کباب اور کافی کے مگ لیے آ گئی۔ گلزاری کے فوراً بعد ایاز اور صائمہ اپنے اپنے کافی کے مگ لیے آ گئے۔

”آئیے آئیے۔ آپ دونوں سے رہا نہیں گیا۔“ فرحان نے شرارت سے کہا۔  
سامعہ مطلب سمجھ کر جھینپ گئی جب کہ ایاز اور صائمہ تو ڈٹ گئے۔

”حد ہوتی ہے چھوٹ کی بھی۔ جل جل کر ہم ڈھیر ہو رہے تھے اور آپ  
دونوں تو بس بھول ہی گئے کہ ہم بھی گھر میں موجود ہیں۔“ ایاز نے کہا۔  
”اور کب سے اکٹھے کافی پینے کا انتظار کر رہے ہیں۔“ صائمہ نے بھی ٹکڑا  
لگایا۔

”ظالم سماج نہ بنو۔ میرے دوست ہی رہو۔“ فرحان نے جواب دیا تو سب  
قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔

”ویسے یار۔ مجھے کبھی کبھی تم دونوں پر غصہ بھی آنے لگا ہے۔“

”غصہ... کیوں؟“ فرحان نے حیرت سے پوچھا۔

”تم دونوں مجھے جلاتے ہو۔ مجھے احساس کمتری ہوتا ہے کہ اللہ نے مجھے صائمہ  
جیسی بیوی کیوں دی جو بیوی کم اور بھینس زیادہ ہے۔“ ایاز نے اس قدر

معصومیت سے کہا کہ فرحان اور سامعہ تو ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے جب  
کہ صائمہ نے بازو چڑھا لیے۔ اس کے موٹاپے پر چوٹ پڑی تھی۔

”کیا فرمایا...؟ میں بھینس ہوں...؟“

”پوری نہیں۔ بس قریب قریب۔“ ایاز نے شرارت جاری رکھی۔

”ایاز! گھر میں رہنا ہے یا نکال باہر کروں؟“ صائمہ نے شرارت سے اکڑ کر  
پوچھا۔

”ہاں۔ بیوی تم تو تاج محل ہو۔ میری حسین راج کمار ہی ہو۔“ ایاز فوراً خوشامد  
پر اتر آیا۔ پھر چاروں دیر تک ہنستے رہ گئے پتہ ہی نہ چلا کہ رات کے دس بج  
گئے اور فرحان پریشان ہو کر گھڑی کی طرف دیکھنے لگا۔

...☆☆☆...

موٹر سائیکل کی آواز پر میاں ستار کی آنکھ کھل گئی۔



رفیعہ نے بھی آنکھیں کھول کے دروازے کی طرف دیکھا۔ زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں اس کے چہرے پر اتری تھکن دونوں نے ہی دیکھ لی۔ وہ دروازہ لاک کر کے ان کے پاس آ گیا۔ دروازے سے پانچ چھ قدم کے فاصلے پر تو صحن تھا۔ ان دونوں کے پلنگ بچھے تھے۔ چھوٹے سے صحن میں دو پلنگ، ایک نماز کی چوکی کے بعد بہت تھوڑی سی جگہ بچتی تھی جہاں رفیعہ عصر کے فوراً بعد میز رکھ کر پانی کا کولر رکھ دیتی تھیں۔ برآمدے میں چولہا رکھا تھا۔ گرمی سے بچنے کے لیے ان دنوں برآمدے میں باورچی خانے کا کام لیا جاتا تھا۔ کمروں میں گرمی اور جس کی وجہ سے سویا نہیں جاتا تھا۔ عادل بھی چھت پر سوتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ رات کے آخری پہر شاید سونے کے لیے چھت پر جاتا تھا ورنہ کمرے میں کوئی نہ کوئی کتاب آنکھوں سے لگائے رکھتا۔ آج تو ویسے ہی کافی دیر سے گھر آیا تھا۔

”اتنی دیر کہاں رہ گئے تھے؟“ رفیعہ نے محبت سے پوچھا۔ وہ ان کی پانٹی میں بیٹھ گیا۔ خلاف معمول میاں ستار چپ رہے یا شاید کھانسی دبائے رکھنے کا حربہ تھا۔

”کچھ نہیں امی کہاں رہنا تھا؟ دو نئی ٹیوشن ملی ہیں وہیں کام کراتے دیر ہو گئی۔“

”تو بیٹا مجھے بتا تو دیتے۔“ رفیعہ نے شکایت کی۔

”کہاں بتاتا... کیسے بتاتا؟ آپ کے پاس کون سا فون ہے؟ جو فون لگوا یا تھا وہ بند کروا دیا۔“ وہ باپ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ میاں ستار کو اس کی بات پسند نہ آئی۔

”ایک فون کی ہی کمی ہے اس گھر میں۔ ویسے تو تم نے سب کچھ گھر میں جمع کر رکھا ہے۔“ اکھڑی ناہموار سی سانس کے ساتھ وہ بولے تو عادل وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا جب کہ انہیں کھانسی شروع ہو گئی۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو...؟ ابھی تھکا ہارا گھر میں آیا ہے اور آپ پیچھے پڑ گئے۔ کھانسی کا خیال رکھ لیا کریں۔“ رفیعہ نے دھیرے سے کہا اور اٹھ کر چولہے کے پاس آگئیں۔ اس کے لیے سالن گرم کیا۔ تو چولہے پر رکھ کے جلدی جلدی دو پھلکے پکائے اور ٹرے میں رکھ کے اس کے کمرے میں رکھ آئیں۔ وہ کمرے میں نہیں تھا۔ شاید واش روم میں تھا۔ باہر ستار میاں کو مستقل کھانسی ہو رہی تھی۔ وہ ان کے پاس آئیں۔ جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کے ان کے ہونٹوں سے لگایا۔ ایک دو گھونٹ لینے سے ان کو سکون سا ملا۔

”تم سمجھتی ہو میں بیٹے کا دشمن ہوں۔“ وہ بولے۔

”نہیں مجھے پتہ ہے تم بیٹے سے بہت محبت کرتے ہو۔ اس کے بھلے کے لیے غصہ کرتے ہو۔“ رفیعہ نے کہا۔

”جوانی میں اس کے اندر تھکن اتر رہی ہے۔ مایوسی سے روز ملتے ملتے کہیں امید کا دامن نہ چھوڑ دے۔ اس کے خوب صورت چہرے کو غور سے دیکھا کرو۔ دن بھر کی گرد کی تہہ جمنے لگی ہے۔ اس کی ہیرے جیسی آنکھیں غم

وغصے سے دہکنے لگی ہیں۔ مجھے خوف ہے رفیعہ میرا جوان بیٹا نوکری کی تلاش میں ضائع نہ ہو جائے۔ اسے اسے سمجھائو۔ اپنا اسٹور، اسٹور کھولے۔“

بولتے بولتے ایک دم پھر کھانسی جاگنے لگی تو رفیعہ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بولنے سے روک دیا۔

”میں سمجھائوں گی۔ آپ پریشان نہ ہوں لیکن آپ یہ بھی تو سوچیں کہ پڑھے لکھے باہمت نوجوان کو ہتھیار پھینکنے کو میں کیسے کہوں؟ اسے خود کو آزمانے دیں پھر وہ نئے ارادے کی طرف اپنے شوق سے آئے گا۔“ وہ بہت آہستہ آہستہ بولیں تاکہ عادل نہ سن لے۔

”تھوڑی دیر کو اسٹور کھول لیا کرے۔ سارا سامان خراب ہو جائے گا۔“

”اچھا، اچھا آپ اب سو جائو۔ ذہن پر بوجھ نہ ڈالو۔“

”ماں ہو کر ایک باپ کو کہتی ہو کہ میں اپنے بیٹے کے لیے بے فکر ہو جاؤں۔“ وہ دکھی سے ہو گئے۔

”میرا مطلب یہ نہیں ہے۔ بس آپ کی کھانسی کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔“

”اب میاں افتخار آئے گا تو اس سے کھل کر بات کروں گا۔“ وہ یہ کہتے ہوئے آرام سے لیٹ گئے۔ رفیعہ بھی لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگیں لیکن عادل کے کمرے کی روشنی سے انہیں یہ احساس ہوتا رہا کہ عادل جاگ رہا ہے۔ لہذا یہ ایک ماں کے لیے فرض بن گیا کہ وہ بھی اس وقت تک جاگتی رہے گی جب تک عادل نہ سو جائے جب کہ میاں ستار ایک ماں کی بے نیند، بے چینی کو دیکھ کر دیر تک مضطرب سے رہے۔۔۔ ایسے میں پلکوں کی اوٹ سے دیکھتی رفیعہ کے دل میں خواہش جاگی۔

”کاش عادل اس وقت دیکھ سکتا کہ اس کے ابا کے دل میں اس کی کتنی محبت بھری ہے۔“

...☆☆☆...

میاں افتخار اور شاہدہ بیگم جوں ہی گھر سے نکلے۔

بڑی بیگم نے ناجی کو خاصی کڑی نظروں سے دیکھا اور بولیں۔

”یہ کیا سر جھاڑ منہ پھاڑ حلے میں صبح کا آغاز کرتی ہو۔ کیا اپنی صفائی ستھرائی پر توجہ دینی چھوڑ دی۔ ذرا دیکھو تو بال چڑیوں کا گھونسلا بن رہے ہیں، کپڑے میلے ہیں۔“

”فرصت ملتی ہی کتنی ہے؟ سرگئی کے ٹیم سوتی ہوں۔ پہلی اذان پر آپ کھڑا کر دیتی ہیں۔“ ناجی نے ناشتے کے برتن سمیٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بتایا۔

”ارے تجھ پر اللہ کی مار۔ تو زندوں پر جھوٹ بولتی ہے۔ رات گیارہ بجے تو گھر کی سب بتیاں بجھا دیتے ہیں تو جاگ کر کیا کرتی ہے؟“ انہوں نے کڑک آواز میں جھاڑا۔

”بتیاں گھر والوں کے لیے بجھتی ہیں۔ میں تو آپ کے کمرے میں یا اسٹور میں کچھ نہ کچھ کام ہی کرتی ہوں۔“ وہ بھی ترکی بہ ترکی بولتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔

”اچھا اچھا بہت کمیری ہے تو۔ ٹوکری لے کے آ۔ آج گوشت لانا ہے۔ سبزیاں بھی سب ختم ہیں۔“ انہوں نے اسے باورچی خانے سے خریداری والی ٹوکری لانے کو کہا اور خود اپنے کمرے میں سے اپنا پرس لینے چلی گئیں۔

واپس آئیں تو ناجی ٹوکری لیے کھڑی تھی۔

”میں جاتی ہوں دروازہ بند کرو۔ تانیہ اٹھیں یا نہ اٹھیں اب ناشتہ نہیں بنے گا۔“

”فرحان صاحب کے لیے؟“ اس نے فرحان کے لیے یاد دلایا۔

”اس کے لیے بھی نہیں۔ نکمی اولاد، کوئی قاعدہ قانون سکھایا ہی نہیں۔“ وہ جلی کٹی سنا کر ابھی چند قدم ہی آگے گئی تھیں کہ زرتاشیہ کی دلخراش چیخ سے دہل اٹھیں۔ ناجی بھی سناٹے میں آگئی۔ ان کے ہاتھ سے ٹوکری گر گئی۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے کیونکہ وہ مسلسل درد سے چیخ رہی تھی، رو رہی تھی۔ ناجی تو آناً فاناً دروازے سے باہر نکلی اور زبیر احمد کے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی۔

بڑی بیگم تو پھولی سانس اور ڈولتے دل کے ساتھ بعد میں وہاں پہنچیں تو کچھ

سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرف جائیں... زرتاشیہ کی آواز کی سمت آئیں تو برآمدے میں فرش پر زرتاشیہ گری ہوئی تھی۔ اس کے سیدھے پیر کو ہلا ہلا کر دیکھنے کی کوشش زبیر احمد کر رہے تھے۔ ناجی نے اسے سہارا دے کر بٹھانا چاہا مگر وہ پوری شدت سے رودی۔

”ارے کیا ہوا؟ کیا ہوا میری بچی کو؟“ بڑی بیگم قریب پہنچ کر بولیں۔

”پاؤں پھسل گیا۔ گر گئی ہے۔ آپ بیٹھیں بلکہ اندر چلیں۔ میں اسے اندر لاتا ہوں۔“ زبیر احمد انہیں بدحواس دیکھ کر تسلی آمیز انداز میں بولے۔ ساتھ ساتھ وہ اس کا پاؤں حرکت میں لانے کے مختلف طریقے آزما رہے... مگر اسے ہر طرح سے درد ہو رہا تھا۔ درد کی شدت سے رو رہی تھی۔

”ٹخنہ تو نہیں اتر گیا۔ ہڈی تو ٹھیک ہے۔“ بڑی بیگم نے پوچھا۔

”اماں! کیا کہہ سکتا ہوں۔ یہ تو اب ڈاکٹر ہی بتائے گا۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اسے گود میں اٹھایا اور گاڑی کی طرف چل دیے۔



”ارے افتخار کو فون کر دو۔ کہاں ہے نرگھس؟“ بڑی بیگم نے چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے نرگھس کو نہ پا کر کہا تو زبیر احمد ہونٹ کاٹ کے رہ گئے۔ ابھی تک انہوں نے اماں کو نرگھس کے جانے کے بارے میں کچھ بتایا بھی تو نہیں تھا اور اس وقت کچھ بتانے کا موقعہ نہیں تھا۔ انہوں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کے زرتاشیہ کو لٹایا پھر اٹے قدموں اندر گئے۔ وہاں سے موبائل فون اٹھا کر باہر نکلے تو بڑی بیگم نے پھر دریافت کیا۔

”نرگھس بی کہاں ہیں؟“

”بھاڑ میں...“ وہ جھنجھلا کر گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ گاڑی اسٹارٹ کی اور باہر نکل گئے۔

بڑی بیگم نے پر تفتیش نگاہوں سے ناجی کی طرف دیکھا۔ وہ ان کا مطلب بھانپ کر اندر کی طرف چلی گئی تاکہ نرگھس کو کمرے میں دیکھ سکے مگر کچھ دیر بعد وہ جائزہ لے کر آگئی کہ نرگھس گھر میں نہیں ہے۔ بڑی بیگم پریشان سی ہو کر ٹی وی لائونج میں بیٹھ گئیں۔ انہیں زبیر احمد اور زرتاشیہ کی واپسی کا

انتظار تھا۔ ناجی کو انہوں نے گوشت سبزی کی جگہ دال ماش بھگونے کو کہا اور گھر بھیج دیا۔ وہ چلی گئی تو وہ زرتاشیہ کے لیے دعائیں کرتی رہیں مگر دو تین گھنٹے گزر گئے تو مزید فکر مند ہو کر واپس آ گئیں۔ گھر میں ناجی باورچی خانے میں تھی اور تانیہ اپنے کمرے میں ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ انہوں نے ناجی کو آواز دے کر فرحان کا پوچھا۔

”ناجی! فرحان کہاں ہے؟“

”جی ابھی باہر گئے ہیں۔“ ناجی نے باورچی خانے سے ہی جواب دیا۔

”انہیں اور کیا کام ہے۔ آوارہ گردی کرنے کے سوا۔ کسی کے دکھ سکھ میں تو شریک ہوتے نہیں۔ اکیلا جانے بچی کے ساتھ کہاں پریشان ہو رہا ہوگا؟“ وہ بولیں۔

”آپ زبیر صاحب کو فون کر لیں۔“ ناجی نے مشورہ دیا تو بات ان کے دل کو لگی۔ جلدی سے کمرے میں گئیں اور فون ملانے لگیں مگر فون تو مسلسل بزی تھا۔

”یہ فون بھی نری بیماری ہے بلاوجہ کی کوفت۔“ بڑبڑاتی ہوئی پھر کمرے سے آگئیں۔ ناجی نے انہیں اطمینان سے بیٹھنے کا مشورہ دیا۔

”آپ آرام سے بیٹھ کر چھالیہ کاٹیں۔ زبیر صاحب کو کوئی بات کرنی ہوگی تو وہ فون ملا لیں گے۔“

اس کی بات سچ ثابت ہوئی۔ کچھ دیر بعد زبیر احمد نے خود فون کیا اور زرتاشیہ کے ٹخنہ ڈس لوکیٹ ہونے کی اطلاع دی اور یہ بھی بتایا کہ آر تھوپیڈک سرجن نے چیک کیا ہے۔ اب پلاسٹر ہو رہا ہے تاکہ ٹخنہ واپس اپنی جگہ پر آ سکے۔ یہ سن کر بڑی بیگم تقریباً رونے لگیں۔ زبیر احمد کو انہیں تسلی دینا مشکل ہو گئی۔ وہ بار بار یہی کہتے رہے۔

”اماں جان! پریشانی کی بات نہیں ہے۔ شکر ہے فریکچر نہیں ہے۔ یہ تو دس پندرہ دن کے آرام اور میڈسن سے بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

مگر بڑی بیگم کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ گھبراہٹ میں شاہدہ کو بینک فون کیا۔ میاں افتخار کو فون کیا۔ وہ دونوں بھی پریشان سے ہو کر گھر کے لیے نکل پڑے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ بڑی بیگم سب کچھ بھول بھال کے جائے نماز پر بیٹھی رو، رو کر زرتاشیہ کے لیے دعائیں کر رہی تھیں۔ ناجی آج تن تنہا کھانا پکا رہی تھی۔ شاہدہ اور میاں افتخار گھر پہنچے تو ان کے کچھ دیر بعد زبیر احمد زرتاشیہ کو گھر لے آئے۔ ان کے ساتھ ہی سب وہیں جمع ہو گئے۔ بڑی بیگم نے تو جلدی سے پانچ ہزار روپے اس پر سے وار کے صدقے کے بکرے کے لیے میاں افتخار کو دیئے۔ زرتاشیہ کی پیشانی چومی اس کا سر گود میں رکھا اور پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگیں۔ شاہدہ بھی اس کے دائیں ہاتھ بیٹھی تھیں۔ میاں افتخار دھیرے دھیرے زبیر احمد سے تفصیل پوچھ رہے تھے۔ دوائیوں کے اثر سے زرتاشیہ سو چکی تھی۔ زبیر احمد کا تھکن سے برا حال تھا۔ صبح سے نہ ناشتہ کیا تھا نہ کچھ اور حلق سے نیچے اترا تھا۔ دن کے چار بج رہے تھے۔ ناجی آئی تو بڑی بیگم کو کھانا یاد آیا۔

”ناجی! کھانا تو لگا دے کم بخت سب بھوکے ہیں۔“

”کھانا تو تیار ہے آپ لوگ چلیں۔“

”جاؤ تم تینوں کھانا کھاؤ اور زیر تم آرام کرو۔ بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔“

”اماں! مجھے بھوک نہیں ہے۔ آپ جائیں میں زرتاشیہ کے پاس ہوں۔“

زیر احمد نے سوتی ہوئی زرتاشیہ کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔

”اماں بھی کھالیں گی۔ تم تو چلو اور بھابی کہاں ہیں؟“ میاں افتخار نے ایک دم

پوچھ لیا تو زیر احمد کمرے سے باہر نکل گئے۔ بڑی بیگم نے میاں افتخار کو

جواب میں فقط اتنا کہا۔

”نہیں معلوم کیا کہانی ہے۔ صبح سے تو ہم نے بھی بہو بیگم کو نہیں دیکھا۔“

”کہیں گئی ہوگی؟“ شاہدہ نے سرسری سے انداز میں کہا اور میاں جی کو اٹھنے

کا اشارہ کیا۔

”نہیں کوئی اور بات ہے۔ خیر تم دونوں جاؤ کھانا کھاؤ اور ناجی کو کہہ دینا

برتن سمیٹ کر کچن صاف کرے۔ سب کمروں میں نیم اور ہرمل کا دھواں

دے دے۔ بہت مچھر ہو گئے ہیں۔“ انہوں نے اچھے خاصے کاموں کی فہرست زبانی کلامی انہیں تھمادی۔

”آپ نے کھانا نہیں کھانا کیا؟“ میاں جی نے پوچھا۔

”شاہدہ! ایسا کرو میرا اور زیر کا کھانا یہیں بھیج دو۔ میں زرتاشیہ کو تنہا چھوڑ

کے تو نہیں جا سکتی۔“ انہوں نے زرتاشیہ کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے

ہوئے کہا۔ شاہدہ نے اثبات میں گردن ہلا دی اور چلی

گئیں۔ ساتھ ہی میاں جی بھی اٹھ کر چلے گئے تو وہ بھی اٹھ کر زیر احمد کے

کمرے کی طرف گئیں۔

رات اماں جان کو انہوں نے ضد کر کے گھر بھیج دیا کیونکہ وہ جانتے تھے

کہ اماں کو اپنے کمرے، اپنے پلنگ اور اپنے واش روم کی عات ہے۔ وہ رات

بھر بے چین رہیں گی۔ زرتاشیہ کی محبت میں وہ اس کے پاس رہنا تو چاہتی ہیں

لیکن ان کے لیے یہ بے آرامی سود مند نہیں ہے پھر ویسے بھی وہ کئی بار

زرگھس کا پوچھ چکی تھیں جو وہ بتانا نہیں چاہتے تھے۔ بڑی مشکل سے انہیں

ٹال کر بھیجا اور خود زرتاشیہ کو سوپ پلا کر اس کے پاس صوفے پر لیٹ گئے۔ زرتاشیہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ اپنے پیارے باپ کو ٹکٹکی باندھ کے دیکھ رہی تھی اور ماں کی محبت کی پیمائش کر رہی تھی۔ ماں اس سے محبت تو کرتی تھی مگر باپ سے زیادہ نہیں۔ اس درد کے وقت میں ماما اس سے دور تھی۔ وہ یاد کر کے رو دی۔ زبیر احمد اس کے منہ سے نکلنے والی سسکی پر چونک اٹھے اور ایک دم اس کے پاس آ گئے۔

”کیا ہوا میری جان؟“

”کچھ نہیں۔ ماما یاد آ رہی ہیں۔“ وہ سسکیوں سے رو دی۔

”اس کا مطلب ہے مجھ سے آپ کی دیکھ بھال میں کمی رہ گئی۔“ وہ دانستہ برا مانتے ہوئے بولے تو وہ شرمندہ ہو گئی۔

”نہیں نہیں۔ ایسے تو نہ کہیے۔ آپ تو میرے اچھا پیا ہیں۔“ وہ روتے روتے

پیار سے بولی تو زبیر احمد نے اس کی پیشانی چوم لی۔

”اچھے بچوں کی طرح آرام سے سو جائو۔ ذہن پر بوجھ مت ڈالو۔“ انہوں نے سمجھایا تو اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔ وہ دوبارہ لیٹے تو فرحان اور تانیہ کے آنے پر پھر اٹھ بیٹھے۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ وہ دونوں ان کا مطلب سمجھ کر جلدی سے بولے۔

”ماموں! دراصل ہمیں ابھی پتہ چلا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ اب آپ لوگ بیٹھو گپ شپ کرو۔ میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ بس جاتے ہوئے مجھے بتا دینا۔ میں زرتاشیہ کے پاس آ جاؤں گا۔“ زبیر احمد یہ کہہ کر کمرے سے چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی زرتاشیہ کی خوب صورت آنکھوں میں فرحان کی آمد کا احساس تشکر سا چھا گیا۔ وہ شاید پہلی یا دوسری مرتبہ اس کے کمرے میں آیا تھا۔ تانیہ بھی بہت عرصے بعد آئی تھی۔ اس لیے تانیہ سے تو وہ گلہ کر بیٹھی۔

”کتنے عرصے کے بعد ہم مل رہے ہیں۔“



”وہ بھی ان حالات میں۔“ تانیہ نے شرارت سے اس کے پلاسٹر شدہ پاؤں کی طرف اشارہ کیا اور فرحان کی طرف ترچھی نگاہ سے دیکھا۔ وہ خاموش تھا۔ نگاہیں الجھی الجھی سی تھیں۔ زرتاشیہ کی طرف دانستہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

”فرحان بھائی! آپ زرتاشیہ کی خیریت پوچھنے آئے ہیں یا؟“ تانیہ نے شوخی سے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ زرتاشیہ گلنار سی ہو گئی کیونکہ اب وہ فرحان کی نگاہوں کے فوکس میں تھی۔

”تو بتانے کی کیا ضرورت ہے؟“ زرتاشیہ گڑبڑا گئی۔

”بتانے کی ضرورت ہے میرے پیارے بھیا۔ آپ کے خیریت پوچھنے میں کوئی تو خاص بات ہونی چاہیے۔“ تانیہ نے دائیں آنکھ دبا کر کہا تو فرحان لاجواب ہو گیا جب کہ زرتاشیہ کے پاس کوئی جگہ نہیں تھی کہ وہ شرما کر دائیں بائیں چہرہ کر سکے کیونکہ پاؤں تکیے پر سیدھا رکھنے کی سختی سے ہدایت تھی وہ چت لیٹی تھی۔

”سب کچھ خاص ہی خاص ہے۔“ وہ فقط الجھا الجھا سا اتنا ہی بول پایا۔

”سنو زرتاشیہ! میرے لیے کوئی کام ہے تو بتاؤ۔ میں چلتی ہوں۔ فرحان بھائی کو حکم ملا ہے کہ یہ تمہارے پاس رہیں گے۔ تاکہ ماموں جان آرام کر سکیں۔“ تانیہ نے قینچی کی طرح زبان چلائی اور مزے سے دونوں کو شرارت آمیز نگاہوں سے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔ وہ پریشان سا ہو گیا تو زرتاشیہ بہت کچھ سمجھ گئی۔

”آپ چلے جائیں۔ میں آرام سے ہوں۔ پیپا آجائیں گے میرے پاس۔“ اس نے کہا۔

”نہیں کوئی بات نہیں۔ میں ہوں تم سو جاؤ۔“ وہ یہ جواب دے کر ذرا دور فاصلے پر رکھی ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔

”آپ کو زحمت ہوگی پلیز آرام کریں۔“ اس کی اجنبیت پر زرتاشیہ نے سنجیدگی سے کہا تو وہ جھنجھلا گیا۔

”کہا جو ہے کہ کوئی مسئلہ نہیں ہے تم سو جاؤ۔“ زرتاشیہ کا ننھا سا دل اس لہجے پر بھر آیا۔

”اوہو۔ بھئی آپ کا مسئلہ کیا ہے؟“ وہ زور دے کر بولا۔

”کیا ایسے تیمارداری کرتے ہیں؟“ رندھی ہوئی آواز میں پوچھا تو وہ کچھ سوچ کر نادام سا ہو گیا۔

”سوری۔ آپ میری فکر نہ کرو۔ مجھے نانو نے کہا ہے۔ ان کے کہنے پر شاید آیا ہوں۔“ وہ ناگواری سے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے بولا۔

”آپ یہ بتا کر میری توہین تو نہ کریں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ صاف پتہ چلا کہ اس نے برا مانا ہے۔

”پلیز! اتنی حساس نہ بنو۔ الٹا سیدھا مت سوچو۔“ شرمساری سے وہ بولا تو اس کے نرم رویے پر کچھ مطمئن سی ہو گئی۔ اس کے لیے یہ کیا کم تھا کہ وہ اس کا تیماردار تھا۔ اس کے روبرو تھا۔ اس کے کمرے

میں اس کے قریب تھا۔ بے شک وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے چھت گھور رہا تھا۔ اس سے الگ تھلگ رہنے کا تاثر دے رہا تھا مگر اس کے لیے یہی

بہت کچھ تھا۔ کافی دیر وہ اسے اس طرح اسی حالت میں دیکھتی رہی پھر بے دھیانی میں اسے پکار بیٹھی۔

”فرحان۔“

”ہوں ہاں۔“ وہ چونکا۔

”وہ آپ جا کر آرام کریں۔“ اس نے بات بنائی حالاں کہ پکار کے شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

”اوکے۔ کچھ چاہیے تو بتائو؟“ وہ بیڈ کے قریب کھڑے ہو کر بولا۔ وہ دکھ سے مسکرا دی۔

”نہیں کچھ نہیں۔“

”اوکے۔ شب بخیر۔“ وہ عجلت میں یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ زرتاشیہ کے لب خوشی سے مسکرا دیے اور ارمان بھرے دل سے آواز نکلی۔ ”تمہیں کیسے بتائوں۔“

ایک عرصے سے یہ آنکھیں سوئی نہیں

ایک بات تھی دل میں

جو آپ سے کہی نہیں، کہ

آپ جیسا کوئی نہیں

کوئی نہیں...

مگر یہ بات اس کی سننے کے لیے فرحان کمرے میں موجود نہیں تھا۔

ظنظ

یوں ہی رنجشوں میں گزر گئی

کبھی وہ خفا، کبھی میں خفا

چاہتوں کے موڑ پر کبھی وہ رُکا

کبھی میں رُکا

وہی رستے وہی منزلیں

نہ اسے خبر نہ مجھے پتا

اپنی اپنی انا میں گم

صبح کے میلے میلے اجالے کے بعد زبیر احمد نے طویل سرد آہ بھر کے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا۔ رات بھر کی جلن آنکھوں میں باریک کنکروں کی مانند کھٹک رہی تھی۔ سورج کی کرنوں کا اجالا برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ زرتاشیہ نے باپ کو کھڑکی سے الگ ہوتے دیکھ کر دانستہ آنکھیں موند لیں، جب وہ بے دم سے اس کے قریب پڑی کرسی پر بیٹھے تو اس نے آنکھیں کھول دیں... وہ ہولے سے مسکرائے اور پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر بولے۔

”میرا بچہ کیسا ہے...؟“

”آئی ایم فائن، مگر آپ...“ الفاظ اس کے ہونٹوں پر رکے تو وہ کچھ اندازہ لگا کر جلدی سے بولے۔

”میں بھی بالکل ٹھیک ہوں بیٹا۔“

”اسی لیے آپ رات بھر کھڑکی سے باہر کچھ تلاش کرتے رہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”جب کھڑکی سے اندر سب کچھ موجود ہے تو بھلا باہر کیا تلاش کروں گا؟“ وہ بہت شوخی سے اس کے سر پر چپت لگاتے ہوئے بولے۔

”اندر کہاں ہے سب کچھ؟“

”تم، میرا پیارا بچہ میرے جگر کا ٹکڑا، یہاں موجود ہے، یہی تو میرا سب کچھ ہے۔“ انہوں نے بیڈ کے سرہانے کی طرف بیٹھ کر اسے بازوؤں میں بھر کے خوب پیار کیا وہ رو دی۔

”پپا! آپ غلط کہہ رہے ہیں، آپ کے اس جگر کے ٹکڑے کا جس سے تعلق ہے وہ گھر میں نہیں ہیں، ماما تو نہیں ہیں، میں جانتی ہوں آپ انہیں مس کر رہے ہیں۔“

”ارے بھئی! مس تو انہیں کرتے ہیں جو اتفاقاً کہیں دور ہو جائیں آپ کی ماما تو قصداً ہم سے دور گئی ہیں۔“ انہوں نے اس کی نم آنکھیں دائیں ہاتھ سے صاف کیں اور اسے شدت جذبات سے

بانہوں میں سمیٹ لیا۔

”پپا!“

وہ اس پر جھکے اور بولے۔

”جی میری زندگی۔“

”آپ ماما کو فون کریں انہیں منالیں۔“ اس نے منت آمیز انداز میں کہا۔

”زرتاشیہ! وہ بہت ضدی ہیں شاید خود انہیں کچھ وقت کے بعد احساس ہو جائے۔“

”پپا! ایک بار فون ملائیں تو سہی، شاید وہ آپ کے فون کا انتظار کر رہی ہوں۔“



”اچھا، اچھا ٹھیک ہے، پہلے میں آپ کے ناشتے کے لیے کچھ انتظام کر لوں۔“

وہ اس کا دل رکھنے کو بولے۔

”دادو آنے والی ہوں گی۔“

”میں دیکھتا ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئے۔ تو وہ پھر ماں کو یاد کر کے

رو دی۔ مگر باپ کو دکھی نہ کرنے کے خیال سے دل ہی دل میں دبی دبی

سسکیاں بھرتی رہی۔ کچھ دیر بعد اسے خیال آیا کہ خود ماما کو فون کرے،

سائیڈ ٹیبل سے ہاتھ بڑھا کر اپنا موبائل فون اٹھایا۔ تو دوسری طرف کافی دیر

تک بیل جاتی رہی، اس کی ہمت بندھ گئی کیونکہ فون آف نہیں تھا۔ بار بار

ملانے کے باعث فون اٹینڈ ہوا۔

”ہیلو ماما، ہیلو ماما!“ وہ رقت بھری آواز میں بولی۔

”ہیلو، زرتاشیہ کیا ہوا بیٹا۔“ نرگھس نے قدرے محبت سے پوچھا۔

”ماما! ماما!“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”زر تاش! ہوش سے کام لو، کیا چھوٹی سی بچی بن کر رو رہی ہو۔“

”ماما، ماما آپ مجھ سے دور ہو، میں رو رہی ہوں ماں کے لیے۔“ وہ سسکی۔

”تو باپ کے گلے لگ کر رو لو، ان کی یہی خواہش تھی، اپنی دادو کی گود میں

چھپ کر رو لو انہیں یہ نرگھس بہت بری لگتی تھی۔ بیٹے کے کان بھرتی

رہیں۔“ نرگھس کی زبان زہر افشانی کرنے میں بہت تیز چلتی تھی۔ وہ دم بخود

فون کان سے لگائے سن رہی تھی کچھ کہنے کو نہیں تھا۔

”بولو، تمہیں بھی باپ اور دادو، پھوپھی پیاری ہیں ناں۔ چن لو باپ اور ماں

میں سے کسی ایک کو۔ میں تمہارے باپ کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“

نرگھس نے شدید غصے اور نفرت سے کہا۔

”ماما! ماما آپ ایسے کیوں کہہ رہی ہیں، پپا تو...“

”بس، بس مت پپا کی وکالت کرو، میں زبیر احمد کو اچھی طرح جانتی ہوں۔“

نرگھس نے اس کا جملہ کاٹ کر سخت تلخی سے کہا۔

”مما! مجھے آپ کی ضرورت ہے، آپ کو کیا پتا میری کیا حالت ہے؟“ وہ ماں کی سنگدلی پر رقت بھرا گلہ کر بیٹھی۔

”سب کے ذمہ دار تمہارے پپا اور تمہاری دادی، پھوپھی ہیں، ان سے ہی پوچھو بس۔“ نرگھس نے کہا وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ کمرے سے باہر قدموں کی آہٹ کے ساتھ دادو کی اور پپا کی آوازیں سنائی دیں تو اس نے فون بند کر کے رکھا اور بھیگی پلکیں صاف کیں... وہ اپنے پیارے پپا کو کوئی صدمہ دینا نہیں چاہتی تھی۔ ممّا سے کچھ اختلاف اسے از خود بھی تھا ان کا چیخنا چلانا، لعن طعن کرنا، لڑنا جھگڑنا، برتن توڑنا اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ بس ماں کے سامنے زبان کھولنے کی جسارت کبھی نہیں کی تھی۔ کیونکہ اسے تو ماں باپ دونوں ہی چاہئیں تھے۔

بڑی بیگم ان دونوں کے لیے ناشتا بنا کر لائی تھیں۔ ناجی ہمراہ تھی اس نے ٹرالی میں برتن رکھے اور زرتاشیہ کے کمرے میں ہی ٹرالی لے آئی۔

زبیر احمد نے زرتاشیہ کی طرف دیکھا... تو وہ بولی۔

”پپا! مجھے واش روم جانا ہے، ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کروں گی۔“

”ہاں! ناجی اور میں سہارا دے کر لے چلتے ہیں۔“ بڑی بیگم نے کہا۔

”ہاں! بلکہ میں گود میں اٹھا کر واش روم میں چھوڑ دیتا ہوں، ناجی آپ کو ہیلپ کر دے گی۔“ زبیر احمد نے فوراً اپنے بازوؤں میں اسے سمیٹ کر اٹھالیا۔

”پپا! پلستر تو خراب نہیں ہو جائے گا۔“ وہ ڈری ڈری سے بولی۔

”ارے نہیں بیٹا! ناجی اس کی مدد کے لیے ساتھ چلی گئی۔ زبیر احمد واپس آکر بیٹھے تو بڑی بیگم نے فوراً نرگھس کا قصہ چھیڑ دیا۔

”یہ نرگھس والا کیا قصہ ہے زبیر احمد؟“

”بس کچھ نیا نہیں ہے۔“ وہ ٹال گئے۔

”کیا مطلب ہے؟ وہ جوان بیٹی کو تنہا چھوڑ کے گھر سے چلی گئی اور تم کہہ رہے ہو کہ نئی بات نہیں۔“ وہ خاصی برہمی سے بولیں۔

”اماں جان! میں نرگھس کے حوالے سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا“ وہ ناراض ہو کر خود گئی ہے آنا چاہیں گی تو آجائیں گی ورنہ جو فیصلہ کل ہونا ہے وہ بیشک آج ہو جائے۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

”حد ہو گئی“ بڑھاپے میں بات فیصلے تک پہنچ گئی، باپ دادا کے نام پر بڑھ لگانا تھا تو جوانی میں لگاتے۔“ انہوں نے لتاڑا۔

”یہ میرا نہیں آپ کی لاڈلی بہو بیگم کا رویہ ہے“ میں نے آج تک خاندان کا خیال ہی رکھا ہے، گھر وہ چھوڑ کر گئی ہیں۔ میں نے نہیں نکالا۔“ وہ بھی الجھ پڑے۔

”پر کیوں؟ نرگھس کا دماغ چل گیا کیا؟“

”یہ آپ اسی سے پوچھ لیں۔ پر خدا را زرتاشیہ سے اس موضوع پر کوئی بات نہ کیجئے گا میں اب صرف اپنی بیٹی کے لیے زندہ ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولے۔

”زبیر احمد! یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ تم اسے سمجھاؤ، جوان بیٹی کا ڈولا تو اٹھ جانے دو۔“

”میں بے بس ہوں اماں جان! میری شرافت میری مجبوری ہے، آپ جو چاہیں خود کریں۔“ انہوں نے ماں کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے اپنے لڑتے وجود کو سہارا دیا۔ اماں جان بیٹے کی بے بسی دیکھ کر مضطرب ہو گئیں انہیں یہ صدمہ تھا کہ ان کے بیٹے کی جوانی سلگ سلگ کر بڑھاپے میں بدل گئی تھی، وقت سے پہلے وہ جوانی کی حد سے باہر نکل آیا تھا۔ دل کا مریض بن چکا تھا۔ اب یہ بے عزتی کا صدمہ باقی رہ گیا تھا۔

”میں آج گلریز سے بات کرتی ہوں پوچھتی ہوں اس سے کہ بہن کو کہیں اور بسانے کے خواب اتنی دیر بعد دیکھ رہے ہو کیا؟“ اماں جان نے نرگھس کے بھائی کے حوالے سے تند لہجے میں کہا۔

”کیا ضرورت ہے اماں جان! اس میں گلریز بھائی کا کیا قصور ہے؟ جانے نہ گھس نے کیا کہانی سنائی ہوگی؟“ زبیر احمد نے کہا تو اماں جان نے شعلہ بار نگاہوں سے انہیں گھورا۔

”تمہاری اس شرافت سے ہی تو فائدہ اٹھاتی رہی نہ گھس، بہر کیف مجھے جو پوچھنا ہے وہ خود پوچھ لوں گی۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ زبیر احمد نے رضا مندی میں ہی عافیت جانی، اور خاموش رہنے کا انہیں اشارہ کیا، کیونکہ زرتاشیہ واش روم سے باہر نکل آئی تھی۔ وہ اٹھے اور پھر اسے بانہوں میں بھر کے بیڈ تک لے آئے۔ اماں جان نے زرتاشیہ کے لیے ناشتا الگ پلیٹ میں رکھا اور زبیر احمد کو تھما دیا۔

”ناجی! چل تو گھر جا، ناشتا سب نے کر لیا ہوگا، برتن سمیٹ۔“ اماں جان نے ناجی سے کہا۔ ویسے بھی یہاں کی صفائی والی ماسی آچکی تھی برتن اور کپڑے دھونے والی بھی آنے ہی والی تھی ناجی نے حکم کی تعمیل کی اور چلی گئی وہ شاید ابھی پہنچی بھی نہیں ہوگی کہ میاں افتخار اور شاہدہ وہیں آگئے۔

”کیسی ہے ہماری بیٹی؟“ میاں افتخار نے زرتاشیہ کے سر پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں پھو پھا جی۔“ زرتاشیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔

”ٹھیک تو اس وقت سمجھیں گے جب ہماری بیٹی بھاگتی دوڑتی نظر آئے گی۔“ میاں افتخار نے کہا تو بڑی بیگم نے زرتاشیہ کی بلائیں لیتے ہوئے جواب دیا۔

”چند دن کی بات ہے، انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“

”اماں جان! زرتاشیہ کو اپنی طرف شفٹ کر لیتے ہیں، اس طرح اس کا دل بھی لگا رہے گا اور زبیر کو بھی اطمینان رہے گا۔“ شاہدہ نے ماں سے کہا تو وہ خوش ہو گئیں۔

”میری تو اپنی یہی خواہش ہے، چلو ابھی میری بچی کو میرے کمرے میں پہنچادو یہاں تنہا رہی تو بیمار ہو جائے گی۔“ اماں جان نے جلدی سے زبیر احمد کو کہا۔ انہوں نے فوراً اثبات میں گردن ہلادی۔



”نرگھس سے بات ہوئی۔“ شاہدہ نے براہ راست زبیر احمد سے پوچھا۔

”نہیں۔“ انہوں نے مختصراً کہا۔

میاں افتخار نے زبیر احمد کے مختصر جواب سے بہت کچھ سمجھ لیا۔ مصلحتاً خود ہنس کر بولے۔

”بھئی زرتاشیہ کی دادو، پھوپو موجود ہیں، نرگھس بھابی کو آرام کر لینے دو، ہم سب ہیں اپنی بیٹی کے ساتھ۔“ یہ بات سن کر زرتاشیہ کی آنکھیں خوشی سے جھلملانے لگیں۔ زبیر احمد نے اس کے ہاتھ سے جوس کا خالی گلاس لے کر رکھتے ہوئے آنکھوں آنکھوں میں کچھ سمجھایا کہ وہ مسکرانے لگی۔

میاں افتخار نے گھڑی پر نگاہ ڈالی، تو شاہدہ نے ماں سے اجازت لی۔

”جاؤ، اللہ نگہبان، ہم بھی گھر ہی آرہے ہیں۔“ بڑی بیگم نے خوش دلی سے کہا۔ وہ دونوں زرتاشیہ کو پیار کر کے چلے گئے۔

”ناجی! ناجی۔“

”جی، تانیہ بی بی۔“ تانیہ کی آواز پر وہ دوڑی چلی آئی۔

”یہ کیا ہے؟ ٹھنڈے خشک سلائس، ٹھنڈا آملیٹ، یہ ناشتا ہے۔“ تانیہ نے سلائس اور آملیٹ کی پلیٹ زور سے میز پر اٹھا کر پٹنی تو ناجی پریشان ہو گئی۔

”جی یہ سب چیزیں ایک گھنٹے پہلے بالکل گرم تھیں، کچھ دیر پہلے فرحان صاحب کے کھانے تک بھی کچھ گرم تھیں آپ لیٹ ہیں اس لیے۔“ ناجی نے صاف صاف بتا کر اپنی جان چھڑانی چاہی۔

”ناشتا ہے یا جیل کی روٹی، وقت وقت کی بکواس۔“ تانیہ غصے سے پھنکاری۔

”بڑی بیگم ہی بتا سکتی ہیں، بس آنے والی ہیں۔“ ناجی نے جواب دیا۔

”یہ ناشتا ڈسٹ بن میں ڈالو، مجھے نہیں کرنا، میں اس جیل کی زندگی سے

تنگ آگئی ہوں۔“

”ارے تانیہ! تمہیں صرف جیل کا نام پتا ہے، جیل دیکھ لی تو ہوش ٹھکانے

آجائیں گے کیوں اس غریب پر برس رہی ہو؟“ پیچھے سے بڑی بیگم نے

اچانک آکر کہا تو وہ تننتا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نانو! آپ گھر کو جیل بنانا چاہتی ہیں کیا؟“

”خدا نہ کرے، مگر اپنے طور طریقے گھر میں رہنے والے بناؤ، بغل میں

تمہاری ماموں زاد بستر پر پڑی ہے، تمہیں توفیق نہیں ہوئی کہ صبح جلدی سے

جا کر اس کا حال احوال پوچھتیں، اسے ناشتا کراتیں، مگر سچ تو یہ ہے کہ تم خود

پسند ہو، اپنی ذات میں مگن۔“ بڑی اماں نے خوب کھری کھری سنا دیں تو

تانیہ تلملاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

”ناجی! اب تک ناشتا میز پر رکھے تم کیا کر رہی تھیں۔ چلو جلدی سے پہلے

میرے کمرے کی صفائی کرو، زبیر احمد زرتاشیہ کو لا رہے ہیں۔“ انہوں نے سر

جھکائے کھڑی ناجی کو جھڑکا۔ وہ اٹے قدموں اندر چلی گئی عین اسی وقت

فرحان تیار ہو کر باہر آیا تو انہوں نے کڑی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

”کہاں کی تیاری ہے گلغام کی؟“

”دوست کی طرف جارہا ہوں۔“ اس نے نرمی سے جواب دیا۔

”ارے میاں! کب تک بیکار یار دوستوں کے چکر میں رہو گے، پڑھائی ختم

ہوگئی کوئی کام کاج کرلو یا۔۔۔“

”جی بہتر۔“ اس نے ان کا جملہ اچک کر دھیما مگر کڑوا سا جواب دیا۔

”بھئی حوصلہ ہے شاہدہ کا، جوان جہان اولاد کو آزادی دے رکھی ہے۔“ وہ

بولیں۔

”نانو! یہ آپ کی باتیں میں اور تانیہ روزانہ سنتے ہیں۔“ وہ خاصے تکل سے

بولا۔

بڑی بیگم نے پر تفتیش نگاہوں سے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ وہ خاصے

اہتمام سے تیار ہوا تھا۔ انہیں اچھا لگا۔ کچھ دیر کو زرتاشیہ کے حوالے سے

انہوں نے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

”کیا دیکھ رہی ہیں؟“ وہ کچھ سٹیٹا سا گیا۔

”جاؤ، جا کر ماموں کی مدد کرو، زرتاشیہ کو یہاں لانا ہے۔ تمہاری دہری ذمہ داری بنتی ہے۔“ انہوں نے ایک دم ہی سختی سے کہا۔

”میں اس وقت ایسی کسی ذمہ داری کو نبھانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، مجھے معاف رکھیے۔“ وہ قطعی انجان بن کر آگے بڑھا، مگر عین اس وقت ناجی سامنے آگئی اس نے ایک لفافہ فرحان کی طرف بڑھایا اور کہا۔

”فرحان صاحب! بیگم صاحبہ آپ کے لیے پیسے دے گئی تھیں۔“

”او، اچھا ٹھیک ہے۔“ اسے یاد آیا تو خوش ہو کر لفافہ جیب میں رکھ لیا۔

”بہت خوب شاہدہ کی عقل پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔“ بڑی بیگم جل بھن کر بولیں فرحان نے کندھے اچکائے اور گاڑی کی چابی لہراتا ہوا باہر نکل گیا۔

”یہ بتا کس چیز کے لیے پیسے دیے ہیں شاہدہ نے؟“ انہوں نے ناجی کو گھیر لیا۔

”پتا نہیں، رات چھوٹے صاحب نے پانچ ہزار مانگے تھے۔“ اسے جتنی بات معلوم تھی بتادی۔

”ارے بہت گھنٹا ہے یہ فرحان بھی، تانیہ سے کم نہیں ہے۔“ وہ جھلا کر کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

سلطان آرکیڈ کی پارکنگ سے گاڑی نکال کر وہ سیدھا ایاز کے گھر پہنچا سامعہ اس وقت صائمہ کے ساتھ مل کر اپنے کمرے کی سیٹنگ بدل رہی تھی۔ ایاز تو اپنے آفس گیا ہوا تھا۔ وہ دو بڑے بڑے شاپنگ بیگ لیے کمرے میں آیا تو صائمہ نے سلام کیا۔ اس نے سامعہ کی طرف شاپنگ بیگ بڑھائے اور صائمہ کے سلام کا جواب دیا۔

”لگتا ہے، بہت کچھ لائے ہیں سامعہ کے لیے۔“ صائمہ نے شرارت سے پوچھا۔

”کچھ ضرورت کی چیزیں، بہت زیادہ کچھ نہیں ہے۔“ اس نے بتایا۔

صائمہ نے خفگی سے دیکھا اور بولی۔

”اس گھر میں ضرورت کی چیزیں نہیں ہیں کیا۔“

”ارے نہیں، بھابی میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ وہ شرمندہ ہو گیا۔

”تو پھر کیوں؟“

”بس ویسے ہی چند چیزیں دیکھ کر خرید لیں۔“

”چلو معاف کیا، بیٹھو میں چائے بنواتی ہوں۔“ صائمہ ہنس کر کمرے سے چلی گئی۔

”یہ کمرے کی سیٹنگ کیوں بدلی جا رہی تھی، کیا مستقل یہیں رہنے کا پروگرام

ہے۔“ اس نے پورے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”یہ تو آپ پر منحصر ہے۔“ اس نے یاد دلایا۔

”ہاں! بہت جلد انشاء اللہ بابا کوئی طریقہ نکال ہی لیں گے۔ فی الحال تو حالات

رات سے صبح تک کچھ اور ہی ہو گئے ہیں۔“ وہ بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے بولا

سامعہ پریشان ہو گئی۔

”اللہ خیر! کیا ہوا؟“

”کچھ خاص نہیں، ہماری نام نہاد منگیتر صاحبہ کے پائوں پر پلستر چڑھا ہے، وہ

نانو کے کمرے میں براجمان ہونے کو آگئی ہیں... موضوع سخن اب یہی رہے گا

کہ مجھے زرتاشیہ کا خیال رکھنا چاہیے... ہماری ذمہ داری ہے وہ۔“ اس نے

تقریباً نانو کے انداز میں نقل اتاری، تو سامعہ نے ڈوبتے دل کو مضبوط حوصلے

کے باد بان تھما کر دھیرے سے کہا۔

”آپ کو خیال رکھنا بھی چاہیے، وہ صرف زرتاشیہ نہیں ہے۔ آپ کی بچپن کی

منگیتر بھی ہے۔“

”یہ تم طنز کر رہی ہو یا مشورہ دے رہی ہو۔“ اس نے چونک کر پوچھا۔



”فرحان! حالات کیسے بھی ہوں انسان کو اپنے مقام سے گرنا نہیں چاہیے۔ یہ طنز نہیں ہے، حقیقت ہے۔ دیکھا جائے تو میں نے زرتاشیہ کے ساتھ برا کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ رات سے دن تک اور دن سے رات تک خوابوں کے جزیروں سے کیسے کیسے نایاب، کمیاب موتی چن، چن کر ایسا گھر بنا رہی ہوگی جس کا فرش چاہت، جس کی چھت محبت اور جس کی دیواریں اعتبار کی ہوں گی۔ وہ تمہیں میری طرح نہ سہی مجھ سے الگ اپنی طرح بہت چاہتی ہوگی۔“ سامعہ کی آواز میں پیدا ہونے والا ارتعاش اسے چپ کرا گیا۔

”کوئی اور بات کرو، میں صرف تم تک ہوں اور تم تک ہی رہنا چاہتا ہوں۔“ وہ کافی سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ ایسے میں سامعہ کے دل سے آمین کا لفظ نکلا جو لبوں کے پیچھے ہی دبا رہ گیا۔

”مسز جیری کا فون آیا تھا، پوچھ رہی تھیں کہ کیا پروگرام ہے؟“ سامعہ نے موضوع ہی بدل ڈالا۔

”بتا دینا تھا کہ آبادی بڑھانے کا پروگرام ہے۔ آپ جلدی نانی جان بن جائیں گی۔“ اس نے شوخی اور شرارت سے کچھ دیر والا ماحول بالکل بدل ڈالا وہ شرمائی، پھر ایک دم ہی اداس ہو گئی۔

”کیا ہوا؟“ وہ متفکر ہو گیا۔

”کچھ نہیں، کچھ یاد آ گیا تھا۔“

”اوہ! آئی ایم سوری، پلیز گزری باتیں بھول جاؤ۔“ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دباتے ہوئے بولا۔

اسی وقت صائمہ، گلزاری کے ساتھ چائے لیے اندر آ گئی۔ تب وہ شوخ ہو گیا۔

”صائمہ بھابی! آپ میری بیگم کو سجا بنا کر رکھا کریں، دیکھیں کیا حالت بنا رکھی ہے۔“

”ہنہ! مجھے دیکھ کر بات بنالی، تم نے ستایا ہوگا۔“ صائمہ نے جوابی حملہ کیا۔

نوک جھونک میں چائے پی گئی۔ کافی وقت گزر گیا۔ وہ مسز جیری والی بات بھول چکا تھا کہ گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے سامعہ نے پھر یاد دلایا۔

”انہیں کہو، انتظار کریں، اب سب کچھ بابا کی مرضی سے ہوگا اور ہاں میں رات آنے کی کوشش کروں گا۔ وہ پنک لباس پہننا، بالوں کو کھلا رکھنا۔ اوکے۔“

فرحان اس کی سوچ سے بھی بڑھ کر رومانٹک نکلا تھا۔ اس کے تصور سے بھی بدن میں سرسراہٹ ہونے لگتی تھی۔ رات کے خیال سے وہ بہکی بہکی چال چلتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ حالانکہ ابھی رات کافی دور تھی۔

☆☆...☆☆

یونیورسٹی روڈ پر فیوچر اکیڈمی کے سرپرست پروفیسر عبدالرئوف سے مل کر وہ موٹر سائیکل پر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ اچانک سڑک کے دائیں جانب یونیورسٹی کیمپس کے گراؤنڈ میں گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تانیہ اور پیچھے کی طرف بازوؤں پر وزن ڈال کر آرام سے بیٹھے خرم کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا ایک

لمحے دل چاہا کہ سیدھا چلو، کوئی ضرورت نہیں اگلے ہی لمحے دل نے مچل کر اس کے قریب جانے کی خواہش کی اس نے کک ماری اور لمحے بھر میں ان سے چند قدم کے فاصلے پر موٹر سائیکل کھڑی کر کے قدم آگے بڑھائے تانیہ نے پہلے اسے دیکھا اور پھر ناگواری سے انجان بننے کی کوشش کی۔ خرم کے دیکھنے سے پہلے وہ قریب پہنچ کر بولا۔

”ہیلو۔“ وہ دونوں سر اٹھا کے دیکھنے لگے۔ خرم کی نگاہوں میں اچانک والی کیفیت تھی جبکہ تانیہ کی آنکھوں میں زہر ہی زہر دکھائی دے رہا تھا۔

”ہیلو! اینگری ینگ مین۔“ خرم نے ازراہ مروّت اٹھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”کیسی ہو تانیہ؟“ عادل نے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”آئی ایم فائن، خرم چلو دیر ہو رہی ہے۔“ ناک چڑھا کر اس نے جواب دیا اور پرس اٹھا کر کھڑی ہو گئی عادل نے رسٹ واپس پر نظر ڈالی۔

”دیر تو پہلے ہی بہت ہو چکی ہے، پانچ بج رہے ہیں۔ یونیورسٹی کا ٹائم تو شاید یہیں گرانڈ میں گزرا ہو گا۔“ وہ چبا چبا کر طنزیہ بولا تو تانیہ کو آگ لگ گئی۔

”سو وہاٹ! اپنے کام سے کام رکھو، مسٹر۔“

”تم بھول جاتی ہو شاید کہ میرا تم سے کیا تعلق ہے؟“ اس نے غصے پر کنٹرول کرتے ہوئے کہا۔

”ایسا کرو، گلے میں تختی لکھ کر لٹکا لو، مگر تمہاری یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔“

”اچھا، چلو یہ بتاؤ آخر کیوں نہیں ہو سکتی؟“

”اپنا جائزہ لو، اپنی اوقات دیکھو خود ہی پتا چل جائے گا۔ خرم لیٹس گو۔“ وہ

خاص طنزیہ لہجے میں قدرے ہنس کر بولی اور چلنے لگی ایک دم وہ اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ مضبوط ہاتھوں سے اس کے نازک شانے جکڑ کر قطعہ سنا ڈالا۔

اجڑے ہوئے لوگوں سے گریزاں نہ ہوا کر

حالات کی قبروں پر یہ کتبے بھی پڑھا کر

ہر وقت کا ہنسنا تجھے برباد نہ کر دے

تنہائی کے لمحوں میں کبھی رو بھی لیا کر

”اوشٹ اپ!“ اس نے خود کو آزاد کراتے ہوئے چلا کر کہا۔ عادل کو ہنسی

آگئی۔ زور زور سے قہقہے لگاتا چلا گیا۔ تانیہ سلگ اٹھی۔ خرم بالکل خاموش تھا۔

عادل کے جانے کے بعد فقط اتنا بولا۔

”بتانی ڈیر! یہ شخص تمہیں پا کر رہے گا۔ اس کی آنکھوں میں جنون ہی جنون

دیکھا ہے میں نے۔“

”ہنہ! میں اس کی آنکھیں نکال دوں گی۔“

”کم آن ڈیر! وہ باتیں نہیں کرتے جو ممکن نہ ہوں، ویسے اس نے تمہیں

آج ایسا کچھ نہیں کہا تھا، پھر تم ریش کیوں ہوئیں، وہ تو نارمل آیا تھا تم اسے

خود خراب کر رہی ہو۔“ خرم کی بات میں وزن تھا تانیہ نے کچھ اثر قبول کیا۔ مگر پھر سر جھٹک کے آگے آگے چل دی۔

”یار! تمہیں اس سے نجات چاہیے تو اپنی ماما کو بابا کو صاف صاف کہہ دو۔“ خرم نے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے کہا۔

”یہ اتنا آسان نہیں ہے، تم اگر ہیلپ کرو تو ممکن ہے۔“ وہ بولی۔

”ہاں! بولو میں کیا ہیلپ کر سکتا ہوں؟“

”اپنی فیملی کو ہمارے گھر بھیجو۔“ وہ ایک دم کہہ گئی۔

”اس سے کیا ہوگا؟“ وہ سادگی سے گاڑی چلاتے ہوئے بولا۔

”میں تمہارے لیے ماما کو راضی کر لوں گی۔“

”اوہ! یار! یہ اپنے اسٹائل سے بالکل الگ بات ہے، میں راضی راضی کے چکر میں نہیں پڑتا اگر تم مجھے اوکے کہو گی اور مجھے ایکسپٹ کرو گی تو ٹھیک ورنہ

ہم اچھے دوست تو ہیں۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں بے پروائی سے کہا۔

”یو مین! تم باقاعدہ مجھے پرپوز نہیں کر سکتے۔“

”یار! پرپوز کی ویلیو کیا ہے؟ عادل سے تمہاری انگیجمنٹ ہو چکی ہے، پھر بھی

تم اسے قبول نہیں کرنا چاہتیں۔ خاک حیثیت رہ گئی اس کی۔“

”او کے! پلیز خاموش ہو جاؤ بس۔“ وہ غصے سے بولی۔

”یار! اتنا غصہ نہیں اگر تم نے عادل سے نجات حاصل کر لی تو میں حاضر ہوں، یہ کام تمہیں کرنا ہے، میں تو آزاد منش ہوں، ہر حال میں خوش رہنے والا ہوں۔“

”او کے! میں اس وقت کچھ سننے کے موڈ میں نہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد گاڑی گھر کے گیٹ پر تھی وہ اتری پھر کچھ سوچ کر مڑی اور مسکرا کر دیکھا۔ خرم نے بھی مسکرا کر دیکھا وہ ہاتھ ہلا کر گیٹ سے اندر چلی گئی۔



میاں افتخار کی ہمیشہ کی عادت تھی کہ انہیں اخبار دن بھر میں بار بار پڑھنے کے بعد بھی پرانا نہیں لگتا تھا۔ بلکہ ہر بار وہ اس میں سے کوئی نہ کوئی نئی خبر ڈھونڈ نکالتے یا پھر انہیں اخبار صبح سے رات تک پرانا پڑھا ہوا لگتا ہی نہیں تھا۔ انہماک سے جب وہ اخبار کے مطالعے میں مصروف ہوتے تو سوائے اماں جان کے کسی کی آواز ان سے اخبار نہیں رکھوا سکتی تھی۔ اس وجہ سے اکثر و بیشتر شاہدہ بیگم کو سخت غصہ آتا

تھا۔ اس وقت بھی وہ اماں جان کے کمرے سے کوئی بات کرنے کے لیے ان کے پاس آئی تھیں مگر وہ منہمک تھے وہ چپ کر کے بیٹھ گئیں مگر تانیہ کے تیز قدموں کی آواز پر انہوں نے اخبار کی اوٹ سے اسے دیکھا وہ غصے میں متمتا رہی تھی۔

”بابا! میں عادل کی بدتمیزی مزید برداشت نہیں کر سکتی۔“ وہ اک دم انہی سے مخاطب ہوئی تو وہ چونکے۔

”خیر ہے یہ عادل کہاں سے زبان پر آگیا۔“

”اسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجھے بے عزت کرے۔“ وہ پھنکاری۔

”تانیہ! دھیرے بات کرو، مسئلہ کیا ہے؟“ شاہدہ نے غیر ارادی طور پر اماں جان کے کمرے کی طرف دیکھا۔ کیونکہ کمرے میں زرتاشیہ آچکی تھی۔ زبیر احمد اور اماں جان وہیں تھے۔

”کیوں بولوں؟ اس جاہل سے ڈرتی ہوں کیا۔؟“ وہ چلائی۔

”میری اطلاع کے مطابق تو وہ پڑھا لکھا نوجوان ہے۔“ میاں افتخار نے مسکرا کر کچھ سنجیدگی سے کہا۔

”تو آپ اس سے بات کریں تانیہ کو زچ کیوں کرتا ہے۔“ شاہدہ نے بیٹی کی طرف داری کی۔

”وہ غیر ذمہ دار نہیں ہے بیٹا جی!“ میاں افتخار نے اپنے روایتی نرم لہجے میں کہا۔ وہ بھڑک اٹھی۔

”جی ہاں! وہ تو بہت قابل، ذمہ دار ہے، آپ کا بھتیجا ہے اس لیے۔“ وہ یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”پتا نہیں، ہم میں سے کون ٹھیک ہے او رکون غلط، مگر کوئی نہ کوئی غلط ضرور ہے۔“ میاں افتخار نے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”بچوں کی طرف سے بدگمان نہ ہوں۔“ شاہدہ یہی سمجھیں کہ وہ شاید بدگمان ہیں، حالانکہ وہ دل ہی دل میں خاصے مضطرب تھے، شاہدہ کو ان کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ وہ وہاں سے اٹھنے لگے تو وہ بولیں۔

”زرتاشیہ کے لیے اماں جان ہزار مرتبہ یاد دلا چکی ہیں، مگر آپ کے پاس فرصت نہیں۔“

”کس بات کی فرصت، بیگم صاحبہ! آپ اور اماں جان اس گھر کی کرتا دھرتا ہیں، میں کیا کر سکتا ہوں؟“ وہ جلدی میں کچھ غلط کہہ گئے جس کا انہیں فوراً ہی احساس ہو گیا۔ فرحان اور سامعہ کے چہرے نگاہوں میں آ گئے۔

”فرحان سے پوچھ لو۔“ وہ ہکلائے۔

”پوچھنا اس سے کیا ہے؟ اس رشتے سے واقف ہے، آپ فیصلہ کریں کب شادی کریں؟“

”اوہو بیگم! اتنی جلدی بھی کیا ہے؟ تانیہ کے زیادہ سے زیادہ پانچ چھ مہینے فائنل ایگزامز میں رہ گئے ہیں، پھر دونوں کے لیے فیصلہ کریں گے۔“ وہ بولے۔ شاہدہ بیگم چپ ہو گئیں۔

”مگر...“

”اگر مگر چھوڑو۔“

”عادل کے لیے تانیہ راضی نہیں لگتی۔“

”تانیہ کے لیے عادل سے موزوں کوئی اور ہو نہیں سکتا، یہ سمجھانے کی کوشش کرو۔“

”جوان بچی سے سختی بھی تو نہیں کر سکتی۔“

”پھر جو جی میں آئے کرو۔“ وہ یہ کہہ کر مسکرائے اور اندر کی طرف چلے گئے۔ شاہدہ ادھیڑ بن میں گرفتار، گھنٹوں وہیں بیٹھی سوچتی رہیں ذہن مائوف ہو گیا کیا کرنا چاہتی ہیں؟ اور کیا ہوتا ہے؟ یہ سوال انہیں پریشان کر رہے تھے مگر اماں جان اس طرف نکلیں تو وہ چونکیں۔

”خیر تو ہے۔“ اماں جان نے ایک دم ان کی پیشانی چھو کر پوچھا۔

”جی۔“

”ایسا کرو زرتاشیہ کے پاس چلی جاؤ، وہ ماں کی وجہ سے بہت اداس ہو رہی ہے، میں اس کے لیے سوپ بنالوں اور رات کے کھانے کا بھی بندوبست کرنا ہے۔“ اماں جان یہ کہہ کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں اور وہ نپے تلے قدم اٹھاتی ہوئی اماں کے فرمان کے مطابق زرتاشیہ کے پاس چلی گئیں۔

مگر اس وقت وہ سوئی ہوئی تھی، زبیر احمد اس کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھے تھے...

”زبیر! جاؤ جا کر آرام کرو، یہاں زرتاشیہ کے پاس ہم سب ہیں۔“ شاہدہ بیگم نے کہا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“

”کہاں ٹھیک ہو؟ حالت دیکھو اپنی۔“

”زرتاشیہ ٹھیک ہو جائے میری حالت ٹھیک ہو جائے گی۔“

زرتاشیہ بالکل ٹھیک ہے اسے کیا ہوا ہے؟ ایسی چوٹیں تو لگتی رہتی ہیں بلا وجہ اس قدر پریشان ہو۔“

”مجھے تو پریشان ہونا چاہیے، میری بچی کی آنکھوں میں ماں کی کمی موجود ہے۔“

”زبیر! زرتاشیہ نرگس سے اچھی طرح واقف ہے، ویسے تم اسے فون پر اطلاع تو دے دو۔“

”نہیں یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔“ وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

انجم نے کباب تلنے ہوئے نذیر کی طرف دیکھا نذیر نے ہاتھ میں پکڑی پھلو کی ٹوکری کچن کی سنٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے انہیں گلریز صاحب کا پیغام دیا۔  
”صاحب آگئے ہیں۔“ انجم نے فرائی پین سے کباب نکال کر چولہا بند کرتے ہوئے پوچھا۔

”جی! ابھی آئے ہیں اور ایک گھنٹے بعد میاں چنوں جانا ہے۔“ نذیر نے بتایا۔  
وہ ہاتھ دھو کر نیپکن سے خشک کرتی ہوئی فوراً کمرے میں پہنچ گئیں گلریز بیڈ پر دراز تھے۔

”کیا بہت تھک گئے ہیں آج۔“ انجم نے مسکرا کر پوچھا۔

”اب تھکنا تو ہے انجم بیگم، تیس سال سے رات دن کام ہی کیا ہے۔“ وہ طویل سرد آہ بھرتے ہوئے بولے۔

”اب کیا ضرورت ہے اتنے کام کی، کس چیز کی کمی ہے ہمارے پاس۔“ شوہر سے محبت نبھانے کے لیے بڑا ہی روایتی جملہ ادا کیا تو گلریز قہقہہ مار کے ہنس دیے۔

”لائق، محنتی بیٹے کی کمی ہے۔“ ایک دم ہی فسوں طاری ہو گیا۔ کچھ دیر انجم چپ رہی پھر جلدی سے بولیں۔

”کیا کمی ہے میرے افراسیاب میں۔“ وہ توقف سے پھر ہنسنے اور بولے۔

”ماں کی آنکھ سے دیکھتی ہو اس لیے کیا کمی نظر آسکتی ہے۔“

”چلیے اٹھیے کھانا تیار ہے۔“

”کھانا تو راستے میں کھالیا تھا، ابھی پھر سفر کرنا ہے، میاں چنوں میں ٹیوب ویل کئی روز سے خراب ہیں، منشی کے بار بار فون آرہے ہیں۔ مسجد کا افتتاح بھی کرنا ہے۔ بس کچھ دیر کمر سیدھی کرلوں۔“

”چائے بھی نہیں پیئیں گے کیا؟“



”جاتے وقت۔“ وہ بولے۔

انجم نے کچھ کہنے کے انداز میں انہیں دیکھا تو وہ بولے۔

”کیا بات ہے کچھ کہنا چاہ رہی ہو؟“

”نرگھس آئی ہیں۔“

”اچھا، کب؟ بلاؤ زرتاشیہ بیٹی کو بلاؤ۔“ وہ بے تاب ہو گئے۔

”پہلے پوری بات سن لیں۔ نرگھس اکیلی آئی ہیں، زبیر احمد سے ناراض ہو کر چار روز ہو گئے ہیں۔“

”تم نے سمجھایا نہیں کہ جس دروازے پر کہاں کھڑے ہوں وہاں کی مائیں ناراض ہو کر گھر نہیں چھوڑتیں۔“

”آپ ہی کہہ سکتے ہیں، میں تو نرمی سے سمجھا چکی ہوں مگر ان کی ایک ہی ضد ہے۔“ انجم نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

”کیسی ضد؟“

”کہ اب واپس نہیں جانا۔“

”کیا؟ دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟“ گلریز نے معمول سے ہٹ کر اونچی آواز میں پوچھا۔

دروازے سے داخل ہوتی نرگھس کو بڑے بھیا کا لہجہ اور انداز گفتگو اجنبی سا لگا۔ کچھ دھیمے سے لہجے میں انہیں سلام کیا تو انہوں نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”ترازو کے ایک پلڑے میں، میں ساری دولت رکھ دوں اور دوسرے میں تمہیں پھر بھی زبیر احمد کا تم سے جوڑ نہیں بنتا... اس کی شرافت، مروّت اور شائستگی تمہارے مزاج سے لگا نہیں کھاتی، مگر پھر بھی مجھے زبیر احمد سے کبھی کوئی شکوہ شکایت نہیں ملی۔“ بات مزاج کی آئی تو نرگھس بھڑک اٹھی۔

”آج تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ آپ میرے بڑے بھیا ہیں یا زبیر کے۔“

گلریز نے تمسخرانہ نظروں سے نادان بہن کو دیکھا اور بولے۔

”نرگھس! بیکار باتیں، ایک جوان بیٹی کی ماں کے منہ سے سننا اچھا نہیں لگتا۔  
تم زرتاشیہ کے لیے بھی نہیں سوچتیں۔“

”ہنہ! وہ باپ کی چہیتی ہے، دادی، پھوپھی کی دیوانی، میرے خلاف اس کے  
کان بھرے جاتے ہیں۔ جیسا باپ ہے ویسی بیٹی ہے۔“ وہ بولتی چلی گئی انجم  
شوہر کے مزاج کے پیش نظر دھیرے سے بولیں۔

”ٹھنڈے دل اور دماغ سے سوچو، بچی کس قدر ہراساں ہوگی، اس کو تسلی  
دو، بلکہ یہاں بلاؤ۔“

”انجم! اسے خود فیصلہ کرنے دو، مجھے دیر ہو رہی ہے، ڈرائیور سے کہو گاڑی  
نکالے۔“ گلریز خاصی بیزاری سے کہہ کر بیڈ سے اٹھے اور واش روم کے  
طرف بڑھ گئے انجم کمرے سے باہر نکل آئیں۔

نرگھس کچھ دیر خالی کمرے میں کھڑی کچھ سوچتی رہی پھر تیز قدموں سے باہر  
چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ بڑے بھیا کی نظروں میں وہی قصور وار ہوگی ہمیشہ  
یہی ہوا تھا۔ جب کبھی اس نے زبیر احمد کی کوئی شکایت ان سے کی تو وہ اسی

کو سمجھا بجھا کر یہ باور کراتے کہ وہ غلطی پر ہے اپنی غلطی تسلیم کرنے کی  
اسے عادت نہیں تھی اس بار تو بقول اس کے وہ سب کشتیاں جلا کر آئی  
تھی۔ کسی قیمت پر واپس جانے کو تیار نہیں تھی، ایسا پکا فیصلہ گو کہ ابھی  
بڑے بھیا کے روبرو اس نے نہیں سنایا تھا۔ تاہم وہ تیار تھی کہ جو نہی بھیا  
نے کچھ پوچھا تو وہ صاف صاف بتا دے گی۔ مگر آج تو یہ نوبت آئی نہیں  
تھی۔ بڑے بھیا نے شاید جان بوجھ کر اسے سوچنے سمجھنے کا موقع فراہم کیا  
تھا۔ تاکہ وہ کچھ اچھا سوچے۔

☆☆...☆☆

محبت پھر محبت ہے

کبھی دل سے نہیں جاتی

ہزاروں رنگ ہیں اس کے

عجب ہی ڈھنگ ہیں اس کے

کبھی صحرا

کبھی دریا

کبھی جنگو

کبھی آنسو!!!!

اس کی بڑی بڑی شرتی آنکھوں سے اشک بہہ بہہ کرتی تھی میں جذب ہوتے دیکھ کر فرحان ٹھٹکا... وہ تو یہ سوچ کر نانو کے کمرے میں آگیا تھا کہ شاید ماما وہیں ہوں گئیں، مگر کمرے میں زرتاشیہ تنہا آنسو بہا رہی تھی۔ عجب گولگو کی حالت میں تھا، واپسی کے لیے قدم اٹھائے تو قدم من من کے ہو گئے۔ وہ اسے دیکھ چکی تھی پلو سے آنکھیں صاف کر کے مسکرانے لگی تو ازراہ مروت اسے، بیڈ کے قریب جا کر ہیلو کہنا پڑا... جواب میں وہ بولی۔

”ان آنسوؤں کا الزام آپ کو تو نہیں دیا، پھر کیوں لوٹ رہے تھے؟“

”میں تو ماما کو دیکھنے آیا تھا۔“ وہ ہکلا یا من کی چوری پکڑی گئی تھی۔

”مجھے معلوم ہے آپ میری وجہ سے نہیں آئے، مگر میں یہاں کس کی وجہ سے ہوں؟“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

تم اجنبی تو نہیں ہو، یہ تمہاری دادی اور پھوپو کا گھر ہے۔“ کافی سنبھل کر، الفاظ چبا چبا کر حلق سے نکالے تو وہ دل مسوس کے رہ گئی۔

”یاد دہانی کا شکریہ۔“

”زرتاشیہ! دھیرے دھیرے تم کمپلی کیٹڈ سی ہوتی جا رہی ہو۔“

”فرحان! آپ مجھے مشکل راستوں پر کھینچ رہے ہیں، ورنہ میں تو بالکل سیدھی سادی بند آنکھوں سے خواب دیکھنے والی زرتاشیہ تھی۔“

”میں نے ایسا کیا جرم کیا ہے، اور کس بیوقوف نے یہ مشورہ دیا ہے کہ بند آنکھوں سے خواب دیکھو، آنکھیں کھلنے پر بہت مشکل پیش آتی ہے۔ اپنا خیال رکھو۔“ وہ بڑے سلیقے سے ٹال کر کمرے سے نکلنے والا تھا کہ بڑی بیگم آگئیں۔

”شکر ہے آپ کو خیال آیا کہ کسی کی خیریت پوچھنی چاہیے۔“ انہوں نے آتے ہی حملہ کیا۔

”میں خیریت پوچھنے نہیں آیا۔ ماما کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔“ فرحان نے حد درجہ سختی سے جواب دیا۔ زرتاشیہ کا دل چکنا چور ہو گیا۔ بڑی بیگم تائو کھا گئیں۔

”میاں صاحبزادے! ہم جانتے ہیں تمہارے لچھن بتا رہے ہیں کچھ نہ کر کے بھی تم کن ہوائوں میں ہو، یہ ہمیں اچھی طرح نظر آرہا ہے۔ جائو ماما کو ملو وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ جائو کچھ فرمائشیں کرو کچھ روپے مانگو۔“

وہ غصے سے سرخ ہو گیا مگر کچھ بولے بنا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد زرتاشیہ نے بڑی بیگم کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”دادو! آپ کیوں انہیں ایسا کہتی ہیں، وہ سمجھتے ہیں آپ میری وجہ سے ایسا کرتی ہیں۔“

”ہاں! تو سمجھا کریں، بالکل تمہاری وجہ سے کرتی ہوں، بچپن کی مانگ ہو تم اور میاں صاحبزادے کے مزاج نہیں ملتے۔ سارا قصور ہی شاہدہ کا ہے۔ لگام کھینچ کر رکھتی تو دونوں بچے کنٹرول میں رہتے۔“

بڑی بیگم کی لے دے کی تان شاہدہ پر ٹوٹی تھی۔ زرتاشیہ کو پھوپو بے قصور لگیں تو ہمدردی سے بولی۔

”دادو! اس میں شاہدہ پھوپو کا کیا قصور ہے، وہ تو پیار کرنے والی ماں ہیں، میری ماما جیسی تو نہیں ہیں۔ جنہیں میری ذرا سی بھی پروا نہیں ہے میرے پپا کی پروا نہیں ہے۔“ وہ رو دی تو بڑی بیگم کا دل تڑپ اٹھا۔

”نہ، نہ دل میلا نہ کرو، ہم سب تو ہیں تمہارے پاس۔“ انہوں نے اسے سینے سے لگا لیا، مگر وہ جو اشکوں کا سلسلہ فرحان کے آنے پر رکا تھا وہ پھر سے بہہ نکلا۔

دادو یا زبیر احمد لاکھ اس کا دل بہلاتے تھے مگر وہ ماں کے لیے دل ہی دل میں دکھی تھی۔ شاہدہ پھوپو کی تانیہ اور فرحان سے محبت دیکھ کر اور زیادہ



رنجیدہ تھی، مگر چھپ چھپ کے آنسو بہانے کے سوا کوئی اور طریقہ نہیں تھا اس وقت بھی وہ کچھ ماں کے احساس سے کچھ اپنی احساس محرومی سے اور شاید کچھ فرحان کی عدم دلچسپی کے باعث رو رہی تھی، مگر فرحان آدھمکا تو وہ ہنس کر ٹال گئی تھی۔ وہ سلسلہ پھر جاری ہو گیا۔

”زرتاشیہ! نرگھس نادان ماں ہے تو شاہدہ بھی کوئی عقلمند ماں نہیں ہے“ دونوں ہی غلط ہیں... البتہ زبیر احمد اور میاں افتخار کے مزاج میں بہت فرق ہے، تمہاری اور تانیہ، فرحان کی عادات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“ بڑی بیگم کا نظریہ درست تھا یا غلط مگر وہ اپنے نظریے پر ڈٹی ہوئی ضرور تھیں۔

زرتاشیہ ان سے پیار کرتی تھی، احترام کرتی تھی جبکہ تانیہ اور فرحان کے دل میں نفرت تو نہیں، شکایت رہتی تھی۔ وہ اپنے حساب اور مرضی سے جینے کے آرزو مند تھے، یہی وجہ تھی کہ انہیں زرتاشیہ کی طرف سے فکر لاحق تھی۔ وہ جلد از جلد زرتاشیہ اور فرحان کی شادی کرنا چاہتی تھیں زبیر احمد کو ان

کے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بس شاہدہ اور میاں افتخار کی طرف سے خاموشی تھی۔

☆☆...☆☆

خوب کھلے پانی سے بھنڈی اور سبز مرچ دھونے کے بعد، ٹوکری ترچھی کر کے پانی نکالنے کے لیے رکھی، ناشتے کے برتن اکٹھے کر رہی تھیں کہ عادل وہیں آگیا۔

”آج تو بہت سوئے ہو، تمہارے ابا خاصا بول کے گئے ہیں۔“ رفیعہ نے اس کے لیے پراٹھا بنانے کی غرض سے توا چولہے پر رکھا۔

”کہاں گئے ہیں؟“ وہ پیڑھی پر بیٹھے ہوئے بولا۔

”بستر پر پڑے پڑے تھک جاتے ہیں تو یار دوستوں کے پاس جا کر دل بہلا لیتے ہیں۔ آج تو سبزی بھی خود دے کر گئے ہیں۔“

”میں لے آتا سبزی۔“

”بس رہنے دو، گھوڑے بیچ کر سوئے ہوئے تھے۔ دن کے گیارہ بج رہے ہیں۔“ رفیعہ نے گویا اسے یاد دلایا۔

”صبح اٹھ کر بھی کیا کرنا ہوتا ہے مجھے کون سا ڈیوٹی پر جانا ہوتا ہے۔“ صبح صبح اس کا منہ زہر سے کڑوا ہو گیا۔

”اگر اپنے ابا کی بات مان لو تو بہتر ہے۔“ رفیعہ نے شوہر کی غیر موجودگی میں آہستہ سے کہا۔

”آپ بھی یہ چاہتی ہیں کہ میں اسٹور چلائوں۔ اتنا پڑھ لکھ کر صابن، سرف میں گنوا دوں۔“ وہ ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وہ نظریں چراگئیں، اور اس کا ناشتا بنانے میں مصروف رہیں۔

”بولیں نا امی۔“

انہوں نے خستہ پراٹھا اس کے سامنے رکھا اور بولیں۔

”بیٹا! کام چھوٹا بڑا نہیں ہوتا، اپنا اسٹور چلانے میں تعلیم ضائع تو نہیں ہو جائے گی بیکار بیٹھنے سے تو کچھ کرنا بہتر ہے دو ہزار بجلی کا بل، سات سو گیس کا بل کیسے اور کہاں سے بھرے جائیں گے۔ مہنگائی کا طوفان ہے، رات دن یہی فکر مجھے کھائے جاتی ہے۔ میں نے تمہارے ابا کو کبھی اپنا یہ فیصلہ نہیں سنایا، ان سے تو میں تمہاری وکالت کرتی ہوں۔“

”امی! تھوڑا سا انتظار۔“ وہ شرمساری سے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

”اور کتنا انتظار؟ بیٹا ہمیں اپنے لیے کچھ نہیں چاہیے ہم تو آج مرے کل دوسرا دن، مگر گھر کے حالات تمہارے لیے اب بدلنے چاہئیں، اگر آج افتخار اور شاہدہ شادی کی تاریخ دیدیں تو ہمارے پاس کیا ہے؟ تانیہ اس گھر میں، ان حالات میں کیسے آسکتی ہے؟“

رفیعہ نے اس طرح سمجھایا کہ وہ کچھ دیر کو چپ ہو گیا، پھر ایک دم بولا۔

”آپ رشتے سے انکار کر دیں، کیونکہ اگر تانیہ نے گھر اور حالات سے شادی کرنی ہے تو کوئی اور گھر ڈھونڈیں۔“

”عادل! یہ میری تربیت ہے یا لاڈ پیار کہ تم بڑوں کے فیصلے پر اس طرح بات کرو۔ تانیہ کے بارے میں آئندہ اس انداز میں بات نہ کرنا۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں۔ تو وہ ماں کے لیے دُکھی ہو گیا۔ پراٹھا، آملیٹ اپنی جگہ پر پڑے رہے اور وہ مردہ قدموں سے چل کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

ایک مرتبہ پھر بستر پر گر گیا۔ چت لیٹا چھت گھورنے لگا۔

”عادل ستار! یہ تم کس مقام پر آ گئے ہو، جہاں تمہاری خواہش اور انا کے علاوہ سب کچھ موجود ہے۔ افسری کا خواب ملیا میٹ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔

منزل اگر ایک جنرل اسٹور ہی تھا تو کیوں ان سڑکوں کی خاک چھانی جو کالج یونیورسٹی کو جاتی تھیں؟ دوسری طرف تانیہ ایک ایسا سچ ہے جس کی خواہش ہونے کے بعد بھی نامکمل سا احساس موجود ہے تانیہ کے لیے عادل ستار کی

اہمیت ہی کیا ہے؟ سونے کا بن کر بھی اس کا دل جیتنا مشکل کام ہے۔ یہ بات میں کس کس کو سمجھائوں؟“ بے دلی سے کروٹ لے کر آنکھیں موندیں تو چھم سے وہ تند خو قریب آ گئی۔ اس کے نمکین چہرے کا احساس بہت قریب محسوس ہونے لگا۔ وہ اس احساس کی گرفت سے خود کو نکال نہ سکا۔

”نہیں! عادل، تانیہ اب تمہاری زندگی کا استعارہ ہے اسے تو ہر طرح پانا ہے۔ غیرت و حمیت بھی کوئی چیز ہے۔ لطیف جذبوں کی بھی کوئی اہمیت ہے۔ تانیہ! سوری ڈیر تمہیں عادل کے لیے آنا ہے، میں ہر صورت تمہیں لا کر رہوں گا۔ کیونکہ اب تم مجھے ڈسٹرب کرنے لگی ہو، میرے ارد گرد گھومنے لگی ہو۔“

وہ کافی دیر مسرور سا کبھی خود سے اور کبھی تانیہ کے تصور سے باتیں کرتا رہا اور بہت سے مضبوط ارادے باندھتا رہا کہ اسے کیا کرنا ہے؟ کیونکہ اس نے

یہ جان لیا تھا کہ تیز طرار تانیہ اب اسے یاد آنے لگی ہے، یاد رہنے لگی ہے۔  
شاید اب اسے بھولنا یا بھلانا ممکن نہیں رہا تھا۔

”نو، نو مائی ڈیر“ سوری تم کو بھولنا اب ممکن نہیں۔“ دائیں سے بائیں کروٹ  
لیتے ہوئے وہ مسکرا کر بڑ بڑایا۔

ممکن جو اگر ہوتا

ہم تم کو بھلا دیتے

یادوں کو کفن دے کر

بے وقت سُلا دیتے

کٹ گرتی زباں اپنی

تم کو جو صدا دیتے

اس دل سے ترے دل تک

دیوار اٹھا دیتے

ممکن جو اگر ہوتا

ہم تم کو بھلا دیتے

تانی ڈیر! ممکن جو اگر ہوتا ہم تم کو بھلا دیتے۔“

سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔

☆☆...☆☆

میاں جی کو کمرے میں تنہا دیکھ کر وہ فوراً ان کے پاس چلا آیا۔ وہ ٹی وی پر  
حالات حاضرہ کا کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے، اور اتنے محو تھے کہ انہیں  
فرحان کے آنے کا احساس نہیں ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ بابا کو اس قسم کے  
پروگراموں سے خاص دلچسپی تھی۔ اس لیے وہ ان کی پشت پر کچھ دیر کھڑا رہا  
تو عین اسی وقت بجلی چلی گئی۔



”اوشٹ! بجلی کو بھی ابھی جانا تھا۔“ وہ خود سے بے اختیار بولے جبکہ فرحان نے دل میں شکر ادا کیا کہ اب وہ بابا سے بات کر سکے گا، مگر ابھی

وہ ان سے اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ

”بابا! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

تانیہ اور شاہدہ بیگم آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں۔ تانیہ حسب معمول تڑپتا رہی تھی، اور شاہدہ حسب معمول مٹھاس میں ڈوبی اس کو سمجھا رہی تھیں وہ دونوں کچھ نہ سمجھے۔

”تانیہ! ہر چیز زندگی کا حصہ ہے، بجلی کوئی ہمارے ہی گھر کی نہیں جاتی، برداشت کرو۔“ وہ نرمی سے کہہ کر شوہر کے برابر بیٹھ گئیں۔

”معلوم ہے مجھے، لیکن یو پی ایس اور جنریٹر کا استعمال تو لوگ کر رہے ہیں۔“ تانیہ بھنائی۔

”جنریٹر کا شور اور خرچ ناقابل برداشت ہوتا ہے اور یو پی ایس تو ناپائیدار ہے۔“ شاہدہ نے دھیرے سے کہا۔

”یہ آپ نہیں، نانو بول رہی ہیں، مگر مجھے کچھ نہیں معلوم مجھے جنریٹر چاہیے۔“ تانیہ چلائی۔

”تانیہ بات کیا ہے، کچھ پتا تو چلے۔“ میاں افتخار نے پوچھا۔

”افتخار! آپ جانتے ہیں کہ اماں جان کو جنریٹر کا شور پسند نہیں ہے، اور وہ

کبھی یہ پسند نہیں کریں گی۔ میں اسے سمجھا رہی ہوں کہ لوڈشیڈنگ بھی برداشت کرنی چاہیئے، اگر یہ فرمائش پوری کرتی ہوں تو گھر میں جنگ شروع ہو جائے گی۔“ شاہدہ نے نرمی سے میاں جی کو بتایا۔ وہ کچھ نہ بولے ان سے پہلے فرحان بول اٹھا۔

”ماما! کچھ ہماری ضرورت اور خوشی کا بھی خیال کر لیا کریں، آخر ہم آپ کی اولاد ہیں۔“ فرحان تو شاید پہلے سے خار کھائے بیٹھا تھا، ایک دم بھڑک اٹھا تانیہ کو شے مل گئی۔

”ہنہ! ہماری ضرورت اور خوشی ان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتی اس آسیب زدہ حویلی میں ہم رہ رہے ہیں یہ بک نہیں سکتی۔“

”آسیب زدہ! بیگم آپ نے تو کبھی نہیں بتایا کہ حویلی آسیب زدہ ہے۔“  
 میاں جی نے ماحول ٹھنڈا کرنے کی غرض سے مزاح کا سہارا لیا، مگر شاہدہ  
 بیگم تو نم آلود آنکھوں کو آنچل سے صاف کر رہی تھیں۔  
 ”ماما کیا بتائیں گی؟“ تانیہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”آپ یوپی ایس لگوادیں، ورنہ یہ لڑکی ہر ایک گھنٹے بعد طوفان کھڑا رکھے  
 گی۔“ وہ رقت آمیز لہجے میں میاں جی سے بولیں۔

”جو حکم میری سرکار! مگر اماں جان کا مقابلہ آپ کریں گی۔“

”افتخار! کبھی سیریس بھی ہو جایا کریں۔“ وہ ناراض ہو کر بولیں تو میاں جی  
 قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔ فرحان کچھ کہہ نہ سکا، اس لیے بنا کچھ کہے کمرے  
 سے باہر چلا گیا۔ میاں جی کو بھی خیال نہیں رہا کہ فرحان سے پوچھ لیتے کہ  
 وہ کیا بات کرنے آیا تھا۔ انہیں تو بیگم کا حکم ملا اور وہ اٹھ کر باہر چل دیئے  
 یوپی ایس لگوانے کے لیے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ نہ شاہدہ بیگم کے  
 پاس اور نہ میاں افتخار کے پاس شاہدہ نے بظاہر تو شوہر کو بھیج دیا تھا مگر اندر

سے وہ پریشان بھی تھیں کہ اس بات کو اماں جان کبھی پسند نہیں کریں گی۔  
 وہ تو بجلی کے ہونے پر بغیر پنکھے کے، بغیر روشنی کے گزارا کر لیتی ہیں۔ رات  
 دن بجلی کے بلوں پر چیختی چلاتی ہیں تو اب اس خرچے کو وہ فضول خرچی کا  
 نام دیں گی۔ شاہدہ بیگم نے کچھ سوچنے کے لیے آنکھیں موند لیں۔

☆☆...☆☆

”سامعہ! سامعہ۔“ جب کئی آوازوں پر بھی وہ کچن سے باہر نہ نکلی تو صائمہ  
 نے مسز جیری کو کچن کا راستہ دکھادیا وہ رات کا کھانا پکانے میں منہمک تھی،  
 مسز جیری دبے قدموں سے اس کے پیچھے جا کھڑی ہوئیں اور دھیرے سے  
 اس کا کان دبایا تو وہ ڈر گئی۔ بے اختیار منہ سے چیخ نکلی۔

”اوئے تم تو چڑیا کے مافق ہو ایسے ڈر جاتی ہو۔“ مسز جیری نے ہنس کر  
 خوفزدہ سی سامعہ کو اپنے گلے لگا لیا۔

”او، آپ نے مجھے ڈرا دیا۔“ وہ سانس ہموار کرتے ہوئے بولی۔

”مگر تم کو ڈرنے کا نہیں، ابھی تو بہت کچھ ہونا باقی ہے۔“ مسز جیری نے محبت پاش نگاہوں سے دیکھا۔

”ہاں! آپ ہیں نا میرے ساتھ۔“

”کدھر! ہم تو زیادہ سے زیادہ ایک دو مہینہ ادھر ہے۔“

”کیوں؟ کس لیے؟“ وہ تقریباً رو دی۔

”ارے بچہ! ریٹائرمنٹ آرڈر آگیا ہے، اب تم جلدی سے اپنے گھر جاؤ تاکہ ہم خوشی خوشی پاکستان سے جائیں۔“

”یہ خواب تو میں ہر وقت دیکھتی ہوں، مگر تعبیر کسے معلوم کیا ہو؟“ وہ رنجیدہ ہو گئی۔

”تم جتنا جلد ہو، اپنے گھر جاؤ، فرحان کو بولو، اب بہادری دکھائے۔“

اس نے لمبا سانس بھرا اور ان کو کرسی پر بٹھا کر خود سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”مسز جیری! فرحان بہادر ہے، سچا ہے وہ میرا پورا سچ ہے، آپ یہ بتائو کالج کے معاملات کیسے چل رہے ہیں؟“

”ایک دم فائن، بس سب تمہارے واسطے الٹا سیدھا بولتے ہیں جو ہم کو اچھا نہیں لگتا، بس تمہاری وجہ سے چپ کر جاتے ہیں۔“

”تھینک یو مسز جیری!“ اس نے محبت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”مگر، ایسا کتنے دن چلے گا، فرحان کیا بولتا ہے اس کے بابا نے تمہارے واسطے کیا کیا؟“ وہ متفکر تھیں۔

”کوشش کر رہے ہیں، حالات کنٹرول میں آئیں تو بہتری ہوگی۔“ ڈبکیاں کھاتے دل کے ساتھ وہ انہیں بہلانے کو بولی۔ مگر مسز جیری کی بوڑھی آنکھوں میں جانے کیسا خوف اور بے بسی تھی سامعہ جلدی سے انہیں کچن سے باہر اپنے کمرے کی طرف لے آئی۔

”او سامعہ! پتہ نہیں کیوں ہمیں ایک دم تمہارا بہت فکر ہونے لگتی ہے، ہم چلا جائے گا۔ مگر تمہارا کیا ہوگا؟“ مسز جیری تقریباً رندھے ہوئے گلے میں بولیں۔

”سب ٹھیک ہے، سامعہ پہلے بھی حالات سے لڑتی آئی ہے، اب تو فرحان کی بے پناہ محبت میرے ساتھ ہے میں اس کی محبت کے لیے خود کو آزمانا چاہتی ہوں وہ نہیں چاہتا کہ میں جاب کروں تو میں ریزائن کر دوں گی۔“

وہ اپنے کمرے میں لے جا کر بہت محبت سے انہیں صوفے پر بٹھا کر خود دوزانوں ان کے سامنے فرش پر بیٹھ گئی۔

”او گاڈ! خدا کے واسطے ریزائن اس وقت تک نہ کرنا“ جب تک تم اس گھر میں ایڈجسٹ نہ کر جاؤ۔“

”اوکے! ایسا ہی کروں گی، فی الحال کوشش کرتی ہوں کہ ایک ماہ کی چھٹی اور منظور ہو جائے۔“

”بٹ، جو کرنا ہے جلدی کرو۔“

”اوکے! اب آپ آرام سے بیٹھیں، کھانا تقریباً تیار ہے میں لے کر آتی ہوں۔“

”نہیں ڈارلنگ! بالکل بھوک نہیں ہے، اب جانا، گاڈ بلیس یو، وہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں سامعہ ان کے ہاتھ تھام کر بالکل قریب کھڑی ہوئی تو ضبط نہ ہوا، آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ایسا لگا کہ ماں سامنے کھڑی ہے۔

”نو، نو مائی چائلڈ! رونا نہیں، مسز جیری تمہاری ماں اور فرینڈ ہے، بے فکر ہو، کہیں بھی جائوں تم کو پاس بلوا سکتی ہوں۔“ انہوں نے اسے بانہوں میں بھر لیا، مگر وہ مزید تاب نہ لاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

مسز جیری اسے تسلیاں دیتی رہیں... پیار کرتی رہیں۔ دروازے میں کھڑی صائمہ کی پلکیں بھی بھیگ گئیں۔ جیسے ہی ان دونوں کی نظر اس پر پڑی تو وہ

مسکرا دی بس پھر تو مسز جیری کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ صائمہ نے کھانے کے بغیر ہلنے ہی نہ دیا۔ ہلکی پھلکی گپ شپ میں کھانا کھایا گیا کھانے کے فوراً



بعد گلزاری چائے کا پوچھنے آئی تو مسز جیری نے معذرت کر لی اور رخصت ہو گئیں۔

ان کے جانے کے بعد وہ کچھ اداس سی ہو گئی تو صائمہ نے تسلی آمیز انداز میں اسے مسکرا کر کہا۔

”سب تمہارے ساتھ ہیں، کیوں فکر کرتی ہو۔“ صائمہ کے کہنے پر اس نے وہ سب بتادیا جو باتیں مسز جیری سے ہوئیں۔ صائمہ خود حقیقت پسند تھی، وہ مسز جیری کے خدشات اور سامعہ کی منتظر نگاہوں کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھی مگر وہ بھی فرحان اور میاں جی پر بھروسہ کیے ہوئے تھی۔

☆☆...☆☆

کافی دیر سے مسلسل ٹھک ٹھک کی آوازیں آرہی تھیں۔

بڑی بیگم نے ظہر کی نماز کی چار رکعتیں پڑھ کر جو نہی سلام پھیرا تو ڈرل مشین کی آواز آنے لگی غم و غصے سے وہ چلا اٹھیں۔ زرتاشیہ جو کہ سوئی ہوئی تھی وہ بھی جاگ گئی۔ ناجی پہنٹی ہوئی کمرے میں حاضر ہو گئی۔

”یہ گھر میں کیا ہو رہا ہے؟“

”وہ، وہ دو مستری آئے ہیں کوئی مشین لگانے۔“

”مستری! کیسی مشین؟“ ان کی حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

”مجھے کیا پتا؟ میاں جی کو پتا ہوگا یا بیگم صاحبہ کو۔“ ناجی نے تڑک کر کہا۔

”تو، تو بھولی ہے، تجھے سب معلوم ہوتا ہے۔ چل بلا میاں جی کو۔“ انہوں نے اسے اچھی طرح سنا کر بھیجا۔

”دادو! آپ اطمینان سے نماز پڑھ لیں، ہونے دیں جو ہو رہا ہے۔“ زرتاشیہ نے دھیرے سے کہا۔

”ارے بچی! یہ سب منٹوں میں اس گھر کو کھنڈر بنا دیں اگر میں خیال نہ رکھوں تو۔“ وہ بڑی نرمی سے بولیں اسی اثنا میں میاں جی اور شاہدہ بیگم آگئے۔

”اے میاں! یہ کیا ٹھک ٹھک لگا رکھی ہے۔ کیسا شور ہے؟“

میاں جی پر وہ ایک دم حملہ آور ہوئیں تو وہ کچھ سٹیٹائے اور بیوی کو دیکھا۔  
شاہدہ بیگم سمجھ گئیں اس لیے خود بولیں۔

”اماں جی! لوڈشیڈنگ کی وجہ سے یو پی ایس لگوا رہے ہیں تاکہ پنکھے ہی چل سکیں۔“

”یہ یو پی ایس کس کا بلا کا نام ہے؟ اور بجلی کا بند ہونا کون سی اچھنبے کی بات ہے۔“

”آپ نماز پڑھ لیں پھر سمجھاتا ہوں۔“ میاں جی نے بہت سمجھ داری سے کام لیا وہ واقعی جلدی سے نماز پڑھنے میں محو ہو گئیں میاں جی تو وہاں سے کھسک گئے البتہ شاہدہ بیگم زرتاشیہ سے دھیرے دھیرے باتیں کرنے لگیں۔

مگر جو نہی نماز پڑھ کے فارغ ہوئیں تو فوراً شاہدہ بیگم کو گھیر لیا۔

”ہاں! اب بتائو کیا ہو رہا ہے اس گھر میں بنا ہماری اجازت کے۔“

”اماں جان! بجلی کی لوڈشیڈنگ بہت ہو رہی ہے اس لیے ایک ایسا سسٹم لگوا رہے ہیں جس سے بجلی کے جانے کے بعد خود بخود بجلی آجائے گی۔“ شاہدہ بیگم نے انہیں بہت سادہ سے انداز میں سمجھایا۔

”مگر بی بی! ایسی بھی کیا نزاکت، کیا بجلی کے بغیر پہلے لوگ نہیں رہتے تھے بجلی، بجلی سب کے ذہنوں پر طاری ہو گئی۔ کھلی ہوا میں بیٹھا کرو، برداشت کی عادت ہونی چاہیے۔“ انہوں نے پھر بھی خوب لتاڑا۔

”پہلے لوگ عادی ہوتے تھے، اب عادت نہیں رہی اور ہزار مسئلے ہیں بچوں کو پڑھنا ہے۔“ شاہدہ بیگم نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں جواب دیا۔

”یوں کہو، تمہارے بچوں نے شوشہ چھوڑا ہے انہیں ہی یہ چونچلے سو جھتے ہیں ان کا بس چلے تو چاند تاروں کو ہاتھ لگائیں تم کو اولاد کی تربیت کرنی نہ آئی۔“ وہ جلی کٹی سنا کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

”پھوپو جانی!“ زرتاشیہ نے پکارا۔

”جی پیٹا!“

”آپ محسوس نہ کریں، دادو بس اوپر اوپر سے سخت ہیں۔“ زرتاشیہ نے خاموش سی پھوپو کی دل جوئی کی خاطر کہا۔

”جانتی ہوں وہ اماں جان ہیں غلط نہیں کہتیں مگر شاید غلط میں بھی نہیں ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولیں۔

”اچھا! یہ بتائیے پپا کا فون آیا ہے کیا...؟“

”میرا خیال ہے کہ نہیں، ورنہ ناجی یا اماں جان ضرور آپ کو بتا دیتیں۔“

”ہنہ! دراصل میرا فون رات سے بند تھا۔ پپا نے شاید میرے نمبر پر ملایا ہو۔“ وہ کچھ سوچ کر بولی۔

”تو پریشانی کی کیا بات ہے، آفس گئے ہیں آنے والے ہوں گے، ورنہ خود فون کر لو۔“ شاہدہ بیگم نے اس کے ریشمی بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”بس پپا کے لیے ہر وقت دُکھ سا لگا رہتا ہے۔“ وہ اداس ہو گئی۔

”میرا بھائی اپنی اچھائی کی سزا بھگت رہا ہے نرگھس کو کبھی اس کا خیال نہیں رہا۔ اس کی تو چھوڑو، آپ کی بھی پروا نہیں ہے، اولاد تو ماں کی کمزوری ہوتی ہے۔“

شاہدہ بیگم نے کہا تو زرتاشیہ کے اندر کٹر واہٹ کا نیا بیج پھوٹا وہ تلخی سے بولی۔

”مجھے لگتا ہے میں صرف پپا کی بیٹی ہوں۔“

”خیر ابھی ایسے نہیں سوچتے، نرگھس کو آپ کا بہت خیال آئے گا۔ بس انتظار کرو۔“ انہوں نے بہت دلار سے کہا تو بے یقینی کی حالت میں وہ صرف انہیں دیکھتی رہی بولی کچھ نہیں، پلکوں سے آنسو ٹوٹے اور ریشمی بالوں میں جذب ہو گئے۔ شاہدہ بیگم اٹھ کر باہر گئیں تو وہ بہت مضطرب سی ہو کر اٹھ بیٹھی دل تڑپنے لگا، مچلنے لگا بے تاب سے موبائل فون کی طرف دیکھا اور پھر پھوٹ پھوٹ کے رو دی پتا ہی نہ چلا کہ کب پپا کمرے میں آگئے۔

”زرتاشیہ! پپا کو صدمہ دینا پسند ہے آپ کو۔“

”وہ‘ نہیں پپا اللہ نہ کرے۔“ وہ ہکلائی، بہتے آنسوؤں کو جلدی سے صاف کیا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئے، اس کا سر سینے سے لگا لیا۔

”میری طرف سے بیٹا آپ پر کوئی پابندی نہیں ہے آپ جب چاہو فون کرو، ملنے جانا چاہو تو ضرور جاؤ، میں جہاز کی سیٹ بک کرادوں گا۔ مگر یوں چھپ چھپ کر رونے سے مجھے مجرم مت ثابت کرو۔“

”او، مائی سوئیٹ پپا! ایسا کچھ نہیں ہے میں تو آپ کو فون کرنا چاہتی تھی آج آپ نے آفس سے فون نہیں کیا، میں پریشان تھی۔“ وہ جلدی جلدی بولی۔

”میری بیٹی کی آنکھوں میں جو کربناک سچ چھپا ہے، وہ پپا دیکھ سکتے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

”اچھا، آپ نے کھانا کھالیا۔“ وہ ٹال گئی۔

”نہیں، ابھی اماں جان کھانا لگوا رہی ہیں۔ آپ نے کھالیا۔“ انہوں نے پوچھا۔

”ہنہ! دادو نے خود میری فیورٹ سلاد اور چکن نگیس بنائے تھے اور اپنے ہاتھوں سے کھلائے ہیں۔“ اس نے خوش ہو کر بتایا۔

”واہ! مزے ہیں آپ کے۔“ زبیر احمد خوش ہو گئے ان کی خوشی زرتاشیہ کی خوشی میں تھی۔

”آپ کپڑے چینج کر کے کھانا کھالیں، تین بج رہے ہیں۔“

”او کے! بس میں اپنی بیٹی کے پاس بیس منٹ میں آتا ہوں۔“ وہ جانے کے لیے اٹھے اور پھر رک کر بولے۔

”اور ہاں آج شام میں ڈاکٹر صاحب سے اپائنٹمنٹ ہے، ایکسرے بھی کروانا ہے۔“ وہ یاد دہانی کرا کے باہر گئے۔

☆☆...☆☆



صحن میں خوب اچھی طرح چھڑکائو کے بعد ناجی نے تمام گملوں کو کیاریوں کو پانی دیا تخت پوش تبدیل کیا کرسیوں کو ترتیب سے رکھا، پیڈسٹل فین لگایا۔ اور بڑی بیگم کو اطلاع دی۔ انہوں نے آگے اسے

ایک کام بتا دیا اور پوچھا۔

”اسٹور سے اچار کے سارے مرتبان نکالو اور اچھی طرح دھو کر رکھو، صبح دھوپ لگانی ہے اچار نہیں ڈالنے کیا؟“

”ابھی اچار کا سامان تو آیا نہیں جب آئے گا تو مرتبان نکال لوں گی۔“ ناجی نے خاصی ناگواری کا مظاہرہ کیا مگر وہ تو برس پڑیں۔

”اری اللہ کا فضل ہے کل سامان بھی آجائے گا لسوڑے، آم، اور مریچ لیموں کا اچار ہمیشہ ہی ڈلتا ہے کیوں بھول جاتی ہے تو...؟“

”توبہ ہے بڑی بیگم آپ تو بس۔“ وہ بھنا کر آگے بڑھ گئی۔

”ہاں، ہاں تو بھی بولی، تیرے بھی پر پرزے نکل گئے ذرا سا کام آجائے تو نحوست ڈال دیتی ہے کبھی ہنسی خوشی کسی کام کو شروع نہیں کرتی۔“ اس کے جانے کے باوجود وہ زور زور سے بولتی چلی گئیں میاں جی اور شاہدہ بیگم وہیں آگئے۔

”ارے اماں جان! خیریت ہے یہ کس کا ذکر خیر ہو رہا ہے؟“ انہوں نے دانستہ پوچھا۔

”ارے ایک ہی سر چڑھی ہے اس گھر میں جسے تم دونوں نے اپنی اولاد کی طرح بگاڑ کے رکھ دیا ہے۔ ذرا سا کام بتادوں منہ لٹک جاتا ہے۔“ تخت پوش کو ہاتھوں سے سیدھا کرتے ہوئے بولیں۔

”اماں جان! ناجی تو بہت کام کرنے والی ہے، آپ اس سے خفا نہ ہوا کریں، وہ تو آپ کی آپ کے انتظام کی بہت تعریف کرتی ہے۔“ میاں جی نے حسب عادت ناجی کو حفاظتی قلعے میں بند کر دیا۔

”خاک تعریف کرتی ہوگی، میرے سامنے تو ترنی بہ ترکی جواب دیتی ہے۔“  
انہوں نے کچھ کچھ لہجہ نرم کیا۔

”سامنے تو وہ تھوڑا سا ناز کر لیتی ہے، لاڈ کرتی ہے آخر اس غریب کا ہے  
ہی کون؟“ میاں جی نے اخبار اٹھاتے ہوئے کہا۔

”آپ کو تو اس کی شادی بھی کرنی ہے۔“ شاہدہ نے کہا تو وہ جھٹ کچھ یاد  
کر کے بولیں۔

”ہاں! ہاں لیکن پہلے جن کی کرنی ہے، ان کی طرف سے تم دونوں نے چپ  
سادھ رکھی ہے۔“

”آج چائے کا نانہ ہے کیا؟“ میاں جی قطعاً سنی ان سنی کر گئے۔

”ہاں! آئے ہائے توبہ ہے بھئی یہ یادداشت بھی بالکل جواب دیتی جا رہی  
ہے۔“ اماں جان ماتھا پیٹ کر جلدی سے چائے بنانے چلی گئیں تو وہ دونوں  
ایک دوسرے کو چور نظروں سے دیکھنے لگے۔

”افتخار! کب تک اماں جان کو ٹال سکتے ہیں آپ۔“ شاہدہ بیگم نے آہستہ سے  
پوچھا۔

وہ توقف کے بعد کچھ مزید سوچتے رہے اور پھر بولے۔

”پھر کیا کرنا چاہیے؟“

”آپ فرحان سے بات کریں، اب نرگس کے جانے کی وجہ سے اماں جان کو  
زرتاشیہ کی زیادہ پریشانی ہے، زبیر بھی ٹینس ہے، میرا خیال ہے پہلے فرحان  
کی شادی کر دیتے ہیں۔“ شاہدہ بیگم نے اپنی دانست میں بڑا معقول حل پیش  
کیا۔ جس پر میاں افتخار ہکھلانے لگے۔

”مہ، کیا؟ شادی دونوں بچوں کی اور الگ الگ۔“

”تو کیا ہوا؟ تانیہ کی تو ابھی تعلیم جا رہی ہے، ویسے بھی تانیہ تو اتنی آسانی  
سے راضی نہیں ہوگی۔ میرا خیال ہے فرحان...“

”آں، آں اماں جان آرہی ہیں۔“ میاں جی نے جلدی سے شاہدہ بیگم کا جملہ اچک کر باورچی خانے سے آتی ہوئی اماں جان کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی۔ شاہدہ بیگم فوراً خاموش ہو گئیں۔

”افتخار میاں! کل اچار کے لیے سرسوں کا تیل اور مسالے یاد سے لانے ہیں تیل میں ہیک نہ ہو، اور مسالے بھی پرانے نہ ہوں۔“ انہوں نے چائے کی ٹرے رکھتے ہوئے کہا تو میاں جی نے اطمینان بھری سانس لی اور جلدی سے بولے۔

”آپ بس لسٹ بنادیں۔“

”لسٹ تو میں ابھی بنادوں گی، بس کل سامان آنا چاہیے۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں۔“ شاہدہ بیگم کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے وہ بولے۔

”اور یہ فرحان، تانیہ ابھی تک چائے کے لیے نہیں آئے۔“

”وہ، شاید گھر میں نہیں ہیں۔“ شاہدہ بیگم نے بہت آہستہ سے کہا۔

”اوہ! ہم بھول جاتے ہیں وہ تو دونوں مادر پدر آزاد ہیں۔“ انہوں نے ایک کپ چائے زرتاشیہ کے لیے بنائی اور دو تین بسکٹ پلیٹ میں رکھ کے اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

”ویسے بیگم صاحبہ تانیہ کہاں ہے؟“ میاں افتخار نے ان کے جانے کے بعد پوچھا۔

”اسے لا بھریری جانا تھا۔“

”وہ بھی خرم کے ساتھ۔“

”ہاں شاید۔“ وہ کچھ طنزیہ بولیں۔ تو میاں افتخار نے دانستہ خاموشی اختیار کر کے اخبار نظروں کے سامنے کر لیا۔

☆☆...☆☆

رات کے کھانے کے بعد گلریز کی عادت تھی کہ وہ لان میں چہل قدمی کے لیے نکل آتے تھے کبھی کبھی انجم ساتھ ہوتیں کبھی افراسیاب باپ کا ساتھ نبھاتا، لیکن عموماً وہ اکیلے ہی تقریباً گھنٹہ بھر چہل قدمی کر کے اندر آتے تھے آج بھی وہ باہر نکلے تو پیچھے سے نذیر نے آکر اطلاع دی ٹیلی فون سننے کی۔ وہ واپس پلٹے یہ سوچ کر کہ کوئی ایسا آدمی فون کر رہا ہے جس کے پاس موبائل فون نمبر نہیں ہے۔ ٹی وی لائونج میں فون ہولڈ پر تھا۔ انجم باہر تھیں، نرگس ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھی۔

”ہیلو!“ وہ بولے۔

”ہیلو! گلریز بیٹا کیسے ہو؟“ دوسری طرف بڑی بیگم کی آواز تھی، گلریز ٹھٹکے۔ نرگس کی طرف دیکھا سمجھ گء یکہ فون کیوں آیا ہے؟

”جی، جی خالہ جان بالکل ٹھیک ٹھاک، آپ سنائیں کیا حال چال ہے؟“ وہ خوش دلی کا مظاہرہ کرنے کے لیے کافی کھنک دار لہجے میں بولے۔

”ارے میاں! ہمارے حال تو اپنی بہن سے پوچھو جس نے ہمیشہ خراب ہی کیے کیسے بھائی ہو پوچھا بہن سے کہ بی بی گھر بار چھوڑ کے بیٹی، شوہر کو چھوڑ کے کیوں آئی ہو؟“ بڑی بیگم نے اچھے خاصے تند لہجے میں شکوہ کیا۔

”جی، وہ میں مصروف تھا۔ آج ہی زمینوں سے آیا ہوں، ابھی پوچھتا ہوں، آپ فکر نہ کریں، زبیر احمد اور زرتاشیہ بیٹی کیسے ہیں؟“ خلاف عادت گلریز صاحب کو جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔ حالانکہ وہ دو دن سے یہیں تھے مگر ضدی نرگس سے بات نہیں کی تھی۔ یہ بھی ان کی سرزنش کا انداز تھا، جسے نرگس بھی خوب سمجھتی تھی مگر پھر اڑی ہوئی تھی۔

”میاں! اب فرصت نکال کر بات کرلو کیا چاہتی ہیں بہو بیگم، باقی میرے زبیر احمد کو دل کا مریض تو بنا دیا ہے۔ رہی بات زرتاشیہ کی تو اس کے پیر پر پلستر چڑھا ہے۔ وہ ماں کی بے حسی سے کمہلا کے رہ گئی ہے۔“

”کیا؟ زرتاشیہ کے پائوں پر پلستر کیوں؟“ گلریز صاحب کو شاک لگا نرگس کے کانوں میں آواز پڑی تو اٹھ کر ان کے قریب آگئی۔



”پھسل گئی تھی، اللہ کا کرم ہو گیا ہڈی ٹوٹی نہیں۔“

”اوہ! خالہ جان! میں شرمندہ ہوں، میں ابھی بات کرتا ہوں زرتاشیہ سے۔“

”چھوڑو میاں! اصل مسئلہ پہلے حل کرو، نرگھس سے دو ٹوک پوچھ لو، ادھر یا

ادھر بس، یہ درمیان میں لٹکتے لٹکتے تو میرے بچے کی جوانی بڑھاپے میں بدل گئی۔“ انہوں نے اپنے روایتی سخت لہجے میں کہا۔

”آپ پلیز میری زرتاشیہ سے بات تو کرا دیں۔“

”اس کی ماں کے پاس بیٹی کا نمبر تو ہوگا“ لے کر ملاؤ اور بات کرلو، ہم اسے نہیں کہہ سکتے اور ہاں اسے یہ پتا بھی نہ چلے کہ ہم نے تم سے بات کی ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”جی بہتر۔“ وہ انتہائی سعادت مندی سے بولے۔ بڑی بیگم کا فون بند ہوا تو گلریز صاحب کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے نرگھس کو گھورا اور پھر بولے۔

”سنا تم نے، تمہاری اکلوتی بیٹی بستر پر پڑی ہے، پلستر چڑھا ہے اس کے پیر پر۔“ وہ کچھ پریشان ہوئی مگر پھر فوراً سنبھل کر بولی۔

”مجھے الہام تو نہیں ہوتا۔“

”ماں کو اولاد کے لیے الہام ہی ہوتا ہے، مگر تم جانے کیسی ماں ہو؟“ گلریز صاحب نے خاصے غصیلے لہجے میں جواب دیا تو وہ بگڑ کر بولی۔

”بڑے بھیا! یہ آج جو ان کو فون کرنے کی ضرورت پڑی، پہلے بھی تو کر سکتی تھیں وہ زبیر احمد ماں، بہن کا دم بھرتے ہیں انہیں توفیق ہوئی کہ وہ مجھے فون کرتے۔“

”نرگھس! کبھی اپنے میرے رشتے پر غور کیا ہے۔ ہم بہن بھائی، ہمارے بھی ماں باپ تھے، زبیر احمد کو دنیا ہی نہیں دین بھی چاہیے اگر تم اپنے اندر رشتے سمو نے کا فن سیکھ لو تو زندگی جنت بن جائے مگر تم تو رشتوں کو چبا چبا کر تھوکتی ہو۔“ زبیر احمد کے لیے گلریز صاحب کے دل میں بہت احترام

تھا۔ ان کے منہ سے یہ باتیں سن کر وہ بجھ سی گئی۔ لہجے میں رقت طاری ہو گئی۔

”آپ کو بہن ہی میں ہزار کیڑے نظر آتے ہیں آپ نے اگر مجھے سپورٹ دی ہوتی تو حالات مختلف ہوتے۔

”ادھر آؤ بیٹھو۔“ گلریز صاحب نے اس کو جھٹکے سے کھینچ کر صوفے پر بٹھایا اور خود سامنے بیٹھ کر اسے گھورتے ہوئے بولے۔

”مثلاً کیا سپورٹ نہیں کیا، اور کیا کرنا چاہیے تھا؟ تمہیں گھر آباد کرنے شوہر کے حقوق فرائض سکھانے کی تعلیم دے کر بھیجا، جو دینا چاہا اس خود دار شخص نے لینے سے معذرت کر لی، ایک معقول گھر، معقول آدمی اچھے طریقے سے گھر چلا رہا تھا پھر ہم کیا کرتے؟ تمہیں کہتے گھر چھوڑ کر آجائو یا اس پر مقدمہ دائر کر دیتے بولو، بتائو کیسی سپورٹ چاہیے تمہیں۔ اس پر مقدمہ کرنا ہے تو بولو، وہ شریف آدمی تو مقدمے کی نوبت نہیں آنے دے گا۔ تم بولو، صاف بتائو کیا چاہتی ہو؟“

غم و غصے سے گلریز صاحب کے منہ سے کف نکلنے لگا۔ چہرہ متمتا اٹھا بولتے بولتے آواز اتنی بلند ہو گئی کہ انجم اور افراسیاب بھی فوراً وہیں آگئے اور دونوں سمجھ گئے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟

”آپ اٹھیں اپنے کمرے میں جائیں آرام کریں، مسئلے کا حل غصہ نہیں ہے۔“ انجم نے نہایت سنجیدگی سے گلریز صاحب کو مخاطب کیا۔

”مسئلہ ہے نہیں انجم، آپ کی نند صاحبہ نے مسئلہ شادی کے چند دن بعد سے بنا دیا ہے۔ اس سے پوچھ لو“ جو چاہتی ہے وہی ہوگا۔“

وہ دو ٹوک الفاظ میں کہہ کر تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ افراسیاب بھی باپ کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ جبکہ انجم نے نرگھس کے پاس بیٹھ کر کہنا شروع کیا۔

”نرگھس! فیصلے سوچنے آسان ہوتے ہیں، ان پر عمل کے بعد اکثر اوقات عمر بھر کے پچھتاوے ملتے ہیں... آپ کے بڑے بھیا ٹھیک کہہ رہے ہیں بات تو کچھ بھی نہیں ہے۔ زبیر احمد کے لیے منفی سوچ سوچ کر خود مسئلہ بنا دیا ہے۔

یقین رکھو وہ شخص جیسا تم کہو گی منٹوں میں کر گزرے گا۔ مگر صرف زرتاشیہ کے بارے میں سوچو وہ بچی کیا کرے گی؟“

وہ ایک دم بولی۔ ”زرتاشیہ کو اگر ماں کے پاس رہنا ہوگا تو ٹھیک ورنہ رہے اپنے باپ کے پاس۔“

”اچھا! اس سارے منظر میں تمہارے لیے کیا ہے، کوئی دوسرا راستہ، منزل کوئی نیا خواب۔“ انجم نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”بھابی! ابھی کچھ نہیں ہے، لیکن زبیر احمد بھی میری ضرورت نہیں ہے، میں نے اس خشک بور آدمی کے ساتھ جتنا عرصہ بھی گزارا ہے وہ بے رنگ اور بدمزہ ہے۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ انجم اس کی ذہنیت پر بڑی دیر بیٹھی کڑھتی رہیں۔

ظنظ

رات کو زرتاشیہ کا ڈاکٹر نے پلستر اتار دیا تھا۔ اب وہ دھیرے دھیرے تھوڑا سا چل سکتی تھی۔ ایکسرے رپورٹ کے مطابق ٹخنہ اپنی اصل جگہ پر کام کر

رہا تھا۔ بس دو ہفتے چند دوائیں جاری رکھنے کی ہدایت تھی۔ نرم اور فلیٹ جوتا پہننے کی سخت تاکید تھی۔ زبیر احمد خوش ہو گئے اسے گلے لگا کر جیب سے ہزار کا نوٹ نکال کر صدقہ دیا۔ اسے اس کی من پسند آئس کریم کھلائی ڈھیر ساری شاپنگ کرائی تھی۔

وہ رات تو بڑی بیگم کے پاس رہی، مگر صبح ناشتے سے پہلے ہی اس نے دادو سے اجازت لے کر ناجی کے ساتھ اپنے گھر کا رخ کیا۔ شاہدہ بیگم اور میاں جی نے بہت روکا۔ لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا۔

”آج پپا کا آف ہے، میں پپا کے لیے خود ناشتہ بنائوں گی۔“

سب مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ البتہ ناجی کو اس کے ساتھ ساتھ رہنے کی ہدایت کر دی گئی۔

شاہدہ بیگم کو اپنی کولیگ کے گھر اس کے والد کی تعزیت کے لیے جانا تھا میاں جی کی بھی چھٹی تھی، مگر حسب معمول انہیں تیار ہونا پڑا، شاہدہ بیگم کو

جانا تھا۔ اماں جان نے وقت پر ناشتا میز پر لگادیا۔ فرحان اور تانیہ حسب عادت غائب تھے۔ وہ دونوں جلدی جلدی ناشتا کر کے نکل گئے۔

فرحان تیار ہو کر نکلا تو ناجی کو آواز دینے لگا۔

بڑی بیگم نے باورچی خانے سے نکل کر اس سے کہا۔

”ارے! کیوں ناجی ناجی چلا رہے ہو؟“

”گاڑی کی چابی کہاں رکھی ہے؟“

”ہمیں کیا معلوم...؟“

”میں ناجی سے پوچھنا چاہتا ہوں آپ سے نہیں۔“ وہ جھنجلا سا گیا۔

”تو زحمت کرو وہ زرتاشیہ کے ساتھ گئی ہے۔“

”زرتاشیہ کے ساتھ کہاں؟“ وہ چونکا۔

”کہاں سے کیا مطلب؟ اپنے گھر اور کہاں۔“

زرتاشیہ ٹھیک ہو گئی ہے؟“ وہ انجان تھا اس لیے پوچھ رہا تھا۔ مگر بڑی بیگم کو تنقید کا موقع مل گیا۔

”ارے میاں! تمہیں کیا دلچسپی، کوئی کیسا بھی ہو؟ تم نہ گھر میں ٹکتے ہو نہ

گھر کے معاملات سے تم کو دلچسپی ہے۔ تم تو تیار ہوتے ہو اور مٹر گشت کے لیے نکل جاتے ہو۔“ وہ بھنا کے بنا جواب دیے زبیر احمد کی طرف چلا آیا۔

”ناجی! ناجی!“ اس نے کوریڈور میں کھڑے ہو کر آواز لگائی تو ناجی اور

زرتاشیہ دونوں کچن سے باہر آ گئیں۔

”آپ۔“ زرتاشیہ کے لب انجانی سی خوشی سے پھیل گئے۔ گرے شلوار سوٹ

میں خوب صورت سراپا اس کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔

”مبارک ہو۔“ بے ساختہ ہی وہ اس کی نگاہوں کی زد سے نکلنے کی کوشش

میں بولا۔

”شکریہ!“ وہ حد درجہ خوش ہو کر بولی۔



”ناجی! گاڑی کی چابی کہاں ہے؟“ مگر وہ یکسر اسے نظر انداز کر کے دائیں ہاتھ کھڑی ناجی سے بولا۔ زرتاشیہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ”وہیں رکھی تھی آپ کے موبائل فون کے پاس۔“ ناجی نے بتایا۔

”وہاں نہیں ہے۔“

”ناجی! تم بھاگ کر لے آؤ۔ اتنی دیر فرحان یہاں ہمارے ساتھ ناشتہ کریں گے۔“ زرتاشیہ نے بھی بڑی مہارت سے اسے کچھ دیر روکنے کی بھرپور کوشش کی۔

”آں، نہیں، ناشتہ تو نہیں کرنا۔“ وہ گھبرا گیا۔

”کیوں نہیں کرنا فرحان میاں!“ پشت سے زبیر احمد کی دھیمی سی آواز آئی تو وہ مزید بوکھلایا۔

”وہ ماموں جان! دراصل دوست ہے نا ایاز، اس نے ناشتہ کے لیے بلایا ہے۔“

”اس سے معذرت کرلو، ہماری بیٹی کی صحت یابی کی خوشی میں آج ناشتہ ہمارے ساتھ کرو، دیکھو، ہماری بیٹی بہت خوش ہے۔ اس نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔“ زبیر احمد کو بیٹی کی آنکھوں میں دلِ بیتاب کے مچلتے اشارے دکھائی دے رہے تھے۔

”جی، وہ...“ اس کی زبان ساتھ نہ دے پائی۔ دراصل اسے سامعہ کا خیال تھا۔ وہ رات خاص طور پر وعدہ کر کے آیا تھا کہ صبح ناشتا اس کے ساتھ کرے گا۔ مگر وہ بے بس ہو گیا۔ ہتھیار پھینک کر ٹی وی لائونج میں جا کر بیٹھ گیا۔ تنہائی پا کر سامعہ کا نمبر ملایا اور آہستہ سے کچھ دیر بعد آنے کی اطلاع دی۔ ساتھ ہی ناشتا کر لینے کی تاکید بھی کر دی۔ وہ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد خوش دلی سے او کے کہہ کر فون بند کر گئی۔ اس کو کچھ اطمینان سا ملا۔

زبیر احمد ناشتہ کے لیے میز کی طرف گئے۔ زرتاشیہ دھیرے دھیرے چل کر اسے بلانے لگی۔

”تم... تمہیں ابھی اتنا نہیں چلنا۔ چاہیے“ بے اختیار ہی وہ کہہ گیا تو زرتاشیہ جھوم اٹھی۔

”شکریہ۔“

”کس بات کا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”آپ کو میری فکر ہوئی اس کا۔“ وہ شوخی نگاہوں میں بھر کے بولی۔

”اوکے! اب اگر تم راستہ چھوڑو تو میں باہر جائوں۔“ اس نے اسے احساس دلایا کہ وہ راستے میں کھڑی تھی۔ ایک دم شرمندہ سی ہو کر ایک طرف ہو گئی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہو ڈاننگ روم کی جانب بڑھ گیا۔

...☆☆☆...

شالیمار کالونی سے واپس آتے ہوئے میاں افتخار نے ایک دم گاڑی علی ٹائون کی طرف موڑی تو شاہدہ بیگم نے ان کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”جاننا چاہ رہی ہوں گی کہ یہ ہم کس طرف جا رہے ہیں؟“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا تو میاں افتخار نے مختصر! ”ہنہ!“ کہا۔

”ظاہر ہے تین چار ماہ اگر کسی راستے پر نہ جائیں تو بھول ہی جاتے ہیں“ وہ ہے نا چینی کہاوت کہ کسی جگہ سے اگر لوگ گزرنا چھوڑ دیں تو وہاں گھاس اُگ آتی ہے۔“

”افتخار!“ وہ دانت بھینچ کر چلا پڑیں۔

”چھوٹی سی ہنہ کے بدلے میں اتنا لمبا جواب۔“ میاں افتخار قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

”مجھے معلوم ہے تم اتنی دیر کسی کی بات سننے کی عادی نہیں۔ بس وہ اماں جان ہی خوش قسمت ہیں جن کی آپ اچھی خاصی تقریریں بھی ہضم کر لیتی ہیں۔“

”پھر وہی بات۔“ وہ مزید زور دار انداز میں چلا گئیں۔

”ارے بس بس بیگم صاحبہ! یہاں سے ایک رستا بھائی میاں کے گھر کی طرف جاتا ہے۔ بھائی میاں یعنی ہمارے بڑے بڑے اکلوتے میاں ستار کا گھر جو کہ مستقبل میں آپ کا اور ہمارا سمہانہ بن جائے گا۔“

”او گاڈ! یہ آپ کے دماغ کی بیٹری کچھ زیادہ چارج نہیں ہوگئی۔“ وہ مسکراہٹ دبا کر بولیں۔

”ہاں شاید‘ تازہ ہوا لگی ہے۔ آزاد ماحول میں آئے ہیں تو کچھ تو اثر ہوگا۔“ وہ آنکھ دبا کر بولے۔

”مطلب؟“ انہوں نے گھور کے دیکھا۔

”مطلب یہ کہ‘ یہ آگئی فروٹ شاپ‘ میں فروٹ لے کر آتا ہوں۔“ میاں افتخار نے ایک بڑی سی فروٹ شاپ کے سامنے گاڑی روکی اور تیزی سے باہر نکل گئے۔ جب کہ شاہدہ بیگم کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

میاں جی نے فروٹ کے بڑے بڑے شاپر پچھلی سیٹ پر رکھے تو وہ چونکیں چند منٹ بعد وہ اور میاں افتخار ”ستار ہاؤس“ کے سامنے تھے۔ گلی میں گاڑی کھڑی کر کے دروازے پر دستک دی تو عادل نے دروازہ کھولا۔

”السلام علیکم!“ دونوں نے کمرے میں داخل ہو کر کہا تو رفیعہ نے اٹھ کر شاہدہ بیگم کو گلے لگایا۔ میاں افتخار نے بھائی میاں سے ہاتھ ملانے کے لیے پہلے ان کے پلنگ کے قریب رکھی میز پر فروٹ کے شاپر رکھے پھر ہاتھ ملایا تو میاں ستار نے اپنی گونج دار آواز میں پوچھا۔

”یہ کیا ہے سیٹھ صاحب؟“

”بھائی میاں! کیوں شرمندہ کرتے ہیں‘ بس تھوڑا سا آپ کے لیے فروٹ خریدا ہے۔“ میاں افتخار نے سعادت مندی سے ان کے قریب بیٹھ کر کہا تو وہ اچھل پڑے۔

”ہنہ! فروٹ، نہیں چاہیے فروٹ وروٹ۔ یہ بھی سنبھال کے رکھو، ہم نے تو سینے پر صبر کی سل رکھ کے سوچ لیا ہے کہ بھائی کی جگہ بہن تھی۔ جسے بیاہ کر سسرال بھیج دیا۔“

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔“ رفیعہ نے مداخلت کی۔

”تم چپ رہو عادل کی ماں، ہمیں ان کا فروٹ نہیں چاہیے۔ بس صاف صاف بتا دیں کہ جو زبان انہوں نے دی تھی اس پر قائم ہیں یا سسرال میں رہتے ہوئے زبان بھی بھول گئے۔“ میاں ستار نے بیوی کو مخاطب کر کے ایک بار پھر میاں افتخار اور شاہدہ بیگم کو لتاڑا۔

”آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں بھائی میاں؟“ میاں افتخار نے کافی نرمی سے کہا۔

”جو آدمی چار چھ مہینے بھول کر بھی کبھی سلام دعا کے لیے نہ آئے تو اس کے بارے میں ایسا ہی سوچتے ہیں۔ کیوں شاہدہ؟“ اب کی بار انہوں نے براہ راست شاہدہ کو مخاطب کیا۔

”بھائی میاں! آپ شاید یہ محسوس کرتے ہیں کہ میں افتخار کو یہاں آنے نہیں دیتی۔“ شاہدہ نے شرمندگی سے کہا۔

”ارے نہیں، تمہارے بھائی میاں کا یہ مطلب نہیں ہے۔“ رفیعہ نے جلدی سے شاہدہ کو تسلی دی۔

”میرا بالکل یہی مطلب ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تم شادی کے بعد اس گھر میں آتیں مگر تم نے اسے سسرال میں بسالیا۔“ بھائی میاں نے بے باکی سے اعتراض کیا۔ شاہدہ بیگم بری طرح جھینپ گئیں اور شاکی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا وہ نظریں چرا گئے۔

”آپ کون سے شکوے لے بیٹھے ہیں؟ کچھ چائے پانی کا پوچھیں۔“ رفیعہ نے ایک مرتبہ پھر میاں افتخار کو روکنے کی کوشش کی۔

”ارے بھابی! یہ بڑے بھائی ہیں۔ ان کے سب شکوے بجا ہیں، مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے۔ مگر اتنا یقین آپ رکھیں کہ میں آپ کو بھولتا نہیں ہوں۔“ میاں افتخار نے مسکرا کر یقین دہانی کرائی۔



”اچھا پھر آپ لوگ باتیں کرو، میں چائے بناتی ہوں۔“ رفیعہ یہ کہہ کر باہر گئیں۔

”اب تانیہ کو رخصت کرنے کا سوچو“ میں بیمار رہتا ہوں تمہاری بھابی میری خدمت میں لگی رہتی ہے۔ گھر میں کوئی تو ہو اس کا مددگار۔“ میاں ستار نے دل کی بات کہہ دی۔ شاہدہ بیگم تو پہلو بدل کے رہ گئیں جب کہ میاں افتخار نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”تانیہ آپ کی امانت ہے۔ مگر ابھی اس کے فائنل ایگزامز ہو رہے ہیں۔ عادل کی ملازمت کا مسئلہ بھی لٹکا ہوا ہے۔“

”تو کرائو اسے ملازم“ اس کی خواہش ملازمت ہی ہے۔“ میاں افتخار نے گھن گرج کے ساتھ کہا۔

”وہ میرے پاس آئے تو، کبھی آتا ہی نہیں۔“ میاں افتخار نے کہا۔

”نہیں چاچو مجھے ملازمت نہیں کرنی۔“ پیچھے سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے عادل نے ان کی بات سن کر کہا۔

”ہیں! اب ملازمت بھی نہیں کرنی۔“ میاں ستار نے اکھڑتی سانس کو ہموار کرتے ہوئے چلا کر کہا۔

”میں اسٹور چلائوں گا۔“ عادل نے ایک دم کہا تو میاں ستار کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور شاہدہ بیگم کے ماتھے پر چند شکنیں پیدا ہوئیں۔ جنہیں میاں افتخار نے بغور دیکھا اور پھر تحمل سے بولے۔

”یہ تو اچھی بات ہے آج کل کاروبار میں ہی فائدہ ہے۔ ملازمت میں تو گھر چلانا مشکل ہو گیا ہے۔“

”وہ بڑے پیمانے کے کاروبار ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے اسٹور سے گھر چلتے ہیں کیا؟“ شاہدہ بیگم نے اپنے مخصوص لہجے میں الفاظ چبا چبا کر ادا کیے۔

”چھوٹا اسٹور ہی میں بڑے اسٹور میں تبدیل کروں گا۔“ عادل شاہدہ بیگم کے لفظوں میں طنز محسوس کر کے کچھ تند لہجے میں کہہ کر باہر نکل گیا۔

”شکر ہے عادل کو عقل آگئی۔“ میاں ستار باہر آکر مسکرانے لگے۔

”نہیں انشاء اللہ عادل میں صلاحیت ہے، تعلیم ہے، کچھ روپے کی کمی میں پوری کردوں گا۔ اسٹور ہر طرح کے نئے سامان سے بھرا ہو تو اچھا نتیجہ نکلتا ہے۔“ میاں افتخار نے بھائی کے حوصلے اور خوشی میں اضافہ کیا۔ جب کہ شاہدہ بیگم نے تیکھی نظروں سے میاں افتخار کو دیکھا۔

رفیعہ چائے کی ٹرے لے کر آئیں تو میاں ستار نے خوش ہو کر عادل کے فیصلے کے متعلق انہیں بتایا۔ وہ بھی خوشی سے مسکرا دیں۔

...☆☆☆...

دن کے ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔

سامعہ کچن سے آکر کپڑوں کا انتخاب کر کے سیدھی واش روم میں گھس گئی۔ سخت گرمی اور جس کا موسم تھا۔ صائمہ کے منع کرنے کے باوجود وہ کچن میں گھس جاتی تھی۔ کچھ نہ کچھ اسپیشل چیز پکانی اسے پسند تھی۔ آج بھی ہٹ اینڈ اسپانسی چکن ونگز بنائے تھے۔ کچھ فرحان کے خیال سے کہ صبح وہ ناشتے کے

لیے نہیں آسکا تھا۔ حالاں کہ صبح ناشتے پر بھی صائمہ نے خاصا پر تکلف اہتمام کیا ہوا تھا۔

اب اسے یقین سا تھا کہ فرحان کو ضرور آنا ہے۔

اس کا یقین سچ میں چند منٹ بعد ہی بدل گیا۔

میری شکل دیکھ کر میرا خیال آتا ہے۔ اس نے اسے دیکھ کر شکوہ کیا۔

”شکایت! سامعہ ڈارلنگ!“ اس نے محبت پاش نگاہوں سے سوال کیا۔

”اوں ہنہ! آپ سے شکایت اور میں کروں یہ کیوں کر ممکن ہے؟“ وہ ایک دم سادگی سے بولی۔

”کوئی بات نہیں جان! یہ تمہارا حق ہے۔ تمہیں پوچھنا چاہیے کہ میں صبح کیوں نہیں آیا؟“ فرحان نے بہت مضبوط لہجے میں اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”یقیناً کوئی مجبوری ہوگی۔“

”ہاں مجبوری بھی بہت اہم تھی۔ چاہنے کے باوجود جان نہیں چھڑا سکا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ وہ بہت نرمی سے بولی۔

”تھینک یو سامعہ! بس اسی طرح میرا ساتھ نبھانا۔“

”جو آپ نے کہہ دیا وہ میرا ایمان ہے۔“

”صبح میں تمہارے پاس آرہا تھا۔ بس زر تاشیہ کے پاؤں کا پلستر اترتا تو وہ اپنے گھر چلی گئی۔ ساتھ میں محترمہ ناجی بھی چلی گئیں۔ گاڑی کی چابی نہیں ملی تو اس سے پوچھنے چلا گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ وہاں زرتاشیہ اور ماموں جان نے گھیر لیا۔ ناشتے کے لیے اس قدر اصرار کیا کہ مجھے بیٹھنا پڑا۔“ اس نے صاف صاف سچ سچ بتایا۔

”اچھا! کیا زرتاشیہ اب بالکل ٹھیک ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں! بس ویسے ہی معصوم اور بے ضرر سی ہے، اس سے کبھی کبھی شرمندگی سی محسوس ہوتی ہے۔“ فرحان نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ سامعہ کو صاف گوئی اچھی لگی۔

”مجھے تو یہ شرمندگی اکثر ستانے لگی ہے۔“

”کیسی شرمندگی؟“

”میری وجہ سے آپ اس سے دور ہو گئے۔“

”یہی وہ مسئلہ ہے جسے ہمارے بزرگ سمجھتے نہیں ہیں۔ خاص کر ہماری نانوں۔ بچپن میں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دینا کہاں کی عقلمندی ہے آنے والے دنوں میں کیا ہو جائے کس کو خبر؟ تم میری قسمت کا فیصلہ ہو، اس میں نہ تمہارا کوئی قصور ہے اور نہ میری کوئی خطا۔“

وہ بہت رسان سے بولتا چلا گیا۔ سامعہ کا لرزتا کانپتا دل دھیرے دھیرے سنبھلتا گیا۔ فرحان کی باتوں میں محبت کا خالص سچ موجود تھا۔ وہ اس پر مکمل

بھروسہ رکھتی تھی۔ مگر کچھ نہ کچھ ہمدردی زرتاشیہ کے لیے اس کے دل کے  
نہاں خانوں میں چھپی ہوئی تھی۔

...☆☆☆...

کافی عرصے بعد زبیر احمد نے لان کا رخ کیا تھا۔

شاید اس کی وجہ زرتاشیہ کا ٹھیک ہو کر گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا تھا۔ وہ  
کھل اٹھے تھے۔ ایک دم ہی بورے رنگ زندگی میں سرور سا آگیا تھا۔ عدم  
توجہی اور بیزاری کے باعث انسان ہی نہیں پھول پودے بھی اپنا اصل حسن  
رنگ کھو بیٹھے ہیں۔ رحیم مالی کو بڑی توجہ سے کانٹ چھانٹ تراش خراش کرتا  
دیکھ کر خود بھی خوشی محسوس کر رہے تھے۔

”صاحب! یہ پھول پودے بہت پیار اور دیکھ بھال مانگتے ہیں۔ میں تو خوش  
ہوں کہ اتنے دنوں بعد آپ نے مجھے یاد کیا۔“ رحیم بابا نے تیز تیز قینچی  
کے ذریعے فالتو خشک شاخیں کاٹتے ہوئے کہا۔

”بس اب تم کو باقاعدگی سے دونوں ٹائم آنا ہے۔ چھوٹی بی بی کو تمہارے کام  
کا شوق ہے۔ اسے مصروف رکھنا۔ لان پھر سے سرسبز، خوب صورت بنا دو۔“  
زبیر احمد نے ہدایت کی تو پچپن سالہ رحیم بابا نے پھر سے روزی بحال ہونے  
کی خوشی میں مسکرا کر شکریہ ادا کیا۔

زرتاشیہ کو اس طرف آتا دیکھ کر وہ اس کے اٹھتے قدموں کی طرف متوجہ  
ہو گئے۔

”بیٹا! ابھی اتنا نہیں چلنا چاہیے۔“ وہ پاس آکر بیٹھی تو وہ بولے۔

”اب یہاں بالکل ٹھیک ہوں میڈیسن لے رہی ہوں۔“

”او کے بس خیال رکھنا۔“

”اچھا اب اندر چلیے چائے تیار ہے میں نے کٹلتس بنائے ہیں۔ رحیم بابا آپ  
بھی آئیں۔“



”ارے نہیں چھوٹی بی بی! یہ میرے کام کا وقت ہے۔ کام ختم کر کے خود چائے مانگ لوں گا اور یہ کٹلٹس تو مجھے اچھے نہیں لگتے۔“ انہوں نے بھرپور سادگی سے کہا تو زرتاشیہ اور زبیر احمد قہقہے لگانے پر مجبور ہو گئے۔

”چلیں پیپا! چائے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

”ہاں! چلو میں پہلے ہاتھ منہ دھو لوں پھر آتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ زرتاشیہ آگے آگے چل دی۔

کچن میں رکھا اس کا موبائل بج رہا تھا۔ اس نے لپک کر فون رسیو کیا دوسری طرف گلریز ماموں تھے۔

”ہیلو ماموں جانی۔“ وہ خوشی سے غیر متوقع کال پر چلا پڑی۔

”ہیلو! کیسی ہو؟“ انہوں نے شدید محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”آئی ایم فائن۔“ ایک دم ہی اس کی آواز بھرا گئی۔

”بیٹا مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ کے پائوں پر چوٹ آئی۔ یہ کس دن کی بات ہے؟“

”جس دن ماما گھر سے گئی تھیں۔“ وہ رو دی۔

”نہیں بیٹا! روتے نہیں آپ کی ماما آپ کے پاس آئیں گی۔ بس سمجھانے میں وقت لگے گا۔ گلریز صاحب کافی دکھ سے بولے۔

”ماموں جانی! ماما کو ہمارا بالکل خیال نہیں آیا۔“

”ارے نہیں، وہ چھپ چھپ کے آپ کو یاد کرتی، روتی ہیں۔“ گلریز صاحب کے پاس جھوٹ کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

”بس میں ان سے سخت ناراض ہوں۔ میرے پیپا اچھے ہیں۔“ وہ روتے روتے بولی۔

”یو آر رائٹ، یور پیپا از گریٹ۔“

”تھینک یو! انجم ماما کیسی ہیں۔“

”ایک دم ٹھیک ہم سب آئیں گے آپ کی ماما کو ساتھ لائیں گے۔“

”اوکے۔“ اس نے خوشی کا اظہار کیا۔

”اپنا خیال رکھنا اور پاپا کو میرا سلام دینا۔ اس شریف آدمی سے تو بات کرنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں ہے۔“ گلریز صاحب خاصى ندامت سے بولے۔

”اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ بیٹا۔“

فون بند کر کے پلٹی تو زبیر احمد پشت پر ہی کھڑے تھے۔

”پاپا! ماموں جانی کا فون تھا، آپ کو سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ وہ سب آئیں گے۔ ماما کو ساتھ لائیں گے۔“

”اچھا! اچھا چلو بیٹھو چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ زبیر احمد نرمی سے ٹال گئے۔

”پاپا! آپ کو اچھا نہیں لگا؟“ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”کبھی کبھی اچھا برا لگنے کی گرفت سے انسان آزاد ہو جاتے ہیں۔“ کٹلٹس پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”پاپا! آپ اگر ماما آجائیں تو معاف کر دیں گے نا۔“

”زرتاشیہ! میں اب صرف آپ کے لیے زندہ ہوں، غیر ضروری باتوں سے میرا سکون خراب نہ کرو۔“ انہوں نے بظاہر مسکرا کر اسے منع کیا لیکن زرتاشیہ جان گئی کہ پاپا کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔

بس پھر بڑے خاموش ماحول میں چائے پی گئی۔ زبیر احمد کو احساس تھا کہ زرتاشیہ ماں کے لیے اداس ہے۔ مگر وہ جانتے تھے کہ نرگس کو سمجھانا بہت مشکل کام ہے۔ وہ اگر بھائی کے کہنے پر آ بھی گئی تو پھر وہی تلخیاں شروع ہو جائیں گی۔ ویسے انہیں گلریز بھائی سے بھی کچھ شکایت تھی کہ انہیں نرگس کے ساتھ سختی کے ساتھ پیش آنا چاہیے تھا۔ اتنے دنوں بعد انہوں نے رابطہ کیا، مگر یہ شکایت انہوں نے دل میں رکھی۔

...☆☆☆...

ناجی کے لیے آج پھر کڑی مشقت کا وقت تھا۔

اسٹور کے سب برتن اس کے ارد گرد جمع تھے اور وہ سخت ناگوار نظروں سے سامنے موڑھے پر بیٹھی بڑی بیگم کو گھورتے ہوئے انہیں اٹلی کے پانی سے چمکا رہی تھی۔

”میاں جی کی تنخواہ میں سے جتنے پیسے اٹلی خریدنے پر خرچ ہوتے ہیں اتنے میں ہر سال نئے برتن خریدے جاسکتے ہیں۔“ وہ چپ نہ رہ سکی۔ بڑی بیگم تسبیح پڑھتے پڑھتے تڑک کر بولیں۔

”تجھے بھی پر لگ گئے ہیں، نئے برتن۔“ انہوں نے باقاعدہ اس کی نقل اتاری تو وہ ناک چڑھا کر بولی۔

”زمانہ بدل گیا ہے۔ آپ ان برتنوں کا کیا کریں گی۔ تانیہ بی بی کو دیں گی یا زر تاشیہ بی بی کو۔“

”اے ہے! تجھے کیوں فکر لاحق ہے۔“ انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔

”مجھے تو اس فضول خرچی کی فکر ہے جو نالی میں بہہ جاتی ہے۔“

”بس، بس اپنے کام سے کام رکھ۔“ وہ زور سے گرجیں تو تیز تیز قدموں سے آتی تانیہ کے قدم رک گئے۔

”ناجی ماما کہاں ہیں؟“

”وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں کچھ طبیعت خراب ہے۔“

”کیا ہوا؟“ اس نے پوچھا۔

”پوچھو، لاڈلی بیٹی، ماما کی خیر خبر ہی رکھ لیا کرو۔“ بڑی بیگم چپ نہ رہ سکیں

جینز اور ٹی شرت کو تنقیدی نظروں سے گھورتے ہوئے بولیں۔

”نانو! میرے فائنل ایگزام ہو رہے ہیں۔“ اس نے کافی سنجیدگی سے اپنی بے

خبری کی وجہ بتائی۔

”جی ہاں!“ وہ مختصراً کہہ کر اندر چلی گئیں تو وہ ناجی سے بولی۔

”ماما کو بتا دینا کہ میں یونیورسٹی جا رہی ہوں وہاں ہوسٹل میں کلاس فیلوز کے ساتھ تیاری کرنی ہے۔ دیر سے آؤں گی۔“

”آپ جائیں گی کیسے؟“

”خرم آنے والا ہے۔ بتا دینا ماما کو۔“ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”ویسے تانیہ بی بی، بیگم صاحبہ جب سے آئی ہیں کچھ پریشان پریشان اور چپ چپ ہیں۔“ ناجی نے متفکرانہ انداز میں کہا۔

”کہاں سے آئی ہیں؟“

”یہ تو نہیں پتا، میاں جی کے ساتھ گئی تھیں۔“ ناجی نے آخری بڑی سی تانبے کی پرات دھو کر اٹھتے ہوئے جواب دیا۔

”نانو نے ہی کچھ کہا ہوگا۔ ماما جتنا چاہیں ان کا خیال رکھیں، وہ ان کو بھی معاف نہیں کرتیں۔“ تانیہ کے لب و لہجے میں شک و بدگمانی کی تلخی تھی۔ جو واپس آتی بڑی بیگم کو پسند نہ آئی۔

”ارے لڑکی! ہم پوچھتے ہیں یہ ہر وقت تم ہم سے بدگمان کیوں رہتی ہو؟ تمہاری ماں نے تمہارے جیسی اولاد کی شکل میں بہترے دکھڑے پال رکھے ہیں۔ دیکھو اپنے طور طریقے مغرب کا وقت اور تم یہ فرنگیوں کے کپڑے پہن کر گھر سے باہر جانے کے لیے پر تول رہی ہو۔“

”میں سیر کرنے نہیں جا رہی پڑھنے کے لیے جا رہی ہوں۔“

”یہ پڑھنے کا کون سا طریقہ ہے؟ گھر سے باہر۔“ انہوں نے بارعب آواز میں کہا۔ تو تانیہ کو کسی نے ماچس کی تیلی دکھائی دی۔

”جسے آپ گھر کہتی ہے یہ کھنڈر ہے میں یہاں اپنی کلاس فیلوز کو نہیں بلا سکتی۔“



”واہ گھر کھنڈر دکھتا ہے۔ باوا سے کہہ کر محل بنالو۔“ وہ بھی تائو کھا گئیں۔  
 ناجی سے یہ سچویشن دیکھی نہ گئی تو باورچی خانے میں گھس گئی۔

باہر گاڑی کا ہارن بجا تو بڑی بیگم نے طنز کیا۔

”جائو، باہر کلاس فیلو آگئی۔ خوب دھول جھونکو، ماں باپ کی آنکھوں میں۔“

وہ چند قدم ہی بڑھی تھی کہ موٹر سائیکل گیٹ سے اندر داخل ہوا۔

وہ اپنے قدموں پر جم گئی۔ جب کہ عادل موٹر سائیکل کھڑی کر کے سیدھا اسی طرف آگیا۔

”السلام علیکم! اماں جان!“ اس نے گردن اکڑاتی تانیہ پر اچھتی سی نظر ڈال کر بڑی بیگم کو ادب سے سلام کیا۔

”جیتے رہو، آؤ عادل میاں بیٹھو۔“ بڑی بیگم نہال ہو گئیں۔ انہیں عادل بہت پسند تھا۔

”شکریہ!“ وہ ان کے تخت پر بیٹھ گیا۔

تانیہ جانے لگی تو خاصی جرأت کے ساتھ بولا۔  
 ”اس وقت اس لڑکے کے ساتھ کہاں جا رہی ہو؟“

تانیہ کو پتنگے لگ گئے۔

”ہو آر یو؟“

”کیا تم نہیں جانتیں؟“ وہ خاصے تحمل سے بولا۔

”تم نہیں، آپ کہو۔“ وہ پلٹ کر غرائی۔

”چلو، آپ ہی سہی۔“ وہ سادگی سے بولا۔

”میں جس رشتے کو مانتی ہی نہیں اس کی پروا کیوں کروں؟“

وہ شانے اچکا کر، ٹک ٹک کرتی چلی گئی۔ عادل کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔

مگر پھر نارمل ہو گیا۔ اماں جان نے ناجی کو اچھی سی چائے کے ساتھ شامی

کباب تلنے کو کہا۔ وہ نہ نہ کرتا رہا مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔

”بہت اچھا کیا جو چلے آئے۔“

”وہ چاچی اپنا موبائل فون گھر بھول آئی تھیں۔ وہی دینے آیا ہوں۔“ اس نے جیب سے موبائل سیٹ نکال کے ان کو پکڑایا۔

”اچھا! شاہدہ اور افتخار میاں تمہاری طرف گئے تھے۔ بھئی تمہاری ماں تو کبھی بھول کر بھی نہیں آتیں۔ ہمارا خیال ہے پچھلی عید پر آئی تھیں۔“

”جی بس ابا کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ امی کو فرصت نہیں ملتی۔“

ناجی نے میز پر چائے کے برتن رکھے اور منٹوں میں پہلے شامی کباب دہی کی چٹنی اور کیچپ لے آئی پھر چائے لینے چلی گئی۔

”لو بیٹا، کھاؤ۔“ انہوں نے پلیٹ اس کی طرف بڑھائی عادل نے شکریہ کہہ کر پلیٹ میں ایک کباب رکھ لیا۔

”ارے اسی لیے تو کہتی ہوں کہ شادی کرلو، تمہاری ماں کو بھی آسرا ہو جائے گا۔ مگر...“ بولتے بولتے وہ ایک دم ”مگر“ پر رک گئیں۔

”مگر کیا اماں جان۔“ وہ بولا۔ تو انہیں مہارت سے ٹالنا پڑا۔

”تانیہ کے فائنل ایگزام ہو رہے ہیں۔ فرحان صاحب کے ارادے کیا ہیں؟ کچھ خبر نہیں بس انتظار ہو رہا ہے۔“

”چلیں یہ تو اب دور کی بات نہیں ہے۔“ وہ کچھ سوچ کر مسکرایا۔ بڑی بیگم مطمئن ہو گئیں۔ دراصل وہ تو تانیہ کے حوالے سے سچ سچ بولنے لگی تھیں۔ جو عادل کو بتانا اسے متفر کرنے کے برابر تھا۔ وہ خلوص دل سے چاہتی تھیں کہ تانیہ اچھی خوش گوار ازدواجی زندگی بسر کرے۔ ان کے خیال میں عادل ہیرا تھا۔ کچھ بھی تھا۔ تانیہ ان کی نواسی تھی۔ اس کے لیے روک ٹوک، نصیحت تاکید بہتری کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ وہ نادان ان کے پیار کو سمجھتی ہی نہیں تھی۔

پھر کچھ دیر وہ ان سے گپ شپ کر کے رخصت ہو گیا۔ جاتے ہوئے یہ وعدہ کر کے گیا کہ آیا کرے گا۔ امی کو بھی کسی روز لائے گا۔ بڑی بیگم نے ڈھیروں دعائوں کے ساتھ اسے رخصت کیا۔

...☆☆☆...

جب سے بھائی میاں کی طرف سے آئے تھے۔ میاں افتخار مسلسل نوٹ کر رہے تھے کہ شاہد بیگم بہت خاموش اور کھوئی کھوئی سی ہیں۔ نہ شام کی چائے پینے باہر گئیں اور نہ اب ناجی کھانا لگنے کی اطلاع دینے آئی تو کھانے کے لیے گئیں۔ انہوں نے اصرار کیا تو بھوک نہ ہونے کا بہانہ بنا دیا۔ وہ اکیلے کھانا کھا کر واپس کمرے میں آئے تو اماں جان کے بہت سے سوالات ہمراہ تھے۔

”شاہدہ کو کیا ہوا ہے؟“

”تنانیہ کو کھلی آزادی دے رکھی ہے؟“

”فرحان کیا کرتا پھر رہا ہے؟“

”عادل آیا تھا؟“

”میاں ستار کی طرف خیریت سے گئے تھے؟“ وغیرہ وغیرہ۔

انہوں نے ایک ایک کر کے تمام جواب اپنے مخصوص شرارت آمیز انداز میں شاہدہ بیگم کے گوش گزار کر دیے۔

”عادل کیوں آیا تھا؟“ ان سب سوالوں میں ایک پر انہوں نے استفسار کیا۔

یہ کیا آپ کا موبائل فون وہاں رہ گیا تھا۔“ میاں جی نے موبائل ان کے سامنے رکھ دیا۔

”اوہ! یہ وہاں رہ گیا تھا مجھے تو یاد بھی نہیں تھا۔“ وہ بولیں۔

”ہاں! آپ جب سے آئی ہیں آپ کو کچھ یاد نہیں۔ خیریت تو ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”کچھ نہیں، بس ویسے ہی بیزاری سی ہے۔“

”ارے بیگم! ایسے نہ ٹالے صاف صاف بتائیں کیا بات ہے؟“ وہ مصر ہو گئے۔

”کچھ نہیں، آپ آرام کریں۔“ انہوں نے کروٹ لے لی۔

”میڈیسن بھی کھالی ہے، کچھ تو کھالو۔“

”ناجی دودھ لے آئیں گی بس۔“

”وہ بات کیا ہے جو خاموشی کے پیچھے ہے؟“

”فرحان کی شادی کرنی ہے۔ اماں جان روز یہی بات کرتی ہیں۔ زرتاشیہ اکیلی ہے۔ زبیر کو اس کی ٹینشن ہے۔ پہلے ہی دل کا مریض ہے۔“ وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئیں۔

”یہ فرحان کی شادی اس وقت کہاں سے درمیان میں آگئی؟“

”کیوں؟ شادی کرنی نہیں ہے کیا؟“

”نہ، نہیں میرا مطلب یہ نہیں ہے،“ تانیہ کے انگیزام ہو رہے ہیں۔ پھر بیٹھ کر فیصلہ کریں گے۔

”تانیہ کی شادی بعد میں کروں گی۔“ ایک دم ہی وہ بولیں۔

”کیوں؟“ وہ چونکے۔

”بس ویسے ہی۔“

”فرحان سے بات کرنی ہوگی۔ وہ تو باہر جانا چاہتا ہے۔ ہائر اسٹڈیز کے لیے۔“

انہوں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”شادی کے بعد چلا جائے گا۔ ویسے میں چاہتی ہوں آپ اسے کاروبار کرا دیں۔“

”کاروبار کرانا اتنا آسان ہے کیا؟“ وہ ہنستے۔

”افتخار! پلیز بی سیریس، جو کچھ بھی کرنا ہے کرو، مگر فرحان کی شادی پہلے ہوگی۔“

”پہلے ہونا اور بات ہے مگر جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔“

”اماں جان کا فیصلہ ہے مزید دیر نہیں کی جاسکتی۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں کہہ کر اٹھیں اور واش روم میں چلی گئیں۔

میاں افتخار کے ذہن میں ہلچل شروع ہوگئی۔ ان کی سمجھ میں آج کی مسٹری نہیں آرہی تھی۔ یہ ایک دم اچانک فرحان کی شادی کا فیصلہ کرنا کچھ حیرت



انگیز تھا۔ انہوں نے تو ٹھیک سے اب تک سامعہ کے لئے کوئی پلان بنایا بھی نہیں تھا۔ فرحان ان پر بھروسہ کیے بیٹھا تھا۔

”یا خدا! کیا کروں میں؟“ وہ بڑ بڑائے۔

”ان کی نظروں میں پیاری سی، معصوم سی سامعہ کا چہرہ گھومنے لگا۔ شاہدہ بیگم کی ضد سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ اس اچانک فیصلے پر ان کی کیا منطق تھی یہ سمجھنے سے وہ قاصر تھے۔ حالانکہ بات تو بڑی واضح تھی۔ آج عادل کا اسٹور چلانے کا فیصلہ اس چھوٹے سے گھر میں تانیہ کو لانے کی باتیں کافی تھیں۔ شاہدہ بیگم کے چہرے کا رنگ اور ذہنی حالت تو وہیں بدل گئی تھی۔ دوسری طرف تانیہ کا مزاج اور عادات نے بھی انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس چھوٹے سے گھر میں زندگی بسر کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی اور عادل کو اگر اسٹور ہی چلانا تھا تو اتنا پڑھنے لکھنے کی ضرورت کیا تھی؟ کل سے پہلے ان کا اپنا ووٹ عادل کے لیے تھا۔ مگر اب وہ خوفزدہ سی ہو گئی تھیں۔ اس لیے اس فیصلے پر نظر ثانی کی غرض سے انہوں نے پہلے

فرحان کی شادی کا فیصلہ کیا۔ یہ جانے بغیر کہ فرحان کا اس فیصلے پر کیا رد عمل ہوگا؟“

میاں افتخار اس رد عمل کے حوالے سے ہی ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ شاہدہ بیگم کو ناجی نے دودھ لا کر دیا۔ وہ پی کر سو بھی گئیں جب کہ ان کے سامنے رکھا دودھ کا گلاس رکھا رکھا ٹھنڈا ہو گیا وہ تقریباً رات بھر جاگتے رہے۔

...☆☆☆...

”مام! ریلی آئی ایم ویری بزی۔“

”او کے! بس اب آخری پیپر والے دن کی سیٹ کنفرم کراؤ۔ دوسری طرف خرم کی مام مسز ہمدانی نے کچھ نرمی، کچھ تاکید اور انداز اختیار کیا۔“

”میں گاڑی پر آؤں گا۔“

گاڑی وہاں سے آپ کے ڈیڈ منیجر سے کہہ کر خود بک کرا لیں گے۔“

”اوکے۔“ وہ رضا مند ہو گیا۔

”بیٹا! صرف آپ وہاں ہو ہم سب مس کرتے ہیں بہتر تو یہی تھا کہ آپ ہمارے ساتھ اسلام آباد آجاتے۔ اب تو پڑھائی مکمل ہو گئی۔ بس آنے کی کرو آپ کے ڈیڈ کا امریکہ بزنس ٹور ہے۔ ہم سب تفریح کر آئیں گے۔“ مسز ہمدانی نے سمجھانے کی خاطر خاصی تفصیل سے بات کی۔

”ہرے! ہم سب امریکہ جائیں گے۔“ وہ نعرہ مارتے ہوئے تقریباً دو فٹ اچھلا۔

”اوکے بائے۔“ فون بند ہو گیا۔

تانیہ ہونق بنی اس کا منہ دیکھ رہی تھی۔

ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“ اس نے اس کی طرف توجہ کی۔

”یہ سب کیا ہے؟“ وہ خاصی برہمی سے بولی۔

”کیا؟“

”یہی جو پروگرام بن رہا تھا۔“

”او! یس تم جانتی ہو مجھے ہوسٹل سے جانا ہے پہلے ہی مام اور ڈیڈ نہیں چاہتے تھے کہ میں یہاں ہوسٹل میں رہوں۔ اب امریکہ کا ٹور ہے تو میں ضرور جائوں گا۔“ خرم نے خوش ہو کر بتایا۔

”اس کا مطلب ہے۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”تانیہ کم آن، اس میں رونے کی کیا بات ہے؟“ وہ حیرت سے ہنسا۔

”تم مجھے عادل کے رحم و کرم پر چھوڑ جانا چاہتے ہو۔“

”ہا، ہا، ہا۔“ وہ زور زور سے ہنستا چلا گیا۔

”او سوئیٹ ہارٹ! وہ آل ریڈی تمہارے سات چپکا ہوا ہے، بالکل ایسے جیسے

میجک اسٹون سے چپکا یا گیا ہو۔“ ہنسنے سے آنکھوں میں آئے پانی کو صاف

کرتے ہوئے بولا۔ تو وہ جل کر سامنے آگئی۔ بالکل اس کی آنکھوں کے سامنے۔

”مگر میں اسے خود سے دور کرنا چاہتی ہوں۔“

”تو کرو“ میں اس میں کیا کر سکتا ہوں۔ میرے جانے سے اس بات کا کیا تعلق ہے؟“

”تعلق ہے، اگر تم مجھے پرپوز کرو تو۔“ بے دھڑک ہی اس نے دل کی بات کہہ دی۔ خرم کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

”پھر اس سے کیا ہوگا؟“

”میں عادل کے لیے انکار کردوں گی۔“

”تانیہ! ہم اس موضوع پر پہلے بھی کئی بار بات کر چکے ہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”تو۔“

”تو، پہلے پیپرز دو، پھر اس پر سوچنا۔“ وہ بولا۔

”اور تم امریکہ چلے جاؤ۔“ وہ جھلائی۔

”اوہ“ یہ تو سچ ہے۔ تمہیں پتا ہے۔ اگر ڈیڈ کے اسلام آباد شفٹ ہونے سے پہلے میرا یہاں ایڈمیشن نہ ہوتا تو وہ مجھے کبھی یہاں داخلہ نہ لینے دیتے۔“ وہ بولا۔

”اوکے! تم جاؤ، مجھے چھوڑ جاؤ۔“ وہ غصے میں پرس اٹھا کر یونیورسٹی کے داخلی دروازے کی سیڑھیاں اتر گئی۔

”تانیہ، تانیہ!“ وہ پیچھے پیچھے آیا۔ ”یار اگر تم عادل سے نجات حاصل کر لو تو مجھے فوراً ایک ای میل کر دینا یہ میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔“

”اور تمہارے ما‘م ڈیڈ۔“ خوشی کے ساتھ ایک خوف سا بھی اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا۔

”او یار وہ میرا مسئلہ ہے۔ ما‘م ڈیڈ کو میرے معاملات میں انٹرفیر کی عادت نہیں ہے۔ وہ چاہتے ضرور ہیں کہ جلد میری شادی ہو، پر کہاں کس سے؟ یہ مجھ پر چھوڑا ہوا ہے۔ تم اگر دوستی کو رشتے میں بدلنا

چاہتی ہو تو، فائن۔“

خرم نے ایک دم اس کے نازک کندھوں پر اپنے یقین کے پر باندھ دیے وہ ہوائوں میں اڑنے لگی۔ مگر وہ پھر زمین پر لے آیا۔

”بٹ! سوئیٹ ہارٹ دل والا قصہ اپنے ذہن میں رکھو، میں کسی صورت اس معاملے میں الجھنا نہیں چاہتا۔“

”ٹھیک ہے، مگر وعدہ کرو کہ عادل سے نجات کے بعد تم میرا ساتھ دو گے۔“ آئی لو یو ویری مچ۔“ وہ بہت رسان سے اس کے ہاتھ تھام کر بولی۔

”وائے ناٹ! لیکن سلی گرل۔ وہ بہت تیکھی چیز ہے۔ تمہیں چھوڑنے والا نہیں۔“

”دیکھا جائے گا۔“

”چلو چلیں کل کے پیپر کی تیاری بھی کرنی ہے۔“ وہ اسے چھوڑنے کے لیے جیب سے گاڑی کی چابی نکالتے ہوئے بولا۔

چلتے چلتے تقریباً کار پارکنگ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی خرم نے شوخ سی دھن سیٹی کی صورت میں بجانی شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر میں گاڑی یونیورسٹی کی حدود سے باہر نکل کر کشادہ سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔

...☆☆☆...

دوپہر سے آسمان پر سیاہ گھٹا چھائی تھی۔

شدید گرمی کے باعث کمروں میں گھسے لوگ باہر صحنوں میں نکل آئے ہلکی ہوا، جانے کہاں کہاں سے بادلوں کی ٹکڑیاں اکٹھی کر کے لاتی رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان بادلوں کی ٹکڑیوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھام کر خود کو گھٹا میں بدل دیا۔ بجلی بھی بھرپور انگڑائی لے کر بیدار ہوئی اور ایک دم زور دار بارش ہونے لگی۔

بڑی بیگم ہڑبڑا کر سوتی سوتی کمرے سے باہر نکلیں۔



صحن میں اچار کے مرتبان رکھے تھے۔ تار پر کپڑے سوکھ رہے تھے۔ چار پائی پر گندم دھو کر پھیلائی ہوئی تھی۔

”ارے ناجی! ناجی جانے کہاں مر جاتی ہے، موسم کے تیور دیکھ کر بھی ہوش کے ناخن نہیں لیتی۔“ وہ بولتی جا رہی تھیں ساتھ ساتھ جلدی جلدی مرتبان اٹھا اٹھا کر برآمدے میں رکھ رہی تھیں۔ ان کی آواز سن کر شاہدہ بیگم اپنے کمرے سے نکل آئیں۔

”ارے یہ ناجی کہاں ہے؟“ انہیں دیکھتے ہی بولیں۔

”شاید زرتاشیہ نے بلایا تھا۔“ شاہدہ بیگم نے ان کا ہاتھ بٹاتے ہوئے اطلاع دی۔

”اچھا، لیکن اسے موسم کی خرابی کے ساتھ کچھ یاد نہیں رہا۔“ وہ کچھ نرمی سے بولیں۔

”چلیں چار پائی سر ہانے سے آپ پکڑیں۔“ شاہدہ بیگم نے انہیں کہا اور دونوں نے بڑی مشکل سے چار پائی گندم سمیت برآمدے میں کی۔ تیز بارش کے سبب دونوں ہی بھیگ چکی تھیں۔

فرحان نے کھڑکی سے سر نکالا تو اماں جان نے فوراً ناجی کو بلا کر لانے کو کہہ دیا۔

”ہزار مرتبہ کہا ہے کہ انٹر کام لگوالیں۔“ فرحان بڑ بڑاتا ہوا سلیپر پہنے باہر نکلا تو بڑی بیگم کو غصہ آگیا۔

”اوہو! بھی کیا چونچلے ہی اس گھر کے بچوں کے۔“

فرحان نے سنا نہیں بھینگے کے ڈر سے تیز قدموں سے نکلا تھا۔ سفید لان کے کرتے اور سفید لٹھے کی شلوار میں جب زبیر احمد کے کوریڈور میں پہنچا تو اچھا خاصا بھیگ چکا تھا۔

زرتاشیہ اور ناجی گھر کے پچھلے والے لان میں تھیں۔ وہ اس طرف گیا تو وہ دونوں بارش کا لطف لیتے ہوئے چونکیں ہلکے آسمانی لباس میں دوپٹے سے بے

نیاز بھیگی ہوئی زرتاشیہ کے لانبے گھنے بال کمر کو گھیرے ہوئے تھے۔ جب کہ دونوں ہاتھ سمیٹ کر اس نے سینے پر پھیلا لیے۔ ناجی نے دوڑ کر اس کا دوپٹہ اٹھا کے دیا اور خود وہاں سے رفو چکر ہو گئی اور وہ سرتا پیر گلرنگ سی ہوئی دوپٹہ سینے پر پھیلا کر اس کے پاس گئی۔

”ابھی پیر پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا اور تم کو پھسلنے کو شوق پیدا ہو گیا۔“  
 ”بارش میں نہانا مجھے اچھا جو لگتا ہے۔“ وہ ادا سے لہرائی۔

”ٹھیک ہے شوق سے نہاؤ۔ ناجی کو نانو بلا رہی ہیں اسے بھیج دو۔“ وہ سپاٹ لہجے میں کہہ کر پلٹا تو اس نے دھیرے سے پکارا۔

”بیٹھ جاؤ، کچھ دیر۔“ لہجے میں منت، التجا، پیار جانے کیا کچھ تھا کہ وہ پلٹ کے دیکھے بنا نہ رہ سکا۔ مگر نرمی سے یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

”پھر سہی، مجھے کام ہے۔“

اور وہ ملول سی اس کے قدموں کے نشانوں پر چل کر باہر تک آئی برآمدے کے ستون سے لگ کر آنکھیں موند لیں۔

...☆☆☆...

چیراسی نے اسے دیکھ کر پہلے تو سلام کیا اور پھر آفس کا دروازہ کھول کر اندر جانے کا اشارہ کیا۔

میاں افتخار نے سامنے رکھی فائلوں سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میاں افتخار فائلیں کھول کھول کر مخصوص جگہ پر دستخط کرتے رہے۔ تقریباً پانچ سات منٹ کے بعد گھنٹی بجا کر چیراسی کو بلایا۔ فائلیں اسے دے کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔  
 ”بابا! خیریت آپ نے مجھے آفس بلایا۔“

”ہاں! گھر میں بات ہو نہیں سکتی تھی۔ اس لیے یہاں بات کر سکتے ہیں۔“

”خیریت تو ہے۔“ فرحان کو تشویش سی ہوئی۔

”یار! آپ کی ماما نے چند روز سے غیر معمولی سنجیدگی طاری کی ہوئی ہے۔ سبب نہیں معلوم، پوچھنے پر آپ کی شادی کا فیصلہ سنا دیا۔ فیصلے میں سختی اور حتمی انداز اختیار کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس سنجیدگی کی وجہ کیا ہے اور اس کا تعلق آپ کی شادی سے کیا ہے؟ مگر کچھ نہ کچھ ہے۔“ میاں افتخار نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

”میری شادی؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”جی اور کیا میری شادی۔“ میاں افتخار نے اس کی نقل اتاری۔

”مگر بابا آپ جانتے ہیں۔“

”وہ صرف میں جانتا ہوں۔ آپ کی ماما اور اختیار کل رکھنے والی ہستی اماں جان نہیں جانتیں۔“ وہ شرارت آمیز لہجے میں بولے۔

”تو آپ انہیں بتا دیں۔“

”گھامٹر! اس سے کیا ہوگا؟ ہمارا گھر جنگ پلاسی کا منظر پیش کرے گا۔“

”ماما! میری خواہش رد نہیں کر سکتی۔“

”اس صورت میں جو اُن کی ذات تک محدود ہو، یہ بات ان سے زیادہ اماں جان، زرتاشہ اور آپ کے ماموں جان تک پھیلی ہوئی ہے اور طویل عرصے سے پھیلی ہوئی ہے۔“

”کچھ بھی سہی میں شادی تو کرچکا ہوں۔“ وہ اڑ گیا۔

”جی ہاں! اب اس شادی کو نبھانا اور اُس سے جان چھڑانا ہے اس کی ترکیب

سوچو۔“ وہ پریشانی کے باوجود مسکرائے تو فرحان کی ہمت بندھی۔

”آپ نے وعدہ کیا تھا۔“

”وہ تو مجھے یاد ہے، مگر کریں کیا آپ کا باہر جانے کا پروگرام تھا وہ بھی

چوپٹ کر دیا۔ آپ کی ماما فرماتی ہیں کہ کاروبار کرادو۔“

”آپ مجھے اور سامعہ کو باہر بھیج دیں۔“

”اس سے تو سامعہ گھر میں داخل نہیں ہو سکتی اور پھر آپ کی ماما آپ کو شادی سے پہلے بھیجنا نہیں چاہتیں۔ اب تو تانیہ کی شادی بھی بعد میں کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”بابا! کچھ کریں ورنہ میں صاف صاف سب کو بتا دیتا ہوں۔“ وہ خود سری دکھاتے ہوئے بولا۔

”بیٹا جی! جوش نہیں ہوش۔ میرے ذہن میں ایک ترکیب ہے۔“ میاں افتخار بولے۔

”کیا؟“

”سامعہ کینیڈا سے آئی ہے میرے دوست کی بیٹی ہے دوست نے مرتے ہوئے میرا پتا اسے دیا تھا اور اب یہ یہاں رہے گی۔“

”واہ! سامعہ یہاں کالج میں پڑھاتی ہے۔ کیا پتا ماما نے اُسے دیکھا ہوا ہو اور آپ کے دوست اچانک کہاں سے آگئے۔ کچھ وزن نہیں ہے۔“ فرحان نے مذاق اڑایا۔

”اویار! چھری تلے سانس تو لو، سوچتے ہیں۔“ وہ گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ پھر ایک دم چٹکی بجا کر بولے۔

”آج کل، سوات سے لوگ نقل مکانی کر کے آرہے ہیں، سامعہ سواتی لگتی ہے، اس کی پوری فیملی دہشت گردی کا نشانہ بن چکی ہے۔ بے یارو مددگار تھی میرے باس کے کہنے پر میں نے پناہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔“

”ہنہ! لیکن سامعہ تو پڑھی لکھی ہے۔ وہاں کی خواتین تو...“ فرحان سوچ رہی پڑ گیا۔

”وہاں پڑھے لکھے گھرانے بھی آباد تھے۔ بڑے بڑے افسران رہائش پذیر تھے۔ سامعہ بھی سرکاری افسر کی بیٹی ہے۔ پچھلے پانچ سال سے سوات میں اس کی فیملی رہائش پذیر تھی۔ بس اس سے بہتر کوئی آئیڈیا نہیں۔ اس پر آپ کی نانو کا دل پسینہ جائے گا۔ وہ کل ہی سوات کے متاثرین کے لیے پرانے کپڑے نکلا رہی تھیں۔“

”اور ماما؟“



”یار! ان کو تم سمجھا لینا۔ ویسے شاہدہ بیگم نرم دل ہیں انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ میاں افتخار نے غائبانہ بھی بیگم کی تعریف کی۔

”ہاں! بس ماما، نانو کی مرضی پر چلتی ہیں۔“

”یار چلنا پڑتا ہے۔ نانو ان کی ماں ہیں ماں بھی ایسی جنہوں نے سارا گھر سنبھال رکھا ہے۔ پرانے وقتوں کے لوگ اپنی روایات سے بہت محبت کرتے ہیں۔ شاہدہ کو معلوم ہے کہ ان کی بہت سے باتوں سے وہ خوش نہیں، پھر بھی ماں کی خدمت ان پر فرض ہے۔“ میاں افتخار نے کافی حد تک سمجھانے کی کوشش کی۔

”اور پھر اس کے بعد کیا ہوگا؟“

”پہلے گاؤں بسنے تو دو، بعد کی بعد میں سوچیں گے۔ بس تم اڑ جاؤ کہ باہر جانا ہے۔ واپس پر شادی کروں گا۔ باہر جانے میں دیر ہوتی رہے گی پھر کاروبار شروع کرانے کا پروگرام یوں کچھ وقت مل جائے گا۔“ میاں افتخار نے دائیں آنکھ دبا کر کہا۔ تو وہ مسکرا دیا۔

☆☆☆☆☆

”ماما! آپ نے مجھے بلایا ہے۔“ تانیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”ہنہ، آؤ۔“ شاہدہ بیگم نے تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا۔  
”آپ ٹھیک تو ہیں۔“ خلاف توقع تانیہ نے ان کی پیشانی چھو کر فکر مندی ظاہر کی۔

”میں ٹھیک ہوں کتنے سپر رہ گئے ہیں؟“

”پانچ، آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟“

”یہ خرم کے ساتھ دیر تک رہنا میں کیا سمجھوں؟“ انہوں نے کافی متانت سے پوچھا تو وہ بے باکی سے بولی۔

”ہی از مائی بیسٹ فرینڈ اور اس کے ساتھ رہنے کو آپ نانو کی طرح ناپسند کریں یا پسند کریں۔ مجھے خرم کے لیے کوئی کمپرو مائز نہیں کرنا۔“

”خرم کو صرف فرینڈ رکھنا چاہتی ہو یا...؟“ انہوں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ

دیا

”ماما! خرم سے شادی ہو جائے تو رشتہ بن جائے مگر...“ وہ ایک دم کڑوا سا

منہ بنا کر چپ ہو گئی۔

”مگر کیا؟“

”عادل کا پھندا میرے گلے میں ڈال رکھا ہے۔“

”کچھ دیر کو سمجھ لو، عادل کا پھندا گلے سے نکال لیا ہے۔“

”ماما! آپ مجھے ٹیسٹ کر رہی ہیں۔“ وہ حیرت سے بولی۔

”چلو یونہی سمجھ لو، بس کسی طرف تو کشتی لگے۔“

”عادل کا پھندا اتنی آسانی سے آپ لوگ اترنے دیں گے؟“

”ننانیہ! میں نے کہا نا کہ عادل کو کچھ دیر کے لیے بھول کے خرم کے لیے

بتاؤ۔“

”خرم میں اچھے لائف پارٹنر والی سب خوبیاں ہیں۔“

”تو معاملہ آگے بڑھائو۔ میرا مطلب ہے اس سے بات کرو، رشتہ مانگنے گھر

والوں کو بھیجے۔“

”بڑی ڈی ٹیل بات ہوئی ہے پر...“

”پر کیا۔“

”1930ء کے اس پرانے کھنڈر میں جسے آپ سب حویلی کہتے ہیں خرم کی

فیملی کو تو نہیں بلا سکتی۔ معلوم ہے وہ کتنے بڑے بزنس مین کا بیٹا ہے۔“

”آپ خرم سے مرعوب ہو یا اس کی دولت سے۔ یہ کھنڈر حویلی پہلے کہاں

سے آگئے اسے آپ سے لگاؤ ہے تو گھر والوں کو بھیجے۔“

”ماما! یہ نا ممکن ہے اس گھر میں بلانے سے بہتر ہے میں خرم سے شادی کا

ارادہ بدل لوں۔“ وہ تڑک کر بولی۔

”تانیہ! خرم کو آپ سے شادی کرنی ہے تو یہ پرانی حویلی، پرانا فرنیچر میسر نہیں کرتا۔“

”کرتا ہے ماما! یہ ماڈرن دور ہے آپ جس ماحول میں زندہ ہیں وہ آپ کے علاوہ کسی کو سوٹ نہیں کرتا۔ میں ایک اعلیٰ افسر باپ اور بینک آفیسر ماں کی بے بسی پر شرمندہ ہونا نہیں چاہتی۔“ وہ طنزیہ ہنسی۔

”ہم میاں بیوی نے کبھی اس طرح نہیں سوچا۔“ شاہدہ بیگم کو اس کا انداز ناگوار گزرا۔

”آپ نے تو نانو کی فرمانبرداری کی، بابا نے آپ کو فرمانبرداری کے لیے خاموش قوت عطا کی۔ مگر سوری ماما! ہم کیوں بے بسی کی زندگی جئیں۔ یہ حویلی آپ کے نام ہے مگر نانو نے اس میں آپ کو اپنی مرضی سے جینے کا حق نہیں دیا۔ کوئی چھوٹی سی چیز آج تک آپ اپنی مرضی سے نہیں بدل سکیں۔ یہاں تک کہ کھانے، پینے، سونے، جاگنے کے اوقات بھی نانو کی مرضی کے ہیں۔“ وہ شدید احتجاجی انداز میں بولتی چلی گئی۔

”تانیہ! کبھی پوزیٹو بھی سوچا کرو۔“ وہ خفگی سے بولیں۔

”یہ آپ سوچا کریں۔ انہیں اپنی سوچ بدلنی ہوگی۔ اس کھنڈر میں رہنا ہم سب کے لیے باعث شرمندگی ہے دو گاڑیاں، بابا اور فرحان بھیا کی۔ آپ کی میری گاڑیاں کیوں نہیں آنے دیتیں نانو؟“

”کہاں کھڑی کریں گے۔ بلا وجہ کی بحث؟“

”تو ٹھیک ہے آپ کو اب فیصلہ کرنا ہے میں شادی صرف خرم سے کروں گی پلینز یہاں سے نکلیں یہاں اس کی فیملی نہیں آسکتی۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

”تانیہ! ہر بات کو مسئلہ بنانا آپ کی عادت ہے۔ جائو جا کر سو جائو۔ مجھے کیا کرنا ہے اب یہ میرا مسئلہ ہے۔“ شاہدہ بیگم زچ آگئیں۔ سلجھانے بیٹھی تھیں۔ وہ گتھی جو چند دن سے ذہن میں الجھی ہوئی تھی۔ تانیہ مزید الجھا گئی۔

”او کے گد نائٹ۔ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی۔“

”گڈ نائٹ۔“ وہ دھیرے سے بڑ بڑا کر رہ گئیں۔

...☆☆☆...

”اگر مجھ سے ماں کو چھین لیا جائے تو میں پاگل ہو جائوں۔“

”آسمان کا بہترین تحفہ ماں ہے۔“

”بچے کے لیے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہے۔ خواہ بچے کی عمر کتنی ہو۔“

”ماں کے اختیار میں ہوتا تو وہ موت کو رد کردیتی زندہ رہتی ہمیشہ اپنے بچوں کے لیے۔“

اخبار کے صفحے پر ماں سے متعلق اقوال پڑھتے پڑھتے اسے اپنی ماما کا خیال تڑپا گیا اور وہ ٹپاٹپ روتی ہوئی گئی۔ دل شدت غم سے بھر آیا۔ پورے گھر میں روتی ہوئی گھومنے لگی۔ ماما کے کمرے کا دروازہ کھول کے دیوانوں کی طرح ماں کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی تصویر اٹھا کر چومنے لگی۔

آفس کے لیے زبیر احمد واش روم سے تیار ہو کر باہر نکلے تو اسے اس حالت میں دیکھ کر بے کل ہو گئے۔

”زرتاشیہ میری جان!“ انہوں نے تصویر لے کر بیڈ پر پٹنی اور اسے سینے سے لگا کر خوب سارا پیار کیا۔

”پپا! کتنے بڑے بڑے لوگوں نے ماں کے لیے کتنی بڑی باتیں لکھی ہیں۔ میری ماما تو سب سے الگ ہیں انہیں میرا ذرا سا بھی خیال نہیں۔“ وہ سسکیاں لینے لگی۔

”بیٹا ہم خوش رہنا چاہتے ہیں تو دوسروں کو خوش رکھنا چاہیے۔ میں آپ کی خوشی میں خوش رہتا ہوں مگر آپ اپنی ماما کو یاد کرتی ہو، یہ جان کر بھی کہ وہ ضدی، خود سر ماں ہے۔ اس نے کبھی آپ کو ممتا کی آنکھ سے نہیں دیکھا اپنی فطرت کی آنکھ سے دیکھا۔“ زبیر احمد نے سینے سے لگائے پیار سے سمجھایا۔

”مگر پپا یہ تو غلط ہے۔“



”اگر کوئی غلطی تسلیم کرے تو۔ نرگھس ٹوٹ جائے گی مگر غلطی تسلیم نہیں کرے گی۔ لہذا اب بھول جاؤ۔“ زبیر احمد نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

زبیر احمد تو اسے سمجھا بجھا کر آفس کے لیے نکل گئے۔ لیکن بعد میں وہ اور دکھی ہو گئی کہ بلا وجہ پیپا کو دکھ دیا اور وہ بنانا شتا کیے چلے گئے۔ جب کہ اس نے خود ناشتا بنایا تھا۔ انتظار کرتے ہوئے اخبار پر نظر پڑی تو اٹھا کے پڑھنے لگی تھی۔

”سوری پیپا آپ کو دکھ دیتی ہوں۔“ وہ ان کے تصور سے معافی مانگنے لگی اور خود نے بھی ناشتا نہیں کیا۔ وہیں پیپا کے بیڈ پر لیٹ گئی ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی تو اس نے رسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

”زبیر احمد! مجھے فیصلہ چاہیے۔“ نرگھس کی آواز بجلی کی طرح اس کے کانوں میں کڑکی۔

”مما!“ حیرت سے فقط ”مما“ ہی اس کے منہ سے نکلا۔

”زرتاشیہ!“ نرگھس کی آواز ندامت اور حیرت میں ڈوب کر ابھری۔ اسے تو یقین تھا کہ ابھی زبیر احمد کمرے میں ہوں گے اس لیے اس نے بیڈ روم والا نمبر ملایا تھا۔

”مما! آپ کو کیا چاہیے؟“ اس نے دکھ سے پوچھا۔

”آپ کیسی ہو؟ پیر ٹھیک ہو گیا؟“ وہ بوکھلا کر بولی۔

”آپ کو جلدی خیال آگیا۔“ شکریہ۔“ گلے میں پھنسے آنسو ضبط کر کے بولی۔

”آپ میرے پاس آجاؤ، میں گلرئز بھیا سے کہہ کر جہاز کی سیٹ کنفرم کرا دیتی ہوں۔“ وہ خفت مٹانے کو بولی۔

”نہیں، مجھے اپنے پیپا کے پاس رہنا ہے۔“

”کچھ دن کے لیے آجاؤ۔“

”نہیں۔“

”تو ٹھیک ہے رہو، مجھے معلوم ہے کہ سب نے مل کر ذہن میں میرے خلاف زہر بھر دیا ہوگا۔“ وہ اپنی مخصوص ٹون میں آگئی۔“

”آپ غلط سوچتی ہیں۔“

”آگئی نہ وہی بات، زبیر احمد ان کی ماں بہن یہی کہتی ہیں، بیٹی سے بھی کہلوا دیا۔“

”مما! پلیز آپ ایسا سوچنا چھوڑ دیں۔“ وہ منت آمیز لہجے میں بولی۔

”کیوں چھوڑ دوں، آپ کے پیانے مجھے دیا کیا ہے۔ قید میں زندگی بسر کی ہے میں نے...“

”پیانے آپ کو کبھی کچھ کرنے کو منع نہیں کیا آپ روز ہی افشین آنٹی سے ملنے جاتی تھیں۔ پارٹیز، شاپنگ، کب پیانے روکا؟“ زرتاشیہ میں جانے کہاں سے اتنی ہمت آگئی کہ وہ سب باتیں کہہ ڈالیں جو کبھی ماں کی موجودگی میں نہیں کہی تھیں۔ یہی حیرت نرگھس کو تھی۔

”یہ زبان دادو، پھوپھی نے دی ہے، رہو ان کے ساتھ ماں سے تمہیں محبت نہیں ہیل۔“

”مما! پلیز ماں بن کر کبھی تو دیکھا کریں۔ آپ کو میری کیا فکر تھی؟ میری تکلیف میری تنہائی کچھ بھی تو جاتے وقت آپ کے ذہن میں نہیں رہا۔“

”اسی لیے تو چھوڑ کر آئی تھی کہ تم باپ بیٹی کو احساس ہو۔“

”مما! آپ بہت مس کریں گی، ریلی یو مس می۔“ زرتاشیہ کو رونا آگیا۔ فون بند کر کے تکیے میں منہ دے کر رونے لگی۔ کچھ دیر بعد اس کے ذہن میں وہ پہلا جملہ گردش کرنے لگا۔

”زبیر احمد مجھے فیصلہ چاہیے۔“ وہ کپکپا کے رہ گئی دل شدت غم سے بری طرح دھڑکنے لگا۔ اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”مما! یہ آپ نے کیا کہہ دیا؟ کیا سب کچھ ختم ہونے جا رہا ہے۔ نہیں ممما، نہیں میرے پیانے کے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہی ہیں آپ... میرے پیانے ٹوٹ جائیں گے... بکھر جائیں گے... اگر آپ نے ایسا کیا تو میں آپ کو کبھی

معاف نہیں کروں گی... کبھی نہیں سنا مما آپ نے۔“ وہ چیخ چیخ کر روتے ہوئے بولی۔ کمرے میں آواز کا تعاقب آواز نے ہی کیا۔ باقی وہاں کوئی نہیں تھا۔

...☆☆☆...

کئی روز کی رات دن کی کڑی محنت کے بعد اسٹور کی نمایاں اور منفرد سی شکل نکلی تھی۔ اپنی ذہانت اور پی آر سے کافی معیاری اور بڑی کمپنیوں کا سامان اسٹور میں بھرا تھا۔ کسی محلے کی داخلی گلی میں چھوٹی جگہ پر بڑے اسٹور کی کمی پوری کرنے والا ہر سامان تھا۔ رفیعہ کی سونے کی چوڑیاں ان کی ضد اور اصرار پر اس نے فروخت کر کے کام چلایا میاں ستار کی خوشی دیدنی تھی۔ زردے کی دیگ پکوا کر تقسیم کی اپنے سب دوستوں کے گھروں میں دے کر آئے۔

رفیعہ نے میاں افتخار کی طرف لے جانے کے لیے زردہ ایک دیگچی میں ڈال کر رکھا۔ عادل کو تاکید کی کہ وہ فارغ ہو کر آئے انہیں لے کر چلے۔

”امی! آج پہلا دن ہے میں جلدی فارغ ہو کر کیسے آجائوں؟“ عادل نے جواب دیا۔

”بھئی کچھ دیر اپنے ابا کو چھوڑ آنا اور تمہارے دوست گوگی کو کہہ دو بس جلدی آجائیں گے۔“ رفیعہ نے زور دے کر کہا تو وہ اثبات میں گردن ہلا کر نکل گیا۔

رفیعہ نے اپنے اور عادل کے کپڑے استری کیے۔ نہا کر غسل خانے نے باہر نکلیں تو میاں ستار آگئے پھولی ہوئی سانس اور کھانسی کے باعث صحن میں ہی بیٹھ گئے۔ رفیعہ نے سہارا دے کر کمرے میں پہنچایا جلدی سے پانی پلایا۔

”آپ گرمی میں کیوں باہر بیٹھے تھے؟“

”بس رونق میں... میلہ تھا۔ اللہ کی رح... رحمت ہوگئی۔ خوب بوتلیں چل رہی ہیں اور وہ مسالے جو غریب محلے والوں کو کہیں نہیں ملتے تھے وہ عادل نے اسٹور میں رکھے ہیں۔“ وہ خوشی سے اٹک اٹک کر بولے۔ رفیعہ مسکرا دیں۔

”اللہ کا شکر ہے۔ تم ہی صبر کا دامن چھوڑ دیتے تھے۔“

”ارے کم عقل! اگر میں بار بار نہ ٹوکتا تو عادل کبھی جوش میں نہ آتا۔“  
میاں ستار اپنی دانش مندی کا رعب ڈالتے ہوئے ہنسے۔

”چلو یونہی سمجھ لو، مگر میرے عادل پر خفا نہ ہوا کرو۔“ رفیعہ کے دل میں  
ممتا کا احساس جاگا۔

”ارے تم کہو تو میں منہ پر ٹیپ لگا لیتا ہوں۔“ ذرا سی شوخی سے وہ بولے  
تو رفیعہ کو ہنسی آگئی۔

”آج ہم افتخار کی طرف جا رہے ہیں زردہ بھی دے آئیں گے اور خوش  
خبری بھی سنا آئیں گے۔“ رفیعہ نے اطلاع دی۔

”اچھی بات ہے، افتخار کو صاف صاف کہہ دینا کہ شادی کی تاریخ سوچ  
لے۔“ انہوں نے جذباتی انداز میں کہا۔

”میرا خیال ہے اب تو یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اصل مسئلہ  
تو عادل کی ملازمت بنی ہوئی تھی۔“ رفیعہ نے یقین دہانی اپنے سادہ طرز  
زبان سے کرائی۔

”ارے تم نہیں سمجھتیں شاہدہ کو یہ اسی کا کمال ہے کہ میرا اکلوتا بھائی گھر  
داماد بنا ہوا ہے۔ اس کے میٹھے لہجے میں کوئی جادو ہے۔ افتخار سر نہیں اٹھاتا  
اس کے سامنے۔“

”افتخار تو سدا کا ایسا ہے۔ ہنس مکھ، صلح پسند۔“ رفیعہ نے دیور کی تعریف کی۔  
”چلو، ایسا ہی ہو۔ میں کون سا اس کا دشمن ہوں۔ تانیہ کے بارے میں کیا  
خیال ہے؟“

”اب وہ باتیں کرنے کا فائدہ؟ کیوں وہم کر رہے ہیں یہ پہلے سوچنے والی  
باتیں تھیں۔“ رفیعہ نے کہا۔ میاں ستار خاموش ہو گئے۔

”میں تانیہ کے لیے کچھ لے جانا چاہ رہی ہوں سمجھ میں نہیں آ رہا کیا لے  
کر جائوں؟“ رفیعہ نے سوچتے ہوئے بتایا۔

”تو لے جائو۔ عادل آئے تو اسے کہہ دینا اپنے اسٹور سے ہی لے آئے گا۔“

”ہیں! اسٹور سے کیا بوتل، آئس کریم لے جائوں۔ میں راستے سے سوٹ لے جائوں گی۔“

”جیسی تمہاری مرضی۔“

میاں ستار سو گئے اور رفیعہ تیار ہو کر کچھ دیر تو عادل کی راہ دیکھتی رہیں۔ پھر خود بھی لیٹ گئیں۔ نیند نے آلیا اور سو گئیں۔ عادل مغرب کی اذانوں کے بعد آیا تو وہ بگڑ کر بولیں۔

”اب آنے کی کیا ضرورت تھی۔ سارا دن گزار کے۔“

”امی! پہلا دن تھا، رش تھا۔ دوست یار مبارک باد دینے آرہے تھے۔ اب بھی گوگی کو کچھ دیر کے لیے بٹھا کر آیا ہوں۔“

”اب کون سا وقت رہ گیا ہے جانے کا۔“

”بہت وقت ہے۔ آپ نماز پڑھ لیں میں نہا کر ابھی آیا۔“ عادل یہ کہہ کر اپنے کمرے میں گیا۔ وہ وضو کر کے نماز پڑھنے میں مشغول ہو گئیں۔

ٹھیک بیس منٹ بعد موٹر سائیکل فراٹے بھرتی ہوئی۔ مین مارکیٹ کے قریب پہنچ گئی۔ رفیعہ نے ایک دکان سے اپنی پسند کے مطابق ہلکے گلابی اور آسمانی رنگ کا پھول دار لان کا سوٹ پیک کرایا اور باہر آ گئیں۔ عادل نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے طنزیہ کہا۔

”آپ نے زحمت ہی کی ہے۔ آپ کی پسند کا سوٹ تانیہ بی بی کی ناک کے نیچے نہیں آئے گا اور ویسے بھی وہ ایسے کپڑے نہیں پہنتی۔“

”تم دونوں باپ بیٹا کو غیر ضروری شک کی عادت ہے، پہلے ہی سے کہانی بنا لیتے ہو۔“ انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے بہت احتیاط سے موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے کہا۔ عادل ماں کی سادگی پر مسکرا دیا۔ ایک بار پھر وہ بڑی مہارت سے موٹر سائیکل دوڑانے لگا۔

ژژژ

بڑی بیگم، رفیعہ کو دیکھ کر کھل اٹھیں۔ بڑی گرم جوشی سے گلے لگایا۔ محبت سے اپنے قریب صحن میں تخت پر بٹھایا عادل کرسی پر بیٹھ گیا۔



”رفیعہ! بہت خوش ہو رہی ہے تمہیں دیکھ کر۔“

”مجھے بھی بہت خوشی ہو رہی ہے، بس چاہتے ہوئے بھی فرصت نہیں ملتی۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو رفیعہ، گھر کے ہزار بکھیڑے ہوتے ہیں۔“ بڑی بیگم نے تائید کی۔

”کام تو اتنے نہیں ہوتے عادل کے ابا کی بیماری نے بالکل پیر باندھ دیے ہیں۔“

بڑی بیگم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”آج تو بہت خوشی کا دن تھا۔ عادل نے اپنے ابا کے اسٹور کو کھولا ہے زردے کی دیگ بنوائی تھی۔ آپ سب کے لیے لے کر آئی ہوں۔“

”ماشاء اللہ، اللہ مبارک کرے۔“ بڑی بیگم نے بڑے سے شاپرہیں بندھی دیکھی پکڑتے ہوئے کہا۔

”بس دعا کیا کریں۔“ رفیعہ نے ان سے کہا۔

”رفیعہ! اللہ خوش رکھے، آباد رکھے یہ بچے پھلیں پھولیں۔ یہی رات دن دعا کرتی ہوں۔“

”یہ شاہدہ، افتخار نظر نہیں آرہے۔“ رفیعہ نے چاروں طرف نظر دوڑانے کے بعد پوچھا۔

”وہ گھر میں ہیں ہی نہیں، تانیہ کو کچھ خریدنا تھا شاہدہ اور میاں افتخار بھلا کیسے ٹال سکتے تھے۔“

”ابھی گئے ہیں کیا؟“

”نہیں آنے والے ہوں گے۔ انہیں پتا ہے کھانا لگنے کا وقت ہو گیا ہے۔“ بڑی بیگم نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”کھانا لگا دوں۔“ اسی اثنا میں ناجی نے باورچی خانے سے آکر پوچھا۔

”ہاں! اور سنو پہلے شامی کباب فرائی کرو اور مسالا لگے ہوئے چکن کو ڈیپ فریزر سے نکال کر کڑاہی میں ڈال کے چولہے پر رکھو جب گوشت کھل جائے تو ٹماٹر، ہری مرچ اور گرم مسالا ڈال کر بھون لینا۔“ انہوں نے رفیعہ اور عادل کی وجہ سے ناجی کو ہدایت کی۔

”جی اچھا۔“

”اور سنو! سلاد، رائتہ بھی ڈھنگ سے بنانا دال خشکا بن گئے؟“ انہوں نے اسے روک کر مزید ہدایت کی اور پوچھا۔

”جی سب تیار ہے، میٹھا بھی بنا دیا ہے۔“ ناجی نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“

”ہمیں تو پھر اجازت دیں۔ عادل کے ابا کو کھانا دینا ہے اور ان کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔“

”ہیں! ارے بائولی ہوئی ہو، نہ کچھ کھایا نہ پیا، ایسے کیسے بھیج دیں۔“

”اماں جان! کوئی ضروری تو نہیں ہے۔“ اتنی دیر میں عادل نے پہلی بار زبان کھولی۔

”ارے عادل میاں! آپ چپ رہو، یہ ناجی کو ہدایت ہم نے اپنے لیے دی ہے۔ ہمارے رات کے کھانے میں دال اور خشکا ہی بنتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”مگر“ عادل نے کچھ کہنا چاہا۔

”ارے بیٹا! بھول کے آ گئے ہو تو سب سے مل کر جانا۔“

”دیر ہو جائے گی۔“ رفیعہ نے کہا۔

”نہیں ہوتی ہم خود جا کر دیکھتے ہیں۔ بس دس منٹ بیٹھو۔“ بڑی بیگم نے اصرار کیا اور خود کچن کی طرف چلی گئیں۔

”آپ کو بہت شوق تھا یہاں آنے کا۔“ عادل بور ہو رہا تھا۔

”بیٹا! رشتے داری ہے اور نبھانی ہے، نہیں معلوم کہ کیوں یہاں آنے کا شوق ہے۔“ رفیعہ نے مسکرا کر دھیرے سے پوچھا۔ تو وہ تانیہ کے خیال سے چپ ہو گیا۔

سچ مچ دس بارہ منٹ میں کھانا میز پر لگ چکا تھا، مگر رفیعہ نے ان کے بلانے پر سب کا انتظار کرنے کو کہا۔ تو وہ بولیں۔

”رفیعہ! یہ اس گھر کا دستور نہیں، کھانے کا وقت ہو گیا کھانا تیار ہو تو کوئی ہو یا نہ ہو، جو موجود ہوتے ہیں کھالتے ہیں۔ بعد میں کسی کے لیے کھانا نہیں لگتا۔

”مگر...“ عادل نے کچھ کہنا چاہا۔

”اگر مگر چھوڑو عادل میاں، کھانا کھاؤ۔“ انہوں نے بڑی صاف گوئی سے اسے کھانے پر مجبور کر دیا۔

”ناجی! ٹرے زرتاشیہ کو دے کر آؤ، زبیر بھی آگیا ہے۔“ بیٹھتے ہوئے ناجی کو آواز دے کر کہا۔

”فرحان! کہاں ہوتا ہے؟“ عادل نے پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”فرحان بھی ہوگا دوستوں کے ساتھ، آج کل اس کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں ہے۔“ بڑی بیگم نے سرسری انداز اختیار کیا۔

”زرتاشیہ کیسی ہے؟ نرگھس کو ملے بھی زمانہ ہو گیا۔“ رفیعہ نے قطعاً انجان ہونے کے باعث کہہ دیا۔ بڑی بیگم کے چہرے پر بہت سی شکنیں بنیں اور اپنا تاثر رفیعہ پر واضح کر گئیں۔

”رفیعہ تم تو اپنی ہو، تم سے کیا پردہ؟ نرگھس تو میرے زبیر کی زندگی کا ناسور ہے، پھول سی بچی ماں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے کھلا کے رہ گئی ہے اور وہ بھائی کے پاس عیش کر رہی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ رفیعہ چونکیں۔

”مطلب یہی کہ گھر سے گئی ہیں نہ خیر نہ خبر زرتاشیہ کا ٹخنہ اتر، پلستر چڑھا رہا اس نے پلٹ کر نہیں پوچھا جانے کیا چاہتی ہے؟“ بڑی بیگم افسردہ سی

ہو گئیں۔ نوالہ پلیٹ میں ہی رہ گیا۔ رفیعہ کو بھی حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ ہو رہا تھا۔

”زرتاشیہ اکیلی رہ رہی ہے؟“

”ہاں زبیر آجاتا ہے کچھ وقت یہاں آجاتی ہے تھوڑا بہت وقت نکال کے ہم چلے جاتے ہیں۔ تم جانتی ہو اس گھر کے الجھائوں سے ویسے ہی فرصت نہیں ملتی۔ بس بچی اتنی صابر شاکر ہے کہ کیا بتائوں۔“ بڑی اماں کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

”یہ تو نرگھس نے برا کیا۔“ رفیعہ نے کہا

”ارے برے سے برائی ہی کی توقع رکھنی چاہیے۔“ وہ چلا پڑیں۔ اندر کا غصہ باہر نکال دیا۔

”ظاہر ہے آپ کے لیے تو نئی پریشانی کھڑی ہو گئی۔“

”اسی لیے تو رفیعہ بی اس سے زرتاشیہ کی شادی کی ہزار بار بات کر چکی ہوں۔ وہ اس گھر میں آجائے تو چلو مجھے سکون مل جائے۔ ہاں بھئی تم کو عادل کی شادی کی جلدی نہیں ہے کیا؟“ انہیں بولتے بولتے ایک دم یاد آگیا تو خاصا دبائو ڈال کے بولیں۔

”اب بس شادی ہی کرنی ہے۔ پہلے عادل کی ملازمت کا مسئلہ تھا۔ اب ماشاء اللہ اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ تو میں یہ بات ہی کر کے جائوں گی۔“ رفیعہ نے ان کی بھرپور تائید کی۔

”بس جلدی کا کہو، ورنہ تانیہ بی بی بہت اونچی ہوائوں میں ہیں۔“

”امی! اب چلیے دیر ہو گئی ہے اسٹور مجھے جا کر خود لاک کرنا ہے۔“ عادل نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں، اماں جان! اب اجازت دیجیے۔ بس شاہدہ کو آپ پیغام دے دیجیے گا اور میں تانیہ کے لیے سوٹ لائی ہوں وہ دے دیجیے گا۔“ رفیعہ نے کھانے کی میز سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ بڑی بیگم نے محبت سے رفیعہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔  
عادل نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ بڑی بیگم گیٹ تک انہیں رخصت کرنے  
آئیں۔

☆☆...☆☆...☆☆

رات کو ان لوگوں کی واپسی خاصی دیر سے ہوئی۔ بڑی بیگم، ناجی دونوں سو  
گئی تھیں۔ کافی دیر ہارن دینے پر ناجی کی آنکھ کھلی۔ بڑی بیگم دن میں تو بہت  
محتاج نیند سوتی تھیں لیکن رات کی دوائیں ایسی تھیں کہ جن کی وجہ سے  
خاصی گہری نیند آتی تھی۔ ناجی نے گیٹ کھولا۔ میاں افتخار نے گاڑی اندر کھڑی  
کی۔ فرحان کی گاڑی نہیں تھی۔ وہ تو کچھ سوچ کر ٹال گئے۔ البتہ شاہدہ بیگم نے  
پوچھ لیا۔

”فرحان نہیں آیا ابھی۔“

”وہ“ اس نے فون کر کے بتادیا تھا کہ رات دوست کی طرف رہے گا۔“  
میاں افتخار نے جلدی سے کہا۔ شاہدہ بیگم خاموشی سے مطمئن انداز میں تانیہ

کے ہمراہ اندر چلی گئیں۔ میاں افتخار بھی سیدھے کمرے کی طرف چلے گئے۔  
کسی کو کسی کے آنے جانے کی خبر نہ ہوئی۔

صبح سویرے بڑی بیگم نے نماز پڑھ کر کمرے سے باہر آتے ہی۔ واشنگ مشین  
لگا کر کپڑے دھونے میں مصروف ناجی سے پڑتال کی۔

”یہ لوگ کتنے بجے آئے تھے؟“

”رات کو آگئے تھے۔“ ناجی نے سادگی سے جواب دیا۔

”رات کو کتنے بجے آئے تھے یہ بتائو۔“

”میں نے گھڑی نہیں دیکھی تھی۔“ وہ دانستہ ٹال گئی۔ حالانکہ اس کی نگاہ وال  
کلاک پر پڑی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

”تجھے سب پتا ہوتا ہے چشم پوشی کرتی ہے۔“ وہ خود گھاگ تھیں۔

”آپ کو تو بس تھانے دار ہونا چاہیے تھا۔“ ناجی نے جل کر جواب دیا۔



”ارے تو پگلی، ہماری اماں جان تھانے دار ہی تو ہیں گھر کی تھانے دار۔“ اس لمحے میاں افتخار اخبار لیے صحن میں آتے ہوئے بولے تو ناجی ہنس پڑی۔ اماں جان بھی خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ تخت پر ان کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

کچھ دیر تسبیح پڑھنے میں مصروف ہوئیں۔ فارغ ہوتے ہی باورچی خانے میں جانے سے پہلے ان سے پوچھا۔

”میاں کہاں گئے تھے جو گھر یاد نہ رہا۔“

”بس تانیہ اور شاہدہ نے شاپنگ کی اور اس میں دیر ہو گئی تھی، گھر کے کھانے کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے باہر کھانا کھلانا پڑا۔“

”ارے رہنے دو میاں، تم بیٹی، بیوی کے سامنے دم نہیں مار سکتے انہوں نے فرمائش کی ہوگی اور تم سر جھکا کر چل دیئے۔“ وہ خاصی کڑک آواز میں بولیں۔

”اماں جان! کیا کریں ابھی اس گھر میں رہنا جو ہے، آپ کو تو پتا ہے ہم آپ کی بیٹی کے سامنے پہلی دفعہ ہی سر جھکا بیٹھے تھے۔“ وہ شرارت سے بولے تو ناجی کھی، کھی کر کے ہنسنے لگی۔

”تو کیوں دانت نکال رہی ہے۔“ وہ ناجی پر برس پڑیں۔

”ہاں! تمہاری یہ جرأت کہ تم ہماری فرمانبرداری کا یوں مذاق اڑاؤ۔“ میاں افتخار نے آنکھ دبا کر ناجی کو ڈانٹا۔

”کتنے عرصے بعد رفیعہ بے چاری آئی تھی اور بیٹھ بیٹھ کر چلی گئی۔“ وہ نارمل سے انداز میں بولیں۔

”کیا بھابی آئی تھیں، کب؟“ میاں افتخار چونکے۔

”تم لوگوں کے جاتے ہی آئی تھیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اب ہم نے اونچے لوگوں کے ڈھنگ اپنالے ہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ ناجی کو باورچی خانے میں آنے کا کہہ کر خود بھی چلی گئیں۔ بات درمیان میں رہ گئی۔

اور دوبارہ جب ناشتا میز پر لگ گیا۔ میاں افتخار، شاہدہ آکر بیٹھ گئے ناجی نے تانیہ کی طرف سے ابھی نہ آنے کا اعلان کر دیا تو اماں جان نے ناشتا شروع کر دیا۔ میز پر زردے کی پلیٹ دیکھ کر شاہدہ چونکیں۔

”خیریت! اماں جان یہ ناشتے پر ہماری پسند کا اہتمام۔“ میاں جی کی باچھیں کھل اٹھیں زردہ انہیں بہت پسند تھا۔ بلکہ میٹھا کھانے کے ساتھ روزانہ ہی ان کی وجہ سے بنتا تھا۔

”آپ نے رات زردہ بنایا تھا۔“ شاہدہ نے پوچھا۔

”ارے نہیں بھئی، رات رفیعہ اور عادل آئے تھے۔ عادل کے کام شروع کرنے کی خوشی میں زردے کی دیگ بنوائی تھی۔ ہاں یاد آیا۔ تانیہ کے لیے ایک سوٹ بھی دے گئی ہیں۔“ انہوں نے تفصیل سے بتایا شاہدہ بیگم کے چہرے پر سناٹا سا چھا گیا۔ جب کہ میاں افتخار خوش ہو کر بولے۔

”پھر تو سب سے پہلے زردہ ہی کھائیں گے۔“

”جی، آپ کے بھتیجے نے تیر مارا ہے، ضرور کھائیے۔“ شاہدہ بیگم نے دبی دبی نرمی اور دبا دبا طنز یک جا کر دیے۔ تو میاں جی کے ساتھ اماں جان بھی ٹھٹکیں۔

”کیا مطلب؟“ اماں جان نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، اب زردہ باٹنا وہ بھی اسٹور کھولنے کی خوشی میں مجھے تو کچھ پسند نہیں آیا، بھئی آپ لوگوں کے لیے خوشی کی خبر ہے۔“ شاہدہ بیگم نے آملیٹ پلیٹ میں ڈالتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا۔

”بھئی آج کے دور میں اپنا کام ہی وارے میں آتا ہے۔ نوکریوں میں کچھ نہیں پڑا۔ پہلی بات تو یہ کہ نوکریاں ملنا آسان نہیں، دوسری بات یہ کہ مارکیٹنگ اور سیل میں خون نچوڑنے کے بعد بھی کوئی مستقبل نہیں سمجھا جا رہا۔“ میاں افتخار نے حسب پسند زردے پر دہی ڈال کے کھاتے ہوئے کہا۔

”ارے لڑکا ہیرا ہے ہیرا، ایسی اولاد اللہ سب کو دے۔ رفیعہ کو شاباش ہے ایسی تربیت کی ہے کہ دل خوش ہوا ہے۔“ اماں جان نے توصیفی کلمات کے

ذریعے شاہدہ کو پہلو بدلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اماں جان ان کی تربیت پر تنقید کر رہی ہیں، مگر وہ خاموش رہیں۔

”ہم نے تو کہہ دیا رفیعہ سے کہ اب بیٹے کی شادی جلدی کرو۔“ اماں جان نے ایک اور ایسی بات کہہ دی جو شاہدہ بیگم کے لیے برداشت کرنی مشکل ہو گئی وہ معذرت کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میاں جی کو کچھ تشویش سی ہوئی۔ مگر خاموش رہے۔

واش روم سے باہر نکلی تو ناجی نے بیڈ پر رکھے شاپر کی طرف اشارہ کیا اور صفائی میں مصروف ہو گئی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے تولیہ ایک طرف رکھ کر بال جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

”خود ہی دیکھ لیں، آپ کے لیے تحفہ آیا ہے۔“ ناجی نے شریر انداز میں بتایا۔

”تحفہ کون لایا ہے اور ہے کیا؟“ بڑبڑاتے ہوئے اس نے شاپنگ بیگ سے پیکٹ نکالا پھر اسے کھولا تو لان کا سوٹ نکلا اس نے ابرو چڑھا کر ایک بار پھر ناجی کی طرف دیکھا۔

”تم ٹھیک سے بتاتی کیوں نہیں کون لایا ہے یہ چیتھڑے؟“

”توبہ، توبہ تانیہ بی بی، ان کپڑوں کو آپ چیتھڑے کہہ رہی ہیں۔ یہ آپ کے سسرال سے آئے ہیں۔ رفیعہ بیگم صاحبہ اور عادل صاحب لائے تھے۔“ ناجی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بتایا تو اس کو پتنگے لگ گئے۔

”کیوں، کیوں لائے تھے؟ اور تم نے کیوں لیے؟“ اس نے پیکٹ اس کے منہ پر دے مارا۔

”میں نے تو نہیں لیے بڑی بیگم صاحبہ کو دے کر گئے ہیں اور اس میں حرج کیا ہے۔ وہ اتنی خوشی سے لائی ہیں۔“ ناجی نے تنک کر کہا۔

”ہنسہ! خوشی سے، لے جاؤ یہ فوراً، کسی نوکر کو دے دو، یا خود رکھ لو، میں تو ایسے کپڑے پہنتی ہی نہیں۔“

ناجی نے بالکل ایسا ہی کیا اٹھا کر بڑی بیگم کے حوالے کر آئی۔ وہ اس وقت زرتاشیہ کو گلے سے لگائے دھیرے دھیرے باتیں کر رہی تھیں۔ اس لیے کوئی نوٹس نہ لیا۔ مگر جیسے ہی زرتاشیہ اٹھ کر گئی۔ تو وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئیں اور کھلے پیکٹ سے سب کچھ سمجھ گئیں۔ اس وقت میاں افتخار اور شاہدہ گھر پر نہیں تھے۔ اس لیے وہ چپ ہوئیں کہ شام کو بات کروں گی۔ حالانکہ تانی نے تو جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بلاوجہ بات بڑھے مگر ناجی نے باورچی خانے میں قصہ چھیڑ دیا۔

”بڑی بیگم صاحبہ! تانیہ بی بی کو یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔“ ہنڈیا بھونٹتے بھونٹتے ان کا ہاتھ رک گیا۔

”اس نے کچھ کہا ہے؟“ پر تفتیش نظروں سے اسے گھورا۔

”نہیں مگر آپ کو ان کی حرکتوں سے اندازہ نہیں ہے کیا؟“

”اندازہ تو ہے“ شاہدہ نے ہی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اچھی ماں بن کر تربیت نہیں کی۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولیں۔

”آپ شاہدہ بیگم صاحبہ کو برا نہ کہا کریں۔ وہ تو بہت اچھی ہیں۔“

”ہاں بہت اچھی ہیں، خاموشی سے سب فرمائشیں پوری کرتی ہیں۔ نہ بیٹی پر توجہ اور نہ بیٹے کی فکر، رات سے برخوردار غائب ہیں۔ کسی نے پوچھا۔ ہمیں تو ویسے ہی دقیانوسی کہتے ہیں۔“ بڑی بیگم نے کہا۔

”اچھا میں تانیہ بی بی کے کپڑے استری کرنے جا رہی ہوں۔“ ناجی نے سلاہ تیار کر کے ہاتھ دھوئے اور جانے کو مڑی۔

”انہیں اب کہاں جانا ہے؟“

”کیا پتا۔“

”پہلے زرتاشیہ کے پاس جائو اور کہو کہ ہم نے پسندے بنائے ہیں، کھانا یہاں ہمارے ساتھ آکر کھائے، زبیر کے لیے بھی کھانا رکھ دیں گے۔“ انہوں نے اسے کہہ کر بھیجا اور خود ابلتے ہوئے پانی میں چاول ڈالنے لگیں۔ دراصل پسندے زبیر احمد کو بہت پسند تھے، نرگس تو کبھی ان کی پسند کا خیال رکھتی نہیں تھی اس لیے وہی بیٹے کی پسند کی اکثر ڈشز بناتی تھیں۔ آج کل تو انہیں

ویسے بھی اندر ہی اندر غم کھائے جا رہا تھا اور زرتاشیہ کی فکر ستارہ ہی تھی۔ ماں کی غیر موجودگی میں وہ بالکل کملا کے رہ گئی تھی۔ کیا کریں اور کیا نہ کریں یہ سرا ان کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔

☆☆...☆☆...☆☆

پچھلے دو گھنٹے سے میاں افتخار اکیلے اسے سمجھا رہے تھے۔ فرحان بالکل خاموش تھا۔ ایاز اور صائمہ بھی چپ تھے۔ سامعہ خود ساکت سی بیٹھی تھی۔ میاں جی نے اپنی بات مکمل کر کے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ ٹھیک سوچ رہے ہیں یا غلط۔

”میرا خیال ہے کہ آپ کی پلاننگ ٹھیک ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”لیکن کیا یہ راز رہ سکے گا۔ کہیں کوئی جان پہچان والا مل گیا تو؟“ صائمہ نے پوچھا۔

”مل تو سکتا ہے۔ اس کے لیے کچھ عرصہ سامعہ کو بالکل لوگوں سے کٹ کے رہنا ہوگا۔ میری کوشش ہوگی کہ جلد از جلد اس کو اصل جگہ قائم کرا سکوں۔“ میاں افتخار نے جواب دیا۔

”اور وہ فرحان کی شادی والا معاملہ؟“ ایاز بولا۔

”بیٹا! وہ بہت زور شور سے جاری ہے۔ دراصل بچپن کے فیصلے اتنی آسانی سے بدلے نہیں جاتے۔ وہ بھی ایسے گھر میں جس میں چیف آف آرمی اسٹاف ہماری ساس جیسی ہو۔“ میاں جی ہنس کر بولے۔

”اور آنٹی؟“ صائمہ کی زبان پر یہ لفظ اٹکا۔

”وہ بہت فرمانبردار بیٹی اور ممتا سے بھرپور ماں ہیں۔ ہماری حیثیت ان دونوں کے درمیان کیا ہوگی۔ یہ خود سوچ لیں۔“

”پھر سامعہ کا کیا ہوگا؟“ ایاز اور صائمہ پریشان ہو کر ایک ساتھ بولے۔



”صرف سامعہ کا نہیں، فرحان اور فرحان کے ابا بھی رگڑے میں آئیں گے۔ لیکن پوزیٹو سوچو، سامعہ کے جانے سے کوئی نئی بہتری بھی تو آسکتی ہے۔ بات سے بات نکل سکتی ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، سامعہ کو حسب پروگرام لے جایئے۔ آگے دیکھا جائے گا کیوں سامعہ؟“ فرحان نے پہلی مرتبہ اس سے کہا۔

”جیسے آپ کہیں، میں تو آپ کے فیصلے کے احترام کی پابند ہوں۔ جو ہوگا وہ میرا مقدر مگر میں آپ کے لیے اور میاں جی کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہونے دوں گی۔“ سامعہ نے بڑے رسان سے جواب دیا۔

”جیتی رہو بیٹا! ہم پوری کوشش کریں گے کہ آپ کو، آپ کا حق ملے خوشیاں ملیں۔“ میاں جی نے اٹھ کر سامعہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”اب تم استعفیٰ لکھ دو۔ مختصر سا سامان پیک کرو اور بابا کے ساتھ آجاؤ۔“ فرحان نے ایک دم کہا۔

”ابھی۔“ وہ چونکی۔

”ہاں! جو کرنا ہے اس میں تاخیر کیوں کی جائے۔“

”چلو ایسا ہی کر لیتے ہیں۔ فرحان پہلے چلا جائے۔ آج اس کی ماما اور بہن سب گھر میں ہیں۔ ہم آکر دھماکہ کرتے ہیں۔“ میاں جی نے بھی فرحان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”چلیں سامعہ بھابی آپ وہم نہ کریں۔ اللہ کا نام لے کر جائیں۔“ ایاز نے سامعہ کے چہرے پر پھیلی فکر کی پرچھائیاں دیکھ کر کہا۔

”میں فکر مند نہیں ہوں ایاز بھائی اس تذبذب میں ہوں کہ کیا میں فرحان کے لیے کچھ کر سکوں گی؟“

”اللہ سے اچھائی کی امید رکھو۔“ فرحان نے سامعہ کو براہ راست مخاطب کیا۔

☆☆...☆☆...☆☆

کھانا ختم کر کے زبیر احمد ہاتھ دھونے کے لیے واش روم کی طرف گئے زرتاشیہ نے میز سے سب برتن سمیٹ کر کچن کا رخ کیا۔ زبیر احمد ہاتھ

صاف کرتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں جانے سے پہلے زرتاشیہ کو بھی اپنے پاس آنے کا کہہ کر گئے اس نے کچن سے ہی جی اچھا کہا زبیر احمد نے کمرے کا اے سی آن کیا۔ ایزی چیئر پر بیٹھے تو فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بادل نحواستہ انہیں وہ فون اٹینڈ کرنا پڑا۔

”ہیلو۔“

”زبیر! فون بند نہیں کرنا۔ میری بات سنو۔“ دوسری طرف نرگس تھی۔ وہ جزبز سے ہو کر بولے۔

”راستے بند کرنا“ فون بند کرنا میری عادت نہیں ہے۔“

”چلو یہ برائی بھی مجھ میں ہی ہے۔“ وہ تڑخی۔

”بے کار بحث کا کیا فائدہ؟ مطلب کی بات کرو۔“

”دیکھو! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے اب واپس نہیں آنا۔ لہذا آپ مجھے آزاد کر دو۔ نہ آپ کو شکایت نہ مجھے شکایت۔“ وہ بڑی صاف گوئی سے بولی۔

”ٹھیک ہے کاغذات بھیج دو۔ میں دستخط کر دوں گا۔“ بڑی ہمت سے انہوں نے بھی کہہ دیا۔

”زبیر میری بیٹی تم مجھے دے دو۔“ وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

”وہ خود مختار ہے۔ اپنا فیصلہ میں اس پر مسلط نہیں کر سکتا۔“

”مجھے معلوم ہے، اسی کو تو میرے خلاف استعمال کرو گے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”بیٹی کو بھی بدگمانی کی نگاہ سے دیکھتی ہو۔“ وہ طنزیہ ہنسے۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ سنبھال کر رکھو بیٹی کو بھی۔“

”نہیں جو کچھ چاہیے آکر لے جاؤ زرتاشیہ اگر جانا چاہے تو اسے بھی لے جاؤ

مگر اب مجھ سے کبھی تقاضا نہیں کرنا۔“ انہوں نے یہ کہہ کر فون کھٹ

سے بند کر دیا۔ کرسی کی پشت سے سر ٹکایا تو زرتاشیہ نے گلے میں بازو حائل کر دیے۔

”پپا! پلیز آپ اپ سیٹ نہ ہوں۔“

”جان عزیز! میں کہاں اپ سیٹ ہوں۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”مما نے اس دن بھی فون پر ایسا ہی کہا تھا۔“

”اور وہ ایسا ہی کہتی رہیں گی۔ میں بخوبی جانتا ہوں۔“ وہ ہنسنے دکھ کے ساتھ۔

”تو پھر؟“

”پھر کیا بیٹا آپ کی دادو کہتی ہیں کہ ہوا کو زنجیر نہیں پہنائی جاتی ضدی گھوڑی کو لگام ڈالی نہیں جاتی۔“

”پپا! ایک بار آپ ان سے مل کر بات کریں۔“

”نہیں بیٹا! یہ چیپٹر اب کلوز ہو چکا ہے۔ آپ سوچ لو کہ آپ کو کس کے پاس رہنا ہے۔“ وہ خاصے افسردہ سے لہجے میں بول کے خاموش ہو گئے۔

”پپا! ممّا اگر غلط ہیں تو آپ انہیں سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کریں گے؟“

”زرتاشیہ! آپ سمجھ دار ہو، خود بتائو جو وہ ارادہ کرتی ہیں۔ کبھی اس سے واپس آئیں اور سمجھانے کی کمی تو گلریز بھائی نے بھی نہیں چھوڑی ہوگی۔ نرگس آپ کی ممّا بعد میں ہیں اور میری بیوی پہلے، میں رگ رگ سے واقف ہوں۔ اس نے اس شادی کو کبھی دل سے قبول ہی نہیں کیا۔ اب تو وہ منہ سے فیصلہ مانگ رہی ہے۔ آپ چاہتی ہو کہ آپ کے پپا اس کے پیروں پر سر رکھ کے منائیں۔ تو آپ کی خوشی کے لیے میں شاید ایسا کر دوں۔“ وہ بولتے بولتے ذرا دیر کو رکے تو زرتاشیہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”نہیں پپا میں ایسا کبھی نہیں چاہوں گی۔ میں تو بس آپ دونوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“ وہ رو دی۔

”بیٹا! ہر بچہ یہی چاہتا ہے۔ مگر ضروری نہیں کہ سب مائیں ایسا چاہیں یا سب باپ ایسا کریں۔ اب تک سمجھوتے کی جو چادر اس گھر پر تنی رہی وہ صرف آپ کی وجہ سے تھی۔ خود سوچو کتنی معمولی سی بات کا بہانہ بنا کر وہ ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔“ انہوں نے اسے گلے سے لگا کے دھیرے دھیرے کہا۔

”یہی تو دکھ ہے انہوں نے میرا بھی خیال نہیں کیا۔“

”بس اب آپ بھی کچھ نہ سوچو، آپ کو کون سا ہمیشہ یہاں رہنا ہے اور میں ٹھہرا بیمار آدمی، جانے کب دل جواب دے جائے۔“ انہوں نے اس انداز سے کہا کہ وہ شدت غم سے تڑپ اٹھی۔ اپنا ہاتھ ان کے لبوں پر رکھ دیا۔

”پاپا! اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے۔ آپ کے سوا میرا کون ہے؟“

”وہ ہے نافرمان وہ ہماری بیٹی کا بہت خیال رکھے گا۔“ فضا خوش گوار بنانے کے لیے زبیر احمد نے شرارت کا سہارا لیا۔ تو وہ روتے روتے مسکرا دی اور شرما گئی۔ بظاہر زبیر احمد مطمئن ہو گئے اور اسے مطمئن بھی کر دیا لیکن حقیقت

میں ان کی آنکھوں کے کونے نم تھے۔ رفاقت تلخ تھی مگر اس عمر میں یہ فیصلہ کڑا اور تکلیف دہ تھا، مگر نرگھس کو یہ سمجھانا بہت مشکل تھا۔ اسے رفاقت کے کسی ایک لمحے کا بھی احساس نہیں تھا۔ لاکھ کم گو، سنجیدہ سے زبیر احمد اس کی نظر میں تھے۔ مگر انہوں نے جب جب اس کی آنکھوں میں قربت کے احساس کی چمک دیکھی تھی اسے احساس سے بڑھ کر پیار دیا تھا۔

بہت عرصے تک زبیر احمد یہ سوچتے رہتے تھے کہ اسے کس طرح خوش رکھا جا سکتا ہے۔ کئی مرتبہ تو انہوں نے اس سے یہ پوچھ بھی لیا تھا مگر ہر بار وہ تڑخ کر یہی کہتی تھی کہ

”زبیر احمد! تم وہ بن ہی نہیں سکتے جو مجھے خوش رکھ سکے۔“ اور زبیر احمد سر تا پیر سلگ اٹھتے۔

☆☆...☆☆...☆☆

بڑی بیگم کی نگاہیں مسلسل فرحان پر جمی ہوئی تھیں۔

اضطراب میں وہ ہاتھوں کے ناخن دانتوں سے کاٹتا تھا۔ اس وقت بھی صحن میں ٹہلتے ہوئے وہ ایسا ہی کر رہا تھا۔ چھالیہ کترتے ہوئے وہ بغور اس کو گھور رہی تھیں، مگر وہ اپنی ہی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ ایک ہی وقت میں خوش، پریشان، بے چین دکھائی دے رہا تھا۔

”فرحان کیا بات ہے۔“ آخر کار وہ پوچھ ہی بیٹھیں۔

”جی... ک... کچھ نہیں۔“

”میاں! کچھ تو ہے، پالا پوسا ہے خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ناخن کب اور کیوں کترتے ہو؟“ وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

”کچھ نہیں دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ صاف ٹال گیا۔

”تو پھر ہمارے پاس بیٹھ کر انتظار کر لو۔“

وہ ان کی کھوجتی نگاہوں اور تیکھے سوالوں سے بچنے کے لیے کمرے کی طرف بڑھنے کو تھا کہ زرتاشیہ کی آواز پر ٹھٹکا۔

”فرحان!“

”جی فرمائیے۔“ لہجے کی بے زاری دبا کر بولا۔

”یہ کچھ چیزیں لانی ہیں مجھے مارکیٹ لے چلیے۔ پپا نے کہا ہے۔“ وہ ہاتھ میں پکڑی فہرست دکھاتے ہوئے بولی۔

”آئی ایم سوری۔ میں اس وقت مصروف ہوں۔“

”ہیں! خوا مخواہ کے مصروف ٹہلنے میں جو وقت برباد کر رہے ہو وہ کام میں لگالو، لے جاؤ۔“ بڑی بیگم نے لتاڑا تو وہ سیخ پا ہو گیا۔

”میں نوکر نہیں ہوں۔“

”ارے واہ بھئی! اچھے تیور ہیں، صاحب زادے بنا سوچے سمجھے اتنی بڑی بات کہہ دی۔“ بڑی بیگم کو بھی شدید غصہ آ گیا۔

”رہنے دیں دادو میں کل پپا کے ساتھ لے آؤں گی۔“ زرتاشیہ سہم گئی۔



”کیسے رہنے دیں۔ اتنی بڑی بات کردی یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم اس کی ذمہ داری ہو۔“

”کیسی ذمہ داری۔“ وہ بھی غرایا۔

”فرحان! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“ شاہدہ بیگم وہیں قریب آکر بولیں۔

”مما آپ نانو کو سمجھادیں بس۔“ وہ بگڑا۔

”ارے یہ کیا سمجھائیں گی ان کے ہی تو سر چڑھائے ہو۔“

”فرحان! جائو زرتاشیہ کے ساتھ میں نے سب سن لیا ہے۔“ حسب معمول انہوں نے دھیرے سے کہا۔

”ماما۔“

”پلیز!“ انہوں نے منت کی مگر وہ پیر پٹختا ہو اپنے کمرے کی طرف چلا گیا شاہدہ بیگم شرمسار سی بیٹھ گئیں۔

”ابھی آپ کے انکل آتے ہوں گے۔ ان کے ساتھ چلی جانے۔“ زرتاشیہ کی نم آنکھیں دیکھ کر انہوں نے دلاسا دیا۔

”سچ پوچھو تو شاہدہ میں فرحان کی طرف سے خوف زدہ ہوں۔“ بڑی بیگم نے کہا۔

”کیوں آپ بلاوجہ پریشان ہوتی ہیں۔ اس کا مزاج ہی ایسا ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں نے محبت کی چاشنی میں الفاظ ڈبو کر تسلی دی۔ تو اماں جان کو خاموش ہونا پڑا۔

”ناجی! یہ چھالیہ ڈبے میں رکھو۔“ کچھ فاصلے پر دال صاف کرتی ناجی کو مخاطب کیا۔

”جی اچھا۔“ وہ اٹھ کر قریب آئی عین اسی لمحے میاں افتخار کی گاڑی کا ہارن بجا۔ وہ پہلے گیٹ کی طرف بھاگی۔ عصر کی نماز پڑھنے کی غرض سے شاہدہ اٹھیں اور پھر حیرت زدہ سی رک گئیں۔ اماں جان نے بھی غور سے اسی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ جس طرف شاہدہ کی نظریں جمی تھیں۔ میاں افتخار

گاڑی لاک کر کے ایک بیگ اٹھائے ان کی طرف آئے ان کے بالکل برابر  
ڈرے ڈرے قدموں سے چل کر آنے والی لڑکی قطعاً اجنبی تھی۔ قریب پہنچنے  
پر میاں جی چپکے۔

”سامعہ بیٹا! ان سے ملو یہ ہماری اکلوتی ساس صاحبہ ہیں اور یہ اکلوتی بیگم  
ہیں۔ ہمارے فرحان کی پیاری سی ماما۔“

”صرف فرحان کی۔“ شاہدہ بیگم نے دھیرے سے مسکرا کر میاں جی کو  
چونکایا۔

او ہاں ہماری پیاری سی بیٹی تانیہ بھی ہے۔ ابھی بلواتے ہیں اسے۔“ میاں جی  
نے جلدی سے کہا اور فوراً ناجی کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئی اور فوراً تانیہ کو  
بلانے چلی گئی۔

”افتخار! تعارف پورا کراتے ہیں۔ اور بٹھائو تو سہی۔“ شاہدہ بیگم نے اتنی  
دیرے پریشان نظروں سے دیکھتی سامعہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیگم صاحبہ! یہ ہمارے باس کے عزیز دوست کی بیٹی ہیں ہمارے گھر میں  
رہیں گی نام ان کا سامعہ ہے۔ میاں جی نے بیگم سے اور اماں جان سے  
نظریں چراتے ہوئے مختصراً روانی سے کہا اور دھم سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

”بیٹھو بیٹا!“ شاہدہ نے کہا تو وہ بیٹھ گئی۔

”کہاں سے آئی ہو بیٹا؟“ اماں جان نے پوچھا۔

”جی، وہ سوات سے۔“ پہلی مرتبہ اس نے زبان کھولی۔

”ارے واہ سوات سے۔“ پہلی بار اماں جان کے برابر بیٹھی زرتاشیہ خوشی سے

بولی تو اماں جان کو جلدی سے خیال آیا۔

”بیٹا! یہ ہماری پوتی زرتاشیہ ہے فرحان کی منگیت۔“

”جی، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ دھڑکتے دل، سہمی سہمی نگاہوں

کے ساتھ زرتاشیہ کو دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ میاں جی اس سے

نظریں چراتے ہوئے جلدی سے بولے۔

”ارے ہمارے گھر کا خاص آدمی تو سامنے آیا ہی نہیں۔“

”کون؟“ شاہدہ بیگم نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

”فرحان‘ ہمارا بیٹا‘ ناجی ذرا فرحان کو تو بلاؤ۔ وہ تانیہ بھی نہیں آئی۔“ وہ براہ راست ناجی سے مخاطب ہوئے۔ سامعہ کا دل زور سے دھڑکا۔

”ناجی! پہلے باورچی خانے میں چلو۔ رات کے کھانے کی تیاری کرو۔ بچی اتنی دور سے آئی ہے۔ کھانا پہلے ہونا چاہیے۔ اماں جان نے اپنی کڑک آواز میں ناجی کو مخاطب کیا۔ وہ تو فوراً سیدھی ہوئی۔ جب کہ میاں جی کو اندازہ ہو گیا کہ ایسا کیوں کہا گیا ہے۔ مگر وہ ٹال گئے۔

”اماں جان سامعہ بیٹی ہفتہ دس دن ہوئے یہاں ہمارے شہر میں رہ رہی تھی آپ کھانے کی فکر نہ کریں۔ اس کو میں کمرہ دکھاتا ہوں۔“

”میاں جی! آپ زحمت نہ فرمائیں۔ میں یہ کام کر لیتی ہوں۔“ شاہدہ بیگم نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

”کون سا کمرہ کھلوانا ہے ہمیں صفائی ستھرائی کرنی ہوگی۔“

”واہ جی! روز ہر کمرہ صاف کرتی ہوں۔ ابھی صفائی کرانی ہے کیا؟“ ہاتھ میں چھری اور پیاز لیے ناجی کسی کام سے وہاں آئی تو جھٹ بولی۔

”ارے ڈسٹنگ کرنی ہے کوئی اہلی کے پانی سے مانجھنا تھوڑا ہے۔“ میاں افتخار نے پھلجڑی جلائی۔ تو ماسوائے اماں جان کے سب ہنس دیے۔

”آہیں سامعہ میں آپ کو اندر لے کر چلتی ہوں‘ تانیہ اور فرحان سے بھی ملواتی ہوں۔“ زرتاشیہ نے خود محبت بھرا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے فوراً میاں افتخار کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں رضا مندی دے دی۔ تو وہ زرتاشیہ کے ساتھ ہولی۔ نازک سی سامعہ کو ساتھ لیے زرتاشیہ تانیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ میاں افتخار نے یہاں تک پہنچنے پر دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

...☆☆☆...

ساکت نظروں اور بے دم خاموشی کے ساتھ زرتاشیہ کے ہمراہ وہ فرحان کے روبرو تھی۔ فرحان کی نگاہوں میں طمانیت کے تمام سامان موجود تھے مگر جانے اسے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ فرحان اس سے دور ہو گیا ہے۔ حالانکہ دور رہ کر اسے قریب محسوس کرتی تھی۔ اب جب کہ وہ اس کے گھر میں اس کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ تو جانے کیوں وہ دور بہت دور محسوس ہو رہا تھا۔ شاید اسے یقین آگیا تھا کہ فرحان کے قریب آکر اسے پانا مشکل کام ہے۔ اس کام کے لیے دشوار اور کٹھن مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔

”ارے آپ کیا سوچنے لگیں۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد زرتاشیہ کو ہی بولنا پڑا۔

”وہ... میں کچھ خاص نہیں۔“ وہ چونکی۔ فرحان اس کی ہکلاہٹ کو بھی خوشی کی کیفیت سمجھ کر مسکرا دیا۔ اب باری زرتاشیہ کے چونکنے کی تھی۔

”گڈ سائن۔“ آپ کے آنے سے اتنا فرق تو پڑا کہ فرحان مسکرانے لگے۔  
 ”ورنہ۔“ پہلی بار سامعہ کے لب ہلے۔

”خیر چھوڑیے۔ ان سے ملیے یہ ہیں فرحان اور یہ ہیں۔“

”سامعہ۔“ کھوئے کھوئے سے فرحان کے لبوں سے اس کا نام پھسلا تو زرتاشیہ کو اور زیادہ حیرت ہوئی۔

”فرحان آپ کو سامعہ کا نام کیسے پتا چلا؟“

”اوہ! وہ بابا نے ذکر کیا تھا۔“ وہ سٹیٹا گیا۔ سامعہ ہولے سے مسکرا دی۔

”پھر تو آپ سامعہ کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوں گے۔“ زرتاشیہ نے پوچھا۔

”ہاں! سب کچھ کچھ بھی تو چھپا ہوا نہیں ہے۔“ فرحان نے ذومعنی انداز میں کہا۔ سامعہ کا دل زور سے دھڑکا زرتاشیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ یہ کہہ کر کچھ دیر کو باہر چلی گئی۔

”میں دیکھ کر آتی ہوں کہ پپا آتو نہیں گئے۔“ جو نہی وہ باہر نکلی۔ وہ دروازے سے لگ کر کھڑ ہو گیا۔ دونوں بازو پھیلائے۔

”کم آن‘ ہری اپ۔“ وہ اسے جزبز دیکھ کر بولا۔ تو وہ جلدی سے اس کی بانہوں میں سما گئی۔

”اپنے گھر میں پیار کے گھروندے میں محبت کا پہلا لمس ہمیشہ یاد رکھنا۔ ویکم ٹو ہوم سوئیٹ ہارٹ۔“ سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ دور سے زرتاشیہ کے قدموں کی آہٹ سن کر جلدی سے الگ ہو گئے۔

”پلیز! احتیاط کی ضرورت ہے۔“ خود کو نارمل کرتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

”کوشش کریں گے حضور، مگر کبھی کبھی تو ایسا کرنے کی اجازت ہے ہمیں۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”آئیے آئیے سامعہ جی فرحان صاحب آپ کو باہر بلا رہے ہیں۔ اسی لمحے زرتاشیہ نے آکر کہا۔

”آپ لوگ چلیں میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

کمرے سے نکلتے ہوئے سامعہ کی نگاہیں اس سے ٹکرائیں اور پھر وہ خاموشی سے زرتاشیہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ان کے جاتے ہی فرحان کی خاموشی میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا خود بخود عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسے بھی بالکل سامعہ کی طرح آج اس گھڑی ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک نئے انوکھے سے فاصلے پر آگئے ہیں۔ سامعہ سے شادی کرنا اس سے آسان تھا۔ اب تو وہ پرانی سی بن کر آئی اور آکر کمرے سے نکل گئی۔

”یا خدا! یہ کس قدر صبر آزما امتحان ہے کیا میں اپنی سامعہ سے دور رہ سکوں گا۔“ بے اختیار ہی وہ بڑبڑایا۔

”فرحان صاحب! کھانا لگ گیا ہے۔“ باہر سے ناجی کی آواز آئی تو وہ نارمل ہو کر باہر نکل آیا۔ دروازے پر کھڑی ناجی کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ فرحان صاحب ایک مرتبہ کے بلانے پر چلے آئے۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا وہ گھور کے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

☆☆...☆☆...☆☆



بڑی بیگم نے فی الحال تو سامعہ کو رات گزارنے کے لیے اپنے کمرے میں رکھا کیوں کہ انہیں افتخار میاں کی یہ تجویز پسند نہیں آئی تھی کہ سامعہ کو فرحان کے ساتھ والا کمرہ دیا جائے۔ یہ سن کر انہوں نے خوب صورت سامعہ کو سر سے پیر تک دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر اس وقت خاموش ہو گئیں شاہدہ بیگم ماں کی خاموشی بھانپ کر چپ رہیں، مگر کمرے میں پہنچ کر وہ خاصی بگڑیں۔

”آپ نے حد کر دی۔“

”خیریت۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولے۔

”جوان جہان لڑکی گھر لے آئے۔“

”تو سڑک پر چھوڑ آتا کیا؟“

”افتخار! بات کی نزاکت کو سمجھا کریں۔ اماں جان کی خاموشی کو سمجھیں۔“

شاہدہ بیگم خاصے غصے میں آ گئیں۔

”اس گھر میں بیگم صاحبہ ہمارے سوا خاموش کوئی نہیں آپ کا بس بھی ہم پر چلتا ہے۔“ وہ معصومیت سے بولے۔

”یہ کتنے دن یہاں رہے گی؟“

”جب تک اس کا گمشدہ شوہر نہ مل جائے۔“

”کیا یہ شادی شدہ ہے؟“ اس سوال میں بھی خاصا اطمینان موجود تھا۔

”ہاں!“ وہ مختصراً بولے۔

”کون ہے وہ؟“

”یہی تو انٹیلی جنس والے معلوم کر رہے ہیں۔“

”اوہ!“ شاہدہ بیگم کے لبوں سے بے اختیار تاسف بھری آواز نکلی تو میاں

افتخار جلدی سے بولے۔

”اب تو وہ یہاں رہ سکتی ہے۔“

”یہ تو اماں جان پر منحصر ہے۔ آپ کو ان کی عادت کا تو پتا ہی ہے۔“

”جی ہاں! کچھ دن آپ اور آپ کی اماں جان مہربانی فرمادیں۔“ میاں افتخار نے منت بھرے انداز میں کہا۔ تو شاہدہ بیگم کو ان کے اس انداز پر ہنسی آگئی۔ میاں جی کو کچھ سکون ملا۔ ایک دم غیر ارادی طور پر ایک نیا جھوٹ بول کے وہ پھنس گئے تھے۔ مگر بات آئی گئی ہوگئی۔

”فرحان! میرے باپ، مجھے پھنسا دیا ہے۔ دو صاحب اقتدار خواتین کے درمیان۔“ وہ بڑبڑائے تو شاہدہ بیگم نے پوچھا۔

”کیا کہہ رہے ہیں۔“

”وہ کچھ نہیں، کل چلو بھائی میاں کی طرف مبارک باد دے آئیں۔“

”کس بات کی مبارک باد؟“ شاہدہ بیگم نے دبا دبا سا طنز کیا۔

”بھئی عادل کے کاروبار کی۔“

”بس آپ ہی جائیں کوئی تیر نہیں چلایا۔ وہ سوٹ تانیہ کو پسند نہیں آیا۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ وہ حیرت سے بولے۔

”فی الحال میرا تھکن سے برا حال ہے، مجھے آرام کرنے دیں۔“ وہ بیزاری سے کہہ کر، لیٹ گئیں۔ میاں افتخار اپنی بے بسی کے باعث، رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔ کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ شاہدہ اپنی فطرت کے مطابق جو بات نہ سننا چاہیں تو اس کے لیے نیند کا سہارا لیتی ہیں اور ایسے میں ان سے کوئی بات کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ویسے بھی وہ بہت صلح پسند آدمی تھے۔ کسی قسم کی بدمزگی اور اضطراب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ سامعہ کو اس گھر میں لا کر جو مشکل کام وہ کر بیٹھے تھے اس کے نتیجے سے بے فکر ہو کر اب رہنا ان کے لیے بھی بہت دشوار تھا۔ جھوٹ کو نبھانے کے لیے جھوٹ بولا۔

”اے اللہ! میری عزت رکھنا، میں جھوٹا نہیں ہوں۔ مگر کسی کی خوشی کے لیے میں کچھ دیر کو جھوٹا بن گیا ہوں۔“ انہوں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کیا۔ ذہنی و قلبی اطمینان کے حصول کے لیے وہ اللہ کے دامن میں پناہ لیتے تھے۔

☆☆☆...☆☆☆...☆☆☆

آخری پیپر دے کر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کینیٹین کے سامنے جا کر رک گئے۔

”کیا خیال ہے بیٹھیں؟“ خرم نے تانیہ سے پوچھا۔

”وہاں سامنے بیٹھتے ہیں۔“ تانیہ نے کینیٹین سے ذرا دور انگلی سے اشارہ کیا۔  
”اوکے لیٹس گو۔“

”آج تو فریڈم ڈے منانا چاہیے۔ اوہ مائی گاڈ! یہ امتحان بھی تھکا ڈالتے ہیں۔“  
خرم کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے وہ بولی۔

”تو چلو مناتے ہیں ڈیر۔“ خرم نے کہا۔

”یار! آزادی تو تمہارے لیے ہے ہماری آزادی کا تو آج آخری دن ہے۔“ وہ  
نرم نرم سبز گھاس پر آلتی پالتی مارتے ہوئے بیٹھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ بھی برابر میں بیٹھ گئی۔

”کل صبح نو بجے کی فلائٹ سے اسلام آباد جانا ہے اور بس۔“ وہ انتہائی  
اطمینان سے بولا تو وہ اچھل پڑی۔

”یومین‘ تم جا رہے ہو۔“

”یہ تو پرانی بات ہے۔“ وہ ہنسا۔

”اور پھر۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”اور پھر کیا‘ اسلام آباد سے امریکا۔“

”اس کا مطلب۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”تانی ڈیر! مطلب وہی ہے جو کئی بار ہیں بتا چکا ہوں۔ باقی تمہارا پروگرام  
امریکا جانے کا بنے تو جلدی بتانا۔“

”بہت خوب امریکا جانا اتنا ہی آسان ہے۔“ وہ طنزیہ ہنسی۔

”چلو، جب تم آنا چاہو تو فوراً بتا دینا۔“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا اور تم واپس نہیں آؤ گے کیا؟“

”موڈ کی بات ہے ڈیڈ جیسا کہیں گے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”بات اتنی سی ہے کہ تم جا رہے ہو۔“

”یس، اب میرا دن خراب نہ کرو، ہنسو مسکرائو۔“

”بس چلو۔“

”ہیں! کیا ہو گیا؟“ وہ چونکا۔

”بس جانا ہے، صبح ناشتا کیے بنا آئی تھی۔ ویسے بھی رات سے گھر ایک مہمان

آئی ہوئی ہے۔ اب تک ملاقات نہیں ہوئی۔“

”واہ! تمہارا گھر اتنا بڑا ہے کہ ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوتی۔“

”میرا مذاق کا موڈ نہیں۔“ وہ بیزار تھی۔

”تمہارا مسئلہ عادل ہے جو ہڈی بن کر تمہارے حلق میں اٹکا ہوا ہے۔“ وہ

خود ہی بولا۔

”اسی لیے تم جا رہے ہو۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”دیکھو! میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔“

’جب میں کہوں گی تو اپنے مام، ڈیڈ کو بھیجو گے۔“ اس نے پوچھا۔

”اوکے۔“

”اور وعدہ کرو کہ تم...“

”سنو میں وعدے نہیں کرتا، تم کو سوٹ کرے تو بتا دینا ورنہ ہم ہمیشہ اچھے

دوست رہیں گے۔“ وہ شوخی سے بولا۔

اوکے بس رابطے میں رہنا۔“ وہ مطمئن ہو گئی۔

”فائن، چلو تمہیں ناشتہ کرائوں۔“

”ہنہ ٹائم تو کھانے کا ہی ہونے والا ہے۔“

”اوکے چلو، مجھے بھی پیکنگ کرنی ہے۔“

تانیہ نے پر امید نگاہوں سے یونیورسٹی میں گزرے آخری دن کو یاد رکھنے کے

لیے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

ناشتے کے بعد سے وہ اب تک بڑی بیگم کے کمرے میں بند تھی۔

فرحان کو، میاں جی اور شاہدہ بیگم کو ناشتے کی میز ہی پر دیکھا تھا۔ اس کے بعد میاں جی اور شاہدہ بیگم تو ڈیوٹی پر گئے اور اسے اماں جان نے آرام کرنے کا کہہ کر کمرے میں بھیج دیا۔ فرحان کی طرف دیکھتی ہوئی وہ کمرے کی طرف چلی آئی تھی۔ دل کو یقین تھا کہ فرحان موقع پا کر ضرور اس کے پاس آئے گا مگر دن کے بارہ بج رہے تھے اس کی دور دور تک کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ دل میں بہت سے اندیشے

بہت سی الجھنیں بے دار ہو کر اسے بے چین کر رہی تھیں۔ کبھی بیٹھتی اور کبھی سٹلنے لگتی۔ ناجی کمرے میں آئی تو اسے اس طرح ٹھلتا دیکھ کر ہنسنے لگی۔  
”کیا ہوا؟“ وہ پریشان ہو کر بولی۔

”آپ کو ایسے سٹلتے دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔“ ناجی نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہا۔

”لیکن کیوں؟“

”بڑی بیگم صاحبہ کے کمرے میں ہر کوئی ایسا پریشان ہو جاتا ہے۔“ ناجی نے بڑے رازدرا نہ انداز میں کہا۔ تو وہ مسکرا دی۔

”مسکرائیں نہیں، جلد از جلد اس کمرے سے کسی دوسرے کمرے میں چلی جائیں۔“ وہ مزید سادگی سے بولی تو سامعہ سنجیدہ ہو گئی۔

”میں یہاں اپنی مرضی کیسے چلا سکتی ہوں۔“

”بات تو ٹھیک ہے یہاں کسی کی مرضی نہیں چلتی۔“ وہ بے بسی سے کندھے اچکا کر بولی۔

”ننانیہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ پرچہ دے کر ابھی آئی نہیں، وہ بھی بہت نخرے والی ہیں، اپنی مرضی سے ملیں گی۔“

”اور فرحان صاحب۔“



”فرحان صاحب تو اپنے کمرے میں ہیں۔“

”ناجی! ناجی کہاں رہ گئیں۔“ باہر سے اماں جان کی گرج دار آواز آئی تو ناجی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”اوہ! میں تو دنداسا لینے آئی تھی۔“ یہ کہہ کر ناجی نے چابی سے لوہے کی بڑی سی الماری کھولی اور دنداسا نکال کر دوبارہ بند کر کے تیزی سے باہر نکل گئی۔

وہ ناجی کے جانے کے بعد غور سے کمرے میں موجود ہر چیز کو دیکھنے لگی۔

پرانی طرز کے پلنگ پر خوب صورت کڑھائی والی سفید چادر، اسی طرز کی بڑی

سی ڈریسنگ ٹیبل جس پر اماں جان کا پاندان، سرے دانی مختلف تیل کی

بوتلیں، لکڑی کی کنگھی، پاؤڈر کا ڈبہ اور دو پرفیوم رکھے تھے۔ اس کے علاوہ

ایک سنگل بیڈ تھا جس پر اس نے رات گزاری تھی۔ صاف ستھرے کشادہ

کمرے میں مکمل صوفہ تھا۔ اس کے ساتھ دو الگ سے کرسیاں رکھی تھیں۔ وہ

سب چیزیں دیکھنے سے اماں جان کے مزاج اور عادت کو کافی حد تک سمجھ

گئی۔ صحن میں کھلنے والی کھڑکی کا پردہ سرکا کے باہر دیکھنے لگی۔ اماں جان اپنے

تخت پر بیٹھی ہاتھ میں شیشہ پکڑے دوسرے ہاتھ سے دنداسا مل رہی تھیں۔

ناجی پالک کاٹ رہی تھی۔ باقی ہر طرف سناٹا تھا۔ فرحان کا کہیں اتنا پتا نہیں

تھا، کچھ دیر مایوس کن نگاہوں سے اسے تلاش کرنے کی مزید کوشش کی اور

پھر چونک اٹھی اس کی کمر کے گرد فرحان کے بازو حائل تھے۔ اس کے وجود

کی گرم سی مہک اس سے لپٹی تھی۔ تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پلٹ کر شاکی

نگاہوں سے فرحان کو دیکھا تو وہ سمجھ گیا اور اسے بانہوں میں لے لیا۔

”اداس تمہیں یا بدگمان۔“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔

”نہ اداس تھی اور نہ بدگمان بس منتظر تھی۔“ وہ بھی دھیرے سے اس کی

بانہوں سے نکلتے ہوئے بولی۔

”میں موقع کی تلاش میں تھا۔ نانو تقریباً آدھا گھنٹہ تو دنداسا ملیں گی اور ناجی

پالک کاٹ کر گھنٹہ بھر پالک دھوئے گی اور اس وقت کو ہم اکٹھا بتائیں

گے۔“

”فرحان پلیز احتیاط ضروری ہے، ہم مشکل میں پھنس سکتے ہیں۔“

”یار جو وقت ملا ہے اسے تو اچھا گزارو۔“

”دل کو سمجھائیے اور اب جایئے پلیز۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”آج اس گھر میں تمہارا پہلا دن ہے رات کو ضرور ملنا۔“ وہ بولا۔ سامعہ کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”جو تم نے سنا ہے! تم نے وعدہ کیا تھا کہ جو میں کہوں گا وہ تم کرو گی

اور...“

”اور کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ کے کہنے سے اختلاف نہیں، آپ کے بابا

کی عزت کا خیال ہے۔“ وہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے بولی۔

”اوکے! لیکن رات کو ملنا ضروری ہے۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا اور وہ الجھن میں گرفتار بیڈ پر گر گئی۔ پہلے دن ہی وہ اسے کس مشکل میں ڈال گیا تھا۔

☆☆...☆☆...☆☆

”ہنہ یہ آگیا اس ہیں لمین جوس اب باری ہے اس کو اوون میں رکھنے کی۔“ خود سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے ڈش اوون میں رکھ کے اس کا ٹمپرچر سیٹ کیا ہاتھ دھوئے اور پھر سلاد بنانے کے لیے مطلوبہ سبزیاں فریج سے نکالنے لگی۔ اپنے کام میں اتنی محو تھی کہ زبیر احمد کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

”واہ! کیا خوش ہو ہے۔“ وہ لمبی سانس بھر کے بولے۔ تو وہ چونکی۔

”پپا! آپ آگئے۔“

”جی ہاں! ہماری بیٹی مزے دار کھانا بنائے اور پپا نہ آئیں یہ کیسے ممکن

ہے؟“ زبیر احمد خوش ہو کر بولے۔

”مگر جلدی کیوں؟“

”دراصل میں کچھری سے آرہا ہوں آفس تو آج جاہی نہیں سکا۔“ وہ یہ کہہ کر دھلی ہوئی سرخ گاجر اٹھا کر کھانے لگے مگر زرتاشیہ زرد پڑ گئی۔

”پپا! کچھری۔“ مشکل سے وہ بولی۔

”ہاں بیٹا کاغذات تیار کرانے تھے۔“ وہ اطمینان سے بولے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور پوچھتی ان کا موبائل فون بج اٹھا وہ بات کرتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ جب کہ بے اختیار ہی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

”مما! آپ نے اچھا نہیں کیا میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“

روتے روتے وہ بڑبڑائی اور بازوؤں میں سر دے کر فرش پر بیٹھ گئی۔ کافی دیر گزر گئی۔ زبیر احمد بھاگتے ہوئے کچن میں آئے تو اوون سے اٹھتے ہوئے دھوئیں اور جلے ہوئے مسالوں کی بو سے ان کا دماغ الٹ گیا۔ اسے فرش پر بیٹھا دیکھا جلدی سے اوون بند کیا۔ ایگزاسٹ فین آن کیا۔ پھر اسے کھینچ کر باہر نکالا۔

”زرتاشیہ! زرتاشیہ کیا ہوا؟“ وہ پریشانی میں اسے روتا دیکھ کر بولے۔

”کچھ نہیں پپا۔“ آنکھیں صاف کر کے روسٹ جلنے کی وجہ سے شرمندہ ہو کر بولی۔

”اٹس اوکے مائی چائلڈ! میں اس کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔ آپ کیوں رو رہے تھے؟ انہوں نے اسے سینے سے لگا کر وفور محبت سے پوچھا۔

”کچھ بھی تو نہیں۔ میں آپ کے لیے کچھ اور بناتی ہوں، آپ تھوڑا سا آرام کر لیں۔“ وہ نارمل ہوتے ہوئے کچن کے اندر جانے لگی۔

”نہیں چلو ہم باہر چلتے ہیں آپ فریش ہو کر آؤ۔“ انہوں نے منع کر دیا۔ مگر اس وقت اس کا کسی چیز میں دل نہیں تھا۔ طبیعت بے چین تھی۔

”پپا! موڈ نہیں ہے۔“

”کوئی موڈ ووڈ نہیں چلے گا۔ آپ فوراً تیار ہو کر آؤ۔“ انہوں نے ایک نہ سنی تو وہ بے دلی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

زبیر احمد کا دل دکھ سے بھر گیا۔ انہیں اس وقت زرتاشیہ بہت تنہا اور ڈپر لیس لگی تھی۔ وہ بطور خاص تو کچھ نہیں جانتے تھے۔ البتہ معلوم تھا کہ وہ ماں کو مس کرتی ہے۔ لیکن کچھ دیر پہلے تو وہ بالکل نارمل تھی۔ ایک دم اسے کیا ہوا؟ یہ سوال انہیں مضطرب کیے ہوئے تھا۔ اس کا دل بہلانے کے لیے ہی باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ ورنہ کھانا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اماں جان کے پاس جانے کی دیر تھی۔ وہ منٹوں میں گرما گرم پھلکے بنا کر دیتیں۔

وہ تیار ہو کر آئی تب بھی چہرہ سوگوار تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ مستقل قسم کی خاموشی تھی، غیر معمولی سنجیدگی اور تیاری میں بھی لا ابالی پن سا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ بلکہ گاڑی میں بھی کوئی بات نہیں کی۔ ریسٹورنٹ میں مینو کارڈ اس کے سامنے کر دیا تو اس نے ایک دم ہی اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کی۔ اس کے پپا اس کی خاطر اب تک بھوکے تھے، اس نے جلدی جلدی مسکرا کر ان کی پسندیدہ دو ڈشز کا آرڈر کیا اور پھر گپ شپ کرنے لگی۔ زبیر احمد کو حیرت تھی۔

”بیٹا! ایکٹنگ پہلے تھی یا اب ہو رہی ہے۔“ وہ پوچھ ہی بیٹھے۔

”نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔“ اس نے مطمئن کر دیا۔

”آپ کچن میں مت جایا کرو، مجھے ڈر لگتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”پپا مجھے کچن میں جانا اور آپ کے لیے کچھ کھانا اچھا لگتا ہے۔“

”تھینک یو بیٹا!“ وہ خوش ہو گئے۔

پھر وہ کھانا آنے سے لے کر کھانے کے دوران بھی ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کرتی رہی جس میں سامعہ کا ذکر بھی شامل تھا۔ زبیر ٹھٹکے اور پہلو بدل کے رہ گئے مگر زرتاشیہ سے کچھ پوچھا نہیں۔

☆☆...☆☆...☆☆

شاہدہ بیگم کا آفیشل ڈنر تھا۔ تانیہ نے مارکیٹ سے خرم کے لیے گفٹ خریدنا تھا وہ میاں افتخار کے ذمے لگ گئی۔ ایسے میں میاں افتخار نے سامعہ کو بھی ساتھ چلنے کو کہا۔

”جی وہ میں نہیں پھر سہی۔“ سامعہ ہکلائی۔

”چلیں آپ کو آئس کریم کھلائیں گے۔“ تانیہ نے کافی خوش اخلاق ہونے کا مظاہرہ کیا۔

”شکریہ! پھر سہی۔“ سامعہ فرحان کی نگاہوں کا اشارہ سمجھ کر صاف انکار کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ کھانا تو سبھی کھا چکے تھے۔

”ارے میاں! آپ واپسی پر فینائل، ڈی ڈی ٹی پائوڈر اور تارپین کا تیل ضرور لائیے گا۔“ اماں جان کھانے کے برتن سمیٹے ہوئے بولیں۔

”نانو! ہم سپر مارکیٹ جا رہے ہیں وہاں یہ چیزیں نہیں ملتیں۔“ تانیہ تنک کر بولی۔

”ارے لڑکی! ہم نے تمہارے باوا کو کہا ہے، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اماں جان نے بھی خاصے سخت لہجے میں جواب دیا۔

”اوکے! اماں جان آپ فکر ہی نہ کریں۔ بس آپ سامعہ بیٹی کے لیے فرحان کے برابر والا کمرہ کھلوا دیں۔ آپ تو سارا دن اپنے کمرے میں ہوتی نہیں ہیں۔ یہ بے چاری خود کو حراست میں محسوس کر رہی ہوگی۔“ آج فرحان نے باپ سے یہ بات کی تھی۔ اس لیے میاں افتخار نے موقع دیکھ کر کہہ دیا۔

”بوریت سے بچنے کا تو ایک ہی حل ہے کہ خود کو مصروف کرلو۔“ اماں جان بات ٹال گئیں۔

”سامعہ آپ ایسا کرو اپنا کمرہ خود سیٹ کرو، سجاؤ اس طرح بوریت نہیں ہوگی۔“ میاں جی پھر اسی موضوع پر آگئے۔

”ارے واہ! ہر کمرہ سیٹ ہے اور صاف ستھرا ہے۔ ہمیں پھوہڑ سمجھا ہے کیا؟“ اماں جان بد کہیں۔

”نانو! بابا کا مطلب یہ نہیں تھا۔“ فرحان نے نرمی سے کہا۔



”اچھا اب سب یہاں سے اٹھو ناجی کو برتن اٹھا کر ٹیبل کی صفائی کرنی ہے۔“ وہ بولیں کمرے والی بات وہیں رہ گئی میاں جی آہ بھر کے تانیہ کو لیے پورچ کی طرف بڑھ گئے اور فرحان کو خود ناجی کو آواز لگانی پڑی۔

”ناجی! سامعہ بی بی کے لیے میرے ساتھ والا کمرہ ابھی کھول دو۔“

”جی اچھا۔“ ناجی نے قریب آکر جواب دیا۔ فرحان نے سامعہ کو دیکھا اور خود اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سامعہ بھی اٹھی اور اندر کی طرف چلی گئی۔

”بڑی بیگم صاحبہ کمرہ کھول دوں۔“ ناجی نے اجازت طلب کی۔

”کھول دو صاحب بہادر حکم جو دے گئے ہیں۔“ اماں جان نے تخت پر بیٹھ کر اپنا پاندان کھولتے ہوئے کہا۔

انہیں صحن میں بیٹھا دیکھ کر زبیر احمد اسی طرف آگئے۔

”آؤ بیٹھو ماں صدقے۔“ اماں جان نہال ہو گئیں۔ وہ ان کے برابر بیٹھ گئے۔

”کھانا لائوں۔“

”نہیں زرتاشیہ نے چائومن اور کسٹرڈ بنایا تھا۔ وہ ہم کھا چکے ہیں۔“

”ہماری زرتاشیہ کتنی سگھڑا ور ذمہ دار ہو گئی ہے۔“ اماں جان محبت سے بولیں۔

”جی ہاں اور بہت ڈسٹرب سی بھی ہے۔“ وہ سرد آہ بھر کے بولے۔

”ماں کا ایسا قدم اٹھانا بچی کو ڈسٹرب تو ہونا ہی تھا۔“

”بہر کیف مجھے آپ کو بتانا تھا کہ نرگس فیصلہ چاہتی ہے۔ سو میں نے طلاق

دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ گلریز بھائی ایک دو روز میں آرہے ہیں وہ ایسا نہیں

چاہتے مگر نرگس جو چاہتی ہے میں وہی کروں گا۔ آپ کو گلریز بھائی کی بات

سے اتفاق نہیں کرنا۔“ وہ خاصے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولتے چلے گئے۔

اماں جان کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے اکلوتے

بیٹے کا گھر اجڑتے دیکھنے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

”زبیر اچھی طرح سوچ سمجھ لو یہ چھوٹا فیصلہ نہیں ہے۔“

”اماں جان آپ سے ہی سنا تھا کہ اس طرح کے فیصلوں پر عورتیں زیادہ سوچتی ہیں نرگھس آپ کے سامنے ہے۔“

”وہ کم عقل اور نادان ہے۔“

”وہ خود سر اور خود پسند ہے۔“

”چلو کچھ بھی کہہ لو مگر پھر بھی تم سمجھداری سے کام لو۔“ اماں جان بہت دکھی ہو کر بولیں۔

”اماں جان! جس عورت نے ایسا کہہ دیا۔ سمجھ لیجیے اس نے ایسا کر لیا۔“ زبیر احمد خاصے تحمل سے بولے۔

”اس کے بعد زرتاشیہ کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا؟“

”اللہ مالک ہے فی الحال آپ افتخار بھائی سے شاہدہ باجی سے کہیے کہ وہ شادی کی تاریخ طے کریں۔“

”ارے تاریخ تو ہم طے کریں گے۔ وہ راضی تو ہوں۔“ اماں جان بولیں۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونکے۔

”میاں صاحبزادے کا کوئی واضح مقصد کام کاج تو سامنے آئے کبھی فرماتے ہیں باہر جانا ہے کبھی کہتے ہیں یہاں بزنس کرنا ہے۔“

”کچھ بھی پروگرام ہے شادی تو ضروری ہے۔“

”چلو میں آج یا کل کھل کر بات کرتی ہوں۔“

”میں نے گھر اور کنال والا پلاٹ زرتاشیہ کے نام کرا دیا ہے۔ پروسیجر میں ہے ایک دو روز میں زرتاشیہ کے سائن بھی ہو جائیں گے۔“

”اس کی کیا ضرورت تھی۔“

”میں دل کا مریض ہوں جو کچھ زندگی میں کر دوں بہتر ہے۔ جو بھی ہے زرتاشیہ کا ہی ہے۔“ وہ دکھ سے ہنس کر بولے۔

”اللہ خیر رکھے، ماں کی عمر لگ جائے دل چھوٹا نہیں کرتے زرتاشیہ کون سا دور جائے گی۔“ اماں جان نے وفور محبت سے بیٹے کا سر سینے سے لگا کر پیار

کیا ماں کی گرم محبت کے اثر نے زبیر احمد کے ذہن کا بوجھ کافی حد تک کم کر دیا۔ وہ کافی دیر ان کے پاس بیٹھے رہے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے سامعہ کے بارے میں بھی انہوں نے پوچھا اور اماں جان نے منسل سامعہ کی حقیقت ان کو بیان کر دی۔

☆☆...☆☆...☆☆

اماں جان کا کہنا بالکل سچ تھا۔ کمرہ آئینے کی طرح اُجلا اور چمک دار تھا روشن اور ٹھنڈا وہ بیڈ پر دراز ہو کر بغور جائزہ لینے لگی۔ ناجی جا چکی تھی اس نے پلکیں موندی ہی تھیں کہ کھٹ سے کمرے کا دروازہ کھلا اس نے آنکھیں کھول دیں اور فوراً اٹھ بیٹھی زرتاشیہ آئی تھی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ دھیرے سے مسکرا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”فائن آپ سناؤ کہاں غائب تھیں۔“ سامعہ کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

”بس یونہی کچھ اپ سیٹ تھی۔“ زرتاشیہ نے سچ بولا۔

”خیریت۔“

”ہاں! سب کچھ شاید نارمل ہی ہے۔ دھواں دھواں سا۔“ وہ بے پروائی سے کہہ گئی مگر سامعہ نے جملہ پکڑ لیا۔

”دھواں ہو تو آگ بھی ضرور ہوتی ہے۔“

”ہاں آگ تو برابر لگی ہے سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا ہے شاید۔“ وہ بجھی بجھی سی بولی۔

”زرتاشیہ! آپ تو اتنی اچھی پیاری ہو، پھر کیا ہوا؟“ سامعہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”ہنہ کچھ نہیں آئیں ہیں آپ کو اپنے گریٹ پپا سے ملواتی ہوں۔“ وہ ایک دم بولی۔

”اچھا لیکن اب تو کافی وقت ہو گیا ہے۔“ سامعہ نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔

”صرف گیارہ بجے ہیں۔“

”اس وقت بے آرام کرنا اچھا نہیں لگتا کل مل لوں گی۔“ سامعہ کے اندر کسی اور وجہ سے بے چینی تھی۔ اسے یقین تھا کہ فرحان شدت سے اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور فرحان ہاتھ میں چھوٹی سی ڈبیہ پکڑے ایک دم اندر آگیا اور پھر سامعہ کے پاس زرتاشیہ کو دیکھ کر کچھ جزبہ سا ہونے لگا۔

”تم یہاں ہو۔“ نظریں چراتے ہوئے پوچھا۔

”آپ مجھے تلاش کر رہے تھے۔“ زرتاشیہ کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

”نہیں بس ویسے ہی۔“

”ہمیں بیٹھیں پلیز۔“ سامعہ نے کہا۔

”ہاں! بیٹھیں سامعہ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں۔“

”جانتا ہوں۔“

”جی۔“ زرتاشیہ نے حیرت سے کہا۔

”ہنہ ہاں چلو آؤ ماموں جان انتظار کر رہے ہیں۔“

”یہ کیا ہے؟“ زرتاشیہ نے اس کے دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کیا جس میں ڈبیہ دبی تھی۔

”یہ سرپرائز ہے۔“ وہ یہ کہہ کر جانے کو تھا کہ زرتاشیہ بولی۔

”کس کے لیے۔“

”یہ بتانا ضروری نہیں۔“ وہ کچھ سختی سے بولا۔

”یہ یقیناً آپ کے لیے ہوگا۔“ سامعہ نے ایک دم ہی بڑی جرأت کا مظاہرہ

کردیا۔ فرحان نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا... وہ نظریں جھکا کر دوبارہ بولی۔

”دیکھیں تو آپ زرتاشیہ کے لیے کیا لائے ہیں؟“

”یہ لیں جی بھر کے دیکھیں۔“ فرحان نے آگے بڑھ کر سختی سے سامعہ کا ہاتھ پکڑ کر ہتھیلی پر ڈبیہ رکھی اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ سامعہ دروازہ تکتی رہ گئی۔ زرتاشیہ نے اس کی ہتھیلی سے ڈبیہ اٹھالی اور کھول کر دیکھا۔

”واہ بیوٹی فل۔“ اس کے منہ سے ایک دم نکلا سامعہ نے اداسی ضبط کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ سفید جڑائو نازک سی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں تھی۔

”واقعی بہت خوب صورت ہے پہن کر دکھائو۔“ اس نے مسکراتے کی بھرپور اداکاری کی۔

”حیرت ہے فرحان کوئی تحفہ میرے لیے لائے ہیں۔“ زرتاشیہ جھوم اٹھی۔

”اس سے پہلے کبھی نہیں لائے۔“

”اوہ ہنہ! یہ تو آپ کے مبارک قدموں کا کمال ہے۔“

”چلو ایسا ہی سمجھ لو۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”میں یہ پپا کو دکھاتی ہوں۔ آپ اب آرام کریں۔“ زرتاشیہ یہ کہہ کر بے قرار سی باہر نکل گئی۔ سامعہ دکھ سے مسکرا کر دروازہ بند کر کے بیڈ پر گر گئی۔

”سب کچھ غلط ہو گیا فرحان اس کے لیے کتنے ارمان سے لایا تھا اور سب الٹ ہو گیا یقیناً وہ ناراض ہو گا۔ اس نے سوچا اور پہلے موقع پر ہی زرتاشیہ اس کی خوشی اڑا لے گئی تھی۔ آگے کیا ہو گا؟ سامعہ دل کڑا رکھو۔“ اس نے خود کو دلاسہ دیا اور پھر بھیگی بھیگی پلکوں کے ساتھ وہ سو گئی بالکل فرحان کے کمرے کی دیوار کے دوسری طرف یہ جانتے ہوئے بھی کہ فرحان کو شدید غصے کے باعث نیند نہیں آئے گی۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ نہ اس کے پاس جا سکتی تھی اور نہ پاس بلا سکتی تھی۔

...☆☆☆...

سارے گھر میں دھوم مچی تھی۔



فرحان کی دی ہوئی انگوٹھی سب نے زرتاشیہ کی انگلی میں دیکھی اور سب ہی خوش تھے۔ خاص کر بڑی بیگم اور زبیر احمد۔ شاہدہ بیگم تو بڑے قرینے سے خوشی کا اظہار کرتی تھیں۔ میاں افتخار کو البتہ انگوٹھی دیکھ کر جھٹکا سا لگا تو وہ فرحان کے ساتھ پیدل ہی گھر سے باہر نکل آئے۔

”یار! یہ کیا ڈرامہ ہے؟“ وہ خاصے بلند لہجے میں بولے۔

”ڈرامہ تھا تو نہیں بنا دیا گیا۔“ وہ پھولے ہوئے منہ کے ساتھ بولا۔

”آپ نے پانچ ہزار کی انگوٹھی سامعہ کے لیے خریدی تھی اور دے دی زرتاشیہ کو یعنی زرتاشیہ والا معاملہ ٹچ ہے۔“ میاں جی خاصے بوکھلائے ہوئے تھے۔

”بابا! سامعہ نے آناً فاناً انگوٹھی زرتاشیہ کو دے دی۔“

”مگر کیوں؟“ وہ چلائے۔

”بس شاید وہ بوکھلا گئی زرتاشیہ اس کے پاس تھی اور...“

”گھامڑ! آپ کو اس وقت جانا تھا کیا؟“

”دیکھ بھال کے ڈر ڈر کے جانا تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ نانو کی کڑی نگاہیں تو تعاقب میں رہتی ہیں۔“

”مجھے ترس آرہا ہے زرتاشیہ پر بے چاری کتنی خوش ہے۔ اسے نہیں معلوم اس خوشی کی حقیقت کیا ہے۔ عجیب سی بات ہے ایسا لگتا ہے کہ زرتاشیہ کو ہم دھوکا دے رہے ہیں۔ اس کے خوابوں کو تعبیر سے محروم کر رہے ہیں۔“ میاں جی نرم دل اور نرم خو ہونے کے باعث دکھی سے ہو گئے۔ تب فرحان نے بھی کچھ مذامت محسوس کی مگر وہ تو کسی اور کا ہو چکا تھا۔

”بابا! دل چاہتا ہے زرتاشیہ کو سچ سچ بتادوں۔“ وہ بولا۔

”شباباش تاکہ گھر میدان جنگ بن جائے آپ کی اماں اپنی اماں جان کی چیخ و پکار تلے دب جائیں اور ہم گھر بدر کر دیے جائیں۔“

”پھر۔“

”پھر یہ کہ میرے بچے آئندہ کچھ دیتے ہوئے دھیان رکھنا زرتاشیہ کو طریقے سے اس گرداب سے نکالنا ہے۔ تاکہ اسے صدمہ نہ ہو۔“ میاں جی بولے۔

”پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ زرتاشیہ کی خوش فہمی نے نیا رخ اختیار کر لیا ہے۔“ وہ جھنجھلا سا گیا۔

”چلو چھوڑو دیکھا جائے گا‘ آپ نے محسوس نہیں کیا کہ نانو کے لہجے میں کتنی تبدیلی آئی ہے۔“

”ارے بیٹا آپ کی نانو دل کی بری نہیں ہیں۔ ان کی محبت کا انوکھا سا انداز ہوتا ہے۔“

”بابا! ایسے کیسے ٹھیک ہوگا۔ وہ اپنے کمرے میں بند اور میں اپنے میں۔“ وہ جذباتی سا ہوا تو میاں افتخار نے چلتے چلتے اس کا کان پکڑ کے دبا دیا۔

”دل قابو میں رکھو صاحبزادے ورنہ سب چوپٹ ہو جائے گا۔ تانیہ کے ایگزائمز ہو گئے ہیں۔ اب گھر میں آپ کی اور تانیہ کی شادی کا مسئلہ کھڑا ہوگا۔“

”جس دن مسئلہ کھڑا ہوگا اسی دن میں صاف صاف بتا دوں گا۔“

”صبر، حوصلہ فی الحال یہ بتاؤ کہ کاروبار کب شروع کرنا ہے۔ اپنے پاس پلاٹ ہیں اور ایک عدد دکان۔ شاید کچھ رقم اکاؤنٹ میں بھی ہو۔“

”اما بھی تو کہتی رہتی ہیں۔ ان کے پاس بھی کچھ پیسے ہیں۔“ وہ بولا۔

”بھی ان کے روپے پیسے کا ہمیں کچھ علم نہیں وہ اپنی اماں جان کے سوا کسی کو کچھ نہیں بتاتیں۔“ میاں جی نے واپسی کے لیے مڑتے ہوئے کہا۔

”خیر کچھ تو کرنا ہے۔ ورنہ ملازمت کر لیتا ہوں۔“

”ہنہ یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے۔ اپنا سی وی مختلف ملٹی نیشنل کمپنی کو بھیجتے رہو۔“

”اور بابا اگر شادی کے لیے دائرہ تنگ کیا گیا تو میں سامعہ کو لے کر یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

”یار! جلد بازی نہیں، ابھی تو فلم شروع ہوئی ہے۔ بہت کچھ باقی ہے۔“ وہ بولے۔

”بابا! مسز جیری کا فون آیا تھا۔ وہ یہاں سے جا رہی ہیں۔ ایک بار سامعہ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ اسے یاد آیا۔

”تو ملوادیے ہیں آپ ایاز کی طرف انہیں بلا لیں۔ میں خود سامعہ کو لے آؤں گا۔“ میاں جی نے اس کی مشکل حل کر دی۔

”یہ ہوئی نا بات۔“ وہ خوش ہو گیا۔

اور پھر گھر واپس آنے تک وہ سارے راستے کل کے پروگرام ذہن میں ترتیب دیتا رہا۔

بڑی بیگم، رفیعہ کو دیکھ کر کھل اٹھیں۔ بڑی گرم جوشی سے گلے لگایا۔ محبت سے اپنے قریب صحن میں تخت پر بٹھایا عادل کرسی پر بیٹھ گیا۔

”رفیعہ! بہت خوش ہو رہی ہے تمہیں دیکھ کر۔“

”مجھے بھی بہت خوشی ہو رہی ہے، بس چاہتے ہوئے بھی فرصت نہیں ملتی۔“

”ٹھیک کہہ رہی ہو رفیعہ، گھر کے ہزار بکھیرے ہوتے ہیں۔“ بڑی بیگم نے تائید کی۔

”کام تو اتنے نہیں ہوتے عادل کے ابا کی بیماری نے بالکل پیر باندھ دیے ہیں۔“

بڑی بیگم نے اثبات میں گردن ہلائی۔

”آج تو بہت خوشی کا دن تھا۔ عادل نے اپنے ابا کے اسٹور کو کھولا ہے زردے کی دیگ بنوائی تھی۔ آپ سب کے لیے لے کر آئی ہوں۔“

”ماشاء اللہ، اللہ مبارک کرے۔“ بڑی بیگم نے بڑے سے شاہرہ بیگم سے دعا کی دیکھی پکڑتے ہوئے کہا۔

”بس دعا کیا کریں۔“ رفیعہ نے ان سے کہا۔

”رفیعہ! اللہ خوش رکھے، آباد رکھے یہ بچے پھلیں پھولیں۔ یہی رات دن دعا کرتی ہوں۔“

”یہ شاہدہ‘ افتخار نظر نہیں آرہے۔“ رفیعہ نے چاروں طرف نظر دوڑانے کے

بعد پوچھا۔

”وہ گھر میں ہیں ہی نہیں، تانیہ کو کچھ خریدنا تھا شاہدہ اور میاں افتخار بھلا

کیسے ٹال سکتے تھے۔“

”ابھی گئے ہیں کیا؟“

”نہیں آنے والے ہوں گے۔ انہیں پتا ہے کھانا لگنے کا وقت ہو گیا ہے۔“

بڑی بیگم نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔

”کھانا لگا دوں۔“ اسی اثنا میں ناجی نے باورچی خانے سے آکر پوچھا۔

”ہاں! اور سنو پہلے شامی کباب فرائی کرو اور مسالا لگے ہوئے چکن کو ڈیپ

فریزر سے نکال کر کڑاہی میں ڈال کے چولہے پر رکھو جب گوشت کھل جائے

تو ٹماٹر، ہری مرچ اور گرم مسالا ڈال کر بھون

لینا۔“ انہوں نے رفیعہ اور عادل کی وجہ سے ناجی کو ہدایت کی۔

”جی اچھا۔“

”اور سنو! سلاد‘ رائتہ بھی ڈھنگ سے بنانا دال خشکا بن گئے؟“ انہوں نے

اسے روک کر مزید ہدایت کی اور پوچھا۔

”جی سب تیار ہے، میٹھا بھی بنا دیا ہے۔“ ناجی نے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔“

”ہمیں تو پھر اجازت دیں۔ عادل کے ابا کو کھانا دینا ہے اور ان کی دوا کا

وقت ہو گیا ہے۔“

”ہیں! ارے بائولی ہوئی ہو، نہ کچھ کھایا نہ پیا، ایسے کیسے بھیج دیں۔“

”اماں جان! کوئی ضروری تو نہیں ہے۔“ اتنی دیر میں عادل نے پہلی بار

زبان کھولی۔

”ارے عادل میاں! آپ چپ رہو، یہ ناجی کو ہدایت ہم نے اپنے لیے دی

ہے۔ ہمارے رات کے کھانے میں دال اور خشکا ہی بنتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”مگر“ عادل نے کچھ کہنا چاہا۔

”ارے بیٹا! بھول کے آگئے ہو تو سب سے مل کر جانا۔“

”دیر ہو جائے گی۔“ رفیعہ نے کہا۔

”نہیں ہوتی ہم خود جا کر دیکھتے ہیں۔ بس دس منٹ بیٹھو۔“ بڑی بیگم نے اصرار کیا اور خود کچن کی طرف چلی گئیں۔

”آپ کو بہت شوق تھا یہاں آنے کا۔“ عادل بور ہو رہا تھا۔

”بیٹا! رشتے داری ہے اور نبھانی ہے، نہیں معلوم کہ کیوں یہاں آنے کا شوق ہے۔“ رفیعہ نے مسکرا کر دھیرے سے پوچھا۔ تو وہ تانیہ کے خیال سے چپ ہو گیا۔

سچ مچ دس بارہ منٹ میں کھانا میز پر لگ چکا تھا، مگر رفیعہ نے ان کے بلانے پر سب کا انتظار کرنے کو کہا۔ تو وہ بولیں۔

”رفیعہ! یہ اس گھر کا دستور نہیں، کھانے کا وقت ہو گیا کھانا تیار ہو تو کوئی ہو یا نہ ہو، جو موجود ہوتے ہیں کھا لیتے ہیں۔ بعد میں کسی کے لیے کھانا نہیں لگتا۔

”مگر...“ عادل نے کچھ کہنا چاہا۔

”اگر مگر چھوڑو عادل میاں، کھانا کھاؤ۔“ انہوں نے بڑی صاف گوئی سے اسے کھانے پر مجبور کر دیا۔

”ناجی! ٹرے زرتاشیہ کو دے کر آؤ، زبیر بھی آگیا ہے۔“ بیٹھتے ہوئے ناجی کو آواز دے کر کہا۔

”فرحان! کہاں ہوتا ہے؟“ عادل نے پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”فرحان بھی ہوگا دوستوں کے ساتھ، آج کل اس کے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں ہے۔“ بڑی بیگم نے سرسری انداز اختیار کیا۔



”زرتاشیہ کیسی ہے؟ نرگھس کو ملے بھی زمانہ ہو گیا۔“ رفیعہ نے قطعاً انجان ہونے کے باعث کہہ دیا۔ بڑی بیگم کے چہرے پر بہت سی شکنیں بنیں اور اپنا تاثر رفیعہ پر واضح کر گئیں۔

”رفیعہ تم تو اپنی ہو، تم سے کیا پردہ؟ نرگھس تو میرے زبیر کی زندگی کا ناسور ہے، پھول سی بچی ماں کی عدم دلچسپی کی وجہ سے کملا کے رہ گئی ہے اور وہ بھائی کے پاس عیش کر رہی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ رفیعہ چونکیں۔

”مطلب یہی کہ گھر سے گئی ہیں نہ خیر نہ خبر زرتاشیہ کا ٹخنہ اتر، پلستر چڑھا رہا اس نے پلٹ کر نہیں پوچھا جانے کیا چاہتی ہے؟“ بڑی بیگم افسردہ سی ہو گئیں۔ نوالہ پلیٹ میں ہی رہ گیا۔ رفیعہ کو بھی حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ ہو رہا تھا۔

”زرتاشیہ اکیلی رہ رہی ہے؟“

”ہاں زبیر آجاتا ہے کچھ وقت یہاں آجاتی ہے تھوڑا بہت وقت نکال کے ہم چلے جاتے ہیں۔ تم جانتی ہو اس گھر کے الجھائوں سے ویسے ہی فرصت نہیں ملتی۔ بس بچی اتنی صابر شاکر ہے کہ کیا بتائوں۔“ بڑی اماں کی آنکھیں نم آلود ہو گئیں۔

”یہ تو نرگھس نے برا کیا۔“ رفیعہ نے کہا

”ارے برے سے برائی ہی کی توقع رکھنی چاہیے۔“ وہ چلا پڑیں۔ اندر کا غصہ باہر نکال دیا۔

”ظاہر ہے آپ کے لیے تو نئی پریشانی کھڑی ہو گئی۔“

”اسی لیے تو رفیعہ بی اس سے زرتاشیہ کی شادی کی ہزار بار بات کر چکی ہوں۔ وہ اس گھر میں آجائے تو چلو مجھے سکون مل جائے۔ ہاں بھی تم کو عادل کی شادی کی جلدی نہیں ہے کیا؟“ انہیں بولتے بولتے

یک دم یاد آگیا تو خاصا دبائو ڈال کے بولیں۔

”اب بس شادی ہی کرنی ہے۔ پہلے عادل کی ملازمت کا مسئلہ تھا۔ اب ماشاء اللہ اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ تو میں یہ بات ہی کر کے جائوں گی۔“ رفیعہ نے ان کی بھرپور تائید کی۔

”بس جلدی کا کہو، ورنہ تانیہ بی بی بہت اونچی ہوائوں میں ہیں۔“

”امی! اب چلیے دیر ہو گئی ہے اسٹور مجھے جا کر خود لاک کرنا ہے۔“ عادل نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہاں، اماں جان! اب اجازت دیجیے۔ بس شاہدہ کو آپ پیغام دے دیجیے گا اور میں تانیہ کے لیے سوٹ لائی ہوں وہ دے دیجیے گا۔“ رفیعہ نے کھانے کی میز سے اٹھتے ہوئے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ بڑی بیگم نے محبت سے رفیعہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

عادل نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ بڑی بیگم گیٹ تک انہیں رخصت کرنے آئیں۔

☆☆...☆☆...☆☆

رات کو ان لوگوں کی واپسی خاصی دیر سے ہوئی۔ بڑی بیگم، ناجی دونوں سو گئی تھیں۔ کافی دیر ہارن دینے پر ناجی کی آنکھ کھلی۔ بڑی بیگم دن میں تو بہت محتاط نیند سوتی تھیں لیکن رات کی دوائیں ایسی تھیں کہ جن کی وجہ سے خاصی گہری نیند آتی تھی۔ ناجی نے گیٹ کھولا۔ میاں افتخار نے گاڑی اندر کھڑی کی۔ فرحان کی گاڑی نہیں تھی۔ وہ تو کچھ سوچ کر ٹال گئے۔ البتہ شاہدہ بیگم نے پوچھ لیا۔

”فرحان نہیں آیا ابھی۔“

”وہ“ اس نے فون کر کے بتادیا تھا کہ رات دوست کی طرف رہے گا۔“ میاں افتخار نے جلدی سے کہا۔ شاہدہ بیگم خاموشی سے مطمئن انداز میں تانیہ کے ہمراہ اندر چلی گئیں۔ میاں افتخار بھی سیدھے کمرے کی طرف چلے گئے۔ کسی کو کسی کے آنے جانے کی خبر نہ ہوئی۔

صبح سویرے بڑی بیگم نے نماز پڑھ کر کمرے سے باہر آتے ہی۔ واشنگ مشین لگا کر کپڑے دھونے میں مصروف ناجی سے پڑتال کی۔

”یہ لوگ کتنے بچے آئے تھے؟“

”رات کو آگئے تھے۔“ ناجی نے سادگی سے جواب دیا۔

”رات کو کتنے بچے آئے تھے یہ بتاؤ۔“

”میں نے گھڑی نہیں دیکھی تھی۔“ وہ دانستہ ٹال گئی۔ حالانکہ اس کی نگاہ وال کلاک پر پڑی تھی۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔

”تجھے سب پتا ہوتا ہے چشم پوشی کرتی ہے۔“ وہ خود گھاگ تھیں۔

”آپ کو تو بس تھانے دار ہونا چاہیے تھا۔“ ناجی نے جل کر جواب دیا۔

”ارے تو پگلی، ہماری اماں جان تھانے دار ہی تو ہیں گھر کی تھانے دار۔“ اس لمحے میاں افتخار اخبار لیے صحن میں آتے ہوئے بولے تو ناجی ہنس پڑی۔ اماں

جان بھی خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ تخت پر ان کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔

کچھ دیر تسبیح پڑھنے میں مصروف ہوئیں۔ فارغ ہوتے ہی باورچی خانے میں جانے سے پہلے ان سے پوچھا۔

”میاں کہاں گئے تھے جو گھر یاد نہ رہا۔“

”بس تانیہ اور شاہدہ نے شاپنگ کی اور اس میں دیر ہوگئی تھی، گھر کے

کھانے کا وقت ختم ہوگیا تھا۔ اس لیے باہر کھانا کھلانا پڑا۔“

”ارے رہنے دو میاں، تم بیٹی، بیوی کے سامنے دم نہیں مار سکتے انہوں نے

فرمائش کی ہوگی اور تم سر جھکا کر چل دیئے۔“ وہ خاصی کڑک آواز میں

بولیں۔

”اماں جان! کیا کریں ابھی اس گھر میں رہنا جو ہے، آپ کو تو پتا ہے ہم

آپ کی بیٹی کے سامنے پہلی دفعہ ہی سر جھکا بیٹھے تھے۔“ وہ شرارت سے

بولے تو ناجی کھی، کھی کر کے ہنسنے لگی۔

”تو کیوں دانت نکال رہی ہے۔“ وہ ناجی پر برس پڑیں۔

”ہاں! تمہاری یہ جرأت کہ تم ہماری فرمانبرداری کا یوں مذاق اڑاؤ۔“ میاں افتخار نے آنکھ دبا کر ناجی کو ڈانٹا۔

”کتنے عرصے بعد رفیعہ بے چاری آئی تھی اور بیٹھ بیٹھ کر چلی گئی۔“ وہ نارمل سے انداز میں بولیں۔

”کیا بھابی آئی تھیں، کب؟“ میاں افتخار چونکے۔

”تم لوگوں کے جاتے ہی آئی تھیں۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ اب ہم نے اونچے لوگوں کے ڈھنگ اپنالے ہیں۔“ اتنا کہہ کر وہ ناجی کو باورچی خانے میں آنے کا کہہ کر خود بھی چلی گئیں۔ بات درمیان میں رہ گئی۔

اور دوبارہ جب ناشتا میز پر لگ گیا۔ میاں افتخار، شاہدہ آکر بیٹھ گئے ناجی نے تانیہ کی طرف سے ابھی نہ آنے کا اعلان کر دیا تو اماں جان نے ناشتا شروع کر دیا۔ میز پر زردے کی پلیٹ دیکھ کر شاہدہ

چونکیں۔

”خیریت! اماں جان یہ ناشتے پر ہماری پسند کا اہتمام۔“ میاں جی کی باچھیں کھل اٹھیں زردہ انہیں بہت پسند تھا۔ بلکہ میٹھا کھانے کے ساتھ روزآنہ ہی ان کی وجہ سے بنتا تھا۔

”آپ نے رات زردہ بنایا تھا۔“ شاہدہ نے پوچھا۔

”ارے نہیں بھئی، رات رفیعہ اور عادل آئے تھے۔ عادل کے کام شروع کرنے کی خوشی میں زردے کی دیگ بنوائی تھی۔ ہاں یاد آیا۔ تانیہ کے لیے ایک سوٹ بھی دے گئی ہیں۔“ انہوں نے تفصیل سے بتایا شاہدہ بیگم کے چہرے پر سناٹا سا چھا گیا۔ جب کہ میاں افتخار خوش ہو کر بولے۔

”پھر تو سب سے پہلے زردہ ہی کھائیں گے۔“

”جی، آپ کے بھتیجے نے تیر مارا ہے، ضرور کھائیے۔“ شاہدہ بیگم نے دبی دبی نرمی اور دبا دبا طنز یک جا کر دیے۔ تو میاں جی کے ساتھ اماں جان بھی ٹھٹکیں۔

”کیا مطلب؟“ اماں جان نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، اب زردہ باٹنا وہ بھی اسٹور کھولنے کی خوشی میں مجھے تو کچھ پسند نہیں آیا، بھئی آپ لوگوں کے لیے خوشی کی خبر ہے۔“ شاہدہ بیگم نے آلیٹ پلیٹ میں ڈالتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا۔

”بھئی آج کے دور میں اپنا کام ہی وارے میں آتا ہے۔ نوکریوں میں کچھ نہیں پڑا۔ پہلی بات تو یہ کہ نوکریاں ملنا آسان نہیں، دوسری بات یہ کہ مارکیٹنگ اور سیل میں خون نچوڑنے کے بعد بھی کوئی مستقبل نہیں سمجھا جا رہا۔“

میاں افتخار نے حسب پسند زردے پر دہی ڈال کے کھاتے ہوئے کہا۔

”ارے لڑکا ہیرا ہے ہیرا، ایسی اولاد اللہ سب کو دے۔ رفیعہ کو شاباش ہے ایسی تربیت کی ہے کہ دل خوش ہوا ہے۔“ اماں جان نے توصیفی کلمات کے ذریعے شاہدہ کو پہلو بدلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ سمجھ گئی کہ اماں جان ان کی تربیت پر تنقید کر رہی ہیں، مگر وہ خاموش رہیں۔

”ہم نے تو کہہ دیا رفیعہ سے کہ اب بیٹے کی شادی جلدی کرو۔“ اماں جان نے ایک اور ایسی بات کہہ دی جو شاہدہ بیگم کے لیے برداشت کرنی مشکل ہو گئی وہ معذرت کر کے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میاں جی کو کچھ تشویش سی ہوئی۔ مگر خاموش رہے۔

واش روم سے باہر نکلی تو ناجی نے بیڈ پر رکھے شاپر کی طرف اشارہ کیا اور صفائی میں مصروف ہو گئی۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے تولیہ ایک طرف رکھ کر بال جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

”خود ہی دیکھ لیں، آپ کے لیے تحفہ آیا ہے۔“ ناجی نے شریر انداز میں بتایا۔

”تحفہ کون لایا ہے اور ہے کیا؟“ بڑبڑاتے ہوئے اس نے شاپنگ بیگ سے پیکٹ نکالا پھر اسے کھولا تو لان کا سوٹ نکلا اس نے ابرو چڑھا کر ایک بار پھر ناجی کی طرف دیکھا۔

”تم ٹھیک سے بتاتی کیوں نہیں کون لایا ہے یہ چیتھڑے؟“



”توبہ‘ توبہ تانیہ بی بی‘ ان کپڑوں کو آپ چیتھڑے کہہ رہی ہیں۔ یہ آپ کے سسرال سے آئے ہیں۔ رفیعہ بیگم صاحبہ اور عادل صاحب لائے تھے۔“ ناجی نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بتایا تو اس کو پتنگے لگ گئے۔

”کیوں‘ کیوں لائے تھے؟ اور تم نے کیوں لیے؟“ اس نے پیکٹ اس کے منہ پر دے مارا۔

”میں نے تو نہیں لیے بڑی بیگم صاحبہ کو دے کر گئے ہیں اور اس میں حرج کیا ہے۔ وہ اتنی خوشی سے لائی ہیں۔“ ناجی نے تنک کر کہا۔

”ہنہ! خوشی سے‘ لے جاؤ یہ فوراً، کسی نوکر کو دے دو‘ یا خود رکھ لو‘ میں تو ایسے کپڑے پہنتی ہی نہیں۔“

ناجی نے بالکل ایسا ہی کیا اٹھا کر بڑی بیگم کے حوالے کر آئی۔ وہ اس وقت زرتاشیہ کو گلے سے لگائے دھیرے دھیرے باتیں کر رہی تھیں۔ اس لیے کوئی نوٹس نہ لیا۔ مگر جیسے ہی زرتاشیہ اٹھ کر گئی۔ تو وہ فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئیں اور کھلے پیکٹ سے سب کچھ سمجھ گئیں۔ اس وقت میاں افتخار اور شاہدہ

گھر پر نہیں تھے۔ اس لیے وہ چپ ہوئیں کہ شام کو بات کروں گی۔ حالانکہ تانی نے تو جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ بلاوجہ بات بڑھے مگر ناجی نے باورچی خانے میں قصہ چھیڑ دیا۔

”بڑی بیگم صاحبہ! تانیہ بی بی کو یہ رشتہ پسند نہیں ہے۔“ ہنڈیا بھونٹتے بھونٹتے ان کا ہاتھ رک گیا۔

”اس نے کچھ کہا ہے؟“ پر تفتیش نظروں سے اسے گھورا۔

”نہیں مگر آپ کو ان کی حرکتوں سے اندازہ نہیں ہے کیا؟“

”اندازہ تو ہے‘ شاہدہ نے ہی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اچھی ماں بن کر تربیت نہیں کی۔“ وہ تاسف بھرے لہجے میں بولیں۔

”آپ شاہدہ بیگم صاحبہ کو برا نہ کہا کریں۔ وہ تو بہت اچھی ہیں۔“

”ہاں بہت اچھی ہیں، خاموشی سے سب فرمائشیں پوری کرتی ہیں۔ نہ بیٹی پر توجہ اور نہ بیٹے کی فکر، رات سے برخوردار غائب ہیں۔ کسی نے پوچھا۔ ہمیں تو ویسے ہی دقیانوسی کہتے ہیں۔“ بڑی بیگم نے کہا۔

”اچھا میں تانیہ بی بی کے کپڑے استری کرنے جا رہی ہوں۔“ ناجی نے سلا دیا تیار کر کے ہاتھ دھوئے اور جانے کو مڑی۔

”انہیں اب کہاں جانا ہے؟“

”کیا پتا۔“

”پہلے زرتاشیہ کے پاس جاؤ اور کہو کہ ہم نے پسندے بنائے ہیں، کھانا یہاں ہمارے ساتھ آکر کھائے، زبیر کے لیے بھی کھانا رکھ دیں گے۔“ انہوں نے اسے کہہ کر بھیجا اور خود ابلتے ہوئے پانی میں چاول ڈالنے لگیں۔ دراصل پسندے زبیر احمد کو بہت پسند تھے، نرگھس تو کبھی ان کی پسند کا خیال رکھتی نہیں تھی اس لیے وہی بیٹے کی پسند کی اکثر ڈشز بناتی تھیں۔ آج کل تو انہیں

ویسے بھی اندر ہی اندر غم کھائے جا رہا تھا اور زرتاشیہ کی فکر ستارہ ہی تھی۔ ماں کی غیر موجودگی میں وہ بالکل کملا کے رہ گئی تھی۔ کیا کریں اور کیا نہ کریں یہ سرا ان کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔

☆☆...☆☆...☆☆

پچھلے دو گھنٹے سے میاں افتخار اکیلے اسے سمجھا رہے تھے۔ فرحان بالکل خاموش تھا۔ ایاز اور صائمہ بھی چپ تھے۔ سامعہ خود ساکت سی بیٹھی تھی۔ میاں جی نے اپنی بات مکمل کر کے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ وہ ٹھیک سوچ رہے ہیں یا غلط۔

”میرا خیال ہے کہ آپ کی پلاننگ ٹھیک ہے۔“ ایاز نے کہا۔

”لیکن کیا یہ راز رہ سکے گا۔ کہیں کوئی جان پہچان والا مل گیا تو؟“ صائمہ نے پوچھا۔

”مل تو سکتا ہے۔ اس کے لیے کچھ عرصہ سامعہ کو بالکل لوگوں سے کٹ کے رہنا ہوگا۔ میری کوشش ہوگی کہ جلد از جلد اس کو اصل جگہ قائم کرا سکوں۔“ میاں افتخار نے جواب دیا۔

”اور وہ فرحان کی شادی والا معاملہ؟“ ایاز بولا۔

”بیٹا! وہ بہت زور شور سے جاری ہے۔ دراصل بچپن کے فیصلے اتنی آسانی سے بدلے نہیں جاتے۔ وہ بھی ایسے گھر میں جس میں چیف آف آرمی اسٹاف ہماری ساس جیسی ہو۔“ میاں جی ہنس کر بولے۔

”اور آنٹی؟“ صائمہ کی زبان پر یہ لفظ اٹکا۔

”وہ بہت فرمانبردار بیٹی اور ممتا سے بھرپور ماں ہیں۔ ہماری حیثیت ان دونوں کے درمیان کیا ہوگی۔ یہ خود سوچ لیں۔“

”پھر سامعہ کا کیا ہوگا؟“ ایاز اور صائمہ پریشان ہو کر ایک ساتھ بولے۔

”صرف سامعہ کا نہیں، فرحان اور فرحان کے ابا بھی رگڑے میں آئیں گے۔ لیکن پوزیٹو سوچو، سامعہ کے جانے سے کوئی نئی بہتری بھی تو آسکتی ہے۔ بات سے بات نکل سکتی ہے۔“

”تو پھر ٹھیک ہے، سامعہ کو حسب پروگرام لے جائیے۔ آگے دیکھا جائے گا کیوں سامعہ؟“ فرحان نے پہلی مرتبہ اس سے کہا۔

”جیسے آپ کہیں، میں تو آپ کے فیصلے کے احترام کی پابند ہوں۔ جو ہوگا وہ میرا مقدر مگر میں آپ کے لیے اور میاں جی کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہونے دوں گی۔“ سامعہ نے بڑے رसान سے جواب دیا۔

”جیتی رہو بیٹا! ہم پوری کوشش کریں گے کہ آپ کو، آپ کا حق ملے خوشیاں ملیں۔“ میاں جی نے اٹھ کر سامعہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”اب تم استعفیٰ لکھ دو۔ مختصر سا سامان پیک کرو اور بابا کے ساتھ آجاؤ۔“ فرحان نے ایک دم کہا۔

”ابھی۔“ وہ چونکی۔

”ہاں! جو کرنا ہے اس میں تاخیر کیوں کی جائے۔“

”چلو ایسا ہی کر لیتے ہیں۔ فرحان پہلے چلا جائے۔ آج اس کی ماما اور بہن سب گھر میں ہیں۔ ہم آکر دھماکہ کرتے ہیں۔“ میاں جی نے بھی فرحان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”چلیں سامعہ بھابی آپ وہم نہ کریں۔ اللہ کا نام لے کر جائیں۔“ ایاز نے سامعہ کے چہرے پر پھیلی فکر کی پرچھائیاں دیکھ کر کہا۔

”میں فکر مند نہیں ہوں ایاز بھائی اس تذبذب میں ہوں کہ کیا میں فرحان کے لیے کچھ کر سکوں گی؟“

”اللہ سے اچھائی کی امید رکھو۔“ فرحان نے سامعہ کو براہ راست مخاطب کیا۔

☆☆...☆☆...☆☆

کھانا ختم کر کے زبیر احمد ہاتھ دھونے کے لیے واش روم کی طرف گئے زرتاشیہ نے میز سے سب برتن سمیٹ کر کچن کا رخ کیا۔ زبیر احمد ہاتھ

صاف کرتے ہوئے اپنے بیڈ روم میں جانے سے پہلے زرتاشیہ کو بھی اپنے پاس آنے کا کہہ کر گئے اس نے کچن سے ہی جی اچھا کہا زبیر احمد نے کمرے کا اے سی آن کیا۔ ایزی چیئر پر بیٹھے تو فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بادل نحواستہ انہیں وہ فون اٹینڈ کرنا پڑا۔

”ہیلو۔“

”زبیر! فون بند نہیں کرنا۔ میری بات سنو۔“ دوسری طرف نرگس تھی۔ وہ جزبز سے ہو کر بولے۔

”راستے بند کرنا“ فون بند کرنا میری عادت نہیں ہے۔“

”چلو یہ برائی بھی مجھ میں ہی ہے۔“ وہ تڑخی۔

”بے کار بحث کا کیا فائدہ؟ مطلب کی بات کرو۔“

”دیکھو! میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے اب واپس نہیں آنا۔ لہذا آپ مجھے آزاد کر دو۔ نہ آپ کو شکایت نہ مجھے شکایت۔“ وہ بڑی صاف گوئی سے بولی۔

”ٹھیک ہے کاغذات بھیج دو۔ میں دستخط کردوں گا۔“ بڑی ہمت سے انہوں نے بھی کہہ دیا۔

”زبیر میری بیٹی تم مجھے دے دو۔“ وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

”وہ خود مختار ہے۔ اپنا فیصلہ میں اس پر مسلط نہیں کر سکتا۔“

”مجھے معلوم ہے، اسی کو تو میرے خلاف استعمال کرو گے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”بیٹی کو بھی بدگمانی کی نگاہ سے دیکھتی ہو۔“ وہ طنزیہ ہنسنے لگی۔

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ سنبھال کر رکھو بیٹی کو بھی۔“

”نہیں جو کچھ چاہیے آکر لے جاؤ زرتاشیہ اگر جانا چاہے تو اسے بھی لے جاؤ مگر اب مجھ سے کبھی تقاضا نہیں کرنا۔“ انہوں نے یہ کہہ کر فون کھٹ سے بند کر دیا۔ کرسی کی پشت سے سر ٹکایا تو زرتاشیہ نے گلے میں بازو جمائل کر دیے۔

”پپا! پلیز آپ اپ سیٹ نہ ہوں۔“

”جان عزیز! میں کہاں اپ سیٹ ہوں۔“ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”ممانے اس دن بھی فون پر ایسا ہی کہا تھا۔“

”اور وہ ایسا ہی کہتی رہیں گی۔ میں بخوبی جانتا ہوں۔“ وہ ہنسنے دکھ کے ساتھ۔

”تو پھر؟“

”پھر کیا بیٹا آپ کی دادو کہتی ہیں کہ ہوا کو زنجیر نہیں پہنائی جاتی ضدی گھوڑی کو لگام ڈالی نہیں جاتی۔“

”پپا! ایک بار آپ ان سے مل کر بات کریں۔“

”نہیں بیٹا! یہ چیپٹر اب کلوز ہو چکا ہے۔ آپ سوچ لو کہ آپ کو کس کے پاس رہنا ہے۔“ وہ خاصے افسردہ سے لہجے میں بول کے خاموش ہو گئے۔



”پپا! ماما اگر غلط ہیں تو آپ انہیں سمجھانے کی کوشش بھی نہیں کریں گے؟“

”زرتاشیہ! آپ سمجھ دار ہو، خود بتائو جو وہ ارادہ کرتی ہیں۔ کبھی اس سے واپس آئیں اور سمجھانے کی کمی تو گلریز بھائی نے بھی نہیں چھوڑی ہوگی۔ نرگھس آپ کی ماما بعد میں ہیں اور میری بیوی پہلے، میں رگ رگ سے واقف ہوں۔ اس نے اس شادی کو کبھی دل سے قبول ہی نہیں کیا۔ اب تو وہ منہ سے فیصلہ مانگ رہی ہے۔ آپ چاہتی ہو کہ آپ کے پپا اس کے پیروں پر سر رکھ کے منائیں۔ تو آپ کی خوشی کے لیے میں شاید ایسا کر دوں۔“ وہ بولتے بولتے ذرا دیر کو رکے تو زرتاشیہ کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

”نہیں پپا میں ایسا کبھی نہیں چاہوں گی۔ میں تو بس آپ دونوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔“ وہ رو دی۔

”بیٹا! ہر بچہ یہی چاہتا ہے۔ مگر ضروری نہیں کہ سب مائیں ایسا چاہیں یا سب باپ ایسا کریں۔ اب تک سمجھوتے کی جو چادر اس گھر پر تنی رہی وہ صرف

آپ کی وجہ سے تھی۔ خود سوچو کتنی معمولی سی بات کا بہانہ بنا کر وہ ہمیشہ کے لیے چلی گئیں۔“ انہوں نے اسے گلے سے لگا کے دھیرے دھیرے کہا۔

”یہی تو دکھ ہے انہوں نے میرا بھی خیال نہیں کیا۔“

”بس اب آپ بھی کچھ نہ سوچو، آپ کو کون سا ہمیشہ یہاں رہنا ہے اور میں ٹھہرا بیمار آدمی، جانے کب دل جواب دے جائے۔“ انہوں نے اس انداز سے کہا کہ وہ شدت غم سے تڑپ اٹھی۔ اپنا ہاتھ ان کے لبوں پر رکھ دیا۔

”پپا! اللہ آپ کو میری عمر بھی لگا دے۔ آپ کے سوا میرا کون ہے؟“

”وہ ہے نافرمان وہ ہماری بیٹی کا بہت خیال رکھے گا۔“ فضا خوش گوار بنانے کے لیے زبیر احمد نے شرارت کا سہارا لیا۔ تو وہ روتے روتے مسکرا دی اور شرما گئی۔ بظاہر زبیر احمد مطمئن ہو گئے اور اسے

مطمئن بھی کر دیا لیکن حقیقت میں ان کی آنکھوں کے کونے نم تھے۔ رفاقت تلخ تھی مگر اس عمر میں یہ فیصلہ کڑا اور تکلیف دہ تھا، مگر نرگھس کو یہ سمجھانا بہت مشکل تھا۔ اسے رفاقت کے کسی ایک لمحے کا بھی احساس نہیں تھا۔ لاکھ

کم گو، سنجیدہ سے زبیر احمد اس کی نظر میں تھے۔ مگر انہوں نے جب جب اس کی آنکھوں میں قربت کے احساس کی چمک دیکھی تھی اسے احساس سے بڑھ کر پیار دیا تھا۔

بہت عرصے تک زبیر احمد یہ سوچتے رہتے تھے کہ اسے کس طرح خوش رکھا جا سکتا ہے۔ کئی مرتبہ تو انہوں نے اس سے یہ پوچھ بھی لیا تھا مگر ہر بار وہ تڑخ کر یہی کہتی تھی کہ

”زبیر احمد! تم وہ بن ہی نہیں سکتے جو مجھے خوش رکھ سکے۔“ اور زبیر احمد سرتا پیر سلگ اٹھتے۔

☆☆...☆☆...☆☆

بڑی بیگم کی نگاہیں مسلسل فرحان پر جمی ہوئی تھیں۔

اضطراب میں وہ ہاتھوں کے ناخن دانتوں سے کاٹتا تھا۔ اس وقت بھی صحن میں ٹہلتے ہوئے وہ ایسا ہی کر رہا تھا۔ چھالیہ کترتے ہوئے وہ بغور اس کو گھور

رہی تھیں، مگر وہ اپنی ہی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ ایک ہی وقت میں خوش، پریشان، بے چین دکھائی دے رہا تھا۔

”فرحان کیا بات ہے۔“ آخر کار وہ پوچھ ہی بیٹھیں۔

”جی... ک... کچھ نہیں۔“

”میاں! کچھ تو ہے، پالا پوسا ہے خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ناخن کب اور کیوں کترتے ہو؟“ وہ گہری مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

”کچھ نہیں دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔“ وہ صاف ٹال گیا۔

”تو پھر ہمارے پاس بیٹھ کر انتظار کرلو۔“

وہ ان کی کھوجتی نگاہوں اور تیکھے سوالوں سے بچنے کے لیے کمرے کی طرف بڑھنے کو تھا کہ زرتاشیہ کی آواز پر ٹھٹکا۔

”فرحان!“

”جی فرمائیے۔“ لہجے کی بے زاری دبا کر بولا۔

”یہ کچھ چیزیں لانی ہیں مجھے مارکیٹ لے چلیے۔ پپا نے کہا ہے۔“ وہ ہاتھ میں پکڑی فہرست دکھاتے ہوئے بولی۔

”آئی ایم سوری۔ میں اس وقت مصروف ہوں۔“

”ہیں! خوا مخواہ کے مصروف ٹھلنے میں جو وقت برباد کر رہے ہو وہ کام میں لگاؤ، لے جاؤ۔“ بڑی بیگم نے لتاڑا تو وہ سیخ پا ہو گیا۔

”میں نوکر نہیں ہوں۔“

”ارے واہ بھئی! اچھے تیور ہیں، صاحب زادے بنا سوچے سمجھے اتنی بڑی بات کہہ دی۔“ بڑی بیگم کو بھی شدید غصہ آ گیا۔

”رہنے دیں دادو میں کل پپا کے ساتھ لے آؤں گی۔“ زرتاشیہ سہم گئی۔

”کیسے رہنے دیں۔ اتنی بڑی بات کردی یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم اس کی ذمہ داری ہو۔“

”کیسی ذمہ داری۔“ وہ بھی غرایا۔

”فرحان! کیا ہو گیا ہے آپ کو۔“ شاہدہ بیگم وہیں قریب آ کر بولیں۔

”مما آپ نانو کو سمجھا دیں بس۔“ وہ بگڑا۔

”ارے یہ کیا سمجھائیں گی ان کے ہی تو سر چڑھائے ہو۔“

”فرحان! جاؤ زرتاشیہ کے ساتھ میں نے سب سن لیا ہے۔“ حسب معمول انہوں نے دھیرے سے کہا۔

”ماما۔“

”پلیز!“ انہوں نے منت کی مگر وہ پیر پٹختا ہو اپنے کمرے کی طرف چلا گیا شاہدہ بیگم شرمسار سی بیٹھ گئیں۔

”ابھی آپ کے انکل آتے ہوں گے۔ ان کے ساتھ چلی جانا۔“ زرتاشیہ کی نم آنکھیں دیکھ کر انہوں نے دلاسا دیا۔

”سچ پوچھو تو شاہدہ میں فرحان کی طرف سے خوف زدہ ہوں۔“ بڑی بیگم نے کہا۔

”کیوں آپ بلاوجہ پریشان ہوتی ہیں۔ اس کا مزاج ہی ایسا ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ انہوں نے محبت کی چاشنی میں الفاظ ڈبو کر تسلی دی۔ تو اماں جان کو خاموش ہونا پڑا۔

”ناجی! یہ چھالیہ ڈبے میں رکھو۔“ کچھ فاصلے پر دال صاف کرتی ناجی کو مخاطب کیا۔

”جی اچھا۔“ وہ اٹھ کر قریب آئی عین اسی لمحے میاں افتخار کی گاڑی کا ہارن بجا۔ وہ پہلے گیٹ کی طرف بھاگی۔ عصر کی نماز پڑھنے کی غرض سے شاہدہ اٹھیں اور پھر حیرت زدہ سی رک گئیں۔ اماں جان نے بھی غور سے اسی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ جس طرف شاہدہ کی نظریں جمی تھیں۔ میاں افتخار گاڑی لاک کر کے ایک بیگ اٹھائے ان کی طرف آئے ان کے بالکل برابر ڈرے ڈرے قدموں سے چل کر آنے والی لڑکی قطعاً اجنبی تھی۔ قریب پہنچنے پر میاں جی چمکے۔

”سامعہ بیٹا! ان سے ملو یہ ہماری اکلوتی ساس صاحبہ ہیں اور یہ اکلوتی بیگم ہیں۔ ہمارے فرحان کی پیاری سی ماما۔“

”صرف فرحان کی۔“ شاہدہ بیگم نے دھیرے سے مسکرا کر میاں جی کو چونکایا۔

اوہاں ہماری پیاری سی بیٹی تانیہ بھی ہے۔ ابھی بلواتے ہیں اسے۔“ میاں جی نے جلدی سے کہا اور فوراً ناجی کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گئی اور فوراً تانیہ کو بلانے چلی گئی۔

”افتخار! تعارف پورا کراتے ہیں۔ اور بٹھائو تو سہی۔“ شاہدہ بیگم نے اتنی دیرے پریشان نظروں سے دیکھتی سامعہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”بیگم صاحبہ! یہ ہمارے باس کے عزیز دوست کی بیٹی ہیں ہمارے گھر میں رہیں گی نام ان کا سامعہ ہے۔ میاں جی نے بیگم سے اور اماں جان سے نظریں چراتے ہوئے مختصراً روانی سے کہا اور دھم سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

”بیٹھو بیٹا!“ شاہدہ نے کہا تو وہ بیٹھ گئی۔

”کہاں سے آئی ہو بیٹا؟“ اماں جان نے پوچھا۔

”جی، وہ سوات سے۔“ پہلی مرتبہ اس نے زبان کھولی۔

”ارے واہ سوات سے۔“ پہلی بار اماں جان کے برابر بیٹھی زرتاشیہ خوشی سے

بولی تو اماں جان کو جلدی سے خیال آیا۔

”بیٹا! یہ ہماری پوتی زرتاشیہ ہے فرحان کی منگیت۔“

”جی، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ دھڑکتے دل، سہمی سہمی نگاہوں

کے ساتھ زرتاشیہ کو دیکھتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ میاں جی اس سے

نظریں چراتے ہوئے جلدی سے بولے۔

”ارے ہمارے گھر کا خاص آدمی تو سامنے آیا ہی نہیں۔“

”کون؟“ شاہدہ بیگم نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

”فرحان، ہمارا بیٹا، ناجی ذرا فرحان کو تو بلاؤ۔ وہ تانیہ بھی نہیں آئی۔“ وہ براہ

راست ناجی سے مخاطب ہوئے۔ سامعہ کا دل زور سے دھڑکا۔

”ناجی! پہلے باورچی خانے میں چلو۔ رات کے کھانے کی تیاری کرو۔ بچی اتنی

دور سے آئی ہے۔ کھانا پہلے ہونا چاہیے۔ اماں جان نے اپنی کڑک آواز میں

ناجی کو مخاطب کیا۔ وہ تو فوراً سیدھی ہوئی۔ جب کہ میاں جی کو اندازہ ہو گیا کہ

ایسا کیوں کہا گیا ہے۔ مگر وہ ٹال گئے۔

”اماں جان سامعہ بیٹی ہفتہ دس دن ہوئے یہاں ہمارے شہر میں رہ رہی تھی

آپ کھانے کی فکر نہ کریں۔ اس کو میں کمرہ دکھاتا ہوں۔“

”میاں جی! آپ زحمت نہ فرمائیں۔ میں یہ کام کر لیتی ہوں۔“ شاہدہ بیگم نے

خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

”کون سا کمرہ کھلوانا ہے ہمیں صفائی ستھرائی کرنی ہوگی۔“

”واہ جی! روز ہر کمرہ صاف کرتی ہوں۔ ابھی صفائی کرانی ہے کیا؟“ ہاتھ میں

چھری اور پیاز لیے ناجی کسی کام سے وہاں آئی تو جھٹ بولی۔

”ارے ڈسٹنگ کرنی ہے کوئی املی کے پانی سے مانجھنا تھوڑا ہے۔“ میاں افتخار

نے پھلجڑی جلائی۔ تو ماسوائے اماں جان کے سب ہنس دیے۔



”آئیں سامعہ میں آپ کو اندر لے کر چلتی ہوں“ تانیہ اور فرحان سے بھی ملواتی ہوں۔“ زرتاشیہ نے خود محبت بھرا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے فوراً میاں افتخار کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھوں آنکھوں میں رضا مندی دے دی۔ تو وہ زرتاشیہ کے ساتھ ہوئی۔ نازک سی سامعہ کو ساتھ لیے زرتاشیہ تانیہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ میاں افتخار نے یہاں تک پہنچنے پر دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

...☆☆☆...

ساکت نظروں اور بے دم خاموشی کے ساتھ زرتاشیہ کے ہمراہ وہ فرحان کے روبرو تھی۔ فرحان کی نگاہوں میں طمانیت کے تمام سامان موجود تھے مگر جانے اسے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ فرحان اس سے دور ہو گیا ہے۔ حالانکہ دور رہ کر اسے قریب محسوس کرتی تھی۔ اب جب کہ وہ اس کے گھر میں اس کے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ تو جانے کیوں وہ دور بہت دور محسوس ہو رہا

تھا۔ شاید اسے یقین آگیا تھا کہ فرحان کے قریب آکر اسے پانا مشکل کام ہے۔ اس کام کے لیے دشوار اور کٹھن مرحلوں سے گزرنا ہوگا۔

”ارے آپ کیا سوچنے لگیں۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد زرتاشیہ کو ہی بولنا پڑا۔

”وہ... میں کچھ خاص نہیں۔“ وہ چونکی۔ فرحان اس کی ہکلاہٹ کو بھی خوشی کی کیفیت سمجھ کر مسکرا دیا۔ اب باری زرتاشیہ کے چونکنے کی تھی۔

”گڈ سائن۔“ آپ کے آنے سے اتنا فرق تو پڑا کہ فرحان مسکرانے لگے۔“

”ورنہ۔“ پہلی بار سامعہ کے لب ہلے۔

”خیر چھوڑیے۔ ان سے ملیے یہ ہیں فرحان اور یہ ہیں۔“

”سامعہ۔“ کھوئے کھوئے سے فرحان کے لبوں سے اس کا نام پھسلا تو زرتاشیہ کو اور زیادہ حیرت ہوئی۔

”فرحان آپ کو سامعہ کا نام کیسے پتا چلا؟“

”اوہ! وہ بابا نے ذکر کیا تھا۔“ وہ سٹپٹا گیا۔ سامعہ ہولے سے مسکرا دی۔

”پھر تو آپ سامعہ کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوں گے۔“ زرتاشیہ نے پوچھا۔

”ہاں! سب کچھ کچھ بھی تو چھپا ہوا نہیں ہے۔“ فرحان نے ذومعنی انداز میں کہا۔ سامعہ کا دل زور سے دھڑکا زرتاشیہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ یہ کہہ کر کچھ دیر کو باہر چلی گئی۔

”میں دیکھ کر آتی ہوں کہ پپا آتو نہیں گئے۔“ جونہی وہ باہر نکلی۔ وہ دروازے سے لگ کر کھڑ ہو گیا۔ دونوں بازو پھیلائے۔

”کم آن‘ ہری اپ۔“ وہ اسے جزبز دیکھ کر بولا۔ تو وہ جلدی سے اس کی بانہوں میں سما گئی۔

”اپنے گھر میں پیار کے گھروندے میں محبت کا پہلا لمس ہمیشہ یاد رکھنا۔ ویکم ٹو ہوم سوئیٹ ہارٹ۔“ سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ دور سے زرتاشیہ کے قدموں کی آہٹ سن کر جلدی سے الگ ہو گئے۔

”پلیز! احتیاط کی ضرورت ہے۔“ خود کو نارمل کرتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

”کوشش کریں گے حضور، مگر کبھی کبھی تو ایسا کرنے کی اجازت ہے ہمیں۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”آئیے آئیے سامعہ جی فرحان صاحب آپ کو باہر بلا رہے ہیں۔ اسی لمحے زرتاشیہ نے آکر کہا۔

”آپ لوگ چلیں میں ابھی آتا ہوں۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

کمرے سے نکلتے ہوئے سامعہ کی نگاہیں اس سے ٹکرائیں اور پھر وہ خاموشی سے زرتاشیہ کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ان کے جاتے ہی فرحان کی خاموشی میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا خود بخود عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اسے بھی بالکل سامعہ کی طرح آج اس گھڑی ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک نئے انوکھے سے فاصلے پر آگئے ہیں۔ سامعہ سے شادی کرنا اس سے آسان تھا۔ اب تو وہ پرانی سی بن کر آئی اور آکر کمرے سے نکل گئی۔

”یا خدا! یہ کس قدر صبر آزما امتحان ہے کیا میں اپنی سامعہ سے دور رہ سکوں گا۔“ بے اختیار ہی وہ بڑبڑایا۔

”فرحان صاحب! کھانا لگ گیا ہے۔“ باہر سے ناجی کی آواز آئی تو وہ نارمل ہو کر باہر نکل آیا۔ دروازے پر کھڑی ناجی کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ فرحان صاحب ایک مرتبہ کے بلانے پر چلے آئے۔ اس نے حیرت سے اسے دیکھا وہ گھور کے تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

☆☆...☆☆...☆☆

بڑی بیگم نے فی الحال تو سامعہ کو رات گزارنے کے لیے اپنے کمرے میں رکھا کیوں کہ انہیں افتخار میاں کی یہ تجویز پسند نہیں آئی تھی کہ سامعہ کو فرحان کے ساتھ والا کمرہ دیا جائے۔ یہ سن کر انہوں نے خوب صورت سامعہ کو سر سے پیر تک دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر اس وقت خاموش ہو گئیں شاہدہ بیگم ماں کی خاموشی بھانپ کر چپ رہیں، مگر کمرے میں پہنچ کر وہ خاصی بگڑیں۔

”آپ نے حد کر دی۔“

”خیریت۔“ وہ دھیمے لہجے میں بولے۔

”جوان جہان لڑکی گھر لے آئے۔“

”تو سڑک پر چھوڑ آتا کیا؟“

”افتخار! بات کی نزاکت کو سمجھا کریں۔ اماں جان کی خاموشی کو سمجھیں۔“

شاہدہ بیگم خاصے غصے میں آ گئیں۔

”اس گھر میں بیگم صاحبہ ہمارے سوا خاموش کوئی نہیں آپ کا بس بھی ہم پر

چلتا ہے۔“ وہ معصومیت سے بولے۔

”یہ کتنے دن یہاں رہے گی؟“

”جب تک اس کا گمشدہ شوہر نہ مل جائے۔“

”کیا یہ شادی شدہ ہے؟“ اس سوال میں بھی خاصا اطمینان موجود تھا۔

”ہاں!“ وہ مختصراً بولے۔

”کون ہے وہ؟“

”یہی تو انٹیلی جنس والے معلوم کر رہے ہیں۔“

”اوہ!“ شاہدہ بیگم کے لبوں سے بے اختیار تاسف بھری آواز نکلی تو میاں افتخار جلدی سے بولے۔

”اب تو وہ یہاں رہ سکتی ہے۔“

”یہ تو اماں جان پر منحصر ہے۔ آپ کو ان کی عادت کا تو پتا ہی ہے۔“

”جی ہاں! کچھ دن آپ اور آپ کی اماں جان مہربانی فرمادیں۔“ میاں افتخار نے منت بھرے انداز میں کہا۔ تو شاہدہ بیگم کو ان کے اس انداز پر ہنسی آگئی۔ میاں جی کو کچھ سکون ملا۔ ایک دم غیر ارادی طور پر ایک نیا جھوٹ بول کے وہ پھنس گئے تھے۔ مگر بات آئی گئی ہوگئی۔

”فرحان! میرے باپ، مجھے پھنسا دیا ہے۔ دو صاحب اقتدار خواتین کے درمیان۔“ وہ بڑبڑائے تو شاہدہ بیگم نے پوچھا۔

”کیا کہہ رہے ہیں۔“

”وہ، کچھ نہیں، کل چلو بھائی میاں کی طرف مبارک باد دے آئیں۔“

”کس بات کی مبارک باد؟“ شاہدہ بیگم نے دبا دبا سا طنز کیا۔

”بھئی عادل کے کاروبار کی۔“

”بس آپ ہی جائیں کوئی تیر نہیں چلایا۔ وہ سوٹ تانیہ کو پسند نہیں آیا۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ وہ حیرت سے بولے۔

”فی الحال میرا تھکن سے برا حال ہے، مجھے آرام کرنے دیں۔“ وہ بیزاری سے کہہ کر، لیٹ گئیں۔ میاں افتخار اپنی بے بسی کے باعث، رائٹنگ ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔ کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ شاہدہ اپنی فطرت کے مطابق جو بات نہ سننا چاہیں تو اس کے لیے نیند کا سہارا لیتی ہیں اور ایسے میں ان سے کوئی بات کرنا بہت مشکل کام ہے۔ ویسے بھی وہ بہت صلح پسند آدمی تھے۔ کسی قسم کی بدمزگی اور اضطراب کو پسند نہیں کرتے تھے۔ سامعہ کو اس گھر میں لا

کر جو مشکل کام وہ کر بیٹھے تھے اس کے نتیجے سے بے فکر ہو کر اب رہنا ان کے لیے بھی بہت دشوار تھا۔ جھوٹ کو نبھانے کے لیے جھوٹ بولا۔

”اے اللہ! میری عزت رکھنا، میں جھوٹا نہیں ہوں۔ مگر کسی کی خوشی کے لیے میں کچھ دیر کو جھوٹا بن گیا ہوں۔“ انہوں نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کو مخاطب کیا۔ ذہنی و قلبی اطمینان کے حصول کے لیے وہ اللہ کے دامن میں پناہ لیتے تھے۔

☆☆...☆☆...☆☆

آخری سپر دے کر وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کینیٹین کے سامنے جا کر رک گئے۔

”کیا خیال ہے بیٹھیں؟“ خرم نے تانیہ سے پوچھا۔

”وہاں سامنے بیٹھتے ہیں۔“ تانیہ نے کینیٹین سے ذرا دور انگلی سے اشارہ کیا۔

”اوکے لیٹس گو۔“

”آج تو فریڈم ڈے منانا چاہیے۔ اوہ مائی گاڈ! یہ امتحان بھی تھکا ڈالتے ہیں۔“

خرم کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے وہ بولی۔

”تو چلو مناتے ہیں ڈیر۔“ خرم نے کہا۔

”یار! آزادی تو تمہارے لیے ہے ہماری آزادی کا تو آج آخری دن ہے۔“ وہ نرم نرم سبز گھاس پر آلتی پالتی مارتے ہوئے بیٹھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ بھی برابر میں بیٹھ گئی۔

”کل صبح نو بجے کی فلائٹ سے اسلام آباد جانا ہے اور بس۔“ وہ انتہائی اطمینان سے بولا تو وہ اچھل پڑی۔

”یو مین، تم جا رہے ہو۔“

”یہ تو پرانی بات ہے۔“ وہ ہنسا۔

”اور پھر۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”اور پھر کیا، اسلام آباد سے امریکا۔“



”اس کا مطلب۔“ وہ تلخی سے بولی۔

”نتانی ڈیر! مطلب وہی ہے جو کئی بار ہیں بتا چکا ہوں۔ باقی تمہارا پروگرام امریکا جانے کا بنے تو جلدی بتانا۔“

”بہت خوب امریکا جانا اتنا ہی آسان ہے۔“ وہ طنزیہ ہنسی۔

”چلو، جب تم آنا چاہو تو فوراً بتا دینا۔“

”ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا اور تم واپس نہیں آؤ گے کیا؟“

”موڈ کی بات ہے ڈیڈ جیسا کہیں گے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”بات اتنی سی ہے کہ تم جا رہے ہو۔“

”یس، اب میرا دن خراب نہ کرو، ہنسو مسکرائو۔“

”بس چلو۔“

”ہیں! کیا ہو گیا؟“ وہ چونکا۔

”بس جانا ہے، صبح ناشتا کیے بنا آئی تھی۔ ویسے بھی رات سے گھر ایک مہمان آئی ہوئی ہے۔ اب تک ملاقات نہیں ہوئی۔“

”واہ! تمہارا گھر اتنا بڑا ہے کہ ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوتی۔“

”میرا مذاق کا موڈ نہیں۔“ وہ بیزار تھی۔

”تمہارا مسئلہ عادل ہے جو ہڈی بن کر تمہارے حلق میں اٹکا ہوا ہے۔“ وہ خود ہی بولا۔

”اسی لیے تم جا رہے ہو۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔

”دیکھو! میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔“

”جب میں کہوں گی تو اپنے مام، ڈیڈ کو بھیجو گے۔“ اس نے پوچھا۔

”اوکے۔“

”اور وعدہ کرو کہ تم۔۔“

”سنو میں وعدے نہیں کرتا، تم کو سوٹ کرے تو بتا دینا ورنہ ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے۔“ وہ شوخی سے بولا۔

اوکے بس رابطے میں رہنا۔“ وہ مطمئن ہو گئی۔

”فائن، چلو تمہیں ناشتہ کرائوں۔“

”ہنہ ٹائم تو کھانے کا ہی ہونے والا ہے۔“

”اوکے چلو، مجھے بھی پیکنگ کرنی ہے۔“

تانیہ نے پر امید نگاہوں سے یونیورسٹی میں گزرے آخری دن کو یاد رکھنے کے لیے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

☆☆...☆☆...☆☆

ناشتہ کے بعد سے وہ اب تک بڑی بیگم کے کمرے میں بند تھی۔

فرحان کو، میاں جی اور شاہدہ بیگم کو ناشتہ کی میز ہی پر دیکھا تھا۔ اس کے بعد میاں جی اور شاہدہ بیگم تو ڈیوٹی پر گئے اور اسے اماں جان نے آرام

کرنے کا کہہ کر کمرے میں بھیج دیا۔ فرحان کی طرف دیکھتی ہوئی وہ کمرے کی طرف چلی آئی تھی۔ دل کو یقین تھا کہ فرحان موقع پا کر ضرور اس کے پاس آئے گا مگر دن کے بارہ بج رہے تھے اس کی دور دور تک کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ دل میں بہت سے اندیشے بہت سی الجھنیں بے دار ہو کر اسے بے چین کر رہی تھیں۔ کبھی بیٹھتی اور کبھی ٹہلنے لگتی۔ ناجی کمرے میں آئی تو اسے اس طرح ٹہلتا دیکھ کر ہنسنے لگی۔

”کیا ہوا؟“ وہ پریشان ہو کر بولی۔

”آپ کو ایسے ٹہلتے دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔“ ناجی نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہا۔

”لیکن کیوں؟“

”بڑی بیگم صاحبہ کے کمرے میں ہر کوئی ایسا پریشان ہو جاتا ہے۔“ ناجی نے بڑے رازدرا نہ انداز میں کہا۔ تو وہ مسکرا دی۔

”مسکرائیں نہیں، جلد از جلد اس کمرے سے کسی دوسرے کمرے میں چلی جائیں۔“ وہ مزید سادگی سے بولی تو سامعہ سنجیدہ ہو گئی۔

”میں یہاں اپنی مرضی کیسے چلا سکتی ہوں۔“

”بات تو ٹھیک ہے یہاں کسی کی مرضی نہیں چلتی۔“ وہ بے بسی سے کندھے اچکا کر بولی۔

”تانیہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔“ اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ پرچہ دے کر ابھی آئی نہیں، وہ بھی بہت نخرے والی ہیں، اپنی مرضی سے ملیں گی۔“

”اور فرحان صاحب۔“

”فرحان صاحب تو اپنے کمرے میں ہیں۔“

”ناجی! ناجی کہاں رہ گئیں۔“ باہر سے اماں جان کی گرج دار آواز آئی تو ناجی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”اوہ! میں تو دنداسا لینے آئی تھی۔“ یہ کہہ کر ناجی نے چابی سے لوہے کی بڑی سی الماری کھولی اور دنداسا نکال کر دوبارہ بند کر کے تیزی سے باہر نکل گئی۔

وہ ناجی کے جانے کے بعد غور سے کمرے میں موجود ہر چیز کو دیکھنے لگی۔ پرانی طرز کے پلنگ پر خوب صورت کڑھائی والی سفید چادر، اسی طرز کی بڑی سی ڈریسنگ ٹیبل جس پر اماں جان کا پاندان، سرے دانی مختلف تیل کی بوتلیں، لکڑی کی کنگھی، پائوڈر کا ڈبہ اور دو پرفیوم رکھے تھے۔ اس کے علاوہ ایک سنگل بیڈ تھا جس پر اس نے رات گزاری تھی۔ صاف ستھرے کشادہ کمرے میں مکمل صوفہ تھا۔ اس کے ساتھ دو الگ سے کرسیاں رکھی تھیں۔ وہ سب چیزیں دیکھنے سے اماں جان کے مزاج اور عادت کو کافی حد تک سمجھ گئی۔ صحن میں کھلنے والی کھڑکی کا پردہ سرکا کے باہر دیکھنے لگی۔ اماں جان اپنے تخت پر بیٹھی ہاتھ میں شیشہ پکڑے دوسرے ہاتھ سے دنداسا مل رہی تھیں۔ ناجی پالک کاٹ رہی تھی۔ باقی ہر طرف سناٹا تھا۔ فرحان کا کہیں اتنا پتا نہیں

تھا، کچھ دیر مایوس کن نگاہوں سے اسے تلاش کرنے کی مزید کوشش کی اور پھر چونک اٹھی اس کی کمر کے گرد فرحان کے بازو حائل تھے۔ اس کے وجود کی گرم سی مہک اس سے لپٹی تھی۔ تو اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پلٹ کر شاکی نگاہوں سے فرحان کو دیکھا تو وہ سمجھ گیا اور اسے بانہوں میں لے لیا۔

”اداس تھیں یا بدگمان۔“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔

”نہ اداس تھی اور نہ بدگمان بس منتظر تھی۔“ وہ بھی دھیرے سے اس کی بانہوں سے نکلتے ہوئے بولی۔

”میں موقع کی تلاش میں تھا۔ نانو تقریباً آدھا گھنٹہ تو دنداسا ملیں گی اور ناجی پالک کاٹ کر گھنٹہ بھر پالک دھوئے گی اور اس وقت کو ہم اکٹھا بتائیں گے۔“

”فرحان پلیز احتیاط ضروری ہے، ہم مشکل میں پھنس سکتے ہیں۔“

”یار جو وقت ملا ہے اسے تو اچھا گزارو۔“

”دل کو سمجھائیے اور اب جاییے پلیز۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”آج اس گھر میں تمہارا پہلا دن ہے رات کو ضرور ملنا۔“ وہ بولا۔ سامعہ کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”جو تم نے سنا ہے! تم نے وعدہ کیا تھا کہ جو میں کہوں گا وہ تم کرو گی اور...“

”اور کی ضرورت نہیں۔ مجھے آپ کے کہنے سے اختلاف نہیں، آپ کے بابا کی عزت کا خیال ہے۔“ وہ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے بولی۔

”اوکے! لیکن رات کو ملنا ضروری ہے۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا اور وہ الجھن میں گرفتار بیڈ پر گر گئی۔ پہلے دن ہی وہ اسے کس مشکل میں ڈال گیا تھا۔

☆☆...☆☆...☆☆

”ہنہ یہ آگیا اس ہیں لمین جو اب باری ہے اس کو اوون میں رکھنے کی۔“  
خود سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے ڈش اوون میں رکھ کے اس کا ٹمپرچر سیٹ  
کیا ہاتھ دھوئے اور پھر سلاد بنانے کے لیے مطلوبہ سبزیاں فریج سے نکالنے  
لگی۔ اپنے کام میں اتنی محو تھی کہ زبیر احمد کے آنے کا پتا ہی نہیں چلا۔

”واہ! کیا خوش ہو ہے۔“ وہ لمبی سانس بھر کے بولے۔ تو وہ چونکی۔

”پپا! آپ آگئے۔“

”جی ہاں! ہماری بیٹی مزے دار کھانا بنائے اور پپا نہ آئیں یہ کیسے ممکن  
ہے؟“ زبیر احمد خوش ہو کر بولے۔

”مگر جلدی کیوں؟“

”دراصل میں کچھری سے آرہا ہوں آفس تو آج جاہی نہیں سکا۔“ وہ یہ کہہ  
کر دھلی ہوئی سرخ گاجر اٹھا کر کھانے لگے مگر زرتاشیہ زرد پڑ گئی۔

”پپا! کچھری۔“ مشکل سے وہ بولی۔

”ہاں بیٹا کاغذات تیار کرانے تھے۔“ وہ اطمینان سے بولے۔ اس سے پہلے کہ  
وہ کچھ اور پوچھتی ان کا موبائل فون بج اٹھا وہ بات کرتے ہوئے اپنے کمرے  
کی طرف بڑھ گئے۔ جب کہ بے اختیار ہی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں  
ہو گئے۔ وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔

”مما! آپ نے اچھا نہیں کیا میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔“  
روتے روتے وہ بڑبڑائی اور بازوؤں میں سر دے کر فرش پر بیٹھ گئی۔ کافی دیر  
گزر گئی۔ زبیر احمد بھاگتے ہوئے کچن میں آئے تو اوون سے اٹھتے ہوئے دھوئیں  
اور جلے ہوئے مسالوں کی بو سے ان کا دماغ الٹ گیا۔ اسے فرش پر بیٹھا دیکھا  
جلدی سے اوون بند کیا۔ ایگزاسٹ فین آن کیا۔ پھر اسے کھینچ کر باہر نکالا۔

”زرتاشیہ! زرتاشیہ کیا ہوا؟“ وہ پریشانی میں اسے روتا دیکھ کر بولے۔

”کچھ نہیں پپا۔“ آنکھیں صاف کر کے روسٹ جلنے کی وجہ سے شرمندہ ہو  
کر بولی۔



”اُس اوکے مائی چائلڈ! میں اس کی وجہ سے پریشان نہیں ہوں۔ آپ کیوں رو رہے تھے؟ انہوں نے اسے سینے سے لگا کر وفور محبت سے پوچھا۔

”کچھ بھی تو نہیں۔ میں آپ کے لیے کچھ اور بناتی ہوں، آپ تھوڑا سا آرام کر لیں۔“ وہ نارمل ہوتے ہوئے کچن کے اندر جانے لگی۔

”نہیں چلو ہم باہر چلتے ہیں آپ فریش ہو کر آؤ۔“ انہوں نے منع کر دیا۔ مگر اس وقت اس کا کسی چیز میں دل نہیں تھا۔ طبیعت بے چین تھی۔

”پپا! موڈ نہیں ہے۔“

”کوئی موڈ ووڈ نہیں چلے گا۔ آپ فوراً تیار ہو کر آؤ۔“ انہوں نے ایک نہ سنی تو وہ بے دلی سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

زبیر احمد کا دل دکھ سے بھر گیا۔ انہیں اس وقت زرتاشیہ بہت تنہا اور ڈپرپس لگی تھی۔ وہ بطور خاص تو کچھ نہیں جانتے تھے۔ البتہ معلوم تھا کہ وہ ماں کو مس کرتی ہے۔ لیکن کچھ دیر پہلے تو وہ بالکل نارمل تھی۔ ایک دم اسے کیا ہوا؟ یہ سوال انہیں مضطرب کیے ہوئے تھا۔ اس کا دل بہلانے کے لیے ہی

باہر جانے کا پروگرام بنایا۔ ورنہ کھانا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اماں جان کے پاس جانے کی دیر تھی۔ وہ منٹوں میں گرما گرم پھلکے بنا کر دیتیں۔

وہ تیار ہو کر آئی تب بھی چہرہ سوگوار تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ مستقل قسم کی خاموشی تھی، غیر معمولی سنجیدگی اور تیاری میں بھی لا ابالی پن سا تھا۔ وہ کچھ

نہیں بولے۔ بلکہ گاڑی میں بھی کوئی بات نہیں کی۔ ریسٹورنٹ میں مینو کارڈ اس کے سامنے کر دیا تو اس نے ایک دم ہی اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کی۔ اس کے پپا اس کی خاطر اب تک بھوکے تھے، اس نے جلدی جلدی مسکرا کر ان کی پسندیدہ دو ڈشز کا آرڈر کیا اور پھر گپ شپ کرنے لگی۔ زبیر احمد کو حیرت تھی۔

”بیٹا! ایکٹنگ پہلے تھی یا اب ہو رہی ہے۔“ وہ پوچھ ہی بیٹھے۔

”نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔“ اس نے مطمئن کر دیا۔

”آپ کچن میں مت جایا کرو، مجھے ڈر لگتا ہے۔“ انہوں نے کہا۔

”پپا مجھے کچن میں جانا اور آپ کے لیے کچھ کھانا اچھا لگتا ہے۔“

”تھینک یو بیٹا!“ وہ خوش ہو گئے۔

پھر وہ کھانا آنے سے لے کر کھانے کے دوران بھی ادھر ادھر کی بے شمار باتیں کرتی رہی جس میں سامعہ کا ذکر بھی شامل تھا۔ زبیر ٹھٹکے اور پہلو بدل کے رہ گئے مگر زرتاشیہ سے کچھ پوچھا نہیں۔

☆☆...☆☆...☆☆

شاہدہ بیگم کا آفیشل ڈنر تھا۔ تانیہ نے مارکیٹ سے خرم کے لیے گفٹ خریدنا تھا وہ میاں افتخار کے ذمے لگ گئی۔ ایسے میں میاں افتخار نے سامعہ کو بھی ساتھ چلنے کو کہا۔

”جی وہ میں نہیں پھر سہی۔“ سامعہ ہکلائی۔

”چلیں آپ کو آئس کریم کھلائیں گے۔“ تانیہ نے کافی خوش اخلاق ہونے کا مظاہرہ کیا۔

”شکریہ! پھر سہی۔“ سامعہ فرحان کی نگاہوں کا اشارہ سمجھ کر صاف انکار کرتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ کھانا تو سبھی کھا چکے تھے۔

”ارے میاں! آپ واپسی پر فینائل، ڈی ڈی ٹی پائوڈر اور تارپین کا تیل ضرور لائیے گا۔“ اماں جان کھانے کے برتن سمیٹے ہوئے بولیں۔

”نانو! ہم سپر مارکیٹ جا رہے ہیں وہاں یہ چیزیں نہیں ملتیں۔“ تانیہ تنک کر بولی۔

”ارے لڑکی! ہم نے تمہارے باوا کو کہا ہے، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“ اماں جان نے بھی خاصے سخت لہجے میں جواب دیا۔

”اوکے! اماں جان آپ فکر ہی نہ کریں۔ بس آپ سامعہ بیٹی کے لیے فرحان کے برابر والا کمرہ کھلوا دیں۔ آپ تو سارا دن اپنے کمرے میں ہوتی نہیں ہیں۔

یہ بے چاری خود کو حراست میں محسوس کر رہی ہوگی۔“ آج فرحان نے باپ سے یہ بات کی تھی۔ اس لیے میاں افتخار نے موقع دیکھ کر کہہ دیا۔

”بوریت سے بچنے کا تو ایک ہی حل ہے کہ خود کو مصروف کرلو۔“ اماں جان بات ٹال گئیں۔

”سامعہ آپ ایسا کرو اپنا کمرہ خود سیٹ کرو، سجاؤ اس طرح بوریت نہیں ہوگی۔“ میاں جی پھر اسی موضوع پر آگئے۔

”ارے واہ! ہر کمرہ سیٹ ہے اور صاف ستھرا ہے۔ ہمیں پھوہڑ سمجھا ہے کیا؟“ اماں جان بدکیں۔

”نانو! بابا کا مطلب یہ نہیں تھا۔“ فرحان نے نرمی سے کہا۔

”اچھا اب سب یہاں سے اٹھو ناجی کو برتن اٹھا کر ٹیبل کی صفائی کرنی ہے۔“ وہ بولیں کمرے والی بات وہیں رہ گئی میاں جی آہ بھر کے تانیہ کو لیے پورچ کی طرف بڑھ گئے اور فرحان کو خود ناجی کو آواز لگانی پڑی۔

”ناجی! سامعہ بی بی کے لیے میرے ساتھ والا کمرہ ابھی کھول دو۔“

”جی اچھا۔“ ناجی نے قریب آکر جواب دیا۔ فرحان نے سامعہ کو دیکھا اور خود اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ سامعہ بھی اٹھی اور اندر کی طرف چلی گئی۔

”بڑی بیگم صاحبہ کمرہ کھول دوں۔“ ناجی نے اجازت طلب کی۔

”کھول دو صاحب بہادر حکم جو دے گئے ہیں۔“ اماں جان نے تخت پر بیٹھ کر اپنا پاندان کھولتے ہوئے کہا۔

انہیں صحن میں بیٹھا دیکھ کر زبیر احمد اسی طرف آگئے۔

”آؤ بیٹھو ماں صدقے۔“ اماں جان نہال ہو گئیں۔ وہ ان کے برابر بیٹھ گئے۔

”کھانا لائوں۔“

”نہیں زرتاشیہ نے چائومن اور کسٹرڈ بنایا تھا۔ وہ ہم کھا چکے ہیں۔“

”ہماری زرتاشیہ کتنی سگھڑا ور ذمہ دار ہوگئی ہے۔“ اماں جان محبت سے بولیں۔

”جی ہاں اور بہت ڈسٹرب سی بھی ہے۔“ وہ سرد آہ بھر کے بولے۔

”ماں کا ایسا قدم اٹھانا بچی کو ڈسٹرب تو ہونا ہی تھا۔“

”بہر کیف مجھے آپ کو بتانا تھا کہ نرگس فیصلہ چاہتی ہے۔ سو میں نے طلاق دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ گلریز بھائی ایک دو روز میں آرہے ہیں وہ ایسا نہیں چاہتے مگر نرگس جو چاہتی ہے میں وہی کروں گا۔ آپ کو گلریز بھائی کی بات سے اتفاق نہیں کرنا۔“ وہ خاصے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولتے چلے گئے۔

اماں جان کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے اکلوتے بیٹے کا گھر اجڑتے دیکھنے کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

”زبیر اچھی طرح سوچ سمجھ لو یہ چھوٹا فیصلہ نہیں ہے۔“

”اماں جان آپ سے ہی سنا تھا کہ اس طرح کے فیصلوں پر عورتیں زیادہ سوچتی ہیں نرگس آپ کے سامنے ہے۔“

”وہ کم عقل اور نادان ہے۔“

”وہ خود سر اور خود پسند ہے۔“

”چلو کچھ بھی کہہ لو مگر پھر بھی تم سمجھداری سے کام لو۔“ اماں جان بہت دکھی ہو کر بولیں۔

”اماں جان! جس عورت نے ایسا کہہ دیا۔ سمجھ لیجیے اس نے ایسا کر لیا۔“ زبیر احمد خاصے تحمل سے بولے۔

”اس کے بعد زرتاشیہ کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا؟“

”اللہ مالک ہے فی الحال آپ افتخار بھائی سے شاہدہ باجی سے کہیے کہ وہ شادی کی تاریخ طے کریں۔“

”ارے تاریخ تو ہم طے کریں گے۔ وہ راضی تو ہوں۔“ اماں جان بولیں۔

”کیا مطلب؟“ وہ چونکے۔

”میاں صاحبزادے کا کوئی واضح مقصد کام کاج تو سامنے آئے کبھی فرماتے

ہیں باہر جانا ہے کبھی کہتے ہیں یہاں بزنس کرنا ہے۔“

”کچھ بھی پروگرام ہے شادی تو ضروری ہے۔“

”چلو میں آج یا کل کھل کر بات کرتی ہوں۔“

”میں نے گھر اور کنال والا پلاٹ زرتاشیہ کے نام کرادیا ہے۔ پروسیجر میں ہے ایک دو روز میں زرتاشیہ کے سائن بھی ہو جائیں گے۔“

”اس کی کیا ضرورت تھی۔“

”میں دل کا مریض ہوں جو کچھ زندگی میں کردوں بہتر ہے۔ جو بھی ہے زرتاشیہ کا ہی ہے۔“ وہ دکھ سے ہنس کر بولے۔

”اللہ خیر رکھے“ ماں کی عمر لگ جائے دل چھوٹا نہیں کرتے زرتاشیہ کون سا دور جائے گی۔“ اماں جان نے وفور محبت سے بیٹے کا سر سینے سے لگا کر پیار کیا ماں کی گرم محبت کے اثر نے زبیر احمد کے ذہن کا بوجھ کافی حد تک کم کر دیا۔ وہ کافی دیر ان کے پاس بیٹھے رہے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے سامعہ کے بارے میں بھی انہوں نے پوچھا اور اماں جان نے منصل سامعہ کی حقیقت ان کو بیان کر دی۔

☆☆...☆☆...☆☆

اماں جان کا کہنا بالکل سچ تھا۔ کمرہ آئینے کی طرح اُجلا اور چمک دار تھا روشن اور ٹھنڈا وہ بیڈ پر دراز ہو کر بغور جائزہ لینے لگی۔ ناجی جا چکی تھی اس نے پلکیں موندی ہی تھیں کہ کھٹ سے کمرے کا دروازہ کھلا اس نے آنکھیں کھول دیں اور فوراً اٹھ بیٹھی زرتاشیہ آئی تھی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ دھیرے سے مسکرا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”فائن آپ سناؤ کہاں غائب تھیں۔“ سامعہ کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔

”بس یونہی کچھ اپ سیٹ تھی۔“ زرتاشیہ نے سچ بولا۔

”خیریت۔“

”ہاں! سب کچھ شاید نارمل ہی ہے۔ دھواں دھواں سا۔“ وہ بے پروائی سے کہہ گئی مگر سامعہ نے جملہ پکڑ لیا۔

”دھواں ہو تو آگ بھی ضرور ہوتی ہے۔“



”ہاں آگ تو برابر لگی ہے سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا ہے شاید۔“ وہ بجمی  
بجمی سی بولی۔

”زرتاشیہ! آپ تو اتنی اچھی پیاری ہو، پھر کیا ہوا؟“ سامعہ نے اس کا ہاتھ  
تھام لیا۔

”ہنہ کچھ نہیں آئیں ہیں آپ کو اپنے گرمٹ پپا سے ملواتی ہوں۔“ وہ ایک دم  
بولی۔

”اچھا لیکن اب تو کافی وقت ہو گیا ہے۔“ سامعہ نے وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔  
”صرف گیارہ بجے ہیں۔“

”اس وقت بے آرام کرنا اچھا نہیں لگتا کل مل لوں گی۔“ سامعہ کے اندر  
کسی اور وجہ سے بے چینی تھی۔ اسے یقین تھا کہ فرحان شدت سے اس کا  
انتظار کر رہا ہوگا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ دروازہ کھلا اور فرحان ہاتھ  
میں چھوٹی سی ڈبیہ پکڑے ایک دم اندر آگیا اور پھر سامعہ کے پاس زرتاشیہ  
کو دیکھ کر کچھ جزبہ سا ہونے لگا۔

”تم یہاں ہو۔“ نظریں چراتے ہوئے پوچھا۔

”آپ مجھے تلاش کر رہے تھے۔“ زرتاشیہ کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

”نہیں بس ویسے ہی۔“

”میں بیٹھیں پلیز۔“ سامعہ نے کہا۔

”ہاں! بیٹھیں سامعہ بہت اچھی باتیں کرتی ہیں۔“

”جانتا ہوں۔“

”جی۔“ زرتاشیہ نے حیرت سے کہا۔

”ہنہ ہاں چلو آؤ ماموں جان انتظار کر رہے ہیں۔“

”یہ کیا ہے؟“ زرتاشیہ نے اس کے دائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کیا جس میں  
ڈبیہ دبی تھی۔

”یہ سرپرائز ہے۔“ وہ یہ کہہ کر جانے کو تھا کہ زرتاشیہ بولی۔

”کس کے لیے۔“

”یہ بتانا ضروری نہیں۔“ وہ کچھ سختی سے بولا۔

”یہ یقیناً آپ کے لیے ہوگا۔“ سامعہ نے ایک دم ہی بڑی جرأت کا مظاہرہ کر دیا۔ فرحان نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا... وہ نظریں جھکا کر دوبارہ بولی۔

”دیکھیں تو آپ زرتاشیہ کے لیے کیا لائے ہیں؟“

”یہ لیں جی بھر کے دیکھیں۔“ فرحان نے آگے بڑھ کر سختی سے سامعہ کا ہاتھ پکڑ کر ہتھیلی پر ڈبیہ رکھی اور تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ سامعہ دروازہ تکتی رہ گئی۔ زرتاشیہ نے اس کی ہتھیلی سے ڈبیہ اٹھالی اور کھول کر دیکھا۔

”واہ بیوٹی فل۔“ اس کے منہ سے ایک دم نکلا سامعہ نے اداسی ضبط کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ سفید جڑائو نازک سی انگوٹھی اس کے ہاتھ میں تھی۔

”واقعی بہت خوب صورت ہے پہن کر دکھاؤ۔“ اس نے مسکرا کر بھرپور اداکاری کی۔

”حیرت ہے فرحان کوئی تحفہ میرے لیے لائے ہیں۔“ زرتاشیہ جھوم اٹھی۔

”اس سے پہلے کبھی نہیں لائے۔“

”اوہ ہنہ! یہ تو آپ کے مبارک قدموں کا کمال ہے۔“

”چلو ایسا ہی سمجھ لو۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”میں یہ پپا کو دکھاتی ہوں۔ آپ اب آرام کریں۔“ زرتاشیہ یہ کہہ کر بے قرار سی باہر نکل گئی۔ سامعہ دکھ سے مسکرا کر دروازہ بند کر کے بیڈ پر گر گئی۔

”سب کچھ غلط ہو گیا فرحان اس کے لیے کتنے ارمان سے لایا تھا اور سب الٹ ہو گیا یقیناً وہ ناراض ہوگا۔ اس نے سوچا اور پہلے موقع پر ہی زرتاشیہ اس کی خوشی اڑا لے گئی تھی۔ آگے کیا ہوگا؟ سامعہ دل کڑا رکھو۔“ اس نے خود

کو دلاسہ دیا اور پھر بھیگی بھیگی پلکوں کے ساتھ وہ سو گئی بالکل فرحان کے کمرے کی دیوار کے دوسری طرف یہ جانتے ہوئے بھی کہ فرحان کو شدید غصے کے باعث نیند نہیں آئے گی۔ مگر وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ نہ اس کے پاس جا سکتی تھی اور نہ پاس بلا سکتی تھی۔

...☆☆☆...

سارے گھر میں دھوم مچی تھی۔

فرحان کی دی ہوئی انگوٹھی سب نے زرتاشیہ کی انگلی میں دیکھی اور سب ہی خوش تھے۔ خاص کر بڑی بیگم اور زبیر احمد۔ شاہدہ بیگم تو بڑے قرینے سے خوشی کا اظہار کرتی تھیں۔ میاں افتخار کو البتہ انگوٹھی دیکھ کر جھٹکا سا لگا تو وہ فرحان کے ساتھ پیدل ہی گھر سے باہر نکل آئے۔

”یار! یہ کیا ڈرامہ ہے؟“ وہ خاصے بلند لہجے میں بولے۔

”ڈرامہ تھا تو نہیں بنا دیا گیا۔“ وہ پھولے ہوئے منہ کے ساتھ بولا۔

”آپ نے پانچ ہزار کی انگوٹھی سامعہ کے لیے خریدی تھی اور دے دی زرتاشیہ کو یعنی زرتاشیہ والا معاملہ ٹچ ہے۔“ میاں جی خاصے بوکھلائے ہوئے تھے۔

”بابا! سامعہ نے آناً فاناً انگوٹھی زرتاشیہ کو دے دی۔“

”مگر کیوں؟“ وہ چلائے۔

”بس شاید وہ بوکھلا گئی زرتاشیہ اس کے پاس تھی اور...“

”گھامڑ! آپ کو اس وقت جانا تھا کیا؟“

”دیکھ بھال کے ڈر ڈر کے جانا تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ نانو کی کڑی نگاہیں تو تعاقب میں رہتی ہیں۔“

”مجھے ترس آرہا ہے زرتاشیہ پر بے چاری کتنی خوش ہے۔ اسے نہیں معلوم اس خوشی کی حقیقت کیا ہے۔ عجیب سی بات ہے ایسا لگتا ہے کہ زرتاشیہ کو ہم دھوکا دے رہے ہیں۔ اس کے خوابوں کو تعبیر سے محروم کر رہے ہیں۔“

میاں جی نرم دل اور نرم خو ہونے کے باعث دکھی سے ہو گئے۔ تب فرحان نے بھی کچھ مذمت محسوس کی مگر وہ تو کسی اور کا ہو چکا تھا۔

”بابا! دل چاہتا ہے زرتاشیہ کو سچ سچ بتادوں۔“ وہ بولا۔

”شاباش تاکہ گھر میدان جنگ بن جائے آپ کی اماں اپنی اماں جان کی چیخ و پکار تلے دب جائیں اور ہم گھر بدر کر دیے جائیں۔“

”پھر۔“

”پھر یہ کہ میرے بچے آئندہ کچھ دیتے ہوئے دھیان رکھنا زرتاشیہ کو طریقے سے اس گرداب سے نکالنا ہے۔ تاکہ اسے صدمہ نہ ہو۔“ میاں جی بولے۔

”پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ زرتاشیہ کی خوش فہمی نے نیا رخ اختیار کر لیا ہے۔“ وہ جھنجھلا سا گیا۔

”چلو چھوڑو دیکھا جائے گا، آپ نے محسوس نہیں کیا کہ نانو کے لہجے میں کتنی تبدیلی آئی ہے۔“

”ارے بیٹا آپ کی نانو دل کی بری نہیں ہیں۔ ان کی محبت کا انوکھا سا انداز ہوتا ہے۔“

”بابا! ایسے کیسے ٹھیک ہوگا۔ وہ اپنے کمرے میں بند اور میں اپنے میں۔“ وہ جذباتی سا ہوا تو میاں افتخار نے چلتے چلتے اس کا کان پکڑ کے دبایا۔

”دل قابو میں رکھو صاحبزادے ورنہ سب چوپٹ ہو جائے گا۔ تانیہ کے ایگزامز ہو گئے ہیں۔ اب گھر میں آپ کی اور تانیہ کی شادی کا مسئلہ کھڑا ہوگا۔“

”جس دن مسئلہ کھڑا ہوگا اسی دن میں صاف صاف بتادوں گا۔“

”صبر، حوصلہ فی الحال یہ بتاؤ کہ کاروبار کب شروع کرنا ہے۔ اپنے پاس پلاٹ ہیں اور ایک عدد دکان۔ شاید کچھ رقم اکاؤنٹ میں بھی ہو۔“

”اما بھی تو کہتی رہتی ہیں۔ ان کے پاس بھی کچھ پیسے ہیں۔“ وہ بولا۔

”بھی ان کے روپے پیسے کا ہمیں کچھ علم نہیں وہ اپنی اماں جان کے سوا کسی کو کچھ نہیں بتاتیں۔“ میاں جی نے واپسی کے لیے مڑتے ہوئے کہا۔

”خیر کچھ تو کرنا ہے۔ ورنہ ملازمت کر لیتا ہوں۔“

”ہنہ یہ بھی اچھا آئیڈیا ہے۔ اپنا سی وی مختلف ملٹی نیشنل کمپنی کو بھیجتے رہو۔“

”اور بابا اگر شادی کے لیے دائرہ تنگ کیا گیا تو میں سامعہ کو لے کر یہاں سے چلا جائوں گا۔“

”یار! جلد بازی نہیں، ابھی تو فلم شروع ہوئی ہے۔ بہت کچھ باقی ہے۔“ وہ بولے۔

”بابا! مسز جیری کا فون آیا تھا۔ وہ یہاں سے جا رہی ہیں۔ ایک بار سامعہ سے ملنا چاہتی ہیں۔“ اسے یاد آیا۔

”تو ملوادیے ہیں آپ ایاز کی طرف انہیں بلا لیں۔ میں خود سامعہ کو لے آؤں گا۔“ میاں جی نے اس کی مشکل حل کر دی۔

”یہ ہوئی نا بات۔“ وہ خوش ہو گیا۔

اور پھر گھر واپس آنے تک وہ سارے راستے کل کے پروگرام ذہن میں ترتیب دیتا رہا۔

سنٹرل لائبریری کی کچھ کتابیں واپس کرنی تھیں۔

تانیہ کو مجبوراً رکشے پر جانا پڑا۔ رکشا باہر کچھ دیر کے لیے کھڑا چھوڑ کے وہ کتابیں واپس کرنے گئی۔ جونہی وہ باہر نکلی تو وہ ایک دم موٹر سائیکل لے کر اس کے اور رکشے کے درمیان آگیا۔ اس نے چونک کر دیکھا اور رکشے میں بیٹھنے والی تھی کہ وہ بڑے تحکم سے رکشا ڈرائیور سے مخاطب ہوا۔

”کتنے پیسے ہوئے ہیں بولو؟“

”تم اپنا کام کرو۔“ رکشہ ڈرائیور سے پہلے تانیہ کی آواز گونجی۔

”کام تم سے ہے۔ اچھا ہوا جو مل گئیں۔ چلو موٹر بائیک پر بیٹھو۔“ اس نے جیب سے بٹوہ نکال کر سو روپے کا نوٹ نکالا اور رکشا ڈرائیور کے ہاتھ میں رکھتے ہوئے آرڈر چلایا۔ یہ بھول کر کہ وہ تانیہ افتخار جیسی بدتمیز نک چڑھی سے مخاطب ہے۔ وہ بھٹا گئی۔ رکشہ غائب ہو گیا۔



”یہ سو روپے کے نوٹ کی جھلک تم جیسے بھیک منگوں کے لیے اہمیت رکھتی ہوگی۔ میرے لیے نہیں۔“

”جانتا ہوں اسی لیے رکشے میں سفر کر رہی تھیں اور پلینز پھر کبھی ایسی بد زبانی نہ کرنا، شاید میں بہت فراخ دل نہیں ہوں۔“ وہ دو بدو بولا۔

”اے! ہولڈ یور ٹنگ!“ وہ چلائی۔

”سنا نہیں تم نے کہ میرے ساتھ چلو۔“

”کیوں...؟“

”سوال نہیں، صرف عمل۔“ سخت لہجہ استعمال کر کے موٹر بائیک اسٹارٹ کی۔

”کہاں...؟“

”سامنے صرافہ بازار تک، امی نے زیورات کے ڈیزائن کی بُک منگوائی ہے، تم ساتھ ہوگی تو آسانی ہو جائے گی۔“

”یہ فضول کام میں کیوں کروں؟“ وہ کچھ نہ سمجھی۔

”کیونکہ یہ فضول کام تم سے متعلق ہے۔“

”دیکو مت۔“

”بیٹھ جائو!“ اس نے آخری بار خوں عوار نظروں سے گھورا تو وہ بھی اڑ گئی۔

”ہر گز نہیں۔“

”کیوں تماشا بن رہی ہو؟ بیٹھ جائو میں شاید غریب ہوں مگر اطمینان رکھو، شریف ہوں، تمہیں اغوا کر کے نہیں لے جائوں گا۔ گھر حفاظت سے چھوڑ کے آؤں گا۔“ وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا۔

”دیکھو!“

”عمر پڑی ہے تمہیں ہی دیکھنا ہے۔ اس وقت بیٹھ جائو۔“ وہ خاصا نرمی سے شرارت آمیز جملہ کہہ گیا۔ لوگ دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ سوچ کر مجبوراً بائیک پر بیٹھ گئی۔

”سنجھ کر، مجھے کمر سے پکڑ سکتی ہو۔“ موٹر سائیکل جھٹکے سے اسٹارٹ کی اور دھیرے سے کہا تو وہ چلائی۔

”کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔“

”سنو! تانیہ تم بھی یاد رکھنا کہ عادل اپنی چیزیں اپنے پاس ہی رکھتا ہے۔“

”جسٹ شٹ اپ!“ وہ چیخی تو عادل ہنستا گیا، وہ نا سمجھ اس کی ہنسی میں چھپے پیار کو پہچان نہیں سکی۔ لمبے چوڑے عادل کے سینے میں اس کے لیے کتنی محبت پیدا ہو چکی ہے۔ ہلکی سی گردن گھما کر اس نے اس کی طرف دیکھا اور پھر صرافہ بازار کی پہلی بڑی سی جیولر کی دکان کے سامنے موٹر سائیکل روک کر اسے اترنے کا اشارہ کیا تو وہ اکڑ کر اتری اور ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ عادل نے لاکھ کوشش کی اسے اندر لے جانے کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ تب وہ بری طرح سلگ اٹھا، بنا اندر گئے واپسی کے لیے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور زن سے نکال لے گیا۔ وہ وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

گھر پہنچتے ہی غصہ کم کرنے کے لیے وہ غٹا غٹ دو تین گلاس پانی پی گیا۔ رفیعہ بیگم نے الگنی سے سوکھے کپڑے اتارتے ہوئے غور سے اسے دیکھا۔

”لے آئے ڈیزائن کی کتاب۔“

”نہیں، اور نہ اس کی ضرورت ہے۔“ وہ بھٹنا کر بولا۔

”عادل! کسی سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟“ وہ فکر مند ہو گئیں۔

”امی! جو آپ کے دل میں آئے خریدیں، بنائیں آئندہ مجھے اس قسم کے کاموں کے لیے نہ کہئے گا۔“

”یار! یہ تو شادی کے لیے ضروری کام ہوتے ہیں۔“ میاں ستار ہنس کر بولے۔

”ابا جی! پہلے شادی کی تاریخ ضروری ہوتی ہے، میرا خیال ہے آپ کو مایوسی ہوگی۔“ وہ بولا۔

”اللہ خیر کرے، کیسی باتیں کرنے لگے ہو؟“ رفیعہ بیگم نے بگڑ کر کہا۔

”یقین نہیں آئے گا آپ کو، بات کر کے دیکھ لیں۔“ وہ یہ کہتا ہوا واپس گھر سے باہر نکل گیا۔

”کیا ہو گیا ہے، گیا تو ٹھیک ٹھاک تھا۔“ رفیعہ بیگم نے کچھ حیرت سے کہا۔

”کہتا ٹھیک ہے، پہلے افتخار اور شاہدہ سے شادی کی تاریخ کی بات کرو۔“  
میاں ستار نے بیٹے کی تائید کی۔

”بات ہی بات ہے، اب افتخار اور شاہدہ کیا کہیں گے؟“

”تو بھولی ہے، شاہدہ کو ٹھیک سے نہیں پہچانتی، پہلے ٹھوک بجا کے تاریخ لے پھر کوئی دوسرا کام۔“ میاں ستار نے رفیعہ بیگم کو الجھن میں گرفتار کر دیا۔

”آپ بھی کمال کرتے ہو، اب نیا رشتہ طے کرنا ہے کیا، عادل کا کام خوب چل نکلا ہے، تانیہ کے امتحان ہو گئے ہیں، مجھے خود اماں جان نے جلدی کا کہا تھا۔“

”چلو... یونہی سہی، اب آج کل میں جائو اور تاریخ کی بات کرو۔“

”زیورات کے ڈیزائن والی کتاب اسی لیے منگوائی تھی کہ پسند کرانے کے بہانے بات بھی ہو جائے گی، دوسرے شاہدہ اور افتخار کو اندازہ ہو جائے گا کہ شادی جلدی کرنی ہے۔“

”ڈیزائن بک میں لادیتا ہوں یہ کون سا مسئلہ ہے؟“

”آپ اتنی دور کیسے جائیں گے؟“

”بھئی اب صحت ٹھیک ہے، پیدل سڑک تک پھر آگے سے رکشالے لوں گا۔“ وہ بولے اور فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

”پہلے اپنی دوا کھائیں اور واپسی پر سبزی مارکیٹ سے آلو، ٹماٹر اور پیاز لیتے آئیے گا۔“ رفیعہ بیگم نے جلدی جلدی میز پر سے دوا اٹھا کر انہیں پانی کے گلاس کے ساتھ دی۔

”میرا خیال ہے میں خود نہ افتخار کی طرف ہو آؤں۔“ وہ کچھ سوچ کر بولے۔

”آپ اتنی دور جائیں گے؟“

”ہاں! واپسی پر افتخار چھوڑ جائے گا۔“

”مگر...“ وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

”اگر مگر کچھ نہیں، میں خود بات بھی کر کے آؤں گا۔“

”چلئے ٹھیک ہے لیکن افتخار سے بات کرنی ہے، وہ گھر میں نہ ہو تو چپ چاپ واپس آجائیے گا۔ ڈیزائن بک دے آئیے گا۔ کل پرسوں میں پھر میں چکر لگائوں گی۔“

”تم اتنا ڈرتی کیوں ہو؟“

”ڈرنے کی بات نہیں، رشتہ نازک ہے۔ اونچ نیچ سے ڈرتی ہوں۔ بچپن کا رشتہ ہے۔“

”کوئی بات نہیں، اگر نخرے کرتے ہیں تو بیٹی سنبھال کر رکھیں۔ میرے عادل کے لیے ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ موجود ہے۔“ وہ خاصے گرج دار انداز میں بولے۔

”نہیں، عادل کی مرضی بھی تو سمجھیں۔“

”کیوں؟ عادل نے کچھ کہا ہے کیا؟“ وہ بولے۔

”بھئی اتنا پرانا رشتہ، بچے کچھ سوچنے لگتے ہیں آپ بھی حد کرتے ہیں۔“ رفیعہ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”عادل میرا بیٹا ہے، اگر افتخار اور شاہدہ نے کچھ گڑ بڑ کی تو ہم بھول کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھیں گے۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولے۔

”ارے توبہ ہے جی! اب جاییے اللہ کا نام لے کر۔“ رفیعہ بیگم نے کہا۔

”رفیعہ بیگم! تم شاہدہ کی عادت سے واقف نہیں ہو۔“

”آپ صرف شاہدہ کو موردِ الزام نہ ٹھہرایا کریں، افتخار کی مرضی کے بغیر وہ اسے نہیں رکھ سکتی تھی۔“

”کچھ بھی ہوا، افتخار تو پرایا ہو گیا، کہاں ہم ایک دوسرے کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے اور اب مہینوں ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھ سکتے۔“ میاں ستار کی آواز بھرا گئی۔

”اب عادل اور تانیہ کی شادی کے بعد آنا جانا لگا رہے گا۔“ رفیعہ بیگم نے مسکرا کر تسلی دی تو وہ اللہ حافظ کہہ کر باہر چلے گئے۔

...☆☆☆...

جو نہی شاہدہ بیگم سامعہ کے کمرے میں پہنچیں تو تانیہ بھی تنناتی ہوئی وہیں آگئی... شاہدہ بیگم تو میاں جی کے بتانے پر سامعہ سے اس کے شوہر کی گمشدگی کے بارے میں کچھ باتیں کرنے لگی تھیں... مگر تانیہ کا جلال دیکھ کر وہ اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”کیا بات ہے اس قدر غصے میں کس لیے ہو؟“

”ماما! آپ تائی امی کو ٹھیک سے سمجھا دیں، مجھے عادل کی بلاوجہ کی بدتمیزی ہر گز پسند نہیں۔“ وہ اپنے غصے میں سامعہ کی موجودگی کا احساس بھی بھول گئی۔

”تانیہ! ابھی آرام سے بات کریں گے، آپ اپنے کمرے میں چلو۔“ انہوں نے نرمی سے کہا۔

”تو، ابھی اسی وقت ان سے بات کریں، انہیں بتادیں کہ مجھے ان کے پھٹیچر بیٹے سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ وہ اور زیادہ اشتعال بھرے انداز میں چلائی تو سامعہ کچھ شرمندہ سی ہو کر ”ایکسیکوزمی“ کہہ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

”تانیہ! دیکھو! یہ لڑکی کتنی سمجھدار ہے، اپنا رویہ نارمل رکھا کرو۔“ انہوں نے بہت آہستہ سے کہا تو وہ ہتھ سے اکھڑ گئی۔

”ماما! آپ نہیں جانتیں اس نے آج کتنی بدتمیزی کی ہے؟“

”ویسے وہ بدتمیز تو نہیں۔“



”آپ کس کو بدتمیزی کہتی ہیں۔ گالم گلوچ کو، مارپیٹ کو یا زبردستی کرنے کو۔“

”تانیہ! پلیز! آرام سے بات کرو، میری طبیعت ویسے ہی کچھ خراب ہے۔“ وہ خاصے تحمل سے بولیں۔

”اس کا مطلب ہے مجھے خود انہیں کھری کھری سنانا پڑیں گی۔“

”ایسا کیا ہو گیا ہے تانیہ...“ وہ بے بسی سے بولیں۔

”عادل کی اتنی مجال کہ وہ مجھے اپنی بانیک پر زبردستی بٹھائے اور اس کی خوش فہمی دور کر دیں کہ مجھے اس کے زیورات سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ وہ ایک سانس میں بولتی چلی گئی۔

”خدا کے لیے جائو، جاکر آرام کرو۔“

”آپ بابا سے بات کریں گی یا نہیں، ختم کریں اس رشتے کو۔“

”یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب خرم کی بات آگے بڑھے۔“ انہوں نے بھی کچھ سختی سے دبے دبے لہجے میں کہا۔

”خرم تو جب بات بڑھائے گا، جب آپ اس بھوت بنگلے سے نکلیں گی۔“ وہ تنکی۔

”تانیہ! میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا، آپ کیسی لاینخل قسم کی باتیں کرتی ہو؟“ انہوں نے وہاں سے نکلتے ہوئے کہا۔ مگر تانیہ نے ان کے تعاقب میں ان کے کمرے کا رخ کیا۔ وہاں ناجی اور اماں جان پہلے سے موجود تھیں۔ ان کی الماری کا سب سامان باہر نکلا ہوا تھا۔ کمرے میں کافور کی گولیوں کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

”اماں جان! یہ اس وقت کیا کروا رہی ہیں؟“ وہ ناک دباتے ہوئے بولیں۔

”شاہدہ! خالص ریشم کے کپڑے، قیمتی جارجٹ کی ساڑھیاں کھلی لٹک رہی ہیں، ذرا سا کیڑا لگا تو برباد ہو جائیں گی۔“ اماں جان نے جواب دیا۔

”معاف کرنا نانو! آپ کس کس چیز کو کیڑا لگنے سے بچائیں گی؟“ تانیہ نے طنز کیا۔

”کیا مطلب؟“ انہوں نے عینک کے پیچھے سے گھورا۔

”اتنی پرانی لکڑی کی الماریوں میں اب بچا ہی کیا ہے، یہ آپ کی حویلی اب کھوکھلی ہو چکی ہے۔“ وہ ٹر ٹر بولی تو اماں جان کو تائو آگیا۔

”ارے واہ! کیسے زبان ٹر ٹر چلا رہی ہو، تمہارے منہ میں خاک۔“

”ہونہہ!“ یہ کہہ کر تانیہ تو کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے چلی گئی۔ جب کہ اماں

جان نے شاہدہ بیگم کو گھیر لیا۔ وہ اماں جان کے سامنے مجرموں کی طرح صرف ہوں، ہاں کرتی رہیں کیونکہ اماں جان کے سامنے کچھ بھی کہنے سے

بہتر تھا کہ وہ خاموش رہتیں۔ ویسے بھی ان کی طبیعت صبح سے ناساز تھی۔ اس

لیے بیڈ پر دراز ہو گئیں۔ کافی دیر ناجی اور اماں جان کمرے میں مصروف رہیں

اور پھر انہیں سوتا دیکھ کر باہر چلی گئیں۔ جب کہ وہ آنکھیں کھول کر

مضطرب سی کروٹیں بدلنے لگیں۔ میاں افتخار نے ان کے اضطراب کو محسوس

کر لیا تھا، مگر وہ آج کل سامعہ اور فرحان کی وجہ سے خود کئی کترانے لگے تھے۔ زرتاشیہ نے جس طرح انگوٹھی کی شہرت پیدا کی تھی، اس کے بعد خاصے مسائل انہیں دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ دبے قدموں سے واش روم کی طرف جانے لگے تو شاہدہ بیگم کی آواز نے قدم جکڑ لیے۔

”آج کل آپ کچھ اُلجھے اُلجھے سے کیوں ہیں؟“

”اجی جناب! ہم تو نہ اُلجھے ہیں اور نہ سلجھے ہیں، بس کہیں درمیان میں پھنسے ہیں۔“

”کبھی تو سیدھا جواب بھی دے دیا کریں۔“ وہ جھلا گئیں۔

”آپ کو ہماری ہر بات اُلٹی کیوں لگتی ہے؟“ میاں افتخار کے لہجے میں طنز تھا

یا مزاح۔ شاہدہ بیگم نے اکتا کر بنا کچھ سمجھے ہی آنکھیں موند لیں میاں افتخار

نے اسی میں عافیت جانی اور چپ چاپ واش روم کا رخ کیا۔ وہ جان گئے تھے

کہ بیگم صاحبہ کو تازہ تازہ کسی نئی الجھن کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اسی لیے وہ

مضطرب ہیں مگر ان کی اپنی حیثیت جو تھی اس کا تقاضا یہی تھا کہ وہ خود سے کچھ نہ پوچھیں۔

حالانکہ وہ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پر بچوں کے مسائل میں گھرے تھے۔ میاں افتخار کو فرحان اور سامعہ کی فکر تھی تو شاہدہ بیگم تانیہ کی وجہ سے الجھن کا شکار تھیں۔ تانیہ کی خود سری نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ عادل سے نہیں خرم سے شادی کرے گی اور خرم کو اس گھر میں لانے کے لیے اس گھر سے باہر کہیں شفٹ ہونا ضروری ہے۔ جو کسی صورت ممکن دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

...☆☆☆...

نیند نہیں آرہی تھی... دل مضطرب تھا... کمرے سے باہر نکل کر کوریڈور میں آئی تو فون کی گھنٹی بج اٹھی۔

”ہیلو!“

”ہیلو!“ زرتاشیہ آپ کے ماموں جانی پہنچ گئے ہیں کیا...؟“ دوسری طرف ماما تھی۔

”جی، ماما نہیں تو، آپ نہیں آئیں۔“ وہ سب کچھ بھول کے جلدی سے بولی۔

”زرتاشیہ، آپ کے ماموں جانی پہنچنے والے ہوں گے۔ آپ ان کے ساتھ میرے پاس آجائو۔“

”ماما! آپ کا مطلب ہے میں پاپا کو تنہا کر کے آجائوں۔“

”دیکھو! میں نے آپ کی مرضی پوچھی ہے، کیونکہ میں کسی صورت واپس نہیں آؤں گی۔“ فیصلہ کن انداز پر وہ رودی۔

”مت پوچھیں، میں اپنے پاپا کو کسی صورت نہیں چھوڑ سکتی۔ پچھتانا آپ کو پڑے گا۔“

”پاگل نہ بنو، میں افراسیاب سے آپ کی شادی کر دوں گی۔“

”بس، بس ماما! فارگاڈ سیک، اتنی بے حس نہ بنیں، اپنی بیٹی کی آنکھوں سے وہ سنے بھی نہ چھینیں جو میری خوشی ہیں۔“ وہ چلا اٹھی۔

”باپ کی طرح احمق ہو، اس خود سر فرحان میں کیا نظر آتا ہے۔“ نرگھس نے خاصی سختی سے کہا۔ تو وہ اس بات پر مزید چلائی۔

”اوکے! ہم احمقوں کو جینے دیں، میں بلاوجہ پریشان تھی، پپا نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا ہے۔ میں آپ کی طرح نہیں سوچتی۔“ یہ کہہ کر اس نے فون کھٹ سے بند کر دیا۔ ریسپور کریڈل پر رکھتے ہوئے اس کی نظر انگوٹھی پر پڑی تو روتے روتے بے اختیار اس کی نگاہوں میں خوشی کے جگنو جھلملانے لگے۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر اس نے انگوٹھی لبوں سے لگالی۔

”مما! آپ کیا سمجھو گی فرحان میرے لیے کیا ہے؟“ وہ خود سے بڑ بڑائی۔

”فرحان سے بہت پیار کرتی ہو۔“ ایک دم ہی دل نے پوچھا تو وہ شرما گئی۔

”ہونہہ! بہت، اتنا زیادہ کہ جس کا شمار نہیں۔“ اس نے گردن جھکا کر دل کو جواب دیا۔

”کیوں کرتی ہو؟“ دل پھر مچلا تو وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی درمیان کا دروازہ کھول کر دادو کی طرف آگئی۔

صحن میں مدہم روشنی تھی۔ اس کے قدم اٹھے تو فرحان کے کمرے کی طرف تھے مگر دادو کے کمرے کے باہر ہی سامعہ اسے نظر آگئی، وہ کچھ پریشان سی تھی۔ زرتاشیہ اس کے قریب چلی آئی۔

”خیریت ہے اس وقت دادو کے کمرے سے برآمد ہوئی ہیں۔“

”وہ ہاں، بس گپ شپ کر رہی تھی کہ ضروری فون آگیا۔ کمرے میں جا رہی تھی۔“ وہ بوکھلا سی گئی۔

”او... اوکے، میں تو فکر مند ہو گئی تھی۔“ زرتاشیہ نے ہنس کر کہا۔ سامعہ عجلت میں آگے بڑھی تو عین اسی وقت فرحان اپنے کمرے سے نکلا اس کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں، فرحان سامعہ کے کمرے کے قریب پہنچا تو زرتاشیہ نے جلدی سے اسے گھیر لیا۔

”تم، اس وقت یہاں۔“ فرحان نے تیوری چڑھا کر رسٹ وینچ پر نگاہ ڈالی۔

اسے فون کر کے تو سامعہ کو کمرے میں بلانا پڑا تھا۔ اب عین اس وقت وہ آگئی تھی اس لیے اسے قطعاً اچھا نہیں لگا تھا۔

”آپ سے ملنے کو دل چاہا تو آگئی۔“ زرتاشیہ نے گھنیری پلکیں جھپکا کر کہا۔

”دل کی باتوں پر اتنا عمل نہ کیا کرو۔“ وہ لہجے کی تلخی چھپا کر کچھ نرمی سے بولا۔

”آپ کو بُرا لگا ہے۔“ پہلے سے دکھی دل رقت میں ڈوب گیا۔

”زرتاشیہ! تم دودھ پیتی بچی نہیں ہو، خود سوچو۔“ وہ یہ کہہ کر واپس جھنجھلاتا ہوا سا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تب دروازے سے لگی سامعہ نے زرتاشیہ کی تکلیف کو محسوس کر کے دروازہ کھول کے قدم باہر نکالے۔

”زرتاشیہ! آؤ میں بور ہو رہی تھی، نیند بھی نہیں آرہی، گپ شپ کرتے ہیں۔“ سامعہ نے مسکرا کر اسے کمرے میں آنے کو کہا تو زرتاشیہ کھل اٹھی۔

”مجھے بھی نیند نہیں آرہی تھی، پیا سو گئے تھے اور میں۔“ اس سے آگے گلا رندھ گیا۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔ تو سامعہ نے اس کا ہاتھ تھام کے بیڈ پر بٹھایا۔

”اور ماما۔“ انجانے میں وہ پوچھ بیٹھی تو چند لمحے وہ بیڈ کی چادر پر مضطرب ہو کر انگلیاں پھیرتی رہی اور پھر کچھ دیر بعد ہمت سے بولی۔

”وہ چلی گئی ہیں، پپا سے طلاق لے رہی ہیں۔“

سامعہ سناٹے میں آگئی، یہاں رہتے ہوئے اب تک اسے یہ بات معلوم نہیں تھی، شاید سب اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ وہ تو ویسے بھی بطور مہمان لائی گئی تھی۔ اماں جان اسے کیوں بتاتیں۔ تانیہ سے تو ویسے ہی بہت مختصر سی ملاقات ہوتی تھی۔ شاہدہ بیگم بھی بس لیے دیئے رہتی تھیں۔ بابا جان نے بھی ضروری نہیں سمجھا ہوگا۔

”اوہ! آئی ایم سوری۔“ زرتاشیہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

”نہیں، بیٹھ جاؤ تم اداس ہو۔ باتیں کرو دل بہل جائے گا۔“ سامعہ کے دل میں اس کے لیے ہمدردی ہی ہمدردی پیدا ہو گئی۔

”فرحان کے پاس اسی لیے تو آئی تھی، مگر۔“ وہ بولی تو فرحان کے نام پر سامعہ کا دل دھڑکا۔



”مگر کیا...؟“ ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”اس نے جھڑک دیا، اس کی محبت جانے کیسی ہے۔“ وہ بہت دکھی ہو گئی تب سامعہ کو ایسا لگا جیسے وہ مجرم ہے۔ زرتاشیہ تو فرحان سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ اس کا کیا ہوگا؟

”تمہیں یقین ہے کہ فرحان بھی تم سے محبت کرتے ہیں۔“

”اس انگوٹھی سے پہلے تو اتنا نہیں تھا، مگر اب ہے۔“ وہ انگوٹھی والا ہاتھ اسے دکھاتے ہوئے بولی۔

”ہاں! انگوٹھی تو محبت سے ہی دی جاتی ہے۔“ اس نے کہیں پاتال سے جواب دیا۔

”بڑی بیگم صاحبہ پوچھ رہی ہیں سامعہ بی بی آپ اب تک کیوں جاگ رہی ہیں؟“ ایک دم دروازے کے باہر سے ناجی کی آواز آئی تو زرتاشیہ نے دم سادھ لیا۔

”وہ، بس سونے لگی ہوں؟“ سامعہ نے جواب میں کہا۔ ناجی واپس چلی گئی تو زرتاشیہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ کو نہیں پتا دادو کے اصول کے مطابق رہنا پڑتا ہے۔“ زرتاشیہ نے بہت آہستہ سے کہا اور دبے قدموں باہر نکل گئی۔

زرتاشیہ نہیں جانتی تھی کہ اس سے باتیں کرنے کے بعد سامعہ کی آنکھوں سے نیند بھاگ جائے گی۔ وہ تو محبت کے سفر کی معصوم انجان سی مسافر تھی۔ جسے محبوب منگیتر کی شکل میں ملا تھا، پھر محبت کی کربناک حقیقتوں سے یہ کیسے واقف ہو گئی؟ کیا فرحان کا رویہ اسے ایسا سوچنے پر مجبور کر رہا ہے، یا پھر ماں باپ کی زندگی کے ادھورے پن سے محبت کے ایسے معنی اور مفہوم سمجھ لیے ہیں۔ کیوں زرتاشیہ اتنی سی عمر میں اس قدر بے رحم مرحلے سے گزر رہی ہے۔

”سامعہ! اس کی تہہ میں تم بھی تو کہیں شامل ہو، دبی ہو۔ بظاہر تمہارے وجود کا احساس ابھی یہاں کسی کو بھی نہیں ہے۔ مگر تم خود تو جانتی ہو کہ

زرتاشیہ کے خوابوں کا محل تمہارے قدموں تلے اپنا احساس کھو بیٹھا ہے۔ یہ تمہارے سلوک سے ناواقف ہے، فرحان اس کا منگیترا ہی نہیں، اس کی محبت بھی تو بن چکا ہے، وہ فرحان کو اس قدر چاہتی ہے۔ اے میرے خدا! یہ کیسا ساحل مراد مجھے ملا ہے جس پر پہلے سے

کوئی آس لگائے منتظر ہے۔ اس کا منتظر جو بہت قریب ہو کر، بہت دور ہے۔“  
 ”اوہ سامعہ! یہ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟“ وہ سر تھام کے صوفے پر بیٹھ گئی۔  
 ”کیا ضرورت ہے یہ سب اتنا سوچنے کی۔“ اسی وقت فرحان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بہت دھیرے سے کہا۔

”آپ اس وقت کیوں آئے ہیں؟“ وہ گھبرا گئی۔

”یہ گزارش کرنے کہ کچھ تو موقع ہاتھ میں رہنے دیا کرو، اور رات کو ہی زرتاشیہ کیوں تمہارے کمرے میں آجاتی ہے؟“

”فرحان! زرتاشیہ بہت اچھی، بہت بھولی ہے، آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔ مجھے بہت دکھ ہے کہ ہماری وجہ سے اس کے ارمان بکھر گئے ہیں۔“ وہ تقریباً رودی۔

”ابھی کہاں بکھرے ہیں۔ اس بھولی پیاری سی لڑکی کو آپ کی سوتن بنایا جاسکتا ہے۔“ وہ خاصا لہک لہک کر بولا تو وہ ہولے سے بولی۔  
 ”اگر آپ ایسا بھی چاہو گے تو مجھے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔“  
 ”او ظالم! یہی تو قاتل ادا ہمیں دیوانہ بنائے ہوئے ہے۔“  
 اس نے کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ باہر سے بڑی بیگم صاحبہ کی آواز آئی۔

”سامعہ بیٹی! اب تک لائٹ کیوں جل رہی ہے؟“

سامعہ کی سانس حلق میں اٹک گئی۔ فرحان نے جھٹ سے اٹھ کر لائٹ آف کر دی اور بہت قریب سے دروازہ لاک کر دیا۔

”پلیز فرحان آپ جائو ابھی تک نانو جاگ رہی ہیں۔“ اس نے منت کی۔

”ارے جانِ من! وہ نیند میں بھی بجلی کا حساب کتاب ہی کرتی ہیں، معمول کے مطابق دوائیں کھاتے ہی بستر پر لیٹ جاتی ہیں۔“

...☆☆☆...

گلریز صاحب نے اپنی دانست میں بہت دور اندیشی سے کام لیا کہ اماں جان کی وجہ سے بڑا گھر اسی کو سمجھا اور وہیں آئے۔ ڈرائیور نے پھلوں کی پیٹیاں اور خشک میوہ کے بڑے بڑے پیکیٹس بھی گاڑی سے نکال کر اماں جان کے تخت پر رکھ دیئے۔ یوں اپنے سامنے اچانک انہیں دیکھ کر وہ خوش بھی ہوئیں اور متحیر بھی۔ چادر اوڑھ کر گوشت سبزی کی خریداری کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ فوراً بیٹھ گئیں۔ گلریز صاحب کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور قریب ہی بٹھالیا۔

”ارے میاں! ان سب تکلفات کی اب کیا ضرورت تھی؟“ نرگھس کے فیصلے کے پیش نظر انہوں نے خاصی سنجیدگی اختیار کی۔ جسے گلریز صاحب نے فوراً محسوس کر لیا۔

”اماں جان! یہ اب سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”پھل کھانے والے تو گھونسہ چھوڑ کے اڑ گئے، اب کیا بچا ہے؟“ وہ صاف کہہ بیٹھیں۔

”اللہ بہتری کرنے والا ہے۔ ویسے بھی یہ سب نرگھس کی وجہ سے تو نہیں ہے، آپ سب کے لیے ہے۔“ وہ مسکرائے۔

”نہیں میاں، جب گھر ہی تنکے تنکے کر دیا تو یہ سب بھی ہمیں نہیں چاہئے۔“

”میں پوری کوشش میں ہوں کہ تنکے نہ بکھریں، بہتری کی گنجائش موجود ہے، کیا میرا اتنا بھی حق نہیں کہ یہاں کچھ لاسکوں؟“

”دیکھو بیٹا! میرے زبیر احمد کے حوالے سے دیکھو، وہ دل کا مریض بن گیا، اس کی زندگی ویران کردی۔ بیٹی کی ساری ذمہ داری اس کے کندھوں پر آپڑی ہے، غیر ضروری ضد اور ہٹ دھرمی... لانا تھا تو اسے لاتے۔“ وہ سنجیدگی سے بولیں۔

”آپ کی سب باتیں درست ہیں، ہم اچھی طرح تسلی سے بیٹھ کر ان پر غور کریں گے۔ رات بہت دیر ہوگئی تھی، اس لیے ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ اب سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”تمہارا اپنا گھر ہے، ناشتا کیا ہے یا نہیں۔“

”بس اچھی سی چائے پلوادیں۔ ہوٹلوں میں لش پیش تو بہت ہوتی ہے مگر اچھی چائے نہیں ہوتی۔“ وہ کچھ مطمئن ہو کر بولے۔

”کھانا بھی کہاں اچھا ہوتا ہے؟“ انہوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

”بس مجبوری کا نام شکریہ ہے۔“ وہ بولے۔

”تم آرام سے میرے کمرے میں چل کر بیٹھو۔ میں چائے بنواتی ہوں۔“ انہوں نے کہا تو گلریز صاحب اپنا چھوٹا سا سفری بیگ وہیں چھوڑ کر ان کے کمرے کی طرف چل دیئے۔

ناجی اس وقت کمروں کی صفائی میں مصروف تھی، بڑی بیگم نے اسے آواز دی تو وہ ڈسٹر ہاتھ میں لیے آگئی۔

”ناجی! اچھی سی چائے بنائو اور بسکٹ بھی نکالو، دو کپ چائے ایک گلریز میاں کے لیے میرے کمرے میں لانی ہے اور ایک کپ باہر ڈرائیور کو دینا ہے۔“ انہوں نے تفصیلاً ہدایت کی... ناجی نے

ثبات میں گردن ہلائی تو انہیں یاد آیا۔

”پہلے ذرا زرتاشیہ کو بھیج دو۔“

”جی اچھا...“ ناجی یہ کہہ کر چلی گئی اور وہ اپنے کمرے میں آگئیں۔

گلریز صاحب بہت ریلیکس موڈ میں صوفے پر براجمان تھے، اماں جان کو دیکھ کر اطمینان سے مسکرائے۔

”میں نے زرتاشیہ کو بلوایا ہے، زبیر احمد تو آفس جا چکے ہیں۔“ وہ اپنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”میں آج یہیں ہوں، کل صبح واپسی ہے۔“

”انجم کیسی ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک، بس اکثر بلڈ پریشر لو ہو جاتا ہے، ویسے وہ آرام بھی نہیں کرتی، کھانے پینے کی بھی چور ہے۔“

”ساتھ میں لے آتے۔“

”بس حالات خراب ہیں، ان حالات میں کیا آتی؟ نرگس کی وجہ سے ہمارے گھر میں تناؤ سا ہے۔“ وہ خاصے افسردہ سے ہو گئے۔

”ارے میاں! بڑے بھائی بن کر کان کھینچتے، دماغ درست ہو جاتا، مگر سچ پوچھو تو مجھے تم سے بھی شکوہ ہے، اتنے دن ہو گئے اسے گئے ہوئے اور کسی نے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔“ اماں جان اپنے روایتی مخصوص جاہ و جلال میں آگئیں۔

”اماں جان! اگر چھوٹے خود سر اور ضدی ہوں تو بڑے اپنی عزت بچانے کے چکر میں خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔“ ان کے لہجے میں بے بسی تھی۔ اماں جان نے جس کا انہیں احساس فوراً دلا دیا۔

”تو تم خاموش ہو، چھوٹی بہن کی بے جا خود سری کے سامنے گردن جھکا رکھی ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے، میں نے خاصا سخت رویہ ظاہر کیا ہے، لیکن کیا کروں ہاتھ پکڑ کر گھر سے نہیں نکال سکتا۔ گھر پر اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ میرا۔“



”میاں صاحب زادے! عورت کا اصل گھر کون سا ہوتا ہے؟ شوہر کے گھر کو تو کبھی نرگھس نے عزت دی ہی نہیں، جا کر دیکھو میرے بچے کا گھر کیسے کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے؟“

”آپ کے کہنے سے پہلے میں یہ سب باتیں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا رہا ہوں، بلکہ میرا خیال ہے کچھ وقت کے لیے زرتاشیہ کو میرے ساتھ بھیج دیجئے اس سے بھی بہت فرق پڑے گا۔“

انہوں نے لمحے کی تاخیر بھی گوارہ نہیں کی اور جھٹ کہہ دیا۔

”لو، خوب کہہ رہے ہو، جو ذرا سی رونق اور خوشی میرے بچے کی زندگی میں باقی ہے وہ بھی رخصت کردوں۔ میاں! یہ کیوں نہیں سوچتے کہ آخر چھوٹی سی بات کو تمہاری بہن نے افسانہ کیوں بنادیا؟ گھر چھوڑنے کے لیے تو کوئی بڑا بہانہ بناتیں۔“ وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ کیونکہ ناجی چائے لے کر آگئی تھی اور اس کے ساتھ زرتاشیہ بھی تھی۔ وہ بہت خوشی سے مسکرائے وہ دوڑ کر ان کے گلے لگ گئی۔

”ماموں جانی! آپ رات کو کیوں نہیں آئے؟“

”ارے رے، یہ آپ کو کس نے بتایا؟“ وہ شرارت سے بولے۔

”مما نے فون پر بتایا تھا۔“

”اچھا جی! اندر ہی اندر ماں بیٹی ایک ہیں۔“

”وہ...“ وہ دادو کے سامنے کہہ کر شرمندہ سی ہو گئی۔

”زرتاشیہ! بیٹا یہ رشتے انمول ہوتے ہیں۔“ گلریز صاحب نے اس کی پیشانی چوم کر بہت محبت سے کہا۔

”مگر مماتو...“ وہ کچھ نہ کہہ سکی آواز لڑکھڑا گئی۔

”چھوڑو ذہن پر بوجھ نہیں ڈالتے، سب ٹھیک ہوگا۔ آپ میرے ساتھ چلو۔“ انہوں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا توہ صاف مکر گئی۔

”نہیں، نہیں ماموں جانی! میں اپنے پاپا کو چھوڑ کے نہیں جاسکتی۔“

”سن لیا! ہماری زرتاشیہ کو تو باپ کی فکر ہے۔“ اماں جان نے محبت پاش نظروں سے پوتی کو دیکھا۔

”ہونی بھی چاہئے اس کے پیا ہیں بھی تو بہت اچھے۔“ وہ پوری سچائی کے ساتھ بولے۔ کیونکہ وہ دل سے زبیر احمد کی شرافت اور اچھے اخلاق کی تعریف کرتے تھے۔ ان کے خیال میں زبیر احمد بہت اچھے اور سچے بہنوئی تھے۔ مگر کاش! وہ یہ بات نرگھس کو سمجھا سکتے۔

...☆☆☆...

”عادل کے ابا! آپ کا بھی جواب نہیں، یہ زیورات کے ڈیزائن والی کتاب گھر لے آئے۔“ رفیعہ بیگم کو جو نہی اپنے چرمی بیگ سے کتاب نکال کر دی تو وہ تعجب سے بولیں۔

”بھئی بہت دیر ہوگئی تھی، وہ ٹھہرے بڑے آدمی بس مناسب نہیں سمجھا آج کل میں دکھا آؤں گا۔“ میاں ستار نے جواب دیا۔

”واہ جی! ایک کام کرنے گئے تھے وہ بھی کیے بنا ہی لوٹ آئے۔“ رفیعہ بیگم یہ کہہ کر آلو چھیننے لگیں۔

”ویسے تو بہت بھولی ہے۔“ میاں ستار ان کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے ہنس کر بولے۔

”کیا مطلب...؟“ انہوں نے ان کی طرف دیکھا۔

”شاہدہ بیگم کے ساتھ گزارہ مشکل ہو جائے گا۔“

”کیوں؟ ہمیں شاہدہ سے نہیں تانیہ سے مطلب ہے۔“

”تانیہ تو اور بھی تیز ہے، میں یہی سوچ رہا ہوں کہ۔“

”بس کریں، پہلے ہی بدشگونی کی باتیں نہ کریں، یہ سب باتیں تو اس وقت سوچتے جب رشتہ طے کر رہے تھے۔“ وہ کچھ ناپسندیدہ انداز میں بولیں۔

”میرے دل سے یہ قلق جاتا نہیں ہے کہ شاہدہ نے میرے بھائی کو مجھ سے دور کر دیا۔“ وہ گلوگیر لہجے میں بولے۔

”اس میں شاہدہ کے ساتھ افتخار بھی برابر کا شریک ہے اور اب ان باتوں سے کیا حاصل جو ہونا تھا وہ تو ہو گیا۔ ہم اپنے گھر خوش ہیں اور وہ اپنے گھر۔“ رفیعہ بیگم نے شوہر کی دل جوئی کی خاطر کہا۔

”دکھ تو یہی ہے کہ وہ اپنے گھر میں نہیں ہے۔“

”شاہدہ کا گھر افتخار کا بھی ہے۔“

”ابھی تو اس کی ساس کا ہے، وہ گھر داماد ہے۔“ وہ طنزیہ بولے۔

”چلو، پھر کیا ہوا وہ اس میں خوش ہے تو۔“

”ہاں ہمیں کیا...؟“ انہوں نے لمبی طویل سرد آہ بھری۔

”ویسے ایک بات یاد رکھنا، اگر انہوں نے عادل کے لیے بھی ایسا کچھ سوچا تو یہ رشتہ توڑ دوں گی۔“ رفیعہ بیگم نے اکلوتے بیٹے کی جدائی کا تصور کرتے ہوئے بڑی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”اگر تمہارا بیٹا چاچے کے نقش قدم پر چل پڑا تو؟“ میاں ستار کو شرارت سو جھی۔

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہ ہمارا بیٹا ہے، آپ نے دیکھا نہیں کہ کیسے اس نے ملازمت کا ارادہ ترک کر کے اپنی ضد چھوڑ دی ہے۔“

”ارے بھاگو! مت بھولو تانیہ شاہدہ کی بیٹی ہے۔“

”تو کیا ہوا وہ ہمارے گھر کی عزت ہے۔“ رفیعہ بیگم فطرتاً سادہ لوح خاتون تھیں۔ میاں ستار نے مزید بحث چھوڑ کے بات کا رخ ہی بدل دیا۔

”جائو میری دوائیں لے آؤ۔“

”دوائیں تو عادل لے کر آئے گا، بلکہ میں نے گوشت سبزی کے لیے بھی اسے تاکید کی ہے۔“

”بس تو پھر دوپہر کی ہانڈی رات کو ہی پکے گی، وہ تو جا کر بھول بھال گیا ہوگا۔“ انہیں کھانسی سی ہونے لگی تو کروٹ لے کر لیٹ گئے۔

”کبھی اعتماد نہ کرنا، بدگمان ہی رہنا۔“ رفیعہ بیگم کچھ ناگواری سے کہہ کر وہاں سے اٹھ گئیں۔

”سنو!“ وہ بولے۔

”اب کیا ہوا؟“

”شام کو چلیں گے افتخار کی طرف۔“

”ٹھیک ہے...“ انہوں نے جواب دیا اور باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں اور میاں ستار نے اخبار اٹھا کر، عینک لگائی۔ عادل نے اسٹور پر اخبار لینا شروع کر دیا تھا۔ رات کو اسٹور بند کر کے وہ اخبار ساتھ لے آتا، جو اگلے دن ستار صاحب صبح سے رات تک اس کو پوری طرح کھنگال ڈالتے۔

☆☆☆☆☆

بڑی مشکل سے کامیاب اداکاری کے ذریعے میاں افتخار سامعہ کو مسز جیری سے ملانے کے لیے لے جانے میں کامیاب ہوئے۔ ہزار ہا سوال اماں جان نے

کیے اور چند سوال شاہدہ بیگم کی نگاہوں میں دیکھے۔ دراصل گلریز اور زبیر احمد سمیت سب اماں جان کے کمرے میں موجود تھے، ایسے میں انہیں اجازت طلب کرنی پڑی تو سب میں سے اماں جان اور شاہدہ بیگم کو ہی کچھ برا لگا۔ باقی گلریز صاحب اور زبیر احمد نے تو نوٹس بھی نہیں لیا۔ انہوں نے اسے ایاز کے گیٹ پر ہی ڈراپ کیا اور کہہ دیا کہ جب آنا ہو تو موبائل فون پر بیل دے دینا...

وہاں مسز جیری اور فرحان پہلے سے موجود تھے۔ وہ مسز جیری کے گلے لگ کر رو دی۔

”او کم آن! سویٹ ہارٹ! اب تو تم اپنا فیملی میں رہتے ہو، اتنا سویٹ ہزبینڈ گاڈ نے دیا ہے، پھر کاہے کو روتا ہے۔“ مسز جیری نے بھیگی بھیگی سی پیار بھری چپت اس کے سر پر لگائی اور اپنی آنکھوں کے کونے دھیرے سے صاف کر لیے۔

”مگر تم نہیں ہو۔“ وہ روتے روتے بولی۔

”اومائی ڈارلنگ! ابھی تو تمہارے پاس سب اپنے ہیں اور دعا تو تمہارے واسطے رہے گا۔“ انہوں نے بہت پیار سے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا تو وہ فرحان کی طرف دیکھ کر مسکرا دی۔

”مسز جیری! آپ بے فکر ہو جائیں سامعہ بھابی اب ہماری ذمہ داری ہیں۔“ صائمہ نے بہت اپنائیت کا مظاہرہ کیا۔

”پھر بھی میرے پاس جو تھا میں نے سامعہ کے واسطے بنک میں رکھ دیا۔ یہ کاغذات سنبھال کے رکھنا اور پھر بھی کوئی پر اہلم ہو تو فکر نہ کرنا، ادھر بھی بہت کچھ ہے۔“ انہوں نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک خاکی لفافہ نکال کے سامعہ کی طرف بڑھایا۔

”مگر مجھے تو آپ کی دعائیں چاہئیں۔“ سامعہ نے صاف انکار کر دیا۔

”اوڈیر! یہ دنیا بہت ظالم ہے، ادھر دعائوں سے کام نہیں چلتا، تم بہت سادہ ہو۔“

”آپ کا مطلب ہے میں سامعہ کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔“ فرحان کو ناگوار سا لگا۔

”گاڈ نہ کرے مگر گرگٹ کے بارے میں بھی تو تم کچھ نہ کچھ جانتا ہوئے گا فرحان!“ انہوں نے کافی سنجیدگی سے پوچھا۔

”میں بد عہدی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔“ فرحان نے جواب دیا۔

”اوہو یار! مسز جیری کا یہ مطلب نہیں ہے، یہ ماں بیٹی کا معاملہ ہے، تم اپنی چونچ بند رکھو۔“ ایاز نے شرارت آمیز لہجے سے ماحول کی سنجیدگی دور کی۔

”اور اچھے ماحول میں چائے پی جائے۔“ صائمہ نے بھی فوراً فضا بدلنے میں شوہر کا ساتھ دیا۔

”او بس! یہ اچھا سا ماحول پھر جانے ملے یا نہ ملے۔“ فرحان نے مسکرا کر

کہا۔ مگر مسز جیری نے فرحان کے کندھوں پر اپنے بوڑھے ہاتھوں کا دبائو ڈال کر، نم آلود نگاہوں سے چند ثانیے اسے دیکھا اور پھر دھیرے سے بولیں۔



Farhan! Relation is not, How long u have been together! not, How many times u talk to Each other its All about How u value Each other

”آپ کو یا سامعہ کو کبھی مجھ سے شکوہ نہیں ہوگا۔“ فرحان نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر مضبوطی سے دبائے۔“ وہ خوش ہو گئیں۔

“May Allah bless u”

”چلئے جی، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“ صائمہ نے پھر آواز بلند یاد دہانی کرائی۔

”سامعہ ڈارلنگ! یو آر لکی۔“ مسز جیری نے سامعہ کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔ تو سامعہ ہولے سے ہنس دی۔ حالانکہ اپنے لکی ہونے یا نہ ہونے پر اسے خود کچھ خبر نہیں تھی، مگر مسز جیری کو وہ دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے سارا وقت ہنستی مسکراتی رہی۔ کل سے بالکل غافل ہو کر۔

فرحان کو اندازہ تھا کہ مسز جیری کے جانے کی حقیقت تسلیم کرنا سامعہ کے لیے بہت مشکل کام ہے۔ فرحان، ایاز بھائی اور صائمہ بھابی کے سمجھانے

بجھانے پر آنسو تو اس نے صاف کر لیے تھے، مگر اس کے ڈوبتے دل اور چکراتے سر کا علاج فوری طور پر کیا ہونا چاہئے، یہ اسے پتا نہیں تھا۔ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ سخت رنجیدہ ہے۔ مگر صائمہ بھابی نے اسے فوراً کمرے میں پہنچا کر بستر پر لٹادیا تھا۔ اس پر گرم اونی چادر پھیلاتے ہوئے وہ خاصی فکر مندی سے بولیں۔

”موسم بدل رہا ہے، اس میں خوراک اور ماحول دونوں کا خیال رکھنا چاہئے۔ آپ کو اپنی صورت آئینے میں دیکھے کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔“

”بھابی! اب میں بالکل ٹھیک ہوں، وہ تو مسز جیری کے جدا ہونے کا صدمہ ہے۔“ وہ پھر سے گلوگیر ہو گئی۔

”دیکھو! یہ دنیا ہے یہاں آنا جانا، ملنا بچھڑنا تو لگا رہتا ہے، فرحان کے ملنے کی خوشی بھی تو ہے۔“ صائمہ بھابی نے بہت پیار سے کہا۔

”مسز جیری کو جس طرح میرے وجود نے سمجھا، ویسا شاید کوئی بچہ اپنی ماں کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ میرا گھر، میری گود ہیں وہ، انہیں بھولنا بہت مشکل ہے میرے لیے۔“

”کون کہہ رہا ہے کہ ماں کو بھول جائو، مگر وہ جارہی ہیں، انہیں جانا ہے۔ اس سچائی کو قبول کرو۔“ فرحان نے مداخلت کی تو اس نے بڑے حوصلے سے بھیگی پلکیں صاف کیں۔ فرحان کا کہنا وہ کیسے ٹال سکتی تھی؟

”سامعہ! آپ آرام کرو، میں سوپ بنا کر لاتی ہوں۔“ صائمہ نے کہا۔

”جی، جلدی جاییے ناں!“ فرحان نے شرارت سے کہا تو صائمہ کچھ سمجھ کر ہنستی ہوئی باہر چلی گئی اور فرحان نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

”پلیز فرحان! کچھ تو خیال کریں، صائمہ بھابی کو ابھی آنا ہے اور بہت دیر ہو گئی ہے، بابا کو فون کر دیں۔“

”خاموش!“ مگر ایک دم ہی اس کا دل ڈوبنے لگا۔ آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ وہ خود سے لڑتے لڑتے بے دم سی ہو گئی۔ اس کے فق چہرے پر پسینے کی بوندیں دیکھ کر وہ کچھ چونکا مگر اسی لمحے صائمہ بھابی نے دروازہ ناک کر دیا تو وہ اُچھل کر اسے چھوڑ کر دروازے تک پہنچا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ صائمہ بھابی سمجھ دار تھی، انہوں نے دروازے کی اوٹ سے سوپ کا پیالہ پکڑا دیا اور خود ضروری کام کا بہانہ کر کے چلی گئیں۔ فرحان نے سوپ کا پیالہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اسے ہلایا۔

”فرحان! بابا کو فون کریں جلدی، میری طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

”یار! یہ سوپ لو، ابھی ٹھیک ہو جائو گی۔“ فرحان نے اس کی طرف سوپ بڑھایا، مگر اس نے ناگوار سا منہ بنا کر انکار کر دیا۔

”تمہارا مسئلہ کیا ہے؟“ فرحان نے خود سوپ کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں، بس میں جانا چاہتی ہوں، دیر ہوگئی ہے۔“ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی۔ فرحان نے اس کی بات مان لی اور فوراً جیب سے موبائل نکال کر بابا کو آنے کا کہہ دیا۔

”فرحان!“

”ہوں۔“

”یہ مسز جیری والے کاغذات کا کیا کریں؟“

”اپنے پاس رکھو، بلکہ حفاظت سے رکھو۔“ وہ بے پروائی سے سوپ پیتے ہوئے بولا۔

”مگر...“

”اگر مگر کیا ہے سامعہ جی۔“ وہ بولا۔

”میرے پاس کسی نے دیکھ لیے تو۔“

”سو وہاٹ! تمہاری چیز تمہارے پاس نہیں ہوگی کیا؟“ وہ خاصی بیزاری سے بولا۔

”آپ ایسا کرو، یہ استعمال کرلو۔“ وہ تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”فارگاڈ سیک! مجھے اتنا کمزور سمجھا ہے کیا؟“ وہ برا مان گیا۔

”نہیں، مگر ہم دونوں میں کوئی فرق ہے کیا؟“ اس نے بھی جواباً اسی طرح پوچھا۔

”نہیں، لیکن کچھ چیزیں فرق سے رہیں تو بہتر ہے۔“ وہ نرمی سے بولا۔

سامعہ چپ ہوگئی... ویسے بھی اس وقت وہ بہتر فیل نہیں کر رہی تھی۔

☆☆☆☆☆

”ناجی! اللہ ہی ہے جو تمہیں عقل دے، یہ سبز قہوہ ان بڑے بڑے لگوں میں کون پیش کرتا ہے۔“ بڑی بیگم نے سخت غصے سے کہا۔

”تو برتنوں کی الماری کو آزادی دے دیں، تالے چابی کے چکر میں قہوہ ٹھنڈا ہو جاتا۔“

”توبہ ہے ٹرٹر کرتے حیا نہیں آتی۔“

”بھئی آزادی والی بات خوب کہی ہے ناجی نے۔“ گلریز صاحب نے مسکرا کر کہا۔

”یہ نادان ہے گلریز بھائی، اس گھر میں رہتے ہوئے آزادی کی بات کرتی ہے۔“ میاں افتخار نے ٹکڑا لگا کر اپنا فرض پورا کیا۔

”آپ تو گویا قید میں ہیں۔“ شاہدہ بیگم نے گھور کر پوچھا۔

”ہم تو برتنوں کی قید کی بات کر رہے تھے۔“ میاں جی نے قہوے کی چسکی لی۔

”ارے میاں! تمہیں جو باتیں سوچھ رہی ہیں، یہ سب ہماری وجہ سے ہیں، ورنہ بیگم صاحبہ کو اور صاحبزادی کو تو تم جانتے ہی ہو۔“ بڑی بیگم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سارا ملبہ بیٹی اور نواسی پر ڈال دیا۔

”ناجی جائو، جا کر کھانے کے برتن سمیٹو اور دودھ گرم کرنے رکھو۔“ شاہدہ بیگم نے غصہ ضبط کر کے ناجی کو کہا۔

”ویسے قہوہ بہت اچھا بنایا ہے۔“ زبیر احمد جو اب تک خاموش تھے پہلی بار بولے۔

”پھر بھی کچھ تو کہنا ہی ہوتا ہے۔“ ناجی تمللا کر کہتی ہوئی چلی گئی۔

دراصل کھانے کے بعد سب زبیر احمد کے پورشن میں آگئے تھے، گلریز صاحب نے کھانے کے بعد قہوے کی فرمائش کی تھی۔ اس لیے ناجی کو قہوہ بنا کر لانے کو کہا گیا تھا۔

”ماموں جانی! آپ نے قہوے کی فرمائش کی، ورنہ میں آپ کو اچھی سی کافی بنا کر پلاتی۔“ زرتاشیہ بولی۔

”چلو، ہمارے ساتھ ہم روز کافی اپنی بیٹی کے ہاتھوں کی بنی ہوئی پیا کریں گے۔“ گلریز صاحب نے کہا۔

”اور میرے پپا کو کون پلائے گا؟“ زرتاشیہ نے محبت بھری نگاہوں سے زبیر احمد کو دیکھا۔

”ارے کچھ تو، میرے بچے کے پاس رہنے دو گلریز میاں۔“ بڑی بیگم نے تاسف اور شکوے کو یک جا کر دیا۔

”معافی چاہتا ہوں اماں جان، میرا مطلب یہ نہیں تھا، دراصل سب کوششیں زرگھس کو یہاں لانے کی ہیں۔“

”نہیں گلریز بھائی، آپ ایسی کوئی کوشش نہ کریں، جو فیصلہ ہونا تھا ہو گیا۔“ زبیر احمد نے خاصی سنجیدگی سے کہا۔

”یار! جذباتی نہ بنو، اگر زرگھس کو ہدایت مل سکتی ہے تو کیا حرج ہے؟“ میاں افتخار نے گلریز صاحب کی تائید کی۔

”افتخار بھائی! آپ جانتے ہیں کہ میں جذباتی نہیں ہوں، اگر جذباتی ہوتا تو شاید زرگھس پہلے ہفتے ہی گھر چلی جاتی۔“

”میرا مطلب یہ نہیں ہے لیکن زرتاشیہ کی وجہ سے۔“

”پھوپھا جان! میں کسی قیمت پر اپنے پپا کی بے عزتی نہیں چاہتی، ممانے جو کچھ مجھے کہہ دیا ہے اس کے بعد کچھ نہیں بچتا۔“ زرتاشیہ یہ کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

”دیکھو!“ گلریز میاں! بچی ایسے ہی متنفر نہیں ہوگئی اگر اسے آنا ہے تو فوراً خاموشی سے گھر آجائے۔ ورنہ بس اس موضوع پر بات ختم سمجھو۔“ اماں جان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”میں تو یہ چاہ رہا تھا کہ زرتاشیہ یہاں اکیلی ہے۔ وہاں زرگھس کے پاس جائے گی تو شاید اس کا دل پگھل جائے۔“

”یہ بھی تو سوچو کہ زرتاشیہ چلی گئی تو زبیر کتنا تنہا ہو جائے گا۔“ شاہدہ بیگم نے کہا۔



”چھوڑیں باجی! اگر زرتاشیہ جانا چاہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ زبیر احمد نے بہن کی بات پر رد عمل ظاہر کیا۔

”تو پھر طے ہے کہ زرتاشیہ تو یہاں سے نہیں جانا چاہتی، ویسے بھی اس کی شادی کرنی ہے۔“ اماں جان نے واضح طور پر بتادیا۔ شادی کے نام پر میاں افتخار نے پہلو بدلا۔ جب کہ شاہدہ بیگم نے ماں کی تائید کی۔

”زرتاشیہ کا کوئی مسئلہ نہیں ایک دیوار بیچ میں ہے جب چاہیں گرا دیں۔“

”ویسے بھی میں نے اپنا سب کچھ بیٹی کے نام کر دیا ہے۔“ زبیر احمد نے کہا۔

”گلریز صاحب کو ایسا لگا جیسے ان کا آنا بے سود تھا، یہاں تو کوئی بھی نہ گھس کی واپسی کا منتظر نہیں تھا۔ پھر بھی موہوم سی امید کے سہارے وہ بولے۔

”ماں کو بیٹی سے الگ بھی تو نہیں کیا جاسکتا۔ بیٹی کی شادی ہو اور ماں نہ ہو، لوگ کیا کہیں گے؟“

”دیکھو میاں؟ جھوٹ تو ہم بولتے نہیں، سب کو سچ سچ بتائیں گے، آپ کی بہن ماں کبھی بنی ہی نہیں۔ اگر ماں بن کر سوچتیں تو چھوٹی سی بات پر گھر نہ چھوڑ جاتیں۔“ اماں جان تائو میں آگئیں۔ گلریز صاحب خاموش ہو گئے۔

”آپ کا آنا سر آنکھوں پر، مگر نہ گھس نے اپنا فیصلہ مجھے سنایا ہے۔ تاہم مجھے اس سے یا آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ آپ بڑے بھائی ہیں اور رہیں گے۔ مگر نہ گھس کو آپ مجھ سے زیادہ جانتے ہیں، وہ ضد اور خود سری میں اپنا نقصان تو کر سکتی ہے لیکن ہار نہیں مانے گی۔“ زبیر احمد نے بڑے تحمل سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ گلریز صاحب نے خاموشی اختیار کر لی۔ ان کے پاس کوئی جواب اور جواز نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆

جونہی وہ سیٹی بجاتا ہوا کمرے سے باہر نکالا۔

مسز ہمدانی نے میگزین بند کر کے اس کی طرف توجہ دی۔

”ہائے مام!“

”خرم! تانیہ کے پندرہ بیس فون آچکے ہیں، آپ کا موبائل خراب ہے یا۔“

”او، ویری سیڈ! دراصل فون رات کو سائلینٹ پر کیا تھا۔ وہ تو بہت ناراض ہو رہی ہوگی۔“ وہ جیب سے موبائل فون نکال کر جنرل پرائیکٹیویٹ کرنے لگا۔

”خرم! تانیہ کیا چیز ہے؟“ مسز ہمدانی نے گہری نگاہوں سے اس کی تلاشی لی۔

”مام! ابھی بتاتا ہوں پہلے اسے منا تو لوں۔“ مگر کافی دفعہ نمبر ملانے کے باوجود تانیہ نے فون اٹینڈ نہیں کیا تو وہ سمجھ گیا کہ وہ ناراض ہوگئی ہے۔

”مام! آپ مجھے جگادیتیں۔“

”تجب ہے۔“ مسز ہمدانی نے حیرت سے پوچھا۔

”ایکچوئیلی، جب سے میں آیا ہوں اس سے بات نہیں ہوئی، وہ تو غصے

ہوگی۔“ خرم اپنی ترنگ میں بولتا چلا گیا۔

”خرم! تانیہ کیا ہے؟“

”مام! ابھی تک جسٹ وی آر گڈ فرینڈ۔“

”اینڈ...“ مسز ہمدانی نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

”مام! تانیہ چاہتی ہے کہ ہماری فرینڈ شپ کو نیا رشتہ ملے۔“

”اور آپ، آپ کیا چاہتے ہو؟“ انہوں نے گریدا۔

”وہ آل ریڈی انگیجڈ ہے، اگر وہاں سے آزاد ہو جائے تو مجھے بھی کوئی

اعتراض نہیں۔“ وہ صاف گوئی سے بولا۔

”وہ آزاد صرف آپ کی وجہ سے ہونا چاہتی ہے یا۔“

”وہ اپنے فیانسی کو سخت ناپسند کرتی ہے اس وجہ سے۔“

”تو پھر کوئی بھی خرم اس کی چوائس ہو سکتا ہے۔“

”ایسا نہیں ہے مام! شی از مائی بیسٹ فرینڈ۔“ خرم نے یقین دلانے کے لیے

ان کے پاس بیٹھ کر کہا تو وہ ہولے سے مسکرا دیں۔

”خرم! ٹھیک ہے مان لیا، اسی لیے وہ مسلسل فون ملاتی رہی اور آپ سوتے رہے۔“ مسز ہمدانی نے مسکرا کر سر پر چیت لگائی۔

”اب اس کو منانے کے لیے بھی زمانے لگیں گے۔“

”میرا خیال ہے جب تک امریکا سے واپس آجائیں گے۔“ انہوں نے چھیڑا۔

”امریکا سے کون واپس آئے گا۔ خرم ہمدانی، ہر گز نہیں۔“ وہ صاف انکار کر کے مسکرانے لگا۔

”یہ بعد کی باتیں ہیں، فی الحال آپ کو اپنے ڈیڈ کے پاس پہنچنا تھا، اور فہرست کے مطابق شاپنگ کرنی ہے۔“

”یس، مگر قسم سے مام یہ بیورو کریٹس کا شہر مجھے بہت بور کرتا ہے، باہر نکلیں تو سرد سرد اکڑے ہوئے بے حس لوگ، سانس بھی سرگوشی میں لیتے ہیں۔“ وہ بہت ناگوار سامنہ بنا کر بولا۔

”خرم! کچھ تو ذوق پیدا کرو، اتنا خوب صوت، پُر سکون شہر ہے، لوگ یہاں رہنے کی تمنا کرتے ہیں۔“

”بس خوب صورت اور سکون ہی سب کچھ نہیں ہوتا، زندگی کی حرارت بھی چاہئے۔“ وہ یہ کہتا ہوا جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

”خرم! سب کام مکمل کر کے آنا، ورنہ آپ کے ڈیڈ مجھ سے خفا ہوتے ہیں۔ وہ بھی وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ وہ کچھ دیر کھڑا کچھ سوچتا رہا، پھر ایڑھیوں کے بل گھوم کے واپس صوفے پر بیٹھ کے تانیہ کا نمبر پھر سے ملایا، مگر دوسری طرف سے اس کی خوںخوار آواز میں فقط اتنا کہا گیا۔ ”سوری رانگ نمبر۔“ اور فون کھٹ سے بند ہو گیا۔

”اوگارڈ! یہ نمکین بھی جوالہ مکھی ہے۔“ وہ کندھے اُچکا کر کہتا ہوا ٹی وی لائونج سے نکلا اور کوریڈور عبور کرتا ہوا پورچ کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆☆☆ء

گلریز صاحب کے واپس جانے کے بعد... زبیر احمد اپنے آفس چلے گئے اور زرتاشیہ کی بڑی بڑی آنکھوں میں گویا سمندر اتر آیا۔ تنہائی پا کر وہ دیوار سے لگ کر ہچکیاں لینے لگی۔ ناجی کو اماں جان نے باریک کپڑے الماریوں سے نکال کر گرم کپڑے رکھنے کا حکم دے کر بھیجا تھا۔ ایسے میں وہ سیدھی زرتاشیہ کی پاس آگئی۔ مگر اسے اس طرح روتا دیکھ کر وہ خود بھی اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”زرتاشیہ بی بی!“ اس نے دھیرے سے پکارتو اس نے گھٹنوں پر سے سر اٹھا کر بھیگی نگاہوں سے افسردہ سی ناجی کو دیکھا۔

”ہوں!“

”آپ کیوں روتی ہو؟“

”میں اپنے پیپا کی وجہ سے رو رہی ہوں“ میرے پیپا بہت دکھی ہیں۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”نہیں زبیر صاحب بہت ہمت والے ہیں، وہ تو آپ کے ساتھ خوش ہیں۔“ ناجی نے بتایا۔

”جانتی ہوں، مگر وہ نامکمل تو ہیں۔“

”بی بی! کون مکمل ہے؟ آپ بے چاری سامعہ جی کو دیکھیں ان کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ وہ کتنی تنہا ہیں؟ مگر پھر بھی بہت خاموش اور صابر ہیں۔ میں نے بڑی بیگم صاحبہ نے کئی بار ان سے پچھلوں کے بارے میں جاننا چاہا، مگر وہ مسکرا کر ٹال جاتی ہیں۔ ہمارے پاس رہ تو رہی ہیں مگر یہاں کسی کے پاس ان کے ساتھ بات چیت کا وقت ہی نہیں۔“ ناجی انتہائی تاسف آمیز انداز میں بولتی چلی گئی۔

”بہت اچھی ہیں، بہت پیاری ہیں، ان کے اپنے تواللہ میاں نے لے لیے ہیں، میری ماما تو خود مجھے چھوڑ گئی ہیں۔“ زرتاشیہ نے ہتھیلی سے آنکھیں رگڑ کر کہا۔

”مجھے ہی دیکھ لیں بی بی، میں نے اپنے کسی کو نہیں دیکھا، کسی نے پالا پوسا اور پھر بڑی بیگم صاحبہ کے حوالے کر دیا۔“ ناجی کی آنکھوں میں دھواں سا بھر آیا۔

”ہم سب اب تمہارے ہیں۔“ زرتاشیہ نے پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا تو وہ خوش ہو گئی۔

”مجھے معلوم ہے، آپ سب میرا خیال رکھتے ہو۔“

”اور دادو، دادو کی ڈانٹ...!“ زرتاشیہ نے چھیڑا، تاکہ وہ ہنسنے لگے۔

”وہ تو اب اچھی لگتی ہے، پہلے بری لگتی تھی، بڑی بیگم صاحبہ غلط نہیں کہتیں۔ بس اصول انہیں عزیز ہیں۔ میں انہیں چڑاتی بھی ہوں۔“ وہ سچ مچ ہنس ہنس کر بتانے لگی... زرتاشیہ فرش سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ناجی اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”میں ابھی آپ کے کپڑے لگادیتی ہوں، صاحب جی کے رات کو لگائوں گی۔ گھر میں سب کام پھیلے ہوئے ہیں۔ بڑی بیگم صاحبہ بازار گئی ہیں مجھے ان کے

آنے سے پہلے جا کر کام کرنا ہے۔“ وہ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے بولی۔ زرتاشیہ کا دل اس کی باتوں سے کافی بہل سا گیا۔ ورنہ اس کے دل میں ایک طوفان تھا، کرب تھا، شدید درد تھا جو اسے تڑپا رہا تھا۔ ناجی کو کام میں مصروف چھوڑ کر وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔ پھر دل چاہا تو دادو کی طرف آگئی۔ تانیہ کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ سامعہ سے ملنے کا ارادہ باندھ ہی رہی تھی کہ فرحان کے کمرے سے دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ وہ شاید فون پر بابا سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ دروازے سے اندر داخل ہو گئی۔ فرحان نے تعجب بھری نگاہوں سے اسے دیکھا اور فون بند کر دیا۔

”آپ پڑھی لکھی ہو، کم از کم دروازے پر ناک کر کے آنا چاہئے۔“ وہ خاصے تلخ سے انداز میں کہہ کر جوتے کے تسمے باندھنے لگا۔

”ہاں! لیکن آپ کے دروازے کے لیے یہ شرط عائد نہیں ہوتی۔“ وہ سادگی سے مسکرائی۔

”بہر کیف! فرمائیے کیا بات ہے؟“ وہ سنجیدگی سے بولا۔



”کیوں، آپ سے بنا کام کے ملنا مشکل ہے۔“ وہ اٹھلائی۔

وہ قریب آکر رُکا اور گھورتے ہوئے بولا۔ ”میرے پاس ایسی بے کار باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔“

”پھر کس کے لیے وقت ہے؟“ جانے کیسے دل گرفتگی کے عالم میں اس کے لبوں سے جملہ پھسل گیا۔

”یہ اس سے بھی زیادہ بے کار سوال ہے۔“ وہ خاصا چڑ کر بولا۔

”اگر میں اور میری باتیں بے کار ہیں، تو پھر اس کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ بھی شکوہ کرتے ہوئے انگوٹھی والا ہاتھ اسے دکھانے لگی۔

”کیا آج فضول باتوں کا ٹھیکا لے لیا ہے؟“

”ہاں! میں آج فضول ہوں، میرے لیے کوئی وقت نہیں، صاف بتادیں کہ مجھ سے محبت کرتے ہیں یا نفرت؟“ وہ نین کٹوروں سے بہتے پانی کو صاف کرتے ہوئے پوچھ بیٹھی۔ فرحان چونکا۔ غیر متوقع سوال، لمحہ بھر کو دل میں آیا

کہ صاف صاف کہہ دے کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا۔“ مگر اگلے ہی لمحے دل نے چٹکی لی۔ ”یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں۔“

”سوچ میں پڑ گئے ناں؟“ وہ دکھ سے بولی۔

”زرتاشیہ! تم جانے کیسی باتیں کرتی ہو؟ کیسے سوال کرتی ہو؟ محبت، نفرت کے اظہار کا بھی کوئی طریقہ ہوتا ہے۔“ وہ ٹال کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے اپنا موبائل فون اور پرس اٹھانے لگا۔

”وہ طریقہ آپ بھی اختیار کر لیں، میری ماما کی طرح کہہ ڈالیں۔“ وہ خاصا چلا کر بولی۔

”زرتاشیہ! میرا موڈ خراب مت کرو، مجھے سامعہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے۔“ وہ خاصی تلخی سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے ایک دم احساس ہوا تو لپک کر اس کے پیچھے سامعہ کے کمرے میں آگئی۔ سامعہ بستر پر تھی، خاصی کمزور اور نڈھال سی...

”کیا ہوا سامعہ جی؟“ معصوم سی زرتاشیہ، فرحان کی کڑوی کسلی بھول کر سامعہ پر جھک گئی۔

”کچھ نہیں، بس ویسے ہی گھبراہٹ سی ہے۔“ سامعہ فرحان سے نظریں پچرا کر زرتاشیہ سے بولی۔

”لیکن فرحان تو کہہ رہے ہیں۔“ زرتاشیہ نے فرحان کو دیکھا اور پھر فکر مندی سے بولی۔

”فرحان صاحب کو بلاوجہ فکر ہوگئی، موسم کی تبدیلی ہے بس۔“ سامعہ نے مدھر لہجے میں دھیمے سے جواب دیا۔

”دراصل! بابا نے مجھے کہا ہے کہ آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے جائوں۔“ فرحان نے وضاحت کی۔

”تو پھر سامعہ جی! آپ کو جانا چاہئے، اٹھیں تیار ہو جائیں۔“ زرتاشیہ نے فرحان کی وضاحت کو مکمل سہارا دیا۔ سامعہ کچھ پریشان سی ہوگئی۔

”آپ کیا سوچنے لگیں، اٹھیے جاییے۔“ زرتاشیہ مصر ہوگئی، دوسری طرف فرحان کی آنکھوں میں بھی اصرار تھا۔ اسے کمبل سے باہر نکلنا پڑا۔

”ویسے آپ کو تنہائی کی وجہ سے بھی گھبراہٹ ہوتی ہوگی۔“ زرتاشیہ نے کہا تو سامعہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”آپ سب پیارے لوگوں کے درمیان میں تنہا کہاں ہوں؟“

”فرحان! آپ گاڑی نکالیں میں سامعہ جی کو لے کر آتی ہوں۔“

”اوکے...!“ فرحان کے پاس اس وقت کوئی دوسرا راستا نہیں تھا، حالانکہ وہ خاموشی سے بابا کے کہنے کے مطابق سامعہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہتا تھا۔ مگر زرتاشیہ نے سارا پلان چوپٹ کر دیا۔ دل ہی دل میں اسے زرتاشیہ پر غصہ بھی آرہا تھا کہ وہ اس وقت کیوں آدھمکی تھی۔

ڈاکٹر عنصر عباس نے اپنی مسز ڈاکٹر فوزیہ عباس کے پاس جیسے ہی سامعہ کو بھیجا، فرحان کی چھٹی جس نے الارم بجادیا کہ کچھ نہ کچھ اور ہے، پھر کچھ ہی دیر بعد ڈاکٹر فوزیہ عباس نے اس کی چھٹی جس کا سو فیصد درست نتیجہ

سنادیا۔ سامعہ پریگنٹ ہے۔“ یہ جملہ فرحان کی کندھوں سے طیارے کے پروں کی مانند جڑ گیا اور وہ آسمان کی بلندیوں پر اڑنے لگا، کانوں میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ کچھ اور سمجھ میں نہ آرہا تھا اور نہ سنائی دے رہا تھا۔ میاں افتخار نے ڈاکٹر فوزیہ عباس کی سب ہدایتیں تشویش کے عالم میں سنیں، نسخہ ہاتھ میں دبایا اور فرحان کے بازو پر زور سے چٹکی کاٹی کیونکہ ان کی طرح سامعہ کا رنگ بھی فق تھا۔ اس نئی الجھن کا تو گمان تک نہیں تھا۔ چٹکی کی وجہ سے فرحان بلبلا اٹھا۔ کلینک سے باہر نکلتے ہی میاں جی برس پڑے۔

”الو! خوابوں کی دنیا میں نہیں حقیقت کی دنیا میں دیکھو، کیا ضرورت تھی؟ ابھی اس قسم کی حرکت کی۔“

”بابا! آپ نے اس قسم کی حرکت کے لیے کسی سے مشورہ کیا تھا کیا؟“ وہ منہ بسور کر بولا تو سامعہ نادم سی ہو کر ذرا دور کھڑی ہو گئی۔

”صاحبزادے“ ہمارے حالات ایسے نہیں تھے، ابھی تو آپ کی شادی ڈکلیئر نہیں ہوئی اور شوہر کے لاپتا ہونے کی بات ہے، ایسے میں یہ معاملہ کیسے

سب کو ہضم ہوگا۔ ابھی تک ہاضمے کی ایسی دوا تیار نہیں ہوئی۔“ میاں جی سر پیٹ کر رہ گئے۔

”آپ سب کو صاف صاف بتا دیں۔“ وہ جوش میں کہہ گیا۔

”اچھا! ٹھیک ہے لیکن پہلے میں اپنی رہائش کا بندوبست کر لوں، پھر بے شک خود بتا دینا۔“ وہ مضحکہ خیز شکل بنا کر بولے۔

”بابا! آپ اس قدر ڈرتے کیوں ہیں؟ ہمارا بچہ ہے اس میں غلط کیا ہے؟“ وہ بہت جذباتی ہو گیا۔

”یار! ہمارے ڈر اور ہمارے بچے میں کچھ غلط نہیں، مگر ہلا کو خان اور چنگیز خان کو یہ کون بتائے گا؟“ وہ سخت الجھن میں گرفتار گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئے۔

فرحان نے سامعہ کو بھی گاڑی میں بیٹھنے کا کہا اور خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

”بابا! میں شرمندہ ہوں۔“ پشت سے سامعہ کی ندامت میں ڈوبی آواز آئی تو وہ چونکے اپنی الجھن میں تو وہ یہ بالکل ہی بھول گئے تھے کہ سامعہ کی دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟

”بیٹا! شرمندہ ہونے سے مسئلہ حل ہو سکتا تو کیا ہی بات تھی؟“ وہ کافی نرمی سے بولے۔

”بابا! کوئی جرم نہیں ہے یہ۔“ فرحان نے اسٹیئرنگ پر مکھ مارتے ہوئے کہا۔  
 ”ہاں! لیکن اس صورت میں جب شادی کا بتادیا جاتا اور سامعہ کے شوہر کے لاپتا ہونے کی من گھڑت کہانی نہ سنائی ہوتی۔“

”تو آپ ایک کہانی اور گھڑلیں، سامعہ کا بچہ اس کے شوہر کا ہے۔“ فرحان نے بڑی روانی میں کہہ دیا تو میاں افتخار چند ثانیے اس کی طرف دیکھتے رہے اور پھر اثبات میں گردن ہلادی۔

”ایسا ہی کرنا پڑے گا مگر اتنا سوچ لو، آپ کی نانو پینچی ہوئی ہستی ہیں ان کو سوال پر سوال کرنے کی عادت ہے۔“

”بابا! آپ تو ہمت سے کام لیں۔“ اس نے منہ بسورا تو میاں جی کو ہنسی آگئی۔

”نادا نیاں کرو آپ اور ہمت کریں ہم، جن کی ساری کی ساری ہمت نکاح کے تین کلمے پڑھتے ہی آپ کی ماما اور ان کی اماں جان کے قبضے میں آگئی تھی۔“ حسبِ معمول ان کی حسِ ظرافت پھڑکی۔ فرحان مسکرا دیا۔

”سامعہ بیٹا! بہادری کی ضرورت ہے، یہ بچہ ہمارا ہے، ہمارا ہی رہے گا۔ آپ کو ہر طرح سے اپنا خیال رکھنا ہے اور صبر سے انتظار کرنا ہے۔“ میاں جی نے براہِ راست سامعہ سے کہا۔ مگر وہ بہت اپ سیٹ تھی۔ ان سے نظریں نہیں ملا پارہی تھی۔

”بابا اور فرحان، اگر آپ کہیں تو میں ہر طرح تیار ہوں۔“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ تو میاں افتخار اور فرحان نے ایک ساتھ اسے دیکھا اور بولا فقط فرحان۔

”تمہیں مجھ سے یہ توقع ہے کہ میں وہ کچھ کہوں گا؟“

”نہیں، مگر یہ بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”یہ ہم دونوں کا مسئلہ ہے، بلکہ شاید میری مرضی اور خواہش ہو۔“ فرحان نے یہ کہہ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ سامعہ نے بے بس ہو کر سر سیٹ کی پشت سے ٹکادیا۔ میاں افتخار گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ بات اتنی آسان نہیں تھی، مگر کچھ تو کرنا ہی تھا۔ یہی فیصلہ کر کے وہ اپنے آفس چلے گئے اور فرحان سامعہ کو لیے گھر واپس آگیا۔

نثر ض ظ ثء

موٹر سائیکل کی آواز کے ساتھ ہی ڈور بیل بجی تو ناجی نے باورچی خانے سے بھاگ کر گیٹ کھولا۔

”سلام چھوٹے صاحب۔“ عادل کو دیکھ کر ناجی نے سلام کیا۔ وہ موٹر سائیکل اندر لے آیا۔

”وعلیکم السلام! کہاں ہیں سب لوگ۔“ خالی صحن میں نظریں دوڑاتے ہوئے

پوچھا۔

”اماں جان نہارہی ہیں، صاحب اور بیگم صاحبہ ڈیوٹی سے نہیں آئے، باقی فرحان صاحب اور سامعہ بی بی باہر گئے ہیں۔“

”یہ سامعہ بی بی کون ہیں؟“ عادل نے اس کے مزید کچھ بتانے سے پہلے چونک کر پوچھا۔

”صاحب کے دوست کی بیٹی ہیں، بس اتنا ہی پتا ہے۔“ وہ کچھ بوکھلا سی گئی۔

”اور آپ کی نک چڑھی تانیہ بی بی کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ“ وہ اپنے کمرے میں ہیں، بلائوں۔“

”نہیں، نہیں میں وہیں چلا جاتا ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر سیدھا تانیہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ ناجی پریشان ہو گئی، پتا نہیں اب کیا ہوگا؟ اس گھبراہٹ میں دوبارہ باورچی خانے میں گھس گئی۔

عادل نے ہلکی سی ایک دستک دی، کوئی جواب نہیں آیا۔ دوسری اور پھر تیسری دستک پر سخت غصیلی آواز آئی۔



”ناجی! کیا بے ہودگی ہے؟“

عادل کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مگر اس نے پھر زور سے دستک دے ڈالی۔ جس پر وہ چیختی چلاتی آئی اور جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ مگر دروازے کے عین درمیان عادل کو سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا دیکھ کر کچھ دیر کو پریشان ہوئی اور پھر جلدی سے سلپنگ گاؤن پہنتے ہوئے بولی۔

”پڑھے لکھے ہو، کیا اتنا بھی نہیں معلوم کہ کسی کے بیڈ روم میں ایسے نہیں آتے۔“

”مس تانیہ افتخار! مجھے معلوم سب کچھ ہے، مگر یہ نہیں معلوم تھا کہ دن کے ایک بجے بھی شب خوابی کے لباس میں آپ کا نظارہ ہو سکتا ہے۔“

”شٹ اپ! تم جیسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔“

”تو مت دیا کرو موقع...“

”اپنی حد میں رہو، یہ میرا کمرہ ہے، میری مرضی جو پہنوں، یہاں سے نکل جاؤ۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کے دور ہو گئی۔

”مجھے اپنی حد معلوم ہے، یہ وہی زیورات کے ڈیزائن کی کتاب ہے، جس میں سے تمہیں ڈیزائن پسند کرنا ہے۔ یہ میری خواہش نہیں میرے ماں باپ کی ہے۔ وہ کئی روز سے آنے کی کوشش کرتے رہے مگر ابا کے بخار کی وجہ سے نہ آ سکے۔ یوں مجھے پردہ نشین کے نظارے کا شرف حاصل ہو گیا۔“ وہ اطمینان سے کتاب اس کے بیڈ پر اچھال کر تحمل سے بولا۔

”اے مسٹر! مجھے اس کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ اس نے وہ کتاب اٹھا کر فرش پر دے ماری۔ عادل نے چند ثانیے اسے غور سے دیکھا اور پھر بولا۔

”مگر مجھے بہت دلچسپی ہے تم سے، اپنے والدین کی خواہش سے، یہ کتاب اٹھائو اور اپنے بیڈ پر رکھو۔“

”تم مجھے آڈر کر رہے ہو۔“ وہ تلملائی۔

”یہی سمجھ لو۔“ اس کے لہجے کی ضد آنکھوں سے شعلوں کی مانند بھڑکنے لگی۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

”تانیہ افتخار! کتاب اٹھاؤ۔“

”شٹ اپ! تم یہاں سے نکلو، اور ہاں کان کھول کے سن لو، میرا تم سے کوئی تعلق نہیں۔ آئندہ یہاں اپنی پھٹ پٹی لے کر مت آنا۔“

وہ یہ کہہ کر واش روم میں گھس گئی۔ اندر سے دروازہ کھٹ سے بند کر لیا۔ وہ آگ بگولا ہو گیا۔ کتاب وہیں پڑی چھوڑ کے سخت غصے میں باہر نکلا تو اماں جان تخت پر بیٹھی بال سلجھا رہی تھیں۔ وہ انہیں سلام کر کے آگے بڑھ گیا۔ کوئی بات کی نہ اور کچھ بتایا، موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور تیزی سے نکل گیا۔ اماں جان ہکا بکا سی ناجی کو آوازیں دینے لگیں۔ وہ شاید آٹا گوندھ رہی تھی، دونوں ہاتھ آٹے میں بھرے تھے۔ ان کی آواز پر باورچی خانے سے دوڑی چلی آئی۔

”یہ عادل کو کیا ہوا؟ ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا کیا، کب آیا؟“ انہوں نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

”تانیہ بی بی سے مل کر گئے ہیں کوئی معمولی بات تھوڑی ہے۔“ ناجی نے بتایا۔

”واہ! مگر یہ بچہ کیسے آیا تھا؟ بنا کسی وجہ کے تو نہیں آتا۔“ اماں جان کو تشویش سی ہوئی۔

”واہ بڑی بیگم صاحبہ، اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ تانیہ بی بی کو آپ نہیں جانتیں کیا؟ کہہ دیا ہوگا کچھ الٹا سیدھا۔“ ناجی نے کہا۔

”اچھا، اچھا، جانو۔ اچھی طرح آٹا گوندھنا ہے، پھلکے بناتے ہوئے اگر ذرا بھی خرابی ہوئی تو ہم گرم چمٹے سے خبر لیں گے۔“

”ہونہہ! ہاتھ تو گندم کوٹتے کوٹتے تھک گئے ہیں، خاک آٹا گوندھوں۔“ ناجی نے برا سا منہ بنایا۔

”اے ہے! ذرا سی گندم حلیم کے لیے کوٹنی پڑ گئی تو تمہاری جان پر بن گئی۔“ وہ جل کر بولیں۔

”بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں کہ بازار میں حلیم کی گندم تیار ملتی ہے۔“ ناجی نے گویا انفارمیشن آفیسر کی مانند اطلاع فراہم کی۔

”جی ہاں! ملتی ہے، مگر جو ذائقہ اور تسلی اپنے ہاتھ سے تیار چیز سے ملتی ہے وہ بازاری چیزوں میں کہاں؟“ انہوں نے لکڑی کی کنگھی سے پھنسے ہوئے بال نکالتے ہوئے کہا۔

”مگر اب زمانہ بدل گیا ہے، آپ کو پرانی چیزیں اچھی لگتی ہیں۔“ ناجی نے ذرا عقل جھاڑنے کی کوشش کی تو ان کے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

”تانیہ کی صحبت سے ذرا دور رہا کرو، ٹماٹر، پودینے کی چٹنی بنانی ہے اور لوکی کا رائتہ۔“

”جو کوئی کھائے گا بھی نہیں۔“ ناجی بڑ بڑائی۔

”یہ زیر لب کیا بول رہی ہو؟“ وہ گرجیں۔

”پوچھ رہی تھی اور کوئی کام بھی بتادیں۔“ اس نے منہ بسورا تو انہیں سچ مچ کام یاد آگیا۔

”اسٹور سے بڑا دیگچہ نکال کر اچھی طرح دھو کر رکھو۔“

”وہ بڑا بھاری والا؟“ ناجی نے حیرت سے دونوں بازو پھیلا کر دیگچے کا حجم ظاہر کیا۔

”ہاں، حلیم اسی میں پکتا ہے۔“

”مگر...“

”میں ہنڈیا بھون کے پھلکے خود بنائوں گی۔“ انہوں نے اس کی مگر پر دھیان نہ دیتے ہوئے کہا اور گیلا تولیہ الگنی پر پھیلا کر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

...☆☆☆...

”سینے!“

ایزی چیئر پر گم صم سے آنکھیں موندے ہوئے وہ مضطرب تھے۔ انجم نے کمرے میں داخل ہو کر پکارا تو وہ انہیں دیکھنے لگے۔

”بیڈ پر آرام کر لیجئے۔“ وہ بالکل سامنے آکر بولیں۔

”اپنی تو راتوں کی نیند اڑ گئی ہے، بس شرم ساری کا بوجھ محسوس کر رہے ہیں۔“ وہ بہت سنجیدہ تھے۔

”آپ، نرگس کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔“

وہ دکھ سے ہنسے اور بولے۔

”افسوس! دو شریف آدمی آزمائے جا رہے ہیں، زبیر احمد، جس نے شرافت اور

وضع داری کا بھرم رکھنے کے لیے گردن جھکادی ہے اور دوسرا میں ہوں۔

انجم! تم جانتی ہو کہ میں اتنی آسانی سے نہ گردن جھکا سکتا ہوں اور نہ کوئی

تبدیلی لاسکتا ہوں۔“

”بس ہونے دیں جو بھی ہو رہا ہے، ابھی اسے اندازہ نہیں کہ کیا نقصان ہو رہا ہے، لیکن جلد وہ پچھتائے گی۔“ انجم نے شوہر کی دل جوئی کی خاطر نرمی سے سمجھایا۔

”اور اس پچھتاوے کی قیمت مجھے چکانی ہوگی، زمانہ انگلیاں اٹھائے گا۔ جو ان بچی کی ماں کو، شاید جائیداد نہ دینے کی وجہ سے گھر بٹھالیا ہے۔ زرتاشیہ جیسی بچی جو مسکراتی ہے تو اس مسکراہٹ میں آنسو ہوتے ہیں۔ وہ تنہا پڑ گئی ہے... مگر۔“

”مگر کیا ہے بڑے بھیا، آپ آخر مجھے ہی کیوں قصور وار سمجھتے ہیں؟“ اسی اثنا میں نرگس کمرے میں آکر ان کے روبرو ہو گئی... انہوں نے رخ موڑ لیا۔

”تو کون ہے قصور وار؟ تمہاری نادانیوں کی، جذباتیت کی مختصر سی کہانیاں تو ابھی ہم سن کر آئے ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے انہوں نے آپ کے کان بھی بھرے ہیں۔“ وہ تلملا گئی۔

”بس، چپ ہو جاؤ، اپنی کوکھ سے جنم دینے والی بیٹی کے بارے میں بھی یہی خیال ہے۔“ وہ گرجے۔

”وہ نادان ہے، معصوم ہے۔“ وہ دھیمی پڑ گئی۔

”اور وہ نادانی، وہ معصومیت تم نے چھین لی۔ درحقیقت تم نادان ہو۔ ورنہ اے سی ٹھیک نہ ہونے کے سبب گھر پھونک کر نکلتے ہیں کیا؟“ وہ طنزیہ بولے۔

”یہ تو ایک بات ہے، روز ہی ایسی باتیں ہوتی تھیں۔“

”چلو ٹھیک ہے، آج کے بعد اس موضوع پر بات نہیں ہوگی، تم جو چاہو کرو، یہ سب پھونک ڈالو۔“ وہ خاصے جذباتی ہو گئے تو انجم نے ان کے

کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

”انجم! اسے بتاؤ گیلی روئی جلانے سے صرف ہاتھ جلتے ہیں۔“ وہ براہ راست بیوی سے مخاطب ہوئے تو نرگھس نے تڑک کر ان سے پوچھا۔

”مجھے آپ سے بھی کچھ نہیں چاہئے، مگر میں جہنم میں زندگی بسر نہیں کر سکتی۔“

”یہ سب اپنا ہمارا جو کچھ ہے لے لو، اگر ہو سکے تو گھر بچالو۔“ گلریز صاحب نے امید کی ایک کرن کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کی۔

”بس مجھے آزادی سے رہنے دیں، زرتاشیہ کو میں اپنے پاس لانا چاہتی ہوں مگر وہ باپ کی مالا جیتی ہے۔ آپ میرے لیے فکر مند نہ ہوں، میں اس کا الزام آپ کو نہیں دوں گی، حالانکہ یہ شادی آپ نے کی تھی۔ ایک ایسے آدمی سے جو آپ کو اچھا لگا۔“ وہ تلخی سے کہہ کر پلٹنے کو تھی کہ انجم کو بھی غصہ آگیا۔

”تو تم اس وقت فوراً اسے چھوڑ کے آجائیں اب جوان بیٹی کے بیاہنے کے وقت گھر چھوڑنا کہاں کی شرافت ہے؟“

”بس مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا۔“



”ٹھیک ہے جو تم نے کہا، وہی کرو۔“ گلریز صاحب جھٹکے سے کرسی سے اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ انجم نے ناپسندیدہ نظروں سے اسے دیکھا اور پھر خود بھی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ نرگھس نے سب باتیں ہوا میں اڑائیں اور اپنے کمرے کا رخ کیا۔ سب کچھ وہیں گلریز صاحب اور انجم کے کمرے کی چار دیواری میں قید ہو گیا۔ زبیر احمد، زرتاشیہ بہت اپنے اور قریب ہو کر بھی کس قدر غیر اہم تھے نرگھس کے لیے... ایک ضد اور ذہنی تناؤ نے شاید لمبے عرصے کے لیے یا پھر ہمیشہ کے لیے انہیں دور کر دیا تھا۔ جس کا فیصلہ آنے والے وقت کو کرنا تھا۔ گلریز صاحب کی تو کوشش رائیگاں گئی تھی۔ یہ ملال گلریز صاحب کو اور انجم کو تھا۔ جانے وہ کس مٹی سے بنی عورت تھی کہ نہ اس کے سینے میں ممتا جوش مار رہی تھی اور نہ شوہر کی رفاقت کا احساس بیدار تھا۔ وہ صرف نرگھس بن کر اپنی ذات کے حصار میں قید تھی۔ یہ حصار اتنی آسانی سے ٹوٹنے والا نہیں تھا...

بند دروازے سے ٹیک لگائے دل کی دھڑکنوں کے شور کو دبانے کی کوشش میں بہت سارا وقت گزر گیا۔

ایک نیا موڑ

ایک نیا سفر

ایک نیا پن

زندگی میں اتنی خاموشی سے شامل ہو گیا کہ وہ غافل رہی، جان ہی نہ سکی ”سب کچھ اچانک کیوں ہو رہا ہے...؟“ اپنا سرد ہاتھ لبوں پر رکھ کے خود سے پوچھا۔ تو کوئی جواب نہ ملا۔ لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ بیڈ تک پہنچی اور پھر بستر پر گر گئی۔ اسے اس خاص موقع پر جس طرح خوش ہونا چاہیے تھا وہ ویسے خوش نہیں ہو سکتی تھی۔ دل رنجیدہ تھا، بار بار میاں جی کے چہرے پر پھیلی فکر و تشویش نظروں میں آرہی تھی۔ انہیں اس کی وجہ سے نئی مشکل کا سامنا کرنا تھا۔

”کاش! ایسا نہ ہوتا۔“ مگر ایسا بڑا بڑا کر اس کا اپنا کلیجہ کانپ اٹھا، نئے احساس کی تو لوگ آرزو کرتے ہیں۔ ”یہ کیا سوچنے لگیں سامعہ!“ دل نے سرزنش کی تو وہ رودی۔

”تو کیا کروں؟ فرحان اور بابا میری وجہ سے مشکل میں آگئے ہیں، سب کو کیسے فیس کریں گے...؟“ وہ اور نہ جانے خود کو کتنا برا بھلا کہتی کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اس نے آنکھیں صاف کیں اور اٹھ کر دروازہ کھولا۔ فرحان سفید شاپر لیے تیزی سے اندر آگیا اور دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔

”تھینک یو! سامعہ تھینک یو سویٹ ہارٹ! تم نے اتنی بڑی خوشی دی ہے کہ دل بے قابو ہو رہا ہے۔“

مگر اس کا دل بھر آیا۔ پلکیں بھیگ گئیں تو وہ پریشان ہو گیا۔

”کیا ہوا جان...؟“

”کچھ باقی رہ گیا ہے کیا؟“

”ہاں! ابھی تو ڈھیر سارا انتظار رہ گیا ہے، پھر کہیں ہم اپنے پیار کی نشانی دیکھ سکیں گے۔“ وہ شرارت سے بولا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ کو شرارت سوجھ رہی ہے۔ ذرا غور کریں بابا کو کس قدر مشکل میں ہم نے ڈال دیا ہے اور میرے بارے میں بھی سب کتنا برا سوچیں گے۔“

”سامعہ! تم اتنی کمزور تو نہیں تھیں۔“ وہ سنجیدہ ہو گیا۔

”کمزور اب بھی نہیں ہوں، لیکن میں خود غرض بھی تو نہیں ہوں، ایک اپنے لیے سب کو مشکلات میں ڈال دوں۔“ وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”سامعہ! جو ہونا تھا ہو گیا، میں بھی کمزور نہیں ہوں۔ چاہوں تو ابھی سب کو سب کچھ صاف صاف بتا سکتا ہوں، مگر تمہارے اور بابا کے کہنے کے مطابق خاموش ہوں۔ تم ایک بار اجازت دو تو میں اپنی خوشی اپنے انداز میں پوری

کروں، یوں چھپ چھپ کے تو ملنے نہ آئوں۔“ وہ ایک دم ہی بہت جذباتی ہو گیا۔

”پلیز! مزید کوئی مشکل نہ کھڑی کریں، اگر مجھے کہیں تو میں یہ خوشی اس گھر کے سکون اور بھلائی کے لیے قربان کر سکتی ہوں۔“

”دشش! آج تو یہ بات کہہ دی ہے آئندہ کبھی نہ کہنا“ یہ ہماری جائز اولاد ہے اسے اس گھر میں رہنا ہے۔“ اس نے ڈپٹ کر کہا۔ وہ چپ ہو گئی۔

”خوش رہا کرو“ یہ ڈاکٹر کے نسخے کے مطابق سب دوائیں لے آیا ہوں۔ وقت پر کھانی ہیں، آرام کرنا ہے، کھانے پینے میں کوتاہی نہیں کرنی۔“ وہ تجربہ کار ڈاکٹر کی طرح مشورے دے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا، اب آپ جائیں کسی نے دیکھ لیا تو۔۔۔“

”اوکے، اوکے کوئی بات ہو تو مِس بیل دینا۔“

وہ یہ کہہ کر آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکلا تو زرتاشیہ سے ٹکرا گیا۔ وہ شاید گیراج میں اس کی گاڑی دیکھ کر اسی طرف آگئی تھی۔ اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

”کیسی ہے سامعہ جی...؟“

”مجھے کیا معلوم؟“ وہ بے دھیانی میں کہہ اٹھا تو وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ”کمال ہے، آپ ان کے کمرے سے نکل رہے ہیں اور ان کی طبیعت سے انجان ہیں۔“

”ہاں وہ اب بہتر ہے، دوائیں لادی ہیں۔“ وہ شرمندہ سا ہو کر ہکلا یا۔ ”ڈاکٹر نے کیا بتایا؟“

”زرتاشیہ! یہ ہر وقت کالی بلی کی طرح میرا راستہ مت کاٹا کرو، فضول سوال اور فضول بحث۔“ وہ شدید غصے میں آگیا اور پھنکارتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ حیرت زدہ سی کھڑی اس کو جاتا دیکھتی رہ گئی۔ آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ دل

دکھ سے بھر گیا۔ اسے گمان تک نہیں تھا کہ وہ اس طرح سلوک کرے گا۔ وہیں دیوار سے پشت لگا کے وہ کافی دیر اس کے رویے پر آنسو بہاتی رہی۔ ناکر وہ گناہ کی سزا سنا کر وہ جا چکا تھا مگر وہ جیسے وہیں جم گئی تھی۔ آنکھیں موندے سوچتی چلی گئی اشکوں کی روانی میں بڑ بڑاتی چلی گئی۔

سامعہ کو جانے کیسے اس کی سسکیاں سنائی دے گئیں۔ وہ ننگے پاؤں دروازہ کھول کے باہر نکلی تو زرتاشیہ کو دیوار سے لگے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

”زرتاشیہ! آؤ کیا ہوا؟“ وہ روتے روتے نارمل ہو کر بولی۔

”سامعہ جی! اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟“

”اندر آؤ کیا بات ہے؟“ سامعہ نے اس کا نرم و نازک ہاتھ تھام کے کمرے میں بلایا۔ تو وہ ہونٹ چباتی ہوئی اس کے ساتھ اندر آ گئی۔

”کیا بات ہے؟“ سامعہ قطعاً انجان تھی۔

”کچھ نہیں، بس وہ ویسے ہی ماما یاد آ گئی تھیں۔“ اس نے کچھ روتے، کچھ ہنستے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”نہیں میرے کمرے کی دیوار سے لگ کر آپ ماما کو یاد نہیں کر رہی تھیں۔“ سامعہ نے اس کا جھوٹ پکڑ لیا۔

”کیوں آپ کی دیوار سے لگ کر کوئی رو نہیں سکتا کیا؟“ اس نے الٹا سوال داغا۔

”ہاں! میں قطعاً نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے کوئی روئے۔ میری دیوار سے لگ کر رونے کا مطلب تو یہی ہے کہ میں نے کسی کو دکھ دیا ہے۔“ سامعہ نے کمال خوش اسلوبی کا مظاہرہ کیا تو اس کی بڑی بڑی آنکھیں پھر سے بھیگ گئیں۔

”آپ تو ماہر نفسیات لگتی ہیں۔“

”اصل بات اگر بتانا چاہو تو۔“

”کچھ خاص نہیں، فرحان کی باتوں سے بہت دکھ ہوتا ہے۔“ اس نے بتایا تو سامعہ پہلو بدل کے رہ گئی۔ بات تو سچ ثابت ہو گئی تھی، وہی اس کے رونے کا سبب تھی۔

”فرحان، فرحان صاحب نے کیا کہہ دیا؟“ دل کو مٹھی میں دباتے ہوئے اس نے پوچھا۔ زرتاشیہ نے پوری بات بتادی۔ سامعہ کو بہت شرمندگی ہوئی۔

”یہ تو کچھ ایسی بات نہیں تھی کہ فرحان صاحب نے اتنا کچھ کہہ دیا۔“ سامعہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے اس انجان معصوم سی لڑکی کی دل جوئی کرے۔

”شاید“ میں فرحان کے لیے زیادہ حساس ہو جاتی ہوں، مگر آپ بتائیے کیا آپ کو لگتا ہے کہ فرحان مجھ سے محبت کرتا ہے؟“ اس نے غیر متوقع انداز میں غیر متوقع سوال کر دیا۔ چند ثانیے تو متحیر سی تکتی رہ گئی۔ پھر ذرا سا سنبھل کر جواب دیا۔

”زرتاشیہ! محبت کی مہک تو سب سے پہلے اپنے من آنگن میں اترتی ہے۔ اس کا پہلا احساس اور پہلا جواب اپنے پاس ہوتا ہے۔ آپ کو میں کیا بتاؤں...؟“ زرتاشیہ جھوم اٹھی۔

”یہ سب تو مجھے محسوس ہوتا ہے مگر فرحان کی سرد مہری؟“ وہ ایک دم اُداس ہو گئی۔

”کبھی کبھی ایسا نہیں بھی ہوتا اور کبھی کبھی سب اچانک ہوتا ہے۔“ سامعہ نے بے خیالی میں کہیں دور جا کر کہا تو زرتاشیہ کی سمجھ میں فقط اتنا آیا کہ سامعہ افسردہ ہو گئی ہیں اور اپنے گمشدہ شوہر کے لیے دکھی ہیں۔

”سوری سامعہ جی!“ وہ ندامت سے بولی۔

”سوری کیوں؟“

”آپ کو اپنے شوہر سے بہت محبت ہوگی۔ وہ بھی کرتے ہوں گے، ہیں ناں۔“ زرتاشیہ نے پوچھا۔



”بہت زیادہ تصور سے زیادہ محبت۔“ فرحان کے تصور سے نظریں ملاتے ہوئے وہ دھیرے سے بولی۔

گریٹ! اللہ آپ کو جلد ملائے، ویسے ان کی تلاش کے لیے کیا ہو رہا ہے؟“ زرتاشیہ نے قسم اٹھالی تھی کہ آج اس سے سب وہ سوال کریدنے ہیں، جن کے جوابات سے وہ خود انجان تھی۔ کچھ نہ کہہ سکی انگلیاں مروڑنے لگی۔ اس اضطراب اور خاموشی سے زرتاشیہ نے خود ہی اندازہ لگا لیا۔

{...☆☆ز☆☆...}

موٹر سائیکل دروازے کے باہر ہی لاک کر کے وہ اندر آیا تو میاں ستار اٹھ کر بیٹھ گئے۔ جب سے عادل نے تندہی کے ساتھ اسٹور شروع کیا تھا۔ تب سے وہ بیٹے کے لیے بہت بے قرار سے رہتے تھے۔ رفیعہ بیگم نے مسکرا کر عادل سے کہا۔

”تمہارے ابا کا بس چلے تو یہ دروازے کے باہر بیٹھ کر تمہارا انتظار کیا کریں۔“

”آداب ابا!“ عادل نے ادب سے کہا اور ان کے ساتھ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ وہ کھل اٹھے۔

”ٹھیک کہتی ہو تم! مگر بڑھاپے اور بیماری نے اس قابل نہیں چھوڑا۔“

”ابا! کہاں بڑھاپا ہے؟ اور اب تو بیماری پر بھی کافی کنٹرول ہے۔“ عادل نے محبت پاش نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہاں! تم نے مجھے پھر سے ہمت ضرور دی ہے۔“

”اچھا چھوڑیں یہ بتائیں عادل کیسے آئے تھے؟“ رفیعہ بیگم نے کہا۔

”امی! آج رات مجھے لاہور جانا ہے میرا چھوٹا بیگ تیار کر دینا۔“

”خیریت؟“

”کچھ مارکیٹ کا کام ہے، گوگی اسٹور سنبھال لے گا، کل رات واپسی ہوگی۔“

اس نے بتایا۔

”اچھا! اچھا خیر سے جائو خیر سے آؤ۔“ میاں ستار نے کہا۔

”عادل وہ تم چاچو کی طرف گئے تھے کچھ بتایا نہیں؟“ رفیعہ کو یاد آیا۔

”جی گیا تھا دے آیا ہوں وہ ڈیزائن بک۔“ وہ خاصی سنجیدگی سے بولا۔

”تو پھر؟“

”پھر کیا؟“ وہ یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

”میرا مطلب ہے، کس کس سے ملاقات ہوئی؟“ رفیعہ کو کچھ اضطراب سا تھا۔

”کسی سے ملاقات نہیں ہوئی۔“ وہ مختصراً ٹال کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ

گیا۔ وہ پیچھے سے سوالات کرتے رہے، مگر وہ بنا کچھ کہے کمرے میں آکر کچھ

دیر کے لیے بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ بھلا انہیں کیا صدمہ دیتا کہ جو کتاب بڑی

چاہ سے انہوں نے تانیہ بیگم کو بھیجی تھی وہ ڈسٹ بن کی زینت بن گئی

ہوگی۔ اس نے بھول کر بھی اٹھا کے نہ دیکھی ہوگی ضدی، خود سر تانیہ کو

ایسی چیزوں سے کیا دلچسپی؟ وہ جانتا تھا کہ یہ بات امی ابا کے لیے صدمے کا

باعث ہوگی۔ اس لیے ان کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی، مگر وہ خود اپنے

اندر کی جنگ سے گزر رہا تھا کہ اس تعلق اور رشتے کا انجام کیا ہوگا؟ کہیں

سے بھی تو وہ پگھلتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ادھر شادی کی تیاری اور

ادھر لا تعلق اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ یہ وہ بھی نہیں جانتا تھا۔ تانیہ کو اس

سے محض غریب ہونے کے باعث چڑ اور نفرت تھی یا وہ خرم سے محبت

کرتی ہے۔“ یہ سوال اسے بے کل کرنے لگا تو وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے

لگا۔ ماں، باپ کی خوشی کی خاطر تو اس نے ملازمت کی قربانی دی تھی۔ اب

اس خوشی کو وہ مٹی میں ملنے نہیں دے گا۔ یہ مضبوطی اس کے اندر بھرتی جا

رہی تھی۔

”نہیں عادل ستار! نہ جھکنا ہے، نہ گرنا ہے۔ امی، ابا کی خوشی کو جیتنا ہے“

کچھ نہیں بتانا، سب کچھ برداشت کرنا ہے۔ تانیہ بیگم! عادل ستار تمہارے گلے

میں پھنسی ہڈی ہے، جسے نہ تم اُگل سکتی ہو نہ نکل سکتی ہو، مگر تمہیں نکلنا

پڑے گا۔ میں دولت کو اپنے گھر کی باندی بنائوں گا، اگر دولت معیار ہے تو

دولت کو معیار بنا دوں گا۔ تم جتنا چاہو بے لگام ہو جاؤ۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ جلتے ذہن کے ساتھ اس نے

سوچا، اسی اثنا میں گوگی نے مس بیل دی تو وہ سمجھ گیا کہ گوگی نے اسٹور پہنچنے کا اشارہ دیا ہے۔

{...☆☆☆...}

فون نمبر دیکھتے ہی وہ شدید غصے سے چلائے لگی۔

”میں تم کو گولی مار دوں گی، یو یو۔“

”ارے ارے سانس تولے لو۔“ دوسری طرف سے اس کی شوخ آواز آئی۔

”تم میرے ہاتھ سے فوت ہو جاؤ گے۔“ تانیہ مزید تائو میں آگئی۔

”لائسنس کب لیا؟“ شریر انداز میں خرم نے پوچھا۔

”ابھی اسی وقت۔“ وہ چیخی۔

”توبہ ہے توبہ! کان کا پردہ ڈمیج ہو گیا۔ ویسے یار تم اپنے اس منگیتر صاحب کو گولی کیوں نہیں مارتیں؟“

”اس کو بھی مار دوں گی مگر تم اپنی خیر منائو۔“

”یار مجھے تو بخش دو، میں تو امریکا جا رہا ہوں۔“ خرم نے معصومیت سے کہا۔  
تو وہ پھٹ پڑی۔

”مجھے بنا بتائے بتاتے کیوں، فون تک نہیں سن سکے۔“

”سوری، ریلی سوری، مگر یہ بنا بتائے والی بات غلط ہے۔ اب ایسا کرتا ہوں کہ شہر میں منادی کرا دیتا ہوں، ٹی وی پر خبر چلوا دیتا ہوں۔“ وہ ہنستے ہنستے بولا۔

”میرا بھی کچھ خیال ہے تمہیں...“ وہ دھاڑی۔

”کیوں کیا ہوا تمہیں، بھلی چنگی سالم پوری چھوڑ کر آیا تھا۔“

”خرم! خرم پلیز بے ہودگی سے باز آؤ۔“

”یار اس میں بے ہودگی کون سی ہے؟ اب تم ہی بتادو۔“

”یہاں اس کنگے خاندان کو شادی کی تیاری کا دورہ پڑا ہے اور تم امریکا جا رہے ہو۔“

”او آئی سی! تو جان من! میں یہاں سے انہیں فون کر کے ایسا نہ کرنے کی تاکید کر دیتا ہوں۔ نمبر تو بتاؤ۔“ بہت سادگی اور شرارت سے بولا تو وہ تپ گئی۔

”ارے تم کیا انکار کرو گے۔ میں خود ہی کافی ہوں۔“

”اوکے! بس پھر یہ نیک کام جب کرلو تو بتا دینا تا کہ میں کچھ سوچوں۔“ وہ بہت سادگی اور معصومیت سے بولا۔

”خرم! تم مجھے مشکل میں چھوڑ کر امریکا نہیں جا سکتے۔“ کافی گھن گرج کے ساتھ گویا اس نے آرڈر دیا۔

”جانِ خرم! یہ کوئی مشکل نہیں ہے جب چاہو گی اپنے پاس بلا لوں گا۔“ وہ بہت چاہ سے بولا۔

”سچ کہہ رہے ہو ناں؟“ اس کا دل یقین اور بے یقینی کے درمیان ہچکولے کھا رہا تھا۔

”دیکھو! مائی ڈیئر عادل تمہارا منگیترا ہے، اگر تمہیں نہیں پسند تو کھل کر اعلان کر دو، مجھے جس طرح کہو گی ویسے کر لیں گے، لیکن ایک بات طے ہے کہ ہم ایک دوسرے سے محبت نہیں کرتے، ہاں اچھے دوست ہیں، لائف پارٹنر بننا پڑا تو بھی رہ لیں گے مگر...“ وہ بالکل بے تکلفی سے کہتا کہتا ایک دم چپ ہو گیا تانیہ کو کچھ اچھا نہیں لگا۔

”محبت تو بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔“ اس کا لہجہ بجھ سا گیا۔

”ہونہہ! یہ ہر ایک کے لیے مختلف بات ہو سکتی ہے مسئلہ پہلے یا بعد کا نہیں، محبت کے ہونے کا ہے۔“ وہ جانے اس قدر گہری بات کیسے کہہ گیا۔ تانیہ کو

کچھ حیرت سی ہوئی مگر اسی لمحے اس نے ذہن جھٹک کے حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

”یہ بے کار کی باتیں ہیں، ہم کر لیں گے گزارہ۔“

”او کے فائن! اب جو کرو سوچ سمجھ کر کرنا۔ میں امریکا سے فون نمبر، ای میل نمبر وغیرہ بتاؤں گا، بلکہ باقاعدہ چیٹنگ ہوا کرے گی۔“ وہ بولا۔

”مگر تم مجھے اپنے پاس بلانے کی کوشش جلدی کرو گے۔“

”او یس! ڈونٹ وری۔“ اس نے شوخ آواز میں کہا اور فون بند ہو گیا۔

{...☆☆☆...}

”ناجی! صحن سے دونوں پلنگ اور کرسیاں اٹھا کر برآمدے میں رکھنا۔“ اماں جان کی آواز آئی۔ ساری رات اوس گرتی ہے بان کالا پڑ گیا ہے۔“ لیکن وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے میاں افتخار کے پاس تننتاتی ہوئی آگئی۔ وہاں شاہدہ بیگم کوئی ضروری فائل دیکھ رہی تھیں۔

”میاں جی! خدا کے واسطے، ہمیں کسی اور کے ہاں ملازمت دلوادیں۔“

”ہیں! ہوا کیا؟“ انہوں نے عینک اتار کے نرمی سے پوچھا۔

”بڑی بیگم صاحبہ نے تو ہمیں جن بھوت سمجھ رکھا ہے۔ وہ پلنگ جو پہاڑ جیسے ہیں وہ روز صبح صحن میں نکالیں اور روز رات کو برآمدے میں رکھیں۔“

”ایسا کرو ذرا سی ہمت کرو تو ترکیب ہم بتا دیتے ہیں۔“ میاں افتخار شرارت آمیز لہجے میں ذرا راز داری سے بولے تو شاہدہ نے کھنکھارتے ہوئے انہیں منع کیا۔

”افتخار کیوں اس کو نئی مشکل میں ڈالتے ہیں۔“

”تو آپ ہی بتائیے کہ میں اس معصوم کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

”وہ چوہدری یاور صاحب جس لڑکے کے لیے کہہ رہے تھے اسے کام پر رکھ لیتے ہیں۔ وہ بھاری کام کر لیا کرے گا۔“ شاہدہ بیگم نے کہا۔



”اور اماں جان سے اپنا جلوس کون نکلوائے گا۔ وہ تو اس ناجی کے رکھنے پر ناخوش ہیں۔ اس غریب کا تو حشر کر دیں گی۔“

”کوئی بات نہیں دیکھا جائے گا۔“ ویسے بھی ناجی کو ساری عمر بن بیاہے تو نہیں رہنا۔“ شاہدہ بیگم نے دور اندیشی کے پیش نظر کہا تو ناجی شرما گئی۔

”دیکھ لیں شاہدہ جی! آپ کی اماں جان ہیں۔ سنستی تو وہ آپ کی بھی نہیں ہیں۔“ میاں افتخار نے کچھ ڈرتے ڈرتے چاروں طرف دیکھا۔

”آپ اس لڑکے بلائیں میں اماں جان کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔“

”ارے پہلے اپنی اولاد کو سمجھاؤ شاہدہ بی...!“ عین اسی لمحے اماں جان ان کے کمرے میں وارد ہوئیں۔ میاں افتخار تو فوراً آنکھیں بند کر کے سوتے بن گئے اور ناجی نے وہاں سے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ شاہدہ بیگم نے بے بسی سے میاں افتخار کو گھورا اور پھر فوراً ان کے لیے اپنی جگہ بیٹھنے کے باعث خالی کر دی۔ وہ فوراً بیٹھ گئیں۔

”کیا ہوا اب؟“ شاہدہ بیگم نے دبے دبے لہجے میں پوچھا۔

”ارے مجھ سے کیا پوچھتی ہو اب اور جب۔“

”آپ بتائیں گی تو کچھ پتا چلے گا۔“

”ارے بی! وہ لڑکا آیا اور گیا کیوں آیا اور کیوں گیا؟ پوچھا کسی نے؟“ انہوں نے کڑے تیور لیے پوچھا۔

”کون لڑکا؟“

”ارے بھئی عادل اور کون۔“

”عادل آیا تھا؟“ شاہدہ بیگم کے ساتھ ہی میاں جی نے آنکھیں کھول کر کہا۔

”ہاں! ہم نے تانیہ سے پوچھ کر تفصیل کر لی، وہ بگڑیں اور وہ زیورات کی کتاب اٹھا کر پرزے پرزے کر دی۔“

”عادل کو بتا کر آنا چاہیے تھا۔“ شاہدہ بیگم نے کچھ سنجیدگی سے کہا تو وہ بگڑیں۔

”بھئی یہی بات اس تانیہ کو شہہ دیتی ہے۔ عادل اس گھر کا ہونے والا داماد ہے“

وہ بھلا پوچھ کر کیوں آئے؟ مگر یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ فرحان

صاحب سامعہ کی خاطر داری میں مصروف رہتے ہیں اور تانیہ اس موئے فون

اور کمپیوٹر کے ساتھ۔“

اماں جان کا حملہ ایک طرف شاہدہ بیگم کو ہلا گیا تو دوسری طرف میاں افتخار

بھی پھڑکتے دل کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگے۔

”سامعہ کی خاطر داری سے متعلق تو آپ ان ہی سے پوچھیے۔“ شاہدہ بیگم کو

پہلو لہتی کا بہانہ میسر آگیا۔ انہوں نے عادل اور تانیہ کی بات کو سامعہ کے

حوالے سے تبدیل کر دیا۔

”بھئی دکھ تکلیف گھر والے ہی دیکھتے ہیں۔“ میاں افتخار نے گلا صاف کرتے

ہوئے کہا۔

”ہاں تو میاں ڈھونڈو گھر والے۔“ شاہدہ بیگم ماں کو راضی کرنے کی خاطر

ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولیں۔

”میرے باس پوری کوشش کر رہے ہیں، جیسے ہی اس کے شوہر کا کچھ پتا

چلے گا تو وہ چلے جائیں گے۔“ میاں افتخار نظریں چراتے ہوئے شاید کچھ غلط

کہہ گئے۔ شاہدہ بیگم چونکیں۔

”کون چلے جائیں گے...؟“

”میرا مطلب ہے، سامعہ اور، اور بچہ۔“ میاں افتخار نے سب ہمتیں یکجا کر

کے ہم پھوڑ دیا۔ اب کی بار شاہدہ بیگم کے ہمراہ اماں جان بھی مزید چونکیں۔

”بچہ، کون سا بچہ کس کا بچہ...؟“

”وہ ہماری سامعہ کا بچہ۔“ وہ ہکلائے۔

”ارے میاں! اب آپ پر وحی آنے لگی ہے کیا؟ سامعہ کا بچہ بھی ہے؟“

اماں جان نے پوچھا۔

”وہ اماں جان! سامعہ ماں بننے والی ہے۔ اس لیے آج کل اس کی طبیعت کچھ

ٹھیک نہیں ہے۔“ میاں افتخار نے کچھ نہ سمجھا کچھ نہ سوچا بس کہہ دیا۔

حالانکہ وہ ابھی کچھ بتانے کی مشکل میں گرفتار تھے کہ کیسے بتائیں اور کیا بتائیں، مگر اب انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے دل و دماغ سے بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ ایک دم پُر سکون سے ہو گئے۔ لیکن شاہدہ بیگم کے چہرے کا رنگ کچھ دیر کے لیے سخت متغیر ہوا۔ انہوں نے اماں جان کی کڑی میزان جیسی آنکھوں کا مطلب خوب اچھی طرح سمجھ لیا۔

”لو بھئی! ہم تو اپنے کمرے میں جا رہے ہیں۔ اب خود سنبھالو افتخار کے پلو سے بندھی ذمہ داری۔“

میاں افتخار نے کچھ چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ کیا کہہ گئی تھیں۔ مگر وہ چپ ہو گئے۔ شاہدہ بیگم نے سرد سی آہ بھری اور بولیں۔

”افتخار! بہت جلد سامعہ کو اس کے گھر بھیجنا ہوگا۔“

”ہاں! ہاں مجھے خود بہت جلدی ہے، مگر پلیز فی الحال اس کا خیال رکھو۔“ وہ ایک دم ان کا ہاتھ تھام کر بولے۔ تو انہوں نے دھیرے سے ہاتھ چھڑا کر کچھ فاصلہ پیدا کیا۔

میاں افتخار اس وقت کی دلی کیفیت سے بخوبی واقف تھے۔ شاہدہ کے مزاج آشنا تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ تہہ در تہہ رہ کر احتجاج کرنے والی شخصیت ہیں۔ ماں کے اندر اتر کر فکر کے سب اندیشے چن لانے کی کوشش میں بہت کچھ اپنے اندر ہی سمو لیتی ہیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ شاہدہ سامعہ اور اس کے بچے سے متعلق کچھ نہیں کریدیں گی مگر انہیں اماں جان کو باور کرانے کے لیے اپنا آپ آزمانا پڑے گا۔ یہاں اس مقام پر وہ ہر ممکن کوشش کریں گی کہ ایک فرمانبردار بیٹی زندہ رہے۔“ میاں افتخار نے ترچھی نگاہ سے ان کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ مگر پھر پُر سکون ہو کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔

{...☆☆☆...}

چلتی اے سی بس کی نرم و گداز سیٹ سے سر ٹکائے وہ بے اختیار تانیہ کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ حالانکہ ایسے تو مراسم نہ تھے کہ وہ اس کے دماغ پر چھا جاتی۔ اس کی یاد وہ بھی دوران سفر کیوں اس کا محاصرہ کیے ہوئے تھی

اس کے زہر آلود لبوں کی حرکت اور چنگاریاں اڑاتی نگاہوں نے تو کچھ بھی نہ چھوڑا تھا، اس کے سب ارمان دھتکار کے بے عزتی کی تھی۔ سب کچھ قدموں کی دھمک تلے دبا چھوڑ کے آنے کے باوجود وہ کیوں بس کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔ کھڑکی کے بند شیشے سے اس کا سنہری چہرہ کیوں چپکا ہوا تھا۔ یہ تنہائی اتنی آسانی سے کیوں اس کو قریب لے آئی تھی۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کے بائیں طرف دیکھا۔ آگے اور پیچھے سب مسافر تقریباً سو رہے تھے۔ وہ سونا چاہتا تھا مگر جاگتے ہوئے تانیہ کو دور کرنا چاہتا تھا مگر پاس رکھتے ہوئے۔ عجب بے قراری کا عالم تھا۔ بے اختیار ہی اپنے ہاتھوں کی انگلیوں میں سر کے بال پھنسا کے ذہن کو تھپکی دینے لگا۔

”عادل ستار! یہ سب کیا ہے۔ وہ کمرہ، وہ غضبناک نگاہیں، وہ مغرور تیور، وہ ہتک، وہ توہین، سب کیا تھا؟“ اس نے خود کو جھنجھوڑا، مگر اسی لمحے دل میں کسی نے چٹکی کاٹی۔

”عادل ستار! وہ نیم باز نگاہیں۔ وہ سب کیا تھا؟“ ایک دم اس نے جھرم جھرمی سی لی اور رگ و پے میں اترے سرور سے آشنا ہو گیا۔ شاید یہی سب سامان ہے میرے ساتھ، میرے پاس تمہارے آنے کا۔ ہاں! شاید لیکن یہ مہر و محبت کی شکل بھی ہے چاہے ابتدائی شکل ہی کہو، اپنا آپ ٹٹولو اس میں برسوں سے تانیہ کا سنہرا روپ براجمان ہے۔ محبت کی بھی بہت سی شکلیں اور قسمیں ہیں۔ کہیں ایک لمحے کے چوتھائی حصے میں اسیر کر کے سولی چڑھا دیتی ہے کہیں صدیاں حائل کر دیتی ہے اور کہیں لمحے بھی گراں گزرتے ہیں۔ یہ محبت اس کی مرضی نہیں، مجبوری اور پابندی تھی۔ بچپن سے تانیہ کے وجود کا احساس بار بار اسے دلایا گیا ہے۔ جو کہ نفرتوں، رکاوٹوں اور سختیوں کے باوجود اس کے وجود کی تمام فصیلیں توڑ کے اس سے لپٹ گیا تھا۔ نفرت کا شعلہ بھڑک کر شبہ کی ٹھنڈک بننے کے عمل سے گزرنے لگا تھا۔

اسی لیے وہ بس کے ساتھ بھاگتے دوڑتے ہر منظر میں اس کے ساتھ تھی۔ آنکھیں موند کر بھی دیکھا آنکھیں کھول کے بھی دیکھا تانیہ تو قریب تھی۔

”تانیہ! کہو تو تمہارے لیے تمہیں چھوڑ سکتا ہوں۔ مگر تمہیں کہنا بھی تو نہیں آتا۔ تمہارے کہے بنا مجھے تمہیں چھوڑنا نہیں آتا۔“ بے اختیار ہی اس نے تانیہ سے کلام کیا۔ برابر والی سیٹ پر بیٹھے بزرگ نے ذو معنی نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ نجل سا ہو گیا۔ بھلا وہ انہیں کیا بتاتا؟

{...☆☆ز☆☆...}

”فرحان! اب آپ جائو۔ آج سب گھر میں ہیں۔“

”اچھا جناب! آپ نے کہہ دیا ہم عمل کریں گے۔ لیکن پہلے یہ وعدہ کیجیے کہ یہ سب پھل، جوس آپ کو ختم کرنے ہیں۔“

”آہستہ بولیں اور ہاں شوہر رہیے ساس نہ بنیے۔“ سامعہ نے سرگوشی میں چھیڑا۔

”آپ فی الحال شوہر پلس ساس سمجھیں، بابا نے بھی سختی سے کہا ہے کہ آپ کو سمجھا دوں۔“ فرحان نے جواب دیا۔

”اوکے! مگر اب آپ جانیے کوئی آجائے گا۔“ اس نے بہت خوف زدہ ہو کر دھیرے سے کہا۔

”یار وہ زرتاشیہ ہی آئے گی۔ اس نے تو گویا شرط لگا رکھی ہے کہ جب میں آپ کے پاس آؤں وہ فوراً آجائے۔“ اس نے غیر دانستہ طور پر مذاق اڑایا۔ مگر سامعہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ کافی

مضطرب سی ہو گئی۔

”کیا ہوا؟“ فرحان کو تشویش ہوئی۔

”کچھ نہیں بس دکھ اور شرمندگی سی محسوس ہو رہی ہے۔“ اس نے طویل لمبی آہ بھری۔

”کیا مطلب؟“

”فرحان! میں زرتاشیہ کی دشمن ثابت ہوئی ہوں۔ میں نے اُسے آپ سے دور کر دیا ہے۔“



”یہ غلط ہے وہ میرے قرب کبھی تھی ہی نہیں۔“

”وہ آپ کی بچپن کی مانگ ہے اور آپ سے بہت محبت کرتی ہے بلکہ آپ کی پرستش کرتی ہے اور اسے کچھ معلوم نہیں یہ دھوکا ہے۔“ وہ صدمے اور شرمندگی کے ساتھ بولتی چلی گئی۔ فرحان نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”سب باتیں درست مگر یہ حقیقت ہے کہ میں نے اس سے کبھی محبت نہیں کی۔ آپ کہتی ہو تو میں اسے صاف صاف بتا دیتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”نہیں اس طرح تو وہ بالکل ٹوٹ جائے گی۔ ویسے ہی اپنی ماما کی وجہ سے وہ سخت دکھی ہے۔ میں اس صدمے سے اسے دوچار نہیں کر سکتی۔“ وہ ایک دم ہی سفید پڑ گئی۔

”یار! ایک نہ ایک دن تو اسے یہ حقیقت تسلیم کرنی ہے۔ پھر۔“

”پلیز نہیں کوئی بہتر حل ڈھونڈنے کے بعد۔“ اس نے اس کے لبوں پر تھرا تھرا ہاتھ رکھ کے چپ کرادیا۔

”اوکے! اب ریٹ کرو ذہن پر بوجھ بالکل نہیں ڈالنا۔“ فرحان نے مسکرا کر کہا اور باہر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ تبھی میاں افتخار اور شاہدہ بیگم اندر آگئے۔ فرحان اور سامعہ کے رنگ فق سے ہو گئے۔ شاہدہ بیگم کی نگاہوں میں خاموش سی حیرت اور استفسار تھا۔ میاں افتخار کی حالت پریشان کن تھی۔

”یار فرحان! آپ کو تو میں نے کہا تھا کہ سامعہ کو دوائیں اور پھل وغیرہ دے کر فوراً میرے پاس آؤ۔ کچھ کاروبار کی بات کرنی ہے۔“ وہ ہکلاتے ہوئے کچھ سے کچھ کہہ گئے۔

”فرحان! سامعہ بہن کے لیے آپ کو نہیں میاں افتخار صاحب کو فکر مند ہونا چاہیے۔“ شاہدہ بیگم نے بڑے قرینے اور سلیقے سے کہا کہ میاں افتخار کے لبوں سے بے اختیار پھسل گیا۔

”لاحول ولا قوۃ۔ بھئی آپ نے رشتوں کو کچھ سے کچھ کر دیا۔“

”کیوں؟“ انہوں نے دیکھا۔

”میرا مطلب ہے بیٹھے بٹھائے بہن بھائی بنا دیا۔“

”میں چلتا ہوں۔“ فرحان نے جلدی سے کہا اور لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے نکل گیا جب کہ سامعہ کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

”میرا خیال ہے گھر میں روزانہ ہر قسم کا پھل آتا ہے۔ پھر الگ سے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے افتخار...!“

”وہ تو قاعدے قانون کے پھل ہوتے ہیں وقت پر کھانے ہوتے ہیں۔“  
میاں افتخار نے ہنس کر مذاق میں بات اڑائی۔

”افتخار!“ وہ چڑ گئیں۔

”ہاں وہ یار دوائیں کھانے کے ساتھ پھل وغیرہ کھانے کے لیے ڈاکٹر نے کہا ہے تو اس لیے کہا تھا کہ جب دل کرے سامعہ کھا لیا کرے۔“ میاں افتخار کو سنجیدگی اختیار کرنی پڑی۔

”آپ پریشان نہ ہوں، میں کچن سے لے لیا کروں گی۔ ویسے بھی میری وجہ سے آپ کو بہت زحمت اٹھانی پڑ رہی ہے۔“ سامعہ فروٹ کا تھیلا اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ تب شاہدہ بیگم کو ہلکی سے شرمندگی ہوئی۔

”میر مطلب یہ نہیں تھا آپ اپنے پاس رکھو اور ہاں اپنا خیال رکھو، ہم تو گھر پر چھٹی والے دن ہی ہوتے ہیں۔“

”شکریہ۔“ سامعہ نے مختصراً کہا۔

”کوئی بات نہیں بس اللہ کرے آپ کا شوہر جلد بازیاب ہو جائے۔“ شاہدہ بیگم نے کچھ ذو معنی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو وہ گڑ بڑا گئے۔

”اچھا بیٹا کوئی چیز چاہیے ہو تو بتا دیا کرو، اماں جان بہت اچھے طریقے سے آپ کو ٹپس دے سکتی ہیں۔“ شاہدہ بیگم نے ازراہ مروّت مسکرا کر کہا۔  
”اور کمرے سے نکلا کرو، طبیعت بہل جاتی ہے۔“ میاں افتخار نے کہا تو سامعہ نے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلادی۔ میاں افتخار نے شاہدہ بیگم کی نظروں سے بچا کر انگوٹھے سے وکٹری کا اشارہ کیا۔

{☆☆☆ز☆☆☆...}

”زرتاشیہ!“ الماری سے کپڑے نکالتے ہوئے وہ تیزی سے دروازے کی طرف مڑی۔ ماما کے جانے کے بعد وہ پہلی مرتبہ آئی تھیں۔ سب کچھ بھول بھال کے وہ خوش ہوئی۔ لیکن پھر فوراً سنجیدگی سے الماری بند کر کے بولی۔

”افشین آنٹی آپ اور یہاں۔“

”ہاں! سویٹ ہارٹ میں آپ کی آنٹی افشین ہوں۔“ وہ خوشی سے ہانپیں پھیلا کر اس کی طرف بڑھی اور بے اختیار ہی اس کی پیشانی چوم کر بولی۔

”مگر ماما تو گھر پر نہیں ہوتیں۔“ اس نے خاصے اجنبی لہجے میں اطلاع دی۔

”جانتی ہوں، مگر میں آج صرف اور صرف آپ سے ملنے آئی ہوں۔“ وہ بے تکلفی سے خود ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”مجھ سے۔“

”ہوں! آپ کو سمجھانے کے لیے۔“

”کیا؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”یہی کہ آپ اپنی ماما کا خیال کرو، وہ آپ کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہیں۔“

”افشین آنٹی! آپ کیا لیں گی۔ ٹھنڈا یا گرم۔“ اس نے خاصے سرد لہجے کا مظاہرہ کیا۔

”کچھ بھی نہیں۔ بس آپ سے ملنا تھا۔ وہ کھسیانی سی ہوں۔“

”تو اس کے لیے شکریہ۔“

”نرگھس کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ اب آپ کے پاپا کے ساتھ نہیں رہے گی۔“

”میں بھی اپنے پاپا کو اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ انہیں ایسا کرنے سے منع

ہر گز نہیں کریں گے۔“ ایک دم ہی اس کی آنکھوں سے نفرت اور بے زاری

جھلکنے لگی۔ افشین سمجھ گئی کہ زرتاشیہ کا ووٹ باپ کی طرف ہے۔ اسے فی

الحال سمجھانا مشکل کام ہے۔ تاہم پھر بھی اس نے آخری پرکشش چال چلی۔

”موازنہ کرو تو افرا سیاب فرحان سے ہزار گنا بہتر ہے آپ کی ماما کی یہ خواہش ہے۔“

”پلیز اور کچھ نہ آپ کو کہنے کی ضرورت ہے اور نہ مجھے سننے کی خواہش۔“ وہ یک دم تلخی سے کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”دیکھو! زرتاشیہ آپ نا سمجھ ہو، اپنا اچھا برا نہیں جانتی ماں اولاد کی بہتری چاہتی ہے۔“

”بس، بس کریں آنٹی یہ آپ کہہ رہی ہیں ماں کون سی ماں جو اپنی جوان بیٹی کو معمولی سی ضد کی خاطر چھوڑ گئی۔ آپ بھی تھیں نہ ان کے ساتھ تب ماں کہاں تھی؟ یہ گھر، یہ گھونسہ ماں بن کر کبھی انہوں نے آباد نہیں کیا۔ کیا نہیں ہے یہاں؟ انہیں نہیں معلوم کیا چاہیے؟ پر صاف صاف سن لیں، میں ان کے لیے اپنے پاپا کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اب آپ جائیں میں نے اپنے سینے پر صبر کی سل رکھ لی ہے سمجھ لیا ہے کہ میری ماں نہیں ہے۔“ بات کرتے کرتے وہ رو دی۔ تب افسین نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔

نہ، نہ ڈارلنگ! ایسے نہیں کہتے آپ کی ماما ہیں۔“

”پلیز! مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔“ وہ آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ افسین اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازے کی طرف بڑھی تو کمرے میں داخل ہوتی سامعہ سے ٹکرا گئی۔

”او سوری۔“

”اٹس اوکے۔“

”آپ کی تعریف۔“ افسین نے سر سے پیر تک اس کے حسین سراپا کو دیکھا۔

”یہ سامعہ ہیں۔ ہمارے ساتھ رہتی ہیں اور کچھ۔“ سامعہ سے پہلے زرتاشہ نے جواب دیا۔ افسین خفت سے مسکرا کر باہر نکل گئی۔ تو سامعہ نے استفہامیہ نگاہوں سے زرتاشیہ کو دیکھا۔

”یہ میری ماما کی بیسٹ فرینڈ ہیں افسین۔ مجھے ماما کا سبق پڑھانے آئی تھیں۔ اور یہ سمجھانے آئی تھیں کہ مجھے ماما کے پاس رہنا چاہیے۔ ہاں! یہ بھی فرما رہی تھیں کہ افراسیاب، فرحان سے بہت بہتر ہے۔“ زرتاشیہ طنز اور تمسخر دونوں کا سہارا لے کر بولتی چلی گئی۔

”افراسیاب؟“ سامعہ نے مختصراً کہا۔

”میرے کزن، ماماوں زاد۔“ وہ بولی۔

”اوہ! مگر آپ اتنی ڈسٹرب کیوں ہو؟ بیٹھو آرام سے۔“

”سامعہ جی! کیا ہوں میں؟ کیا ہے میری ہستی؟ کیا ہے میری حیثیت؟“

”آپ سب کچھ ہو، اپنا مکمل سچا احساس ہو۔“

”نہیں میں تو وہ پرندہ ہوں جو دشت میں پیاس بجھاتے ہوئے مر جاتے ہیں۔

سوکھے ہوئے تالاب پر بیٹھے ہنس صرف تعلق کو نبھاتے ہوئے مر جاتے ہیں

ہم جیسے لوگ کردار نبھاتے ہوئے۔ کناروں

کو ملاتے ہوئے مر جاتے ہیں مگر شاید نہ کنارے ملتے ہیں، نہ ٹوٹی ہوئی کشتیاں کنارے لگتی ہیں۔“ سامعہ کے کندھے سے لگ کر وہ سسکیوں کے درمیان دھیرے دھیرے بولتی رہی۔ اسے خود سے لگائے سامعہ کا اپنا وجود ہچکولے کھانے لگا۔ اسے ایسا لگا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے کناروں کے درمیان وہ ہے، رشتوں کے درمیان وہ ہے۔ کسی حد تک وہ بھی تو اس کی مجرم ہے۔ مگر لب ہل نہ سکے بلکہ جن قدموں پر کھڑی تھی وہیں کھڑی رہی۔ زرتاشیہ کی آنکھوں کی نمی اس کے کندھے سے اتر کر اس کے دل کو بھگوتی رہی مگر وہ بے بس تھی۔

{...☆☆☆...}

بڑی بیگم تخت پر اخبار کے مطالعے میں مصروف تھیں۔ بس کبھی کبھار پیاز کی بوری سے پیاز نکال کر صاف کرتی ناجی کو بھی دیکھ لیتیں۔

”ناجی! جلدی ہاتھ چلائو۔ ہانڈی روٹی کا وقت ہو گیا ہے۔“



”ہاتھ ہی چلا رہی ہوں۔ بوری ہے کوئی سیر دو سیر پیاز نہیں ہے۔“ ناجی نے جل کر کہا۔

”معلوم ہے ہمیں ہم نے ہی خریدی ہے۔“ انہوں نے اخبار تہہ کر کے جواب دیا۔

”تو سب کی صفائی ایک ساتھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسٹور میں رکھ دیتی ہوں جتنی استعمال کرنی ہوگی نکال لیا کروں گی۔“ اپنی فہم کے مطابق اس نے اماں جان کو بہت متاثر کیا۔ مگر ایسا ہوا نہیں وہ جل کر بولیں۔

”تو بقراط کہیں کی ہمیں سمجھائے گی جیسا کہتے ہیں ویسا ہی کیا کر، نئی پیاز بند اسٹور میں رکھ کے خراب کرنی ہے۔“

”آج پکانا کیا ہے؟“ ناجی نے موضوع بدلا۔

”آلو گوشت اور بگھاری ماش۔“

”مگر شاہدہ بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہے ان کے لیے دال ماش؟“

”زبان نہیں صرف ہاتھ چلاؤ۔ آج کے دن جو پکتا ہے وہی پکے گا۔ ہیں کہاں شاہدہ۔؟“ انہوں نے پوچھا۔

”اپنے کمرے میں۔“

”چلو ہم دیکھتے ہیں۔ ہاں وہ سامعہ کہاں ہے؟“

”وہ زرتاشیہ بی بی کے پاس، تانیہ بی بی باہر گئی ہیں۔ صاحب کے ساتھ فرحان صاحب گئے ہیں۔“ ناجی نے خود ہی سب کی تفصیل بیان کر دی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی سامعہ آگئی۔

”زرتاشیہ کے پاس تھی؟“ اماں جان نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”جی بس کمرے میں بور ہوگئی تھی زرتاشیہ بھی تنہا تھی۔“ وہ دھیرے سے مسکرا کر بولی۔

”ہا! زرتاشیہ کی تنہائی کا کیا کہتی ہے۔ وہ تو مظلوم اور معصوم بچی ہے۔“  
 زرتاشیہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ حد درجہ رنجیدگی سے بولیں تو سامعہ کو اور  
 زیادہ ندامت سی ہوئی۔

”چلو اچھا ہے آپ کی وجہ سے ان کا دل بہل گیا ہو گا۔“ ناجی نے بوری کی  
 آخری پیاز تک نکال کے کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ امان جان نے  
 اسے گوشت فرج سے نکالنے اور آلو چھیلنے کا کہہ کر شاہدہ بیگم کے کمرے کا  
 رخ کیا۔ مگر گیٹ کے باہر آٹو رکشہ رکنے کی آواز پر وہ ٹھٹکیں ڈور بیل بجی تو  
 ناجی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ سامعہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ میاں ستار  
 اور رفیعہ بیگم کو آتا دیکھ کر اماں جان مسکرا کر آگے بڑھیں۔

”بھئی آج سورج کہاں سے نکلا ہے؟“ انہوں نے میاں ستار کی طویل مدت  
 کے بعد آمد پر کہا۔ تو وہ ہنس کر بولے۔

”سمجھ لو مغرب سے نکلا ہے ورنہ تو ہم نے قسم کھا رکھی تھی کہ ہمارا بھائی  
 چھیننے والوں کی چوکھٹ پر ہم پاؤں نہیں رکھیں گے۔“

”ارے جانے دو ستار! اب تو بھائی کے بال بچوں کی شادی کے دن آگئے  
 غصہ تھوک دو اور ہاں ہم نے آپ کے بھائی کو باندھ کے نہیں رکھا۔ وہ خود  
 ہی بیگم کے غلام ہیں۔“ وہ کب چوکنے والی تھیں۔

”چلیں چھوڑیں پرانے قصے آج تو آہی گئے ہیں۔“ رفیعہ بیگم نے مسکرا کر تلخ  
 موضوع کو خوش گوار بنانے کی کوشش کی۔

”آؤ آؤ بسم اللہ۔“ بڑی اماں نے بہت خوش دلی کا مظاہرہ کیا اور انہیں لیے  
 اپنے کمرے میں چلی آئیں۔

”اماں جان! بیماری نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ کھانسی پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دوائوں  
 پر چل رہے ہیں۔“ میاں ستار نے پھولی سانس کو ہموار کرتے ہوئے کہا۔

”ارے میاں بڑھاپے میں دوائیں ہی ساتھ دیتی ہیں، بس چلتے پھرتے رہو تو  
 ٹھیک ورنہ سمجھو گئے۔ ہماری تو شاہدہ دوائوں کے سہارے پر ہے۔ آج بھی  
 بینک نہیں گئی۔ طبیعت خراب ہے۔“ انہوں نے کہا اور قریب رکھی گھنٹی کا  
 بٹن دبا دیا۔

”خیریت کیا ہوا؟“ رفیعہ بیگم نے فکر مندی کے ساتھ پوچھا۔

”ٹھیک سے تو بھی انہوں نے ہمیں کچھ بتایا نہیں، اندازہ ہے بلڈ پریشر بڑھا ہوگا۔“ وہ بولیں اس اثنا میں ناجی آگئی تو انہوں نے شاہدہ کو بھیجنے اور خود اسے چائے وغیرہ لانے کو کہا۔

”اللہ رحم کرے، بس ملاوٹ شدہ خوراک نے ہمیں کھوکھلا کر دیا ہے اور مہنگائی نے تو کمر ہی توڑ دی ہے۔“ میاں ستار پانوں پھیلاتے ہوئے بولے۔

”بس یہی تو ستم ہے کہ آمدن وہی ہے اور اخراجات گنتی شمار میں نہیں، یہی بات ایک ایک فرد کو سمجھاتے ہیں۔ بھی نئی نسل تو سنتی نہیں۔“ اماں جان نے جملہ مکمل ہی کیا تھا کہ شاہدہ بیگم آگئیں۔ سلام کر کے رفیعہ بیگم سے ملیں اور ان کے برابر بیٹھ گئیں۔

”کیسے آنا ہوا؟ میرا مطلب ہے آج کیسے ہمارا گھر یاد آگیا؟“ شاہدہ نے مخصوص متانت بھرے انداز میں لفظوں کا انتخاب کیا۔

”زخموں پر نمک نہیں چھڑکتے۔“ میاں ستار کب چوکنے والے تھے۔

”ارے میاں ستار اتنے دن میں تو زخم بھر جانے چاہئیں تھے۔“ اماں جان نے کہا۔

”بس کچھ بھر گئے کچھ رہ گئے۔“

”چھوڑیے بھی کون سی باتیں لے بیٹھے ہیں۔“ رفیعہ بیگم نے شوہر کے مزاج کو سمجھتے ہوئے بات سنبھالی۔

”ہاں! بھی اب نئی بستی بسانے کی باتیں کرو، نئے رشتے بنانے کی باتیں کرو۔“ اماں جان نے ہنس کر کہا۔ شاہدہ بیگم نے پہلو بدل کر ماں کی طرف دیکھا اور دھیمی سی ہنسی ہنس دیں۔

”کیا تانیہ نے ڈیزائن پسند کیا۔“ رفیعہ بیگم نے پوچھا۔

”وہ“ وہ بس تانیہ کو تو ایسے ٹی پیکل ڈیزائن پسند نہیں۔ میرا مطلب ہے ان کی ضرورت بھی کیا ہے؟“ شاہدہ بیگم نے ٹالنے کا طریقہ اختیار کیا۔

”لو بھئی عجب بات کی۔ زیور کی شادی پر ضرورت ہی نہیں۔“ اماں جان نے لتاڑا۔ تو شاہدہ بیگم نجل سی ہو گئیں۔

”شاہدہ ہم بہت سے زیور تو نہیں بنوا سکتے البتہ ایک سیٹ تو ضرور بنے گا۔“ رفیعہ بیگم بولیں۔

”ابھی تو بہت سا وقت ہے بن جائے گا۔“ شاہدہ بیگم نے پھر ٹال مٹول کی کوشش کی۔

”یہ کیا بات کی بھئی اب کوئی وقت نہیں ہے۔ ہمارے گھر کو بہو کی ضرورت ہے ہم بوڑھے بھی رونق میلہ چاہتے ہیں۔“ میاں ستار بولے۔

”اب اور کون سا وقت آئے گا۔ زرتاشیہ کو گھر لائو تانیہ کو رخصت کرو۔“ اماں جان نے دل کی بات کہہ دی۔

”اماں جان! کبھی تو سمجھا کریں یہ فیصلے اس طرح تو نہیں ہو جاتے۔“ شاہدہ بیگم یہ کہہ کر سب سے نظریں چرانے لگیں۔

”بھئی فیصلہ تو بچپن میں ہو چکا ہے اب اور کون سا فیصلہ کرنا ہے۔“ میاں ستار نے پوچھا۔

”میں کیا کہوں؟ بس کچھ وقت تو لگے گا۔“ شاہدہ بیگم نے کہا اور بہانے سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔

”فکر مت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تانیہ کے معاملے میں یہ بہت محتاط ہو جاتی ہے۔“ اماں جان نے میاں ستار اور رفیعہ کے چہرے پر پھیلے خدشات محسوس کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ شاہدہ کچھ اور سوچ رہی ہے۔“ میاں ستار نے کریدا۔

”بھئی دلوں کے بھید تو اللہ جانتا ہے۔ بظاہر تو ایسا نہیں ہے ویسے تانیہ کے دل کی بات بھی شاہدہ ہی جان سکتی ہے۔“ اماں جان نے سرسری سے انداز میں کہہ کر خدشات کو پرے دھکیلا۔ اس کے بعد وہ دونوں دوپہر کے کھانے تک اماں جان کے لاکھ اصرار کے باوجود نہ رکے۔ بس چائے پی کر اٹھ

آئے۔ کئی بار رفیعہ بیگم نے تانیہ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی مگر ہر بار ناجی نے آکر یہی بتایا کہ وہ سو رہی ہیں۔ حالانکہ تانیہ گھر پر تھی ہی نہیں۔

{...☆☆ز☆☆...}

”کچھ بھی کہو عادل کی ماں مجھے دال میں کچھ کالا نظر آرہا ہے۔“

”خدا نہ کرے آپ تو شاہدہ کی عادت سے واقف ہیں۔ وہ نپا تلا بولتی ہے۔“  
رفیعہ بیگم نے چادر اتار کر تہہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں مگر نپا تلا کیوں؟ اس نے زیور والی بات کس طرح ہوا میں اڑادی۔“

میاں ستار بھی گھاگھ تھے۔ ان کو یہ بات مستقل ستا رہی تھی۔ چارپائی پر لیٹ کر بھی وہ یہی سوچتے رہے۔ رفیعہ بیگم نے باورچی خانے کا رخ کیا۔ کچھ ہی

دیر میں عادل آنے والا تھا۔ سالن تو وہ تیار کر کے گئی تھیں۔ بس چپاتی بنانی تھیں۔ مگر میاں ستار نے انہیں بھی ذہنی طور پر الجھا دیا تھا۔ روٹی توے پر تھی اور ان کا ذہن شاہدہ کی پراسرار سی خاموشی میں پھنسا تھا۔ روٹی جل گئی دھواں پھیلا تو وہ چونکیں۔

”فکر مند تو تم بھی ہو عادل کی ماں۔“ میاں ستار نے دھوئیں کے پردے میں چھپی بات سمجھ کر لیٹے لیٹے کہا۔

”عادل کے ابا قسمت کس نے دیکھی ہے، جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ شاہدہ کا مطلب جو بھی ہو ہم زبردستی تو نہیں کر سکتے۔ رشتے آسمانوں پر طے پاتے ہیں۔“ رفیعہ بیگم نے اب پوری توجہ سے روٹی پکاتے ہوئے کہا۔

”ہاں مگر افتخار نے اب کی بار مجھے تنگ کیا تو میری شکل دیکھنے سے بھی گیا۔“

”کیوں الٹا سیدھا سوچتے ہیں بات کچھ ہو آپ کی تو عادت بن گئی ہے۔“  
رفیعہ بیگم نے ٹرے میں کھانا رکھ کے ان کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ وہ خاموشی سے کھانے میں مصروف ہو گئے۔ جب کہ وہ عادل کا انتظار کرنے لگیں۔ اسے لاہور سے آنا تھا۔ رفیعہ بیگم کی نگاہیں دروازے پر لگی تھیں۔ اسی لیے تو وہ اماں جان کے لاکھ روکنے پر بھی نہیں رکی تھیں، انہیں عادل نے



صبح سویرے فون کر دیا تھا کہ وہ دوپہر کے بعد پہنچے گا۔ اب تین بج رہے تھے، رفیعہ بیگم نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

”آجائے گا کیوں اس قدر بے قرار ہو۔“

”ماں ہوں اس لیے۔“ رفیعہ بیگم نے باورچی خانے سے جواب دیا۔

میاں ستار نے دل ہی دل میں ان کے جواب کو سراہا۔ مگر بولے کچھ نہیں جب کہ رفیعہ بیگم دل بہلانے کے لیے سلاد، چٹنی جانے کیا کیا لوازمات تیار کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ مگر دل کافی مضطرب تھا۔ عادل کی عدم موجودگی تھی اس کا انتظار تھا یا پھر شاہدہ کی باتوں کا اثر کہ وہ پہلی مرتبہ مصروفیت میں اپنی بے چینی کا علاج ڈھونڈ رہی تھیں۔ انہیں کچھ عرصے سے ہی تو یہ اندازہ ہوا تھا کہ عادل کے دل میں خود سرتانیہ کلبلانے لگی ہے، پہلے تو وہ اس کے ذکر پر بھی چڑتا تھا۔ مگر اب اس کی آنکھوں میں اس کے لہجے سے تانیہ کے لیے پسندیدگی کا اظہار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے اندر تانیہ نے کچھ نہ کچھ نیا نیا سا بھر دیا تھا۔ پہلے جو چاچو کے گھر جانے سے سخت گھبراتا تھا۔ اب

زیادہ انکار نہیں کرتا تھا۔ زیورات کے ڈیزائن والی کتاب بھی وہ خود جا کر دے آیا تھا۔ حالانکہ انہیں امید نہیں تھی کہ وہ یہ کام کرے گا۔ مگر اس کے پس پردہ یقیناً کوئی نہ کوئی وجہ تھی اور اب وہ وجہ ہی ان کے عادل کی خوشی تھی۔ مگر دل میں جانے کیوں وسوسہ اور خدشہ سا تھا۔ بظاہر وہ میاں ستار سے چھپا رہی تھیں۔ لیکن اپنے آپ سے چھپانا تو ممکن نہیں تھا پھر خود سے لڑتے لڑتے انہوں نے خود سے ہی کہا کہ ”اللہ خیر رکھے میرے بچے کی“ اس کی خوشیوں کو کسی کی نظر نہ لگے۔“

{...☆☆☆...}

ملو کہ آج کوئی بات رو برو کر لیں

یہ کیوں ہیں دوریاں کچھ اس پر گفتگو کر لیں

کریں گے پھر سے عبادت تمہارے چہرے کی

کہ پہلے آنکھوں کو اشکوں سے با وضو کر لیں

نیم وا کھڑکی سی لگی صحن میں پھیلی مدہم روشنی سے وہ گزشتہ گھنٹے بھر سے ہم کلام تھی۔ صحن میں کوئی نہیں تھا مکمل خاموشی تھی۔ صرف شاہدہ بیگم کے کمرے سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ اس کا دل بہت تنہائی محسوس کر رہا تھا جانے کیوں خود کو بے بس پر کٹے پرندے کی طرح کمرے میں محسوس کر رہی تھی۔ فرحان کی جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ ویسے ہی اس کے لیے اداس ہو رہی تھی، مگر اس کا تو دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ اسی وجہ سے آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ اپنی بے بسی و بے چارگی پر دھیرے دھیرے آنسو بہا رہی تھی۔ زندگی عجب دوراہے پر آگئی تھی۔ محبت مل گئی تھی مگر محبت کا اعتراف ممنوع تھا جس کی محبت نے غرور بانکپن عطا کیا تھا۔ اس کی ہی خاطر زبان پر تالے لگانے پڑے تھے۔ ایک ہی گھر میں ایک ہی جگہ قریب ہو کر بھی فاصلوں کی زندگی جی رہے تھے۔ وہ کھڑکی بند کر کے رخسار صاف کر کے صوفے پر آ بیٹھی، مگر دل کی اداسی اور تنہائی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ یہ کیسی زندگی ہے سامعہ! یہ کس کا جیون ادھار لے کر گزار رہی ہو۔ سب کس طرح تمہارے بارے میں سوچتے ہوں گے؟ سب برا ہی کہتے ہوں گے۔

تمہیں اور تمہارے بچے کے بارے میں کچھ غلط ہی اندازے لگاتے ہوں گے۔“

”نہیں میں اور ہمارا بچہ کچھ بھی تو غلط نہیں حالات بدلیں گے۔ ضرور بدلیں گے۔“ تڑپ کر بے قرار سی وہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔ تبھی کھڑکی کھلی اور فرحان اچھل کر کمرے میں آ گیا۔ اس نے اس کو خاموشی رہنے کا اشارہ کیا اور کھڑکی بند کر کے چٹخنی چڑھادی۔ وہ گھبرا گئی، خوش ہو گئی۔ الجھ گئی اور پھر اس کی بانہوں میں سمٹ کے سلجھ گئی۔

”میں بہت شدت سے یاد کر رہی تھی۔“ وہ سرگوشی کے انداز میں بولی۔

”دیکھ لو ہم کھنچے چلے آئے۔ طبیعت کیسی ہے؟ کچھ کھایا پیا کہ نہیں۔“ فرحان نے بہت دھیرے سے پوچھا۔

”فرحان! بس طبیعت کا نہ پوچھو کچھ اچھا نہیں لگتا۔“ اس نے جواب دیا۔

”دس از ناٹ فیئر ڈارلنگ! آپ ہمارے ساتھ اور ہمارے بچے کے ساتھ یہ سلوک نہیں کر سکتیں۔ اب یہاں بیٹھو اور سب کچھ کھاؤ۔“ فرحان نے اسے صوفے پر بٹھایا۔ میز پر سے پھلوں کی ٹوکری اٹھائی اور کیلے چھیلنے لگا۔

”بس، بس فرحان ایک کافی ہے۔“ وہ منمنائی لیکن اس نے ایک نہ سنی۔

”مجھے اپنے وجود میں محسوس ہونے دو، سامعہ میں تم میں ہی تو زندہ ہوں۔“ فرحان نے محبت سے کیلا خود اس کے منہ سے لگایا۔ تو سامعہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

”یہ کیا ہے؟“

”فرحان! آنے والا وقت کیا ہو، کاش یہ پل ہی میں محفوظ کر سکتی۔“

”آنے والا وقت بھی ہمارا ہوگا ہم شادی شدہ ہیں ہمیں اب کیا خوف؟“

فرحان جوش جذبات میں ذرا بلند آواز میں بولا۔ تو وہ بولی۔

”پلیز دھیرے بولیں اور اب جائیں کوئی آ نہ جائے۔“

”یار کوئی نہیں آتا۔ میں بابا کو اشارہ کر کے آیا ہوں۔“ وہ شوخی سے بولا۔

”اچھا لیکن اب جائو۔“

”نہیں بابا، رات میں یہیں رہوں گا۔ اپنے کمرے کو اندر سے لاک کر کے کھڑکی کے راستے آیا ہوں۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

”کیا؟ نہیں پلیز یہ ٹھیک نہیں ہے کسی کو شک ہو گیا تو برا ہوگا۔“

”تو ہونے دو، تم کہو تو ابھی سب کو بتا دیتا ہوں۔“ وہ اڑ گیا۔

”بس بس مجھے کچھ نہیں کہنا جو وقت عافیت میں گزر جائے۔“ وہ چپ سی ہو گئی۔ تب فرحان کو کچھ خیال آیا کہ سامعہ کتنے بڑے امتحان سے گزر رہی

ہے، تنہا دوسروں کی نظر میں لاوارث، مجبور اور جانے کیا کیا؟

”سامعہ! مجھے افسوس ہے کہ ویسا نہیں ہوا جیسا اب تک ہونا چاہئے، لیکن

میں نہ خوف زدہ ہوں اور نہ بزدل، کہو تو ابھی اسی وقت اپنے قول کا ثبوت

دے سکتا ہوں۔“ فرحان کی آنکھوں میں ارادے اور عمل دونوں کی چمک دیکھ کر وہ ہولے سے مسکرا کر بولی۔

”میں بھی نہ خوف زدہ ہوں اور نہ بدگمان۔ آپ کی اور اس گھر کی بہتری کے لیے میں بہت کچھ برداشت کر سکتی ہوں، مگر...“

”مگر کیا...؟“ اس نے پوچھا۔

”فرحان! سب کچھ ہوتے ہوئے بھی ایک احساسِ جرم، ایک احساسِ گناہ سا ہوتا رہتا ہے، یہ سب آپ کے گھر والے، خاص کر زرتاشیہ کو جب یہ حقیقت معلوم ہوگی تو اعتبار کس طرح کرچی کرچی ہوگا؟ وہ تو پاگل لڑکی ہے، آپ کو بے حد چاہتی ہے۔“

”سامعہ! سب باتیں اپنی جگہ درست، مگر قسمت پر کس کو اختیار ہے؟ کچھ درد برداشت کرنے مشکل ہوتے ہیں، مگر وقت آنے پر درد کی شدتوں سے انسان گزر جاتا ہے۔ سب کچھ خود بخود ہوتا چلا گیا۔ تم نے ایسے اپنے طلسماتی سحر میں جکڑا کہ فرحان افتخار چاروں خانے چت ہو گیا اور اب، اب تو میں

بہت خوش ہوں، مجھے باپ بننے کے احساس سے ہی خمار آتا ہے۔“ وہ اپنی ترنگ میں بہت مسرور سا کہیں دور نکل گیا۔ وہ اس کی خوشی پر خوش ہو گئی۔

مگر دل میں کسی نے باریک سی چٹکی کاٹ کر کہا۔

”زرتاشیہ!“

”اور زرتاشیہ!“ وہ بڑ بڑائی۔

”کم آن! زرتاشیہ کو یہ حقیقت قبول کرنی ہوگی۔“ وہ بولا۔

”لیکن...“

”اوں ہوں، لیکن ویکن کچھ نہیں، بس سب ٹھیک ہوگا۔“ وہ اسے خود سے قریب کرتے ہوئے بولا۔

”ان شاء اللہ“ اس نے دل میں کہا۔

...☆☆☆...

کمرے میں پرفیوم کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

”افراسیاب!“ اس نے پکارا۔

”جی، پھو۔“ وہ پلٹا اور بولا... نرگھس کو وہ پھوپھو کی جگہ بچپن سے ”پھو“ پکارتا تھا۔

”مجھے ایک کام ہے، بھیا، بھابی تو بات سننے کو تیار نہیں۔“ نرگھس نے خاصی نرمی سے کہا۔

”سوری پھو، آپ مجھے بتادیں کیا کام ہے؟“ ماں باپ کی طرف سے معذرت کر کے اس نے بہت اپنائیت کا مظاہرہ کیا۔

”وکیل صاحب کو پیغام دینا ہے کہ وہ آئیں۔ دراصل ان کا نمبر اٹینڈ نہیں ہو رہا۔“

”کون سے وکیل صاحب؟“

”نواز بخش صاحب۔“

”ابو ناراض تو نہیں ہیں آپ ان کو کہہ کر دیکھیں۔“

”وہ ناراض ہیں، اور ویسے بھی وہ میرا ووٹ نہیں ہیں۔“

”پھو! آپ جو کرنے جا رہی ہیں اس پر غور ضرور کر لیں۔“ افراسیاب نے جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے کہا۔

”افراسیاب! اُس گھر میں غور طلب چیز صرف زرتاشیہ ہے۔“

”زرتاشیہ! چیز نہیں ہے، انسان ہے آپ کی بیٹی ہے، اور کتنی اہم ہے یہ غور طلب بات ہے؟“ افراسیاب نے ایک دم نرگھس کو غلطی کا احساس دلایا۔ زرتاشیہ کے نام پر اس کی آواز میں جو مٹھاس اور رچائو آیا وہ نرگھس نے لمحے بھر کو محسوس کیا۔ پھر اس کے سامنے آکر بولی۔

”مگر وہ اپنے باپ کو اہمیت دیتی ہے، دادو، پھوپھو کو اور...“

”فرحان کو... ہے ناں...“ اس کا جملہ اُچک کر وہ بولا۔

”ہاں! لیکن میں ایسا نہیں چاہتی۔“ وہ اڑ گئی۔



”پھو! آپ ایسا کیوں نہیں چاہتیں، جب کہ آپ جانتی ہیں کہ وہ سب رشتے زرتاشیہ کی رگوں میں دوڑتے ہیں۔“

”کچھ بھی کہو، میں چاہتی ہو زرتاشیہ میرے پاس آجائے۔“ ہمیشہ کی ضد ظاہر ہو گئی۔

”زرتاشیہ کو متنازع مسئلہ نہ بنائیں، اسے اس کی مرضی سے رہنے دیں۔“ اس نے گاڑی کی چابی اٹھا کر جواب دیا۔

”اگر زرتاشیہ میرے پاس آجائے تو تمہیں کیسا لگے گا؟“ اس نے ایک دم پوچھ لیا۔ افراسیاب قہقہہ مار کے ہنستا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں سے نمی باہر آگئی، چہرہ ہنسنے سے سرخ پڑ گیا بڑی مشکل سے ہنسی پر ضبط کر کے بولا۔

”بالکل ایسا لگے۔“

”میری خواہش ہے کہ۔“

”پھو! پلیز سب کو اپنی خواہش اور مرضی سے جینے دیں، آپ اور زیر انکل صرف اپنے بارے میں سوچیں۔ چھوڑ دیں سب کو، زرتاشیہ کو بھی۔“ وہ یک لخت سنجیدہ ہو گیا۔

”اس کا مطلب ہے؟“

”اس کا مطلب ہے، وکیل صاحب کو پیغام پہنچ جائے گا، مگر آپ اور غور کریں۔“ افراسیاب نے ایک بار پھر اس کا جملہ کچج کر لیا۔

”اس بات کا فی الحال بھیا سے ذکر نہیں کرنا۔“

”اوکے! بی ریلیکس! قلعے فتح کیے جاتے ہیں، رشتے نہیں۔“ وہ دھیرے سے کہہ کر باہر نکلا اور چند لمحوں پہلے والی باتوں کو وہیں فضا میں تحلیل کر کے پورچ کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے گاڑی نکال کر لے جانے تک انجم نے باورچی خانے کی کھڑکی سے دیکھا پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے کام میں مگن ہو گئیں۔

ئی...؟...ء

اماں جان اپنی پرانی محلے دار کی عیادت کو گئی تھیں۔ مگر ناجی کو کاموں کی فہرست تھما گئی تھیں۔ اسے صفائی ستھرائی کے بعد باورچی خانے کے تمام کانچ کے برتنوں کو سر کے پانی سے دھونا تھا۔ وہ بھنائی ہوئی، ٹب میں سرکہ ملے پانی سے کانچ کے برتن دھو رہی تھی کہ میاں افتخار آگئے۔ وہ بہت کم آفس کے درمیان آتے تھے۔ ناجی کو حیرت سی ہوئی۔

”میاں جی! اس وقت۔“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”ہاں بھئی! یہ لو یہ سامعہ بی بی کو دے دو۔“ ایک بڑا سا شاپنگ بیگ انہوں نے اس کی طرف بڑھایا۔ مگر اس کے بولنے سے پہلے ہی وہ خود شاپنگ بیگ لیے سامعہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ناجی اپنے کام میں پھر مصروف ہو گئی۔ اماں جان آئیں تو میاں جی کی گاڑی دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ میاں افتخار آئے ہیں۔

”میاں افتخار آئے ہیں؟“ انہوں نے پہلا سوال ہی یہی کیا۔ ناجی نے اثبات میں گردن ہلا کر سامعہ کے کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ انہیں کچھ عجیب سا لگا تخت پر بیٹھ گئیں۔ جو نہی وہ واپس آئے تو انہوں نے پکارا۔

”میاں! یہ کون سی ڈیوٹی ہے؟“

”وہ، وہ آفس کے کام سے نکلا تھا۔“ وہ ہکلائے۔

”یہ تو ہمیں پتا ہے، گھر کس کام سے آئے تھے؟“ انہوں نے تفتیشی افسر کی طرح کُریدا۔

”دراصل! آپ کا پان چھالیہ اور شاہدہ کی میڈیسن لانی تھیں۔“

”اور یہ سب دے آئے مہمان سامعہ کو۔“ وہ طنز یہ ہنسیں۔

”نہیں وہ تو میں لانا بھول گیا، سامعہ کا آئرن پلیس سیرپ اور ملٹی وٹامنز ٹیبلٹ یاد رہیں۔“ وہ نجل سے ہنسے۔

”ہاں میاں! یہ بدحواسی کا دور بھی ایک خاص عمر میں ضرور آتا ہے، چلو ہم سمجھ لیتے ہیں کہ اب تم ایسے ہی دور میں ہو۔“ انہوں نے اچھی خاصی گہری بات کی، میاں افتخار سٹپٹا گئے۔

”میں دوپہر میں لے آؤں گا۔“

”دھیان سے گاڑی چلانا۔“ کچھ انوکھا سا ہی ذائقہ تھا اس جملے میں، میاں افتخار کچھ ٹھیک سے سمجھے نہیں۔ تیزی سے نکل گئے۔ اسی وقت تانیہ کہیں باہر جانے کے لیے نکلی تو ان کی ساری توجہ اس کی طرف ہو گئی۔ انہوں نے اسے چست جینز میں لانگ کرتا پہنے دیکھ کر کہا۔

”تانیہ! ماں باپ کی عزت کا کچھ پاس کرلو، یہ محلہ ہے لوگ کیا کہیں گے؟“

”نانو! کس نے کہا ہے کہ آپ اس پرانے چھوٹے سے محلے میں رہیں، کیوں یہاں سے باہر نہیں جانے دیتیں۔“ وہ بھی روبرو آکر سوالیہ انداز میں بولی۔

”یہاں سے باہر کیا مطلب؟“

”اس کھنڈر حویلی کو بیچ کر یہاں سے باہر نکلیں۔“ وہ بات جو اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتی تھی وہ اس نے بے باکی سے کہہ دی۔ اماں جان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ تنہائی ہوئی چلی گئی، اماں جان کا تو پارہ چڑھ گیا۔ وہ اس کے جانے کے بعد مسلسل غصے کا اظہار کرتی رہیں۔ ”تانیہ کے ہوش و حواس مارے گئے ہیں، اب حویلی انہیں کھنڈر لگتی ہے، اللہ کی پناہ“ بے ہودہ لباس پہن کر باہر نکلنے کے لیے، محلے کے سر الزام تھوپ دیا۔“

”بڑی بیگم صاحبہ! ویسے حویلی اب بہت پرانی ہو گئی ہے۔“ ناجی نے الماری میں برتن لگاتے ہوئے کہا تو اماں جان مزید سیخ پا ہو گئیں۔

”پرانی ہو گئی ہے تو، پرانی چیزیں ناکارہ ہو جاتی ہیں کیا؟“

”وہ دراصل محلہ بھی تو تنگ ہے، گاڑی مشکل سے آتی ہے۔“ ناجی نے ہلکے سے تانیہ کی تائید کی۔

”تم اپنی چونچ بند رکھو، تانیہ کی زبان تمہارے تالو سے کیسے چپک گئی ہے، محلے میں رہنے کے فائدے معلوم ہے کتنے ہیں، اور اس کی مجال بھی کیسے ہوئی کہ یہ حویلی کو کھنڈر کہے۔“ وہ سخت تلملا کر ناجی پر برس پڑیں۔

”کیا پکانا ہے؟“ ناجی نے موضوع بدلنے میں ہی عافیت جانی۔

”یہ برتن پہلے دھوپ میں رکھو، سر کے کی بو نکلے، چمکیں، تمہاری عقل میں کب یہ بات آئے گی؟“ واقعی وہ اس کی کوشش کے مطابق دوسری طرف متوجہ ہو گئیں۔

”بیگم صاحبہ، ساڑھے بارہ بج رہے ہیں، ابھی تک کچھ بتایا نہیں کیا پکانا ہے؟“ ناجی جل بھن کے تمام کانچ کے برتن الماری سے واپس نکالتے ہوئے بولی۔

”آج بدھ ہے، لوکی کی بھجیا اور دال چاول پکنے ہیں۔“ انہوں نے ذہن میں ازبر روزانہ کا مینو جھٹ بتادیا۔

”ٹھیک ہے۔“

”میں ذرا زرتاشیہ کو اچار گوشت پکانے کا طریقہ سمجھا آؤں، تم جلدی جلدی برتن دھوپ میں رکھو اور دال بھگو کے لوکی چھیلو۔“ اماں جان نے ہدایات جاری کیں اور زرتاشیہ کی طرف چلی گئیں۔

...☆☆☆...

اس کی طبیعت کچھ بہتر تھی۔ موسم بھی اچھا تھا۔ دل چاہا کہ کمرے سے باہر نکلا جائے۔ ڈوپٹا سینے پر پھیلا کر کمرے سے باہر نکلی تو صحن میں ناجی آج کے استعمال شدہ دسترخوان دھو رہی تھی۔ باقی سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ فرحان اور میاں افتخار کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ فرحان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

”آؤ، آؤ سامعہ۔“ میاں افتخار اسے دیکھ کر بولے۔

”وہ“ میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”اؤں، ہوں۔“ میاں افتخار کے گلے میں جیسے کچھ پھنس گیا۔

”کیا ہوا...؟“ وہ سادگی سے بولی۔

”ابھی پورے اٹھارہ منٹ باقی ہیں شام کی چائے میں، اور داروغہ کچن کی مرضی کے بغیر کوئی آدمی کچن میں داخل نہیں ہو سکتا۔“ میاں افتخار نے اپنے مخصوص لطیف سے انداز میں بتایا، سامعہ اور فرحان کو ہنسی آگئی۔

”بابا! وہ مجھے کچھ نہیں کہیں گی۔“ سامعہ نے وثوق سے کہا... تو میاں جی کو اس کی سادگی پر ہنسی آگئی۔

”ہاں! وہ جو کچھ کہیں گی، اور بنا اسلحے کے برسیں گی، اس میاں افتخار کی ہستی پر باقی کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا۔“ وہ انتہائی معصوم سی شکل بنا کر بولے۔

”رہنے دو، سامعہ، بلاوجہ نانوائی کا پہاڑ بنا دیتی ہیں۔“ فرحان نے بھی اسے منع کر دیا۔

”فرحان! مجھے تو نانوائی بالکل ایسی نہیں لگتی۔“

”لو اور سنو! بھئی وہ آپ کو کیوں لگیں گی، ان کی نظر میں، آپ ایک مہمان ہو۔ ابھی انہیں پتا چل جائے آپ کی حیثیت پھر سمجھ لو، میری تو کالے پانی کی سزا شروع۔“ میاں افتخار نے کہا۔

”چلیے میں ان سے پوچھ لیتی ہوں۔“ سامعہ دروازے سے باہر نکلی، تو میاں جی بولے۔

”کاش سب کچھ ان سے پوچھ لیتے، آپ دونوں تو، میرا دماغ تو ٹھکانے رہتا۔“ وہ اس قدر معصومیت سے بولے کہ فرحان کی ایک بار پھر ہنسی چھوٹ گئی۔

سامعہ کا دل کیوں کہ بہت چاہ رہا تھا کہ وہ کوئی کام کرے۔ کچھ تو کرے یہ سوچ کر اس نے وضو کے لیے جاتی ہوئیں اماں جان سے چائے بنانے کی اجازت طلب کر لی۔ پہلے تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ۔ ”ابھی تھوڑی دیر میں ناجی بناتی ہے۔“ مگر اس نے بہت اپنائیت سے کہا۔

”میرا دل چاہ رہا ہے، کمرے میں دل گھبرا رہا تھا۔“



”چلو ٹھیک ہے، مگر بچی! آپ مہمان ہو اچھا نہیں لگتا اور پھر ابتدائی دن ہیں احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو میاں افتخار کی نیک نامی داؤ پر لگ جائے گی۔“ اماں جان نے جانے کس سیاق و سباق کے ساتھ اجازت دی وہ قطعاً نا سمجھ سکی۔ بس گردن ہلا کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔ جب کہ اماں جان نے از خود یہ اخذ کر لیا کہ وہ سامعہ کو بہت کچھ سمجھانے میں کسی حد تک کامیاب ہوگئی ہیں۔ اسی خیال کے ساتھ وہ مطمئن سی ہو کر وضو کرنے چلی گئیں۔ ویسے بھی سامعہ کے چہرے میں جانے کیسی معصومیت اور اثر تھا کہ بسا اوقات اماں جان اس کی طرف ایک ٹک دیکھتی رہ جاتیں۔ کچھ کہنے سے پہلے خاموش سی ہو جاتیں۔ اسے مکمل مہمانوں والا پروٹوکول دے رکھا تھا۔ کھانے کی میز پر بھی اسے بار بار ٹھیک سے کھانے کو کہتی رہتیں۔ یہ الگ بات تھی کہ آج کل اسے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا تھوڑا بہت کھاتی یا پھر معذرت کر کے اٹھ کھڑی ہوتی۔

...☆☆☆...

عادل کی تمام چیزیں بیگ سے نکال کر انہوں نے مخصوص جگہوں پر رکھ دیں۔ کپڑے الماری میں رکھ کر پلیٹیں تو ایک ہلکے نیلے چمکیلے سے پیکٹ نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ انہوں نے خوب صورتی سے پیک کیے گئے اس پیکٹ کو دیکھا، اسی اثناء میں عادل واش روم سے باہر آگیا۔ انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ شوخ ہو گیا۔

”امی جان! یہ آپ کی پیاری بہو کے لیے ہے، شاید وہ قبول فرمالیں۔“

”ہش! تحفہ دیتے ہوئے بدگمان نہیں ہوتے۔“ انہوں نے سرزنش کی۔

”گمان اچھا ہو تو بدگمان نہ ہوں، وہ تو بس روا روی میں یہ تعلق نبھار ہی ہیں۔“ اس کے منہ سے نکلا تو رفیعہ بیگم کو شاہدہ کی سب باتیں یاد آ گئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ عادل بھی کچھ نہ کچھ سمجھ رہا تھا۔

”خیر، ایسی کوئی بات نہیں، تم اچھے سے طریقے سے اسے خود جاکر دینا، خوش ہو جائے گی۔“ رفیعہ بیگم نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

”اور اگر محترمہ بگڑیں تو؟“ اس نے پوچھا۔

”تو کچھ نہیں، کیا توپ چلائی ہے، چپ چاپ آجانا۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”جی نہیں اس بار ایسا نہیں ہوگا۔ میں محترمہ کو سبق سکھا دوں گا۔“ وہ سختی سے بولا۔

”پھر تم رہنے دو یہ تحفہ، جب وہ بیاہ کر آئے گی تو دے دینا۔“ رفیعہ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

”ارے امی! آپ اس سے ڈرتی ہیں۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”نہیں، میں اپنے بیٹے کی خوشی اور پسند کو کسی بھی وجہ سے قربان نہیں کرنا چاہتی۔“ انہوں نے براہ راست اس کی جگمگاتی آنکھوں میں جھانکا۔ تو وہ فوراً ایڑھیوں کے بل گھوم گیا۔

”شاید آپ غلط ہوں۔“

”میری طرف دیکھ کر بات کرو۔“ انہوں نے چھیڑا۔

”امی، تانیہ آپ کی خوشی اور خواہش ہے تو میری پسند، اگر آپ لوگ اسے مسترد کر دیں تو میں ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔“

”اور تانیہ جانے کیا سوچتی ہو، مجھے کبھی بہت خوف آتا ہے۔“ رفیعہ بیگم نے دل میں پھنسے خوف کو ظاہر کر دیا۔

”وہ تو سخت متنفر ہے، قطعاً یہ شادی پسند نہیں کرتی، ہمیں بہت بُرا بھلا کہتی ہے، اس کا بس چلے تو وہ مجھے گولی مار دے۔“ اپنی فطرت کے عین مطابق پوری سچائی کے ساتھ اس نے بتا دیا۔ رفیعہ بیگم کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ حد درجہ افسردہ ہو گئیں۔

”تم سچ کہہ رہے ہو عادل...؟“ ڈوبتے دل سے پوچھا۔

”جی ہاں، سو فیصد سچ، وہ سانولی سلونی تانیہ افتخار آپ کے عادل سے نفرت کرتی ہے، وہ زیورات کے ڈیزائن والی کتاب اس نے فرش پر دے ماری تھی۔ اس نے مزید سچ بتایا۔

”پھر، پھر کیا ہوگا... کیا یہ رشتہ...؟“

”ارے ارے“ امی ایسا تو وہ چاہتی ہے، آپ کا بیٹا تو نہیں، بس ہوگا وہی جو آپ کا بیٹا چاہے گا۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تانیہ آپ کی بہو بنے گی، خواہ حالات کیسے بھی رہیں، یہ میرا وعدہ ہے۔“ وہ ماں کی پیشانی چوم کر محبت آمیز لہجے میں بولا۔  
”لیکن...“ وہ رکیں۔

”وہم نہ کریں، اکڑی ہوئی چیزیں ٹوٹ جاتی ہیں، ذرا سا وقت لگے گا۔ آپ بالکل ان پر کچھ ظاہر نہ کریں۔“ وہ مضبوط ہاتھوں میں ان کا ہاتھ دبا کے بولا۔ رفیعہ بیگم کا دل بڑی مشکل سے قابو میں آیا۔ اثبات میں گردن ہلا کر باہر چلی گئیں اور وہ اس پیکٹ کو الماری میں رکھ کے اس سے یوں مخاطب ہوا... جیسے وہ اس کے روبرو تن کے کھڑی ہو اور وہ ہاتھ بڑھا کے اپنی جانب کھینچ کر کان میں کہے...

ہم چھین لیں گے تم سے، یہ ادائے بے نیازی

تم مانگتے پھر و گے، اپنا غرور ہم سے

ہم چھین لیں گے تم سے...

ہم چھین لیں گے تانیہ افتخار تم سے تمہارا سارا غرور...

ژژژ

”بھائی صاحب! یہ لیجیے۔“ زبیر احمد نے سفید رنگ کا ایک لفافہ میاں افتخار کی طرف بڑھایا۔ شاہدہ بیگم نے اخبار سے نظریں ہٹا کر بھائی کو دیکھا، جب کہ میاں افتخار کے لیے سوال تھا۔ وہ لفافہ...  
”یہ کیا ہے...؟“

”یہ پچاس لاکھ روپے کا چیک ہے، فرحان کے کاروبار میں میری طرف سے کچھ حصہ۔“ زبیر احمد نے بہن کے برابر بیٹھتے ہوئے بتایا۔ میاں افتخار کے ذہن کے تار بج اٹھے۔ وہ سمجھ گئے کہ زبیر احمد کا اشارہ کیا ہے۔

”مگر اس کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے اس پر کام شروع کر دیا ہے۔“

”اچھی بات ہے“ یہ پیسا زرتاشیہ اور فرحان کا ہی ہے، اس لیے اس پر بحث صرف بحث ہوگی۔“ زبیر احمد نے صاف لفظوں میں عندیہ دیا۔

”زبیر! زرتاشیہ کسی غیر کے گھر نہیں جا رہی، اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟“ پہلی بار شاہدہ بیگم نے بھائی سے کہا۔

”چھوڑیں اب اس بحث کو، مجھے اپنے بچوں کا خوب صورت کل چاہیے۔ آپ اس کے لیے جو کہیں۔“ زبیر احمد نے انتہائی گرم جوشی اور محبت کا اظہار کیا۔ تو شاہدہ بیگم مسکرا دیں اور میاں افتخار کی سٹی گم ہو گئی۔ نہ وہ لفافہ واپس کرنے کی پوزیشن میں تھے اور نہ لینے کی۔

”زرتاشیہ بہت تنہائی محسوس کرتی ہے میں جلد از جلد اس کو ہنستا مسکراتا دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ دونوں بس شادی کی تاریخ لیں۔“ زبیر احمد نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی، میاں افتخار تو حواس باختہ ہو گئے۔

”ان شاء اللہ سب جلدی اور اچھا ہوگا۔“ شاہدہ بیگم نے تسلی دی۔

”ہاں! مگر یار یہ بوجھ نہ ڈالو۔ فرحان کا کاروبار ہمیں شروع کرانا ہے۔“ میاں افتخار نے آخری کوشش کی، مگر اماں جان نے موقع پر پہنچ کر ان کو خاموش کرادیا۔

”چھوڑو میاں! کیا ہم، تم لگا رکھی ہے، نہ فرحان غیر ہے اور نہ زرتاشیہ، جلدی سے کاروبار کرائو، ادھر دیوار کے پیچھے میری بچی تنہا رہتی ہے۔“

”میری طرف سے تو ایک دن کی بھی دیر نہیں۔“ زبیر احمد نے ماں کی تائید کی۔

”مگر کچھ وقت تو لگے گا۔“ میاں افتخار بولے۔

”یہ سراسر غلط بیانی ہے۔ نیت صاف رکھو، بیٹا، بیٹی دونوں کا فرض ادا کرو۔“ اماں جان نے کہا تو شاہدہ بیگم نے پہلو بدلا۔

”اماں جان! سب سے پہلے تو کہیں اور شفٹ ہونا پڑے گا۔ شادیاں تو اس گھر میں نہیں ہو سکتیں۔“

”ہیں! کیا کیا کیڑے پڑ گئے اس گھر میں، تمہارا ڈولا کہاں سے اٹھا تھا؟“  
اماں جان کو جیسے بچھونے ڈنک مار دیا۔

”اماں! وہ بات اور تھی آپ خود دیکھیں اب دیواروں میں کیل ٹھونکیں تو پلستر جھڑنے لگتا ہے۔“ شاہدہ بیگم نے بہت دھیمے انداز میں جواب دیا۔

”واہ! ہم خوب جانتے ہیں تمہارے کانوں میں یہ صور کس نے پھونکا ہے، تم نے کس کے کہنے پر گھر بدلنے کی بات کی ہے۔“

”اماں جان! ویسے ہی کہہ دیا۔ آپ چھوڑیں۔“ زبیر احمد نے بات کی شدت اختیار کرنے سے پہلے جلدی سے کہا۔ شاہدہ بیگم کی زبان پر تالا لگ گیا۔

”ارے یہ سب تانیہ کی خرافات ہیں، انہیں ایسے شوق ہیں۔“ اماں جان نے برملا کہا۔ اس سے پہلے کہ بات مزید کسی سمت بڑھتی ناجی نے سامعہ کی

طبیعت خرابی کی اطلاع دی۔ میاں افتخار سب سے پہلے بھاگتے ہوئے گئے۔ اماں جان کی نگاہوں کا طلسم تھا کہ شاہدہ بیگم اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ بس جز بز سی ہونٹ چباتی رہ گئیں۔

رات گئے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ سیدھا سامعہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ بابا نے اسے فون پر سامعہ کا بی پی ہائی ہونے کی اطلاع دی تھی۔ پریشانی میں وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ شاہدہ بیگم نے اماں جان کے کمرے سے نکلتے ہوئے اسے دیکھا ہے۔ معمول کے مطابق وہ اماں جان کے پیر دبا کر، دوائیں دے کر سونے جاتی تھیں۔

”فرحان! انہوں نے پیچھے سے آواز لگائی تو فرحان کے قدم کمرے کے عین وسط میں رک گئے۔ بیڈ پر بے دم سی سامعہ غنودگی میں لیٹی تھی۔

”فرحان!“ دوسری آواز آئی تو وہ پلٹا۔

”جی ماما!“

”میرے ساتھ آؤ۔“ انہوں نے تحکم سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

سامعہ نے کھڑکی سے فرحان کو ان کے ساتھ جاتا دیکھ کر لمبی سرد آہ بھری اور کھڑکی بند کر کے، دروازہ بھی لاک کر کے صوفے کا سہارا لیا۔ لرزتی



ٹانگوں میں سکت ہی نہیں رہی تھی۔ دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ فرحان کا ایسے آنا اور اس طرح جانا پریشان کن تھا۔

بے بسی اور بے چارگی سے آنکھیں ڈبڈبا گئیں، مگر استقامت اور صبر نے بڑھ کر آنکھوں کی ساری نمی اپنے دامن میں سمیٹ لی۔ یہ نہ خلاف توقع ہوا تھا اور نہ غیر یقینی تھا۔ اس کو اس زندگی کی حقیقت کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ اس نے تو فقط فرحان کی چاہت کو دین اور عقیدہ بنا کر اس راہ پر قدم رکھا تھا۔ خود کو آزمانے کی ضرورت نہیں تھی۔ فرحان کو آزمانا مقصود نہیں تھا۔ دل کی بات مان کر یہ طے کر لیا تھا کہ اب جو چاہے گا فرحان چاہے گا۔ جو کہے گا فرحان کہے گا۔ محبت اس کی فطرت اور الفت اس کا یقین تھا۔ پھر بھلا وہ اس کڑے امتحان میں بھی کیسے پست حوصلہ ہو سکتی تھی۔ اس وقت حالانکہ شدت سے اس کی منتظر تھی، مگر وہ آیا اور چلا بھی گیا۔ یہ شدید دُکھ اسے تڑپا بھی رہا تھا اور تسلی بھی دے رہا تھا کہ کچھ بھی سہی تمہارا فرحان

تمہارے لیے تمہارے پاس آیا تو تھا۔ تمہیں اس کی وفا پر بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔“

”نہیں، نہیں بہ خدا میں اپنے فرحان سے رائی برابر بھی بدگمان نہیں، میں تو فکر مند ہوں کہ اسے کن سوالوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ مجھے معلوم ہے محبت کا سفر کتنا دشوار ہے، مگر دیکھنا یہ ہے کہ کون کتنا وفا دار ہے۔ یہ سوچ کر اسے مانگا نہیں مجھے معلوم ہے کہ وہ میرا طلب گار کتنا ہے؟“ ذہن میں اٹھتے سوالوں اور جوابوں سے جب فرصت ملی تو بستر پر دراز ہو گئی۔

☆...وؤ...☆

غیر ضروری انداز میں مسلسل چائے کے کپ میں چچچ ہلاتے ہوئے دیکھ کر میاں افتخار کی رگِ ظرافت پھڑکی۔

”بیگم صاحبہ! شوگر تو آپ استعمال کرتی نہیں، پھر کون سی جادوئی شے مکس کرنے کی کوشش کر رہی ہیں، جو ہمیں مدد کھائی بھی نہیں دے رہی۔“

”آپ کو تو آج کل کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا بلکہ آپ نے یہ بھی یقین کر رکھا ہے کہ دوسروں کو بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔“ شاہدہ بیگم نے اپنے نرم مگر گرم لہجے میں وار کیا۔ میاں افتخار پھڑ پھڑائے، فرحان نے پہلو بدلا، سامعہ کی طرف دیکھا۔

”بیگم! خیر تو ہے آپ الہامی گفتگو فرما رہی ہیں۔“

”افتخار! بس زیادہ معصوم مت بنیے۔“ شاہدہ بیگم کے تیور بدلے بدلے سے تھے۔

”بھئی ہم معصوم تو ہیں، سو فیصد معصوم۔“

”کون کتنا معصوم ہے، یہ معلوم ہو جائے گا۔“ انہوں نے ذومعنی نگاہوں سے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھا۔ اماں جان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ بولیں۔

”ہمارے نزدیک تو سب یا تو احمق ہیں یا پھر پرلے درجے کے شاطر۔“

”واہ! کیا خوب حسن ظن ہے۔“ میاں افتخار شرارت سے بولے۔

”اماں جان! آپ صرف افتخار کو کہیں۔“

”کیوں بھئی اس غریب نے ہماری بھینس چرائی ہے، اس گھر میں کون کیا ہے، یہ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے۔ تم لاکھ آنکھیں بند کرو، دو بچے سنبھالنے نہیں آئے، دیکھ لو صبح ہوگئی ہے ناشتا ہو چکا ہے مگر کہاں ہیں تانیہ بی؟“ اماں جان نے کڑک لہجے میں پوچھا۔

”وہ، وہ رات دیر تک نیٹ پر کچھ کام کرتی رہی اس لیے۔“ شاہدہ بیگم نے فوراً بہانہ بنایا۔

”چھوڑو جانے دو، گھنٹوں وہ کیا کام کرتی ہیں یہ ہمیں خوب معلوم ہے بس جلدی بیاہ کر دو۔“

”اوہ ہنہ، اوہ ہنہ۔“ میاں افتخار کو کھانسی شروع ہوگئی۔

”وہ“ وہ میرا اور افتخار کا خیال ہے کہ زرتاشہ تنہا ہوتی ہے، جب تک شادی نہیں ہوتی سامعہ اس کے پاس رہے۔“ ایک دم غیر متوقع بات کر کے شاہد بیگم نے سب کو چونکا دیا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟“ میاں افتخار جلدی سے بولے۔

”کیوں؟ زرتاشہ کا دل بہلا رہے گا“ سامعہ بھی بور نہیں ہوگی۔“ شاہد بیگم نے نگاہیں اماں جان پر مرکوز کرتے ہوئے کہا تو وہ زرتاشہ کے خیال سے چپ ہو گئیں۔

”مگر اس کی کیا ضرورت ہے؟“ فرحان نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے آپ کی ماما بہت دانا ہیں“ اچھا ہے۔“ میاں افتخار نے ہکلا کر فرحان کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔

”کیوں سامعہ؟“ شاہد بیگم نے مسکرا کر سامعہ کو دیکھا۔

”جی“ جی بہتر ہے، میں تو آپ لوگوں کو پریشان کر رہی ہوں۔“ سامعہ نے دھیرے سے جواب دیا، مگر اس کے اندر کی شرمساری فرحان نے صاف محسوس کی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے، بس اپنا خیال رکھو۔“ شاہد بیگم نے مروّت کا اظہار کیا۔ فرحان پائوں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

”ناجی!“

”جی۔“

”کام سے فارغ ہو کو سامعہ کا سامان زرتاشہ کے پاس چھوڑ آنا۔“ شاہد بیگم نے ناجی سے کہا۔

”کام سے فرصت ملے گی تب نا۔“ ناجی نے تڑخ کے کہا۔

”ہیں“ پھر زبان چلی۔“

”ناجی! ایک دو روز میں تیرا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ میاں افتخار نے ناجی کو مخاطب کیا۔

”کیا مطلب؟“ اماں جان نے پوچھا۔

”وہ لڑکا ہے شوکت، شوکی شوکی کہتے ہیں اچھا کام کرنے والا ہے۔“ میاں افتخار نے خاصی جرأت کا مظاہرہ کیا۔

”تو کیا وہ یہاں رہے گا۔“ اماں جان نے خاصی حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”نہیں اسے گلی میں رکھیں گے یا پھر ہالڈے ان میں کمرہ لے دیتے ہیں۔“ میاں افتخار نے بہت سادگی سے کہا تو ناجی کی ہنسی نکل گئی۔

”توبہ ہے میاں، یہاں پوچھنا بھی جرم ہے۔“ اماں جان برا مان گئیں۔

”اماں جان! یہ لاوارث جوان بچی ایسی ہی تو نہیں رکھنی، یہ ہماری ذمہ داری ہے، شوکی بھی اکیلا ہے، شریف لڑکا ہے کسی اچھے خیال سے لا رہا ہوں۔“ میاں افتخار نے خاصی کوشش کے ساتھ سنجیدگی طاری کی۔

”مگر خرچہ تو بڑھ جائے گا۔“ اماں جان نے کہا۔

”ارے! وہ اپنی قسمت کا کھائے گا، مگر ناجی کا مسئلہ تو حل ہو جائے گا۔ ویسے بھی اکیلی کے کندھوں پر سارا بوجھ ہے، اہلی سے برتن دھوتے دھوتے بے چاری اہلی کی گٹک جیسی رہ گئی ہے۔“ میاں افتخار نے اس انداز میں کہا کہ شاہدہ بیگم کے لبوں پر بھی تبسم پھیل گیا۔

”ایسی باتوں نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے، کام سے کوئی نہیں مرتا۔“ اماں جان یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سامعہ بھی اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ تب میاں افتخار نے سوالیہ نظروں سے بیوی کو دیکھا۔

”سامعہ کے شوہر کا کچھ پتا چلا۔“

”ہاں ماشاء اللہ زندہ سلامت، خوب رو نو جوان ہے۔“ میاں افتخار اپنی ترنگ میں کہہ گئے۔

”کیا مطلب؟ آپ نے دیکھا ہے۔“ شاہدہ بیگم چونکیں۔

”وہ“ وہ سامعہ کے کہنے کے مطابق بالکل ایسا ہی ہوگا۔“ وہ بہ مشکل بات سنبھال سکے۔

”بہر کیف! جلدی کچھ کرو“ ورنہ بے چاری سامعہ اور بچے کے لیے مسائل ہوں گے۔“ وہ یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئیں۔ میاں افتخار سوچ میں گرفتار بیٹھے رہ گئے۔

☆...وؤ...☆

زرتاشیہ کی خوشی دیدنی تھی۔ یہ اطلاع جونہی اسے ملی تھی کہ اب سامعہ اس کے پاس رہے گی، وہ خوشی سے بھاگتی ہوئی خبر کی تصدیق کے لیے آرہی تھی کہ تیزی سے باہر نکلتے ہوئے فرحان سے ٹکرا گئی۔ اس غیر متوقع صورت حال پر وہ بگڑا نہیں بلکہ نرمی سے بولا۔

”یہ گھر ہے کوئی کھیل کا میدان نہیں۔“

”سوری، مگر آپ کو پتا ہے اب سامعہ جی میرے ساتھ رہیں گی۔“ وہ اس کا طنز اور سنجیدگی دونوں نظر انداز کر گئی۔ اسے تنہائی دور ہونے کی خوشی ہی

بہت تھی۔ فرحان تو پہلے سے ہی اس حکم نامے پر تیج و تاب کھا رہا تھا۔ بلکہ اس وقت بھی اس نے بابا کو ایاز کی طرف آنے کو کہا تھا تا کہ اس موضوع پر بات ہو سکے۔ وہ اس کی خوش پر جل گیا۔

”تو یہ سب آپ کی خواہش کے مطابق ہو رہا ہے۔“

”سامعہ جی! بے چاری۔“

”کوئی بے چاری نہیں ہے وہ، آپ سب لوگ اس پر رحم کھانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟“ وہ اور زیادہ بگڑ کر بولا تو زرتاشیہ سہم گئی۔

”آپ کو اچھا نہیں لگتا کہ میں خوش رہوں۔“

”مجھے بے کار باتیں سوچنے کا شوق نہیں۔“

”کبھی تو میرے لیے کچھ سوچا کریں۔“

”زرتاشیہ احمد! آپ نہ مسئلہ کشمیر ہیں اور نہ مسئلہ فلسطین کہ آپ کے لیے سوچتا رہوں۔“ وہ خاصا جھلایا ہوا آگے بڑھنے لگا تو اس نے کہا۔



”مگر میں آپ کی زندگی کا مسئلہ ہوں، شراکت دار ہوں۔“ وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔ وہ پلٹا اس کی آنکھوں میں دیکھا اور بولا۔

”جب شراکت دار بن جاؤ تب کہنا، بچپن کی نادانیوں کو سینے سے لگا کے رکھنے سے تسکین تو مل سکتی ہے لیکن سچی خوشی نہیں۔“ وہ چلا گیا اور وہ وہیں کھڑی رہ گئی۔ کانوں میں اس کا آخری جملہ گونجنے لگا۔ کتنی خوش آئی تھی اور کتنی دکھی ہو گئی تھی۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔ دبے قدموں لوٹ آئی، وہاں کسی کو خبر تک نہ ہوئی اس کے آنے اور جانے کی البتہ زبیر احمد نے خاصی گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ زبیر احمد نے لان سے پھول توڑ کر بہت خوب صورت گلدستہ بنا کر اس کے کمرے میں قدم رکھا تو وہ اوندھے منہ بیڈ پر دراز تھی، انہوں نے پھول اس کے چہرے کے قریب رکھے اور بیٹھ کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں تو وہ اٹھ بیٹھی۔

”پپا! میرے سویٹ پپا!“ وہ ان سے لپٹ گئی۔

”میرا بچہ، بہت خوش خوش گیا تھا مگر واپس آیا تو...؟“ انہوں نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

”وہ کچھ نہیں بس ویسے ہی کچھ یاد آگیا تھا۔“

”کسی نے کچھ کہا ہے کیا۔“

”نہیں تو، بھلا کون کچھ کہے گا، مجھے کچھ یاد آیا تو واپس آگئی۔ آپ یہ پھول میرے لیے لائے ہیں۔“

”ہوں، پھول کے لیے پھول لایا ہوں۔“ وہ مسکرائے۔

”میں یہ سامعہ جی کے کمرے میں سجادوں۔“ اس نے پوچھا۔

”میں نے اپنے پھول کو دیے ہیں، اب یہ آپ کے ہیں جو چاہو کرو۔“

”تو آپ بیٹھیے میں گلدان سجا کر ابھی آئی۔“ وہ یہ کہہ کر پھول لیے اپنے

برابر والے کمرے کی طرف گئی، جب کہ وہ بیڈ کی پشت گاہ سے سر ٹکائے

خود کلامی کرنے لگے۔

”پھولوں کا کیا ہے؟ پیدا ہوتے ہیں تو کانٹوں بھرا آنگن ان کا مقدر ہوتا ہے جب یہ کانٹوں میں رہ کر جینا سیکھ لیتے ہیں، دوسروں میں خوشیاں بانٹ لینا سیکھ لیتے ہیں تو کوئی بھی بڑھ کر ان کو توڑ لے جاتا ہے، پھول خیال کرتے ہیں کہ شاید زندگی کے اچھے دن آگئے لیکن یہ معصوم نہیں جانتے کہ توڑنے والا انہیں لے جا کر اپنے محبوب کے قدموں میں پھینک دے گا۔ اس کے گلے کا ہار بنائے گا یا اس کی زلفوں میں سجائے گا یا پھر کسی کے مزار یا میت کی زینت بنائے گا۔ کسی پارٹی کی سجاوٹ میں لگائے گا یا عرق نکال کر دوا بنائے گا۔ توڑنے والا ہر لحاظ سے خود مختار جو ٹھہرا۔ پھول تو اپنا کام پورا کرتے ہیں کوئی بڑا ہو یا چھوٹا، اپنا ہو یا پرایا، دوست ہو یا دشمن، امیر ہو یا غریب ہر کسی کو اپنی خوش بو سے معطر کرتے ہیں۔ کیونکہ یہی ان کی زندگی ہے اور یہی ان کا کام ہے۔ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے پھول وفا شعار ہیں بس۔

”یہ وقت جوش کا نہیں ہوش کا ہے۔ آپ کی ذرا سی تیزی سے سب سے بڑا نقصان سامعہ کو اور ہونے والے بچے کو ہوگا۔ یہ مسائل کے سلجھانے کا وقت ہے۔“ میاں افتخار نے چائے کا کپ خالی کر کے ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا، صائمہ اور ایاز نے اثبات میں گردن ہلا کر تائید کی، لیکن فرحان نے جھلا کر جواب دیا۔

”بابا! میں چپ چاپ اپنی سامعہ کی، اپنے بچے کی تذلیل ہوتا ہوا دیکھتا رہوں، ماما نے دانستہ سامعہ کو زرتاشیہ کے پاس شفٹ کیا ہے۔ تاکہ وہ ہم سے دور ہو جائے۔“

”آپ کے بولنے سے تو اور زیادہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ سامعہ ہمارے گھر میں ہماری نظروں کے سامنے ہے، اتنی صابر بچی ہے، خاموشی سے آپ کی خاطر سب کچھ برداشت کر رہی ہے۔ جیسا آپ نے چاہا اس نے کیا۔ کچھ حوصلہ رکھو۔“ میاں افتخار نے اپنی بات کا وزن جاننے کے لیے ایاز اور صائمہ کی طرف بھی دیکھا۔

”انگل ٹھیک کہہ رہے ہیں فرحان، اب صبر و تحمل کی ضرورت ہے، سامعہ بھابی کو ذہنی، جسمانی آرام کی ضرورت ہے، دوسری طرف تو ایک دم سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“ ایاز نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے میں سامعہ کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کے کاروبار کے جھمیلوں میں پڑ جائوں۔ اس کا حال احوال بھی مجھے پتا نہ چلے۔ میں بزدلوں کی طرح بیوی کو تنہا کردوں۔“ وہ چلایا۔

”میرے رستم! سمجھداری سے کام لو، وہاں زرتاشیہ کے ذریعے سامعہ کے پاس جانے کے مواقع زیادہ روشن ہیں، آپ زرتاشیہ کے لیے تو کھلم کھلا جا سکتے ہو، ماں آپ کی شوگر اور دل کی مرلضہ ہے۔

غلط قدم سے مجھے تنہا مت کرو، سامعہ اور بچے کا خیال ہی کرلو۔“ میاں جی نے خاصے شریر سے انداز میں کہا تو ایاز اور صائمہ مسکرا دیے۔

”اس طرح تو زرتاشیہ کو دھوکا دینا ہوا۔“

”پہلے کون سا آپ نے اسے اس کا حق دیا ہے، وہ تو غریب قربانی کا بکرا بنائی گئی ہے۔“ میاں افتخار نے چھیڑا۔

”بابا! آپ بھی مذاق اڑا رہے ہیں۔“

”میں آپ کو سمجھا رہا ہوں۔ جو بھی ہو رہا ہے اس کو بُردباری سے برداشت کرو، آپ سامعہ کے لیے زرتاشیہ سے قریب ہو جائوں۔“

”سامعہ بھابی بہت اچھی ہیں، وہ تیری خاطر بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہیں۔“ ایاز نے غائبانہ طریقے سے سامعہ کے وجود کو حاضر کر دیا۔ وہ خوشی سے مسکرا دیا۔

”اب چلیں اور ہاں کاروبار کے لیے ابتدائی کام کا آغاز ہو چکا ہے پوری دلچسپی لو۔“

”بابا! ویسے اس طرح تو ماما اور نانو کو یقین آجائے گا کہ میں زرتاشیہ کے لیے راضی ہوں۔“

”یہ راضی اور ناراضی والی بات تو ہے ہی نہیں ایک کلیہ ہے کہ زرتاشیہ اور فرحان کی شادی ہوگی بس۔“ وہ بولے۔

”تو پھر؟“

”پھر کے بعد کا اللہ جانے فی الحال ایک وقت میں دو تین مسئلے آپ نے کھڑے کر دیے ہیں۔“

”بابا! بابا، پلیز میں سخت پریشان ہوں۔“ وہ بولا۔

”اسی لیے کہتے ہیں عشق آدمی کو نکما کر دیتا ہے۔“ میاں افتخار نے ہنس کر کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

”جائو یار! اب بیوی اور منگیتر دونوں کو ساتھ ساتھ فیس کرو۔“ ایاز کی بھی رگ ظرافت پھڑکی۔

”پتا نہیں میرا کیا بنے گا؟“ وہ قدرے بے بسی سے بولا تو میاں افتخار نے پلٹ کر ٹکڑا لگایا۔

”بیٹا! آپ کا تو پتا نہیں البتہ اس بڑھے کا مقبرہ ضرور بنے گا۔“

”اللہ کرے ماما کو خود سب کچھ پتا چل جائے۔“ فرحان نے بابا کے برابر چلتے ہوئے دعا کی۔

☆...وؤ...☆

اپنا مختصر سا سامان ناجی کے ہاتھ بھجوا کے اس نے اُداس نظروں سے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھا، سوچا کمرہ مختصر ضرور تھا مگر بھر پور تھا۔ وہ اس کی خواب گاہ میں تھی اس کی پناہ میں تھی، مگر یہیں سے حکم سفر مل گیا تھا۔ پلکوں کی نمی، ریشمی آنچل میں چھپا رہی تھی کہ فرحان کمرے آگیا۔ ہارٹ کی شکل میں بنا گلدستہ ہاتھ میں لیے۔ وہ جلدی سے مسکرا دی۔ اس اداکاری پر وہ رنجیدہ سا ہو گیا۔

”سوری جان! میں شاید تمہارے قابل ہی نہیں، در بدر کی ٹھوکریں کھلا رہا ہوں، تمہیں تمہارا حق نہیں دے پا رہا۔“

”فرحان! میں نے کچھ کہا ہے کیا؟“

”مجھے معلوم ہے، تم کبھی خود سے کچھ نہیں کہو گی اور میں تماشا بنانا رہوں گا۔“ وہ بہت شرمندہ تھا۔

”فرحان! بیوی بننا، ماں بننا اور محبت بننا اگر تماشا ہے تو مجھے یہ تماشا پسند ہے۔ آپ جو کہو گے میں کرنے کو تیار ہوں۔ میرے لیے یہ اثاثے ہی کافی ہیں۔“ وہ دھیرے دھیرے بولتی چلی گئی فرحان نے محبت سے اسے دیکھا۔

”یہاں سے دیوار کے پیچھے ہی تو جا رہی ہوں۔ میں بہت خوش ہوں کہ تمہارے ساتھ ہوں۔“ اس نے رسان سے کہا۔

”لیکن کیوں؟ تمہیں ایک پل بھی میں خود سے دور نہیں رکھ سکتا۔“ وہ جذباتی ہو گیا۔

”فرحان! پلیز اب جاؤ، کسی نے دیکھ لیا تو۔“

”دیکھنے دو۔“

”یہ گلدستہ میرے لیے ہے تو مجھے دو۔“ گلدستہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے جان بوجھ کر اس کی توجہ دوسری طرف منتقل کی۔ وہ چونکا اور گلدستہ اس کی طرف بڑھایا۔

”سمجھ لو دیوار کے اس پار میرا دل جا رہا ہے میں جتنی بار وہاں آؤں تم نے میرے سامنے رہنا ہے۔“ وہ بولا۔

”اور زرتاشیہ کیا سوچے گی؟“ اس نے چھیڑا۔

”جو بھی سوچے۔“

”اس طرح تو میں اور زیادہ گناہ گار ہو جاؤں گی۔“ وہ افسردہ ہو گئی۔

”اس کو میں نے نہیں چُنا تھا۔“ وہ بگڑا۔

”اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی باہر سے مختلف ملی جلی آوازیں آنے لگیں۔

سامعہ کا رنگ فق ہو گیا۔ فرحان وہیں ڈٹا رہتا، مگر اس نے ہاتھ جوڑے تو وہ



واش روم میں گھس گیا۔ دوسری طرف سے زرتاشیہ، زبیر احمد اور اماں جان کمرے میں داخل ہو گئے۔

”واہ کتنے خوب صورت پھول ہیں۔“ زرتاشیہ نے سامعہ کے ہاتھ میں گلدستہ دیکھ کر خوشی سے کہا۔

”اچھا آپ کو اچھے لگتے ہیں۔“ سامعہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”بھئی سامعہ بیٹا ہماری زرتاشیہ کو پھول، شعر و شاعری اور موسیقی سے تو عشق ہے۔ ابھی آپ کے لیے خوب صورت پھول سجا کر آئی ہے۔“ زبیر احمد اتنے عرصے میں پہلی بار اس سے مخاطب ہوئے تھے۔

”اور آپ کو سامعہ یہ پھول کس نے دیے۔“ زرتاشیہ نے شرارتاً پوچھا۔

”وہ“ وہ انکل لائے تھے۔ میں نے منگوائے تھے آپ کے لیے۔“ سامعہ بری طرح بوکھلا گئی۔ مگر بات سنبھالنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

”واقعی!“ زرتاشیہ کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ زبیر احمد بیٹی کی خوشی پر خوش ہو گئے۔

”بھئی یہ میاں افتخار بھی خوب ہیں“ کل سے دوائیں لانے کا کہا ہوا ہے وہ یہ لائے نہیں پھول لانے یاد رہ گئے۔“ اماں جان نے شاید غیر دانستہ طور پر کہا۔ مگر سامعہ شرمندہ ہو گئی۔

”اماں جان! گھر سے باہر ایک سو ایک کام ہوتے ہیں۔“ زبیر احمد نے ماں کو سمجھانے کے لیے کہا۔

”ہاں میں کچھ دیر میں آتی ہوں۔“ وہ ہکلائی۔

”بھئی چلو ہماری بیٹی بڑی چاہ سے لینے آئی ہے۔“ زبیر احمد نے اصرار کیا تو سامعہ اُلجھن کا شکار ہو گئی۔ فرحان واش روم میں تھا اور زرتاشیہ نے گھیرا تنگ کر دیا تھا۔ بادل خواستہ وہ دھیرے دھیرے ان کے ساتھ چل کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ دل کی باتیں دل میں لے کر۔ بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پیانگھر سے جدا ہو رہی ہے۔ دیوار سے پرے ہی سہی، چند قدموں کے فاصلے

پر ہی سہی دوری تو دوری تھی۔ دل میں نمکین پانی سا بھر گیا۔ کتنی عجب قسمت پائی تھی اس نے، سچ کہتی تھیں مسز جیری کہ یہ جوا بہت مشکل میں ڈال دیتا ہے۔ اس نے دل ہی کو مورد الزام ٹھہرایا اور خود کو تسلی دی۔

☆...وؤ...☆

زرتاشیہ کی بے پناہ محبت نے اسے مبہوت اور متفکر سا کر دیا جس ماحول میں اسے کھانا کھلایا، آؤ بھگت کی، وہ قابل قدر تھی۔ زبیر احمد بھی بڑے خوش گوار موڈ میں ان دونوں سے باتیں کرتے رہے۔ جب وہ اٹھ کر گئے تو سامعہ کی میڈیسن کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے زرتاشیہ سے کہا، وہ سچے سنورے اپنے برابر والے کمرے میں اسے لے آئی۔ اس کا سب سامان سیٹ تھا۔ زرتاشیہ چند منٹ کی اجازت لے کر باہر گئی تو وہ اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ زندگی کا بالکل نیا انجانا موڑ جہاں زرتاشیہ کی گاڑی رُکی ہوئی تھی اور سامعہ کی گاڑی اوور ٹیک کرنے کے بعد بھی وہیں ٹھہر گئی تھی۔ اس کے برابر فرق اتنا تھا اس کے ہاتھ اسٹیرنگ پر تھے اور زرتاشیہ کا پائوں بریک پر تھا۔

”اے خدا! یہ کس دوراہے پر میں آگئی ہوں۔“ وہ رنجیدگی سے بڑ بڑائی، تبھی میاں افتخار آگئے وہ انہیں یوں اچانک دیکھ کر کچھ گڑ بڑا سی گئی۔

”واہ! پھول ہم سے منسوب کر کے بیگم صاحبہ کی چبھتی ہوئی نظروں کا شکار بنا دیا۔“ حسبِ عادت وہ خوش گوار موڈ میں بولے۔ وہ لمحے کے توقف کے بعد فوراً سمجھ گئی کہ انہوں نے کیا اور کیوں کہا ہے۔

”سوری انکل!“ وہ بے ساختہ کہہ گئی۔

”اوہ ہنہ سامعہ! بابا کہو۔“ وہ برامان گئے۔

”ابھی نہیں ابھی تو انکل سے بابا تک کا سفر طے کرنا ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔

”وہ کچھ دیر خاموش رہ کر گویا ہوئے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہو“ شاہدہ بیگم اور اماں جان نے فرحان کی شادی کی ٹھان لی ہے۔ ٹال مٹول دیکھیں کب تک چلتی ہے۔ دوسری طرف فرحان بہت ضدی اور جذباتی ہے۔“

”میری وجہ سے آپ مشکل کا شکار ہیں“ میں ندامت محسوس کر رہی ہوں، ایک طرف آپ لوگ ہیں دوسری طرف زرتاشیہ ہے، جو بے لوث محبت کرتی ہے اس کی محبت کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔“

”بیٹا سب باتیں اپنی جگہ درست، مگر آپ کو فرحان کو سمجھانا ہے کہ ابھی وہ بزنس میں دلچسپی لے، زبان کھولنے سے گریز کرے۔ ہاتھیوں کی لڑائی میں فصلوں کا نقصان ہوتا ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی شاہدہ بیگم نے عندیہ دیا ہے کہ پہلے فرحان کی شادی ہوگی تانیہ کی بعد میں، میں نے فرحان اور تانیہ کی اکٹھے شادی کا مشورہ دیا ہے، مگر آپ جانتی ہو ہمارے مشورے کی حیثیت۔“

”انکل! مجھے آپ جو کہیں، فرحان جو بھی فیصلہ کریں منظور ہے، اس گھر میں کوئی انتشار پیدا کرنا نہیں چاہتی۔“

”پریشانی مسئلے کا حل نہیں فی الحال فرحان کو جذباتیت سے دور رکھنا ہے۔ ماں کا لاڈلا ضرور ہے، مگر ماں اپنی ماں کی فرمانبردار بیٹی بھی ہیں۔“ وہ قدرے شرارت آمیز انداز میں بولے تو وہ سنجیدگی کے باوجود مسکرا دی۔

”یہاں اپنا بہت خیال رکھنا یہ گھر بھی اپنا ہے۔“

”انکل!“

”پھوپا جی! کیا یہ آپ کو کہنے کی ضرورت ہے۔ میرے ہوتے ہوئے۔“

”عین اسی وقت زرتاشیہ گرم دودھ کا گلاس سامعہ کے لیے لائی۔“

”ہر گز نہیں، ہمیں معلوم ہے ہماری زرتاشیہ بیٹیا بہت اچھی مہمان نواز ہیں۔“

میاں افتخار نے کہا۔

”پھوپا جی! یہ تو آپ کا احسان ہے کہ آپ نے اتنی اچھی سی سامعہ جی کو میرے پاس بھیجا۔ میں تنہائی سے تنگ آگئی تھی۔“ زرتاشیہ اُداس ہو گئی۔

”ہاں بیٹا! کاش کوئی آپ کی ماما کو سمجھاتا۔“ وہ دُکھی سے ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

”ویسے ہم سب کو کوشش تو کرنی چاہیے۔“ سامعہ نے کہا۔

”چھوڑیں سامعہ جی! آپ یہ دودھ پیئیں۔“ زرتاشیہ نے بھیگے لہجے پر کنٹرول کیا۔

میاں افتخار گڈ نائٹ کہہ کر چلے گئے اور وہ دونوں بیڈ پر لیٹ کر دھیرے دھیرے باتیں کرنے لگیں۔ کسی نہ کسی حوالے سے زرتاشیہ فرحان کا ذکر کر دیتی سامعہ چپ ہو جاتی، یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہا۔ تقریباً سوا بارہ بجے زرتاشیہ اسے شب بخیر کہہ کر رخصت ہو گئی۔ سامعہ اندھیرے میں بھی کھلی آنکھوں سے چھت کو گھورتے گھورتے رات کے آخری پہر سو سکی۔

☆...وؤ...☆

رات سو تو فرحان بھی نہیں سکا تھا۔

زندگی یوں سلجھتے سلجھتے اور الجھتی جائے گی۔ یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ جس قدر سامعہ کو جلد اس کی جگہ دلانے کا یقین تھا اتنا ہی وہ دور کر دی گئی تھی۔ اب جب کہ سامعہ کو اس کی اشد ضرورت تھی وہ تنہا ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اسے بہت آرام اور اچھی خوراک کی ضرورت تھی، مگر کوئی اس پر ٹھیک سے دھیان نہیں دے پا رہا تھا۔ ساری رات اس نے کروٹیں بدلتے گزار دی تھی۔ دماغ پھٹ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ ایسے میں ناجی نے آکر ناشتا لگنے کی اطلاع دی تو وہ پھٹ پڑا۔

”نہیں کرنا مجھے ناشتا واشتا جا کر کہہ دو۔“

”ناجی اٹے قدموں چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں پھر آئی اور بولی۔

”بڑی بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ دوبارہ ناشتا بنے گا اور نہ چائے۔“

”زہر تو ملے گا۔“ وہ غصے سے چلا لیا۔

ناجی نے آکر اس کا جملہ سنا دیا۔ میاں افتخار کے گلے میں چائے بھی پھنس سی گئی۔ اماں جان نے ابرو چڑھائے، شاہدہ بیگم اپنی جگہ سے اٹھیں۔ تانیہ بے تعلق سے بیٹھی چائے پیتی رہی۔

”بیٹھ جائو، کہاں سرکش گھوڑے کو لگام دے پائو گی۔“ اماں جان نے انہیں روکا۔

”کوئی وجہ تو ہوگی؟“ شاہدہ بیگم نے آہستہ سے کہا اور چلی گئیں۔

”شکر ہے ماما کو خیال تو آیا۔“ تانیہ نے سلگتا ہوا جملہ اُچھالا۔

”لو بھئی، شاہدہ بیگم لے لیں انعام کا ٹکا، اولاد کا دم بھرنے والی کو اولاد یہ کہے۔“ اماں جان نے طنز سے کہا۔

”انہیں ملازمت کے اور آپ کے دم بھرنے سے فرصت ملے تو کچھ اور کریں۔“ تانیہ کب باز آنے والی تھی، اماں جان تمللا اٹھیں۔

”ارے لڑکی مت ہماری زبان کھلوائو۔“

”تانیہ بیٹا بد گمانی ہر چیز کو اپنی ملکیت سمجھ کر نگل جاتی ہے۔“ پہلی بار میاں افتخار نے براہ راست تانیہ کو ٹوکا۔

”بابا! آپ کھلی حقیقتوں کو بد گمانی کہتے ہیں۔ ہم ترس گئے ہیں کہ کبھی ماما اپنے ہاتھوں سے ہمارے لیے کچھ پکائیں۔ اپنے بچوں کو پیار بھرے ماحول میں جینے کا موقع دیں۔ ہم کٹھ پتلیاں ہیں، دوسروں کی مرضی پر زندہ۔“ تانیہ تننتاتی ہوئی کہہ کر چلی گئی۔ تو اماں جان کی توپ کا رخ میاں افتخار کی طرف ہو گیا۔

”میاں! ابھی کچھ نہیں بگڑا، بہت دیر ہوگئی تو پچھتاؤ گے۔“

”ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ وہ ہکلائے۔

”عزت سے رخصت کرو اپنی جان چھڑائو۔“ وہ بولیں۔

”جی بالکل! بھائی میاں اور بھابی نے تو تیاری شروع کر دی ہے۔“

”ادھر زبیر بھی تیار بیٹھے ہیں کہ کسی طرح یہ شادیاں ہو جائیں۔“



”بس فرحان کا بزنس سیٹ ہو جائے۔“ انہوں نے دُکھتی رگ پر دھیرے سے ہاتھ رکھا، مگر درد پھر بھی ان میں شدت سے جاگا۔

”بھئی بزنس کی بات ہے، ہم کہیں سرائے میں بیٹھے ہیں، غیروں کی بچی لا رہے ہیں کیا؟ بچی بے چاری تنہا ہوگئی ہے جتنی جلدی ممکن ہو، بس شادی ہو جائے۔“ اماں جان نے صاف صاف کہا۔

”اب تو تنہائی کی بات نہ کریں۔ سامعہ اس کے پاس ہے، عنقریب بچہ آجائے گا تو اور رونق ہو جائے گی۔“ میاں افتخار نے جلدی سے موضوع بدلا۔

”یہ سامعہ کوئی گھر کا فرد نہیں ہے اور کیا معلوم کب وہ چلی جائے؟ تم نے اُس بچے تک کا سوچ لیا۔“

”فی الحال تو ہے، جانے کب اس کا شوہر ملتا ہے؟“ وہ نظریں چراتے ہوئے بولے۔

”کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں کہ کہیں اس کا شوہر مرا تو نہیں گیا۔“

”ارے ارے اللہ نہ کرے، وہ زندہ سلامت ہے۔“ وہ ایک دم جذباتی ہو گئے۔

”تمہیں یہ کیسے یقین ہے؟“ انہوں نے کریدا۔

”وہ جو معلومات مل رہی ہیں ان سے یہی اندازہ ہوتا ہے۔“ وہ یہ کہہ کر وہاں سے تقریباً بھاگ کھڑے ہوئے۔

☆...وؤ...☆

شاہدہ بیگم کو ٹال کر انہوں نے اپنی عادت کے خلاف کام کیا تھا۔

مگر روح میں ایک بے قراری ایک اضطراب تھا۔ ماں کے پوچھنے پر دل تو چاہا تھا کہ سب کچھ بتا دے، مگر جانے دل کے کس کونے سے بابا اور سامعہ کی محبت بھری ”نہ“ محسوس ہوئی اور وہ ٹال گیا، مگر سامعہ کے پاس آنے سے وہ خود کو روک نہ سکا۔ بابا، ماما کے جاتے ہی نظر بچا کے وہ اس طرف آگیا۔

سامعہ کو زرتاشیہ نے اپنی ڈائری دے دی تھی تاکہ وہ شاعری کے خوب صورت شاہ کاروں سے دل بہلاتی رہے۔ سامعہ کو بھی شاعری سے بہت لگاؤ

تھا۔ زرتاشیہ کے پاس معروف شعراء کے دیوان تھے۔ اس کا ذوق بہت اعلیٰ تھا۔ سامعہ نے دل ہی دل میں داد دی۔ ایک صفحے پر اس کی نظریں جم گئیں۔ زرتاشیہ گویا ہم کلام تھی۔

کشتی بھی نہیں بدلی

دریا بھی نہیں بدلا

اور ڈوبنے والوں کا

جذبہ بھی نہیں بدلا

ہے شوقِ سفر ایسا ایک عمر سے اسے یارو!

منزل بھی نہیں پائی، رستہ بھی نہیں بدلا

”زرتاشیہ تمہارا ذوقِ جنوں اور جنونِ عشق کی تاثیر میں کہاں کمی رہ گئی کہ فرحان تم سے دور ہو گیا۔ کاش! تمہیں وہ تاثیر حاصل ہو جاتی، محبوب کا دل تمہارے احساس میں سمٹ جاتا، یہ لفظ افسوں بن جاتے، یہ کلمے منتر بن

جاتے، تم مجھ سے بدل جاتیں۔“ وہ خود سے باتیں کر رہی تھی، فرحان نے کمرے میں قدم رکھے تو وہ چونکی۔ ڈائری بند کر کے میز پر رکھی اور اٹھ بیٹھی۔

”اس ڈائری میں ایسا کیا ہے جو آپ اس سے باتیں کر رہی تھیں؟“ وہ ڈائری اٹھاتے ہوئے بولا۔

”یہ ڈائری نہیں زرتاشیہ ہے جس کا عشق شاعری میں ڈھلا ہے۔“ وہ سادگی سے بولی۔ فرحان نے جلدی سے ڈائری واپس رکھ دی اور بیٹھ گیا۔

”میں یہاں زرتاشیہ کی ڈائری پر بات کرنے نہیں، آپ سے ملنے آیا ہوں۔“

”فرحان! آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے۔ کچھ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔“

”یہ بھی زرتاشیہ کی ڈائری میں لکھا ہے یا کسی نے ڈکٹیٹ کرایا ہے۔“ وہ کچھ اکھڑا اکھڑا سا بولا۔

”فرحان! پلیز شک نہیں۔“

”تم پر شک نہیں، مگر حالات موافق نہیں اس لیے، یہ ٹینشن ہے۔“

”دھیرے دھیرے بہتری آتی ہے، ٹینشن کیوں؟“ سامعہ نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ خوش ہو گیا۔

”سامعہ! میں ڈرتا نہیں ہوں۔ میں ماما کو بتا دینا چاہتا ہوں۔“

”نہیں، آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے، رشتے بھرم سے بنتے ہیں، ماما کی پوزیشن نظر میں رکھو، یہ ان کے لیے آپ کی خواہش کا احترام نہیں، بلکہ شدید صدمہ بن جائے گا۔ وہ اپنوں سے نظر نہیں ملا سکیں گی۔“

”ایسا تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی ہے، کیونکہ میں اس گھر کے قاعدے قانون سے واقف ہوں۔“ وہ طویل سرد آہ بھر کے بولا۔

”تو ایسا بالکل نہ کریں۔“

”وہاٹ؟ پھر، پھر کیا اسی طرح زندگی بسر کریں، تم یہاں زرتاشیہ کے رحم و کرم پر رہو وہاں میری شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس خاموشی کا مطلب ہے میں تم سے جدا رہوں۔“ وہ چلا اٹھا۔

”ہش! دھیرج، فرحان پلیز میری خاطر کچھ عرصے، جب تک بابا کہیں آپ خاموشی میں عافیت سمجھیں۔“ وہ نروس ہو گئی۔

”خاموشی، خاموشی، خاموشی۔ یہ خاموشی نیم رضا مندی سمجھی جائے گی۔ اپنے آپ پر یہ ظلم نہ کرو سامعہ، مجھے معلوم ہے بابا کچھ نہیں کر سکیں گے۔ یہ جرأت میں ہی دکھا سکتا ہوں۔“

”فرحان! پلیز میرے کہنے کی لاج رکھ لیں، جب بولنا ہوگا تو میں خود آپ سے کہوں گی، پلیز گھر کا سکون خراب نہ کریں۔“ اس نے تقریباً ہاتھ جوڑ دیے۔ اس نے ہاتھ تھام لیے ہلکے سے دبائے اور پھر دھیرے سے بولا۔

”سامعہ! ہم نے یوں زمانے کے ہاتھوں کھلونا بننے کے لیے تو محبت نہیں کی، ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ لوگوں کی پسند نا پسند کے لیے تو نہیں تھاما تھا۔“

محبت کے لیے کبھی حالات سازگار نہیں ہوتے، ہم نے تو وہ محبت کی ہے جس میں تمہارے میرے سوا کوئی نہیں آتا۔ پھر یہ کمپرومائز یہ خاموشی کیوں؟“

وہ ٹکر ٹکر اسے دیکھ رہی تھی، وہ پوچھ رہا تھا ایسا سوال جس کا جواب اس کے ذہن میں موجود تھا، مگر وہ لب نہ ہلا سکی۔

”بولو سامعہ!“ اس نے پھر پوچھا۔

”فرحان! محبت بلند نگاہی بھی عطا کرتی ہے، بڑی دور تک دکھاتی ہے، اسے محدود بھی تو نہیں کر سکتے، پلیز کچھ صبر اور انتظار۔“ سنجیدہ انداز میں بات کرتے کرتے وہ ہولے سے مسکرائی۔ تو وہ خاموش ہو گیا اس کی بات کی گہرائی میں کافی اثر تھا۔

”اب جائو، زرتاشیہ میرے لیے فریش جوس بنانے گئی ہے۔“

”زرتاشیہ جوس بنا کر لا چکی ہے، ایک نہیں تین گلاس۔“ اسی لمحے ٹرے میں تین پائن اپیل فریش جوس کے گلاس لیے وہ آگئی۔ ہمیشہ کی طرح ہنستی مسکراتی۔ فرحان بڑے سلیقے سے اٹھ کر جانے لگا تو سامنے آگئی۔

”ارے واہ! یہ جوس کون پیئے گا؟“

”میں یہاں جوس پینے نہیں آیا، بلکہ سامعہ جی کی ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ ہے یہ بتانے آیا تھا۔“ اس نے ایک دم ہی جھوٹ گھڑ لیا۔

”یہ کس نے پوچھا کہ آپ کیوں آئے تھے؟ میں نے آپ کو آتا دیکھ کر جوس بنایا اور بس۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”پی لیجیے۔“ سامعہ نے مداخلت کی۔

”اسے زبردستی کہتے ہیں۔“ وہ چاروناچار صوفے پر بیٹھ گیا۔

”شکریہ۔“ وہ اٹھلائی۔

”بہت خوش ہو۔“ فرحان نے سامعہ کی طرف دیکھ کر زرتاشیہ سے پوچھا۔

”ہاں بہت خوش‘ سامعہ جی کے آنے سے گھر میں بہار آگئی۔“

”ان کا ٹھیک سے خیال رکھنا۔“ گلاس خالی کر کے ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ تو مجھے بہت عزیز ہیں۔“

”زرتاشیہ کے سراپا میں اتنی اپنائیت ہے کہ جس کی تعریف ممکن نہیں۔“

سامعہ نے تائید کی تو فرحان نے شرارت سے دائیں آنکھ دبا کر سامعہ کو ذومعنی اشارہ دیا۔ ایک دم اٹھا اور چلا گیا، لیکن اس کے جانے میں نہ خوشی تھی اور نہ اطمینان، نہ شکوہ تھا اور نہ احتجاج، بظاہر اس نے سامعہ کی بات مان لی تھی۔ سامعہ کچھ اُداس سی ہوگئی۔ فرحان کا کہاں قصور تھا؟ وہی تو کچھ سے کچھ بنتی جا رہی تھی۔ حالات کس رخ پر جا رہے تھے اس کا خوف اسے مضطرب کیے ہوئے تھا۔ زرتاشیہ نے اس کے چہرے کے اُتار چڑھائو کو دیکھ کر شوخ سے انداز میں چھیڑا اور خوب صورت سی غزل حسبِ حال سنانے لگی۔ ”سامعہ جی! ملاحظہ فرمائیے۔“

ہجر میں خوب رلاتے ہو، کہاں ہوتے ہو

لوٹ کر کیوں نہیں آتے، کہاں ہوتے ہو

مجھ سے نکچھڑے ہو تو محبوبِ نظر ہو کس کے

آج کل کس کو مناتے ہو، کہاں ہوتے ہو

شام کی تنہائی میں اکثر یہ خیال آتا ہے

اپنے دُکھ کس کو سناتے ہو، کہاں ہوتے ہو

”کیوں ہے ناں آپ کے حسبِ حال؟“ سامعہ سے پوچھا تو وہ کرب سے مسکرا دی۔

”کچھ ایسا حال ہے کہ کچھ بھی حسبِ حال نہیں۔“

”سامعہ جی! آپ کو بھائی جان بہت یاد آتے ہوں گے، بھلا کیا نام ہے آپ نے بتایا ہی نہیں۔“

”جو ہر وقت ساتھ ہو اس کی یاد نہیں آتی۔“ وہ بولی۔



”پھر بھی، اچھا نام تو بتائیے۔“ وہ سر ہو گئی۔

”نام، میرے لیے تو فقط جان ہیں وہ۔“ محبت سے چور لہجے میں فقط اتنا ہی کہہ سکی۔

”گڈ، ویری گڈ، آپ کو بتائوں فرحان کو دل ہی دل میں، میں بھی جان ہی کہتی ہوں۔“ اس نے شرما کر آہستہ سے بتایا اور سامعہ کا دل مٹھی میں لے لیا۔ وہ ہونق سی اسے دیکھتی رہ گئی۔

”دل میں کیوں؟“ کچھ دیر بعد خود پر ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

”سامنے کہتے ہوئے ڈر بھی لگتا ہے اور ابھی وقت بھی نہیں آیا۔“ وہ لجاسی گئی۔

”اس کا مطلب ہے کہ دل کو شرمسار کرتی ہو۔“ اس نے دھیرے سے کچھ اس طرح کہا کہ زرتاشیہ صاف سن نہ سکی۔

☆...وؤ...☆

جونہی گلریز صاحب کی جیپ پورچ سے باہر نکلی۔ نرگھس نے اپنے کمرے کی کھڑکی کا پردہ برابر کر کے جلدی سے افراسیاب کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ اپنی رائٹنگ ٹیبل پر جھکا کچھ فائلیں دیکھ رہا تھا۔

”افراسیاب! ایک چھوٹا سا کام کیا کہہ دیا تم تو بات کرنے سے بھی گئے۔“

”بدتمیز تو شاید میں ہوں، لیکن بھلکڑ نہیں ہوں۔ آپ کا کام میرے ذہن میں ہے۔ بس وکیل صاحب سے رابطہ نہیں ہو سکا۔“ وہ فائلیں بند کر کے کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”بہت دن ہو گئے ہیں۔ زبیر احمد اس کو میری ناکامی سمجھے گے۔“ وہ بولی۔

”زبیر انکل کو شاید آپ یاد بھی نہ آتی ہوں۔“

”تو یہاں کون ان کے لیے مرا جا رہا ہے، مجھے تو بس زرتاشیہ کا خیال آجاتا ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔

”چھوڑیں زرتاشیہ کو، آپ صرف اپنا خیال رکھیں۔ ویسے بھی فیصلہ تو آپ نے کر لیا ہے۔“ وہ بولا۔

”وکیل صاحب نوٹس بھیجیں گے تو کچھ ہوگا۔“

”فیصلے تو دلوں کے ہوتے ہیں۔ یہ وکیل شکیل تو بس کاغذی کارروائی کرتے ہیں۔“

”زرتاشیہ بھول کر بھی مجھے فون نہیں کرتی۔“

”تو آپ کر لیا کریں۔“

”کیوں؟ میں اس کی ماں ہوں، وہ باپ کے پاس رہ کر مگن ہے تو میں فون کیوں کروں؟“ وہ بگڑی۔

”فون تو آپ کریں گی کیونکہ آپ اسے بہت مِس کریں گی۔“

”افراسیاب کچھ ایسا کرو کہ زرتاشیہ سب کچھ چھوڑ کر میرے پاس آجائے۔“

وہ ایک دم جذباتی ہو گئی۔ افراسیاب ہنسنے لگا۔

”صاف پتا چل گیا کہ آپ اسے بہت یاد کرتی ہیں۔“

”شاید، بس میری خواہش ہے کہ وہ میرے پاس آجائے۔“

”ابھی ضد ہے اسے خواہش بننے میں وقت لگے گا اور پھر یوں بھی ہو سکتا ہے

کہ وہ خود چل کر آجائے۔“ وہ بہت وثوق سے بولا۔

”افراسیاب! زرتاشیہ بہت اچھی ہے۔“

”جانتا ہوں، مگر وہ اچھا اوروں کو سمجھتی ہے۔“

”یہی تو دکھ ہے۔“

”تو آپ انکل سے صلح کر لیں۔“

”ہر گز نہیں۔“ وہ چلائی۔

”پھر زرتاشیہ کو بھی بھول جائیں۔“

”اگر اس نے باپ کا ساتھ دیا تو بھول جائوں گی۔“

”نہیں“ یہ جھوٹ ہے ہم جنہیں یاد رکھنا چاہتے ہیں انہیں ہی بھولنے کا ارادہ کرتے ہیں، بہر کیف میں آپ کے وکیل صاحب کو پیغام دوں گا۔“ وہ کافی اپنائیت سے کہہ کر باہر نکلا تو انجم نے گھیر لیا۔

”یہ کیا کہانی چل رہی ہے، پھوپھی بھتیجے میں...؟“

”پھوپو کی نادانیاں اور بھتیجے کی دانائیاں۔“ اس نے مزاح پیدا کیا۔

”مذاق نہیں۔“

”کچھ نہیں بس زرتاشیہ کو یاد کر رہی تھیں۔“ وہ ٹال گیا۔

”حیرت ہے۔“ انجم بولیں۔

”ضد میں ایک ماں جاگ رہی ہے۔“

”اللہ ہدایت دے نرگھس کو۔“

”چلیں چھوڑیں، آپ فکر مند نہ ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر رُکا پھر مزید بولا۔  
”میں نے ڈاکٹر سے ٹائم لیا ہوا ہے آپ کو ٹھیک شام چھ بجے تیار رہنا ہے۔“

”نرگھس کو سمجھائو آگ کا کھیل گھر جلا کر نہیں کھیلنے، پیاری سی معصوم سی زرتاشیہ کا ہی خیال کرے۔“

”واہ! آپ نے اس پیاری سی معصوم سی زرتاشیہ کا خیال کیوں نہیں رکھا۔“  
اس نے براہ راست انجم کی آنکھوں میں جھانکا۔

”اس کا موقع اماں جان نے نہیں دیا اور آپ کی بات سمجھ میں اب آئی ہے۔“ انجم نے ہولے سے اس کے گال پر چپت لگاتے ہوئے جواب دیا۔

”خیر، وہ جہاں رہے خوش رہے۔“ وہ بڑے خلوص سے کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

انجم کو اس کا مخلصانہ دعائیہ انداز بہت اچھا لگا۔

”گلریز! آپ تو بلا وجہ میرے بیٹے کو نا سمجھ اور غیر ذمہ دار کہتے ہیں۔“  
انہوں نے خود کلامی کے ذریعے ہی شوہر کی شکایت رفع کرنے کی کوشش کی۔

☆...وؤ...☆

”وہاٹ! تم امریکا میں ہی رہ گئے اور میں...“ وہ تقریباً چلا اٹھی۔

”اور میں“ یہ تمہارا انداز نہیں بدلا۔“ خرم نے دوسری طرف سے شوخی کے ساتھ پوچھا۔

”خرم! خرم تمہیں مذاق سوچھ رہا ہے۔“

”یار! بات سنو“ میں اپنی مرضی سے یہاں رکا ہوں۔ امریکا سے واپس آنے کو دل چاہ سکتا ہے کیا؟ مام ڈیڈ نے اجازت دے دی، بلکہ میں یہاں آفس میں بیٹھا ہوں۔“

”اور میرے بارے میں کیا سوچا؟“ وہ دھاڑی۔

”آہستہ“ کان کے پردے پھاڑ دیے۔ بھئی تمہارے بارے میں اور کیا سوچوں؟  
یہ کام تو تمہارے اس منگیتر نے سنبھال رکھا ہے۔“ وہ ہنسا۔

”شٹ اپ! تم بے کار باتیں مت کرو“ مجھے اپنے پاس بلانا ہے کہ نہیں۔“

”ویکم اپنی ٹائم مائی ڈیئر“ مگر آؤ گی کیسے...؟“

”اپنے مام ڈیڈ سے بات کرو۔“

”یار پہلے تم اس سے چھٹکارا تو پالو“ پھر میں مام کو کہہ دوں گا۔“

”مجھے لگتا ہے تم کچھ نہیں کرنے والے۔“

”اچھا“ تم میں جرأت ہے تو اپنے گھر والوں کو بتاؤ، میں مام سے بات کرتا

ہوں، وہ تمہاری طرف آجائیں گی اور بس۔“

”سچ۔“ اسے یقین نہ آیا۔

”ہاں! لیکن مجھے معلوم ہے یہ اتنا آسان کام تمہارے لیے نہیں ہوگا۔“ اس

نے خدشہ ظاہر کیا۔

”تو میں سب کو چھوڑ کر تمہارے پاس آجائوں گی۔“ اس نے جذباتی ہو کر کہا۔

”کس کے لیے؟“ معصومیت سے پوچھا گیا۔

”تمہارے لیے۔“ وہ بولی۔

”لیکن یہاں کوئی کسی کے لیے نہیں ہوتا یہ امریکا ہے۔“ وہ خاصی سنجیدگی سے بولا۔

”اس لیے اتنے دن فون نہیں کیا۔“

”یہ رینٹیٹی ہے، یہاں تو کبھی کبھی مجھے خود کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔“ وہ بولا۔

”تم ایک بار آجائو، پھر جیسے بھی حالات ہوں گے میں تمہارے ساتھ جائوں گی۔“

”واہ! کیا بے وقوفی ہے، پہلے میری گنجائش تو نکالو، تمہاری نانہ مجھے کچا چبا جائیں گی۔“

”ہم بنا بتائے چلیں گے۔“

”یہ بزدلی مجھ سے نہیں ہوگی۔ جب میرا راستہ کلیئر کرلو تو بتا دینا۔“ وہ سادگی سے بولا۔

”میں بور ہوگئی ہوں کوئی سہیلی ہے نہ دوست، گھر میں کسی سے گپ شپ نہیں ہوتی، بس تم ہی تم ہو۔“

”میں یہاں، ریکی، شمل اور جولی کو تمہارے بارے میں بتاتا رہتا ہوں۔“

”یہ کون ہیں؟“ ایک دم ہی وہ چونکی۔

”دوست ہیں۔“

”دوست، یو مین تم نے میرے علاوہ بھی...“ وہ رو دی۔



”او یار پلیز! کیا احمقانہ حرکت ہے، یہ تو یہاں کا معمول ہے کیوں فکر مند ہوتی ہو، وی آر گڈ فرینڈ۔“ خرم نے جلدی سے سمجھایا۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ میں کیا کروں؟“

”ویسے تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”میں صرف عادل سے نجات چاہتی ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔“ بے دھڑک اس نے کہا۔ دوسری طرف خرم ہنسنے لگا۔

”کیوں ہنس رہے ہو؟“

”کچھ نہیں پاگل لڑکی تم خلا میں ہو، زمین پر قدم رکھو تو بتانا، بائے۔“ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ وہ اس بے بسی پر تقریباً آنسو بہانے کے قریب تھی کہ کمرے سے باہر کے شور و غل نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ فون رکھ کے باہر نکل آئی۔

☆...وؤ...☆

ان کے تخت کے گرد اچھا خاصا رش تھا۔

میاں افتخار، شاہدہ بیگم، زرتاشیہ، سامعہ، ناجی اور تانیہ بھی وہیں آگئیں۔ ایک نوجوان معقول شکل صورت والا، نیلی جینز پر قمیص پہنے، اماں جان کے عین سامنے کھڑا تھا۔ وہ بغور سر سے پیر تک جائزہ لے رہی تھیں۔

”بکرا پسند آگیا ہے تو بٹھا دوں۔“ میاں افتخار نے حسبِ عادت مسکرا کر پوچھا۔

”افتخار! پلیز اماں جان کو فیصلہ کرنے دیں۔“ شاہدہ بیگم نے کہا۔

”کیسا فیصلہ؟ کہ بکرا کب قربان کرنا ہے۔“ میاں افتخار نے معصومیت سے پوچھا۔

”ارے کہاں ہے بکرا، کون سا بکرا افتخار میاں؟“ اماں جان نے کڑک دار لہجے میں پوچھا۔

”وہ“ وہ میں شوکت عرف شوکی کی بات کر رہا تھا۔ آپ اسے قربانی کے بکرے کی طرح جانچ رہی تھیں اس لیے۔“ میاں افتخار نے اس طرح کہا کہ سب کے ساتھ شاہدہ بیگم بھی زیر لب مسکرا دیں۔

”بھئی گھر کا ملازم تو پھر ملازم ہوتا ہے، گھر میں کوئی جانور بھی رکھنا ہو تو دیکھ بھال کے رکھتے ہیں۔“ وہ بولیں۔

”بڑی بیگم صاحبہ“ یہ ٹھیک ہے پورا دکھائی دے رہا ہے اسے رکھ لیں۔“ ناجی جھٹ بولی تو اماں جان نے اسے گھور کے دیکھا۔ اور لتاڑا۔

”ہاں“ تجھے اپنا اُلوہ سیدھا کرنے کی پڑی ہے۔ لگی سفارش کرنے۔“

”تو رکھ لیں، مسئلہ کیا ہے؟“ تانیہ نے حسبِ عادت اکتا کر کہا۔

”لو بھئی تانیہ بی نے بھی ووٹ دے دیا اب تو ہم تمہیں رکھ ہی لیتے ہیں۔“

اماں جان نے پہلی بار تانیہ کی بات پر رضا مندی کا اظہار کیا۔

”اس کا مطلب ہے لڑکا پسند آگیا۔“ میاں افتخار بولے۔

”میاں جی! ملازم کو انسان بنائو، پہلے یہ پینٹ پر شلوار کی قمیص، کوئی عقل بھی دو اور اوپر اسٹور کے ساتھ والا کمرہ ہے اس کا، کتنے بچے اٹھنا ہے، کتنے بچے کون سا کام کرنا ہے، یہ ناجی بتا دے گی۔“ اماں جان نے براہِ راست شوکی کو کہا، وہ سر جھکائے ہاتھ باندھے سب کے سامنے کھڑا تھا۔

”یہ اس جیل کی داروغہ ہے۔“ تانیہ نے ناجی کی طرف اشارہ کر کے شوکی کو بتایا، اماں جان کو سخت ناگوار گزرا۔

”ہاں! بہت قید میں ہو، مادر پدر آزاد۔“

”ہونہہ! اس گھر میں آزادی۔“ وہ کندھے اچکا کر واپس چلی گئی۔

”مبارک! ناجی مٹھائی کھلائو تمہارا بوجھ بانٹنے والا پاس ہو گیا۔“ میاں افتخار نے

تانیہ کی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے ہلکے پھلکے مزاح کا سہارا لیا سب مسکرانے لگے۔

”ناجی! پہلے شوکی کو کام سمجھائو، اس کا حلیہ بدلوائو۔“

”شوکی! تم بولتے ہو۔“ پہلی بار زرتاشیہ نے آواز نکالی۔

”ارے ہاں، اب تک تم نے ایک لفظ نہیں کہا، سریلی آواز تو سنا دو۔“ میاں افتخار نے چہک کر کہا۔

”جی، میں گا بھی سکتا ہوں۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”کیا، گانے وانے کی یہاں اجازت نہیں ہے، چلو اب جائو۔“ اماں جان نے اس کی طبیعت صاف کردی۔ زرتاشیہ اور سامعہ ہنس دیں۔

”ہاں! گانا ہو تو گھر سے باہر جا کر گانا۔“ میاں جی نے شرارت کی تو شاہدہ بیگم نے انہیں متوجہ کیا۔

”آپ تو اٹھیں میں نے ڈاکٹر صاحب سے ٹائم لیا تھا، کچھ طبیعت خراب سی ہے۔“

”اوکے، میں کپڑے چینج کر کے آتا ہوں۔“ میاں افتخار فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

”سامعہ! آپ ٹھیک ہو، کوئی مسئلہ تو نہیں۔“ پیچھے سے شاہدہ بیگم نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

”اللہ کا شکر ہے آنٹی، مسئلہ تو میری وجہ سے آپ کو ہے۔“

”ارے نہیں بیٹا، ہم اس طرح نہیں سوچتے۔“ وہ ٹال گئیں۔

”جی مجھے یقین ہے۔“ وہ بھی مسکرائی۔

”پھوپو! میں سامعہ کے ساتھ بہت خوش ہوں؟“ زرتاشیہ نے کہا۔

’اچھی بات ہے، ویسے اب تھوڑے دنوں کی بات ہے آپ اس گھر میں آجائو گی۔“ شاہدہ بیگم نے غیر ارادی طور پر کہا، سامعہ کے چہرے کا رنگ متغیر

ہو گیا۔ زرتاشیہ شرما گئی۔ سامعہ کی مسکراتی نگاہوں سے ساری آب و تاب غائب ہو گئی۔ معذرت کر کے اجازت لی اور دھیرے دھیرے چل کر اپنے کمرے کی طرف پہنچ گئی۔ زرتاشیہ کچھ دیر بعد آئی۔ اس کے آنے تک وہ جلتی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مار چکی تھی۔

☆...وؤ...☆

سامعہ ڈارلنگ!

امید ہے تم اپنے گھر میں، اپنے لوگوں میں اچھی زندگی گزار رہی ہو گی۔ یہ بوڑھی اور تمہارے واسطے فکر مند رہنے والی مسز جیری تم کو یاد بھی نہیں آتی ہو گی۔ کوئی بات نہیں۔ میں ادھر ٹھیک ہوں۔ بس تمہاری یاد آتی ہے، مگر پھر خوش ہوتی ہوں کہ تم کو گھر مل گیا۔ آزاد، خوش۔ فرحان کے ساتھ مزے ہو رہے ہوں گے۔ سامعہ! یہ تجربہ کیسا رہا، مجھے ضرور لکھنا بس اب ایسی کوئی قربانی نہ دینا کہ ٹوٹ کے بکھرو تو میری گود بھی نہ ہو۔ گود سے یاد آیا کہ ایاز بیٹے نے فون پر بتایا تھا کہ تم ماں بننے والی ہو۔ بہت مبارک ہو، اب مجھے یقین ہے کہ تم نے خود کو مکمل کر لیا، اپنا اور بچے کا خیال رکھنا ایاز کے پاس میرا نمبر ہے بات کرنا۔ فرحان کو بھی میری طرف سے وش کر دینا اور اپنے بابا کو میرا سلام کہنا۔ اللہ تمہارا ساتھ دے۔

مسز جیری

پورا خط پڑھ کے پیار سے لبوں سے لگایا، چوما اور لفافے میں رکھتے ہوئے نم آلود نگاہوں سے فرحان کی طرف دیکھا۔ ایاز اور صائمہ اس وقت کی کیفیت کو محسوس کر سکتے تھے۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ آنکھوں کی نمی باقاعدہ موٹے موٹے آنسوؤں میں بدل گئی تھی۔ صائمہ نے پیار سے ہاتھ تھاما تو وہ اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ فرحان مضطرب سا کمرے کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ ایاز نے دھیرے سے پکارا۔

”بھابی! پلیز آپ کے لیے یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔“

”ہاں کتنی پیلی ہو گئی ہے اور اس وقت بہت آرام اور خوشی کی ضرورت ہے۔“ صائمہ نے بھی پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”اور ہم سب ہیں نا آپ کے پاس، مسز جیری کی جگہ نہیں لے سکتے، مگر کچھ کمی تو پوری کر سکتے ہیں۔“ ایاز نے کہا۔

”ایاز بھائی! مسز جیری ہمیشہ میرے لیے فکر مند ہی رہیں، دور جا کر بھی وہ میرے لیے پریشان ہیں انہیں کیا معلوم کہ سامعہ کیسی ہے؟“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”فارگاڈسک سامعہ! کچھ خیال کرو، طبیعت خراب ہو جائے گی۔“ جب قوت برداشت جواب دے گئی تو فرحان نے جذباتی ہو کر کہا۔

ایاز اور صائمہ مسکرا کر کمرے سے باہر چلے گئے۔

”آپ کیا کرتے ہیں فرحان، صائمہ بھابی اور ایاز بھائی کیا سوچیں گے؟“ وہ ایک دم چونک کر بولی، تو فرحان اس کی معصومیت پر ہنسا۔

”سوچنے دو، بس مجھے آزاد کر دو، بولنے کا اختیار دے دو۔“

”سب اختیارات تو آپ ہی کے پاس ہیں۔ کیا آپ کو اب تک پتا نہیں چلا۔“ اس نے نگاہیں ملاتے ہوئے پوچھا۔

”سویت ہارٹ! میں جس اختیار کی بات کر رہا ہوں اسے سمجھو، مجھے سب کچھ بتانے دو، اپنی اور میری زندگی پر رحم کرو، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ہمیں گھر چھوڑنا پڑے گا۔“ وہ اس کے بال چومتے ہوئے بولا۔

”اللہ نہ کرے، میرے ہوتے آپ گھر چھوڑیں۔“ وہ شدت محبت کے ساتھ لپٹ گئی۔

”سامعہ! اسے جبر کہتے ہیں۔ ہماری محبت میں فاصلہ کہاں سے آگیا؟

”فرحان! آپ ماما کی جان ہو، وہ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کی مریض ہیں انہیں یہ صدمہ نہیں دے سکتی اور سارے گھر کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ میں احساسِ جرم کے ساتھ کیسے جی پائوں گی۔“ وہ کہتی رہی اور فرحان سنتا رہا۔ اس کی کسی بھی بات کو قبول نہ کرنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔“

”کم از کم اپنا خیال تو رکھا کرو، میری جان ہے تمہاری جان میں۔“ وہ بولا۔



”مجھ سے زیادہ تو زرتاشیہ میرا خیال کرتی ہے بلکہ میں تو شرمسار ہو جاتی ہوں۔ کبھی جوس، کبھی فروٹ، کبھی سینڈویچ اور کبھی سوپ۔“ اس نے ہنس کر بتایا۔

”یہ تو وہ مجھ پر احسان کر رہی ہے۔“

”میری وجہ سے بہت خوش ہے۔“

”اس لیے آپ کا سایہ بنی رہتی ہے۔“ اس نے چھیڑا۔

”اچھا اب چلیے، ڈاکٹر کا بہانہ زیادہ دیر نہیں چلے گا۔“ اس نے یاد دلایا تو اس نے گھڑی پر نظر ڈال کے فوراً چلنے کا اشارہ کیا۔

ظفظ

ہو، او عاشقاں توں سوہنا مکھڑا لکان لئی

سجناں نے بو ہے آگے چک تان لئی

چک تان لئی او چک تان لئی ہو او...

اے نسّیں سجناں اصول پیار دے...

”ارے غضب خدا کا۔ ناجی، ناجی!“ عشاء کی نماز مکمل کر کے جاء نماز تہہ کرتے ہوئے وہ چلائیں۔

”جی، جی۔“ ناجی تقریباً بھاگتی ہوئی آئی۔

”ارے جا کر دیکھ یہ کم بخت بانولا مرغا کیوں بانگیں دے رہا ہے۔“ انہوں نے گانے کی مسلسل آنے والی آواز کی جانب اشارہ کیا۔

”یہ مرغا بانگیں نہیں دے رہا، شوکی گا رہا ہے کتنا اچھا گاتا ہے۔“ وہ بہت معصومیت سے بولی۔

”بکو مت، نا مراد نے نماز پڑھنی محال کر دی۔ اس کو منع کرو۔ یہاں یہ لچھن نہیں چلیں گے۔“ انہوں نے جھڑک کر کہا۔ مگر ناجی کو اچھا نہیں لگا۔

”میں بیگم صاحبہ کے پاس جا رہی ہوں۔ انہوں نے بلایا ہے۔“

”ہیں، ہیں وہ تو اس وقت سو جاتی ہیں۔“

”آج جاگ رہی ہیں۔ میاں جی بھی جاگ رہے ہیں۔“

”طبیعت تو ٹھیک ہے شاہدہ کی۔“ انہیں فکر سی ہوئی۔

”پتا نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”نہیں معلوم ہمارے بچوں کی حالت کب سدھرے گی یہاں شاہدہ کی بچوں نے مت مار رکھی ہے اور وہاں زبیر کی زندگی حرام کر کے نرگس بے سکونی سے بیٹھی ہے۔“ ایک دم ہی وہ سرد آہ بھر کے بیڈ پر لیٹ گئیں۔

”اب زرتاشیہ بی بی تو بہت خوش رہتی ہیں۔“

”ہاں! لیکن ماں کی کمی کون پوری کر سکتا ہے۔ آگے شادی قریب آرہی ہے۔

کیسے زبیر سب کچھ سنبھال سکے گا۔“

”آپ نرگس بی بی کے بھائی سے کھل کر بات کر لیں۔“ ناجی نے کافی فہم کا

مظاہرہ کیا۔

”ہنہ! اس کی وہ سنیں تب نا، جیسے یہاں کوئی ہماری نہیں سنتا۔“ انہوں نے تمسخر اڑایا۔

”آپ کی تو سب سنتے ہیں۔ بیگم صاحبہ آپ کی کوئی بات نہیں ٹالتیں۔“

”یہ وہم ہے تمہارا اولاد کے سوا وہ کسی کی نہیں۔“ اماں جان نے صاف انکار کر دیا۔

”پھر تو نرگس بی بی کو کون سمجھائے گا؟“

”اللہ ہی ہدایت دیتا ہے۔ مگر انہیں جو ہدایت کا بوجھ اٹھا سکیں۔ ہم تو اس کے منہ لگیں گے نہیں۔“ وہ بولیں۔ ناجی چپ ہو گئی۔

”ہاں یاد آیا۔ میاں افتخار سے صبح گڑ لانے کو کہا تھا۔“

”میں پوچھتی ہوں۔ مگر گڑ کا کیا کرنا ہے۔“

”ارے بھول گئیں دلیہ کس سے کھائیں گے۔“ وہی گڑ ڈال کر ہی کھایا

جائے گا۔“ انہوں نے تعجب سے کہا۔

”مگر، دلیہ کھائے گا کون؟“ وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

”بھئی کوئی نہ کھائے ہم تو کھائیں گے باقی چائے اور رس کھالیں گے۔“ وہ یہ کہہ کر اٹھیں اور بیڈ کی سائیڈ ٹیبل سے اپنی دوائیں نکالنے لگیں۔ ناجی جانے کو پلٹی تو انہوں نے کہا۔

”اس شوکی کو اچھی طرح سمجھا دو، یہ شرفا کا گھر ہے، شرفا کا محلہ ہے۔ چھت پر چڑھ کر ہماری شرافت کا جلوس نہ نکالے صبح فجر کی نماز مسجد میں جا کر پڑھے۔“

”بیگم صاحبہ، وہی کو جھاگ لگا دیا تھا۔“

”جی ہاں، ہم روز کا کام تمہاری طرح بھولتے نہیں ہیں۔“ وہ یہ سن کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

/.../...

انہوں نے کتاب بند کر کے کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکایا۔ تو شاہدہ بیگم بولیں۔

”افتخار! کبھی تو سمجھا کرو۔ کہ میرے ذہن پر کیا بوجھ ہے۔“

”تین روز سے آپ چھٹی لے کر گھر میں آرام فرما رہی ہیں۔ ذہن پر بوجھ کس قسم کا ہے؟“ انہوں نے اٹھ کر ان کے قریب آتے ہوئے کہا۔

”تانیہ نے مجھے الجھا دیا ہے۔ یہ تین دن زیادہ بے آرامی میں گزرے ہیں۔“ نہایت دھیمے سے کہا۔

”تانیہ نے، خیریت...؟“

”وہ چاہتی ہے کہ حویلی سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں، مگر اس کا مطلب کیا ہوگا؟“

”کہیں اور شفٹ ہونے کی ضرورت؟“ انہوں نے حیرت سے دیکھا۔

”دراصل، نئے ماحول اور نئے دور کے بچے اس طرح کی حویلی میں رہنا پسند نہیں کرتے۔“ وہ نظریں چراتے ہوئے جھوٹ بول گئیں۔

”شاہدہ بیگم! حویلی میں رہنا پسند نا پسند کی بات نہیں۔ اس میں کیا بھید ہے یہ تو آپ جانتی ہیں۔“

”افتخار! آپ جو کہہ رہے ہیں وہ ہیں سمجھ سکتی ہوں، مگر تانیہ نہیں سمجھ سکتی وہ بہت ضدی ہے۔“ انہوں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔

”شاہدہ! یہ ڈپارٹمنٹ آپ کا ہے میں تو پہلے دن سے پس دیوار رہا ہوں آپ کے بچے ہیں اور آپ کی اماں ہیں۔ ان کے درمیان ہم کہاں ہیں؟“ وہ ہولے سے مسکرا کر بولے مگر اس مسکراہٹ میں انہوں نے بہت کچھ کہہ دیا۔ شاہدہ بیگم پہلو بدل کر رہ گئیں۔

”پہلو تہی کر رہے ہو۔“

”نہیں اپنا مقام بیان کیا ہے۔ ویسے تانیہ حویلی کیوں فروخت کرانا چاہتی ہے؟“ انہوں نے توقف کے بعد پوچھا۔

”تاکہ خرم کی فیملی ہمارے گھر آسکے۔“ آخر کار دل کی بات زبان پر لانی پڑی میاں افتخار کی آنکھوں میں حیرت عود آئی۔ پھر کچھ سوچ کر وہ نارمل ہو گئے۔

”پوچھنا تو نہیں چاہیے مگر پوچھ رہا ہوں، خرم کی فیملی اور حویلی میں کیا مماثل ہے؟“

”مماثل ہی تو نہیں ہے۔“ وہ بڑ بڑائیں۔

”کیا تعلق ہے؟ یہی فرمادیں۔“

”افتخار! یہ پرانی حویلی، پرانا فرنیچر، تنگ سا محلہ اس قابل نہیں ہے کہ یہاں ایک امیر کبیر ماڈرن فیملی کو بلایا جائے۔“

”تو کیا بلانا ضروری ہے۔“ انہوں نے نبض پر انگوٹھا رکھا تو وہ ہونٹ چبانے لگیں۔

”بات اتنی سی ہے کہ تانیہ عادل سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔“

”اوہ!“ ان کے منہ سے فقط اتنا نکلا۔

”دراصل میں خود نہیں چاہتی ایک بیٹی ہے وہ بھی خوش حال زندگی بسر نہ کرے۔“ شاہدہ بیگم نے جلدی سے سارا الزام اپنے سر لے لیا۔

”پھر تو قصہ ہی ختم ہو گیا۔ آپ کے بنا چاہے تو کچھ نہیں ہو سکتا“ میاں افتخار نے بے تاثر نگاہوں سے انہیں دیکھا اور سپاٹ لہجے میں کہا۔

”مجھے احساس ہے کہ ہم بھائی میاں کو کیسے انکار کریں گے؟“ وہ کچھ شرمندہ سی ہوئیں۔

”شاہدہ بیگم! آپ ہر کام آسانی سے کر لیتی ہیں۔ پہلے حویلی بیچیں، پھر خرم کی فیملی کو بلائیں اور پھر انکار کریں۔“ وہ ترتیب وار سب مرحلے بتا کر وہاں سے اُٹھ گئے۔

”ایسا جلد ہو جائے تو فرحان اور تانیہ کی شادی ایک ساتھ کر دیں گے۔“ وہ کچھ سوچ کر بولیں۔

”اطلاع دینے کا شکریہ۔“ وہ مسکرائے اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ غیر

ارادی طور پر صحن میں ٹھلنے لگے۔ اتنا بڑا ذہنی دھچکا کس قدر آسانی سے دیا گیا۔ اتنی اہم بات اتنی سادگی سے کہہ دی گئی۔ طویل عرصہ بھائی کی جدائی میں بسر کرنے کے بعد یہ ایک خوشی اور تعلق قائم تھا۔ اس کو بھی یوں ختم کر دینے کا سوچ لیا۔ ”شاہدہ بیگم جو سوچ لیں وہ ویسا ہی کرتی ہیں۔“ انہوں نے سوچا لیکن دل کٹ رہا تھا۔ شاہدہ نے کبھی ان کو ان کے رشتوں کو قبول

ہی نہیں کیا۔ ”یا خدا! یہ فیصلہ بھائی میاں، بھابی اور عادل کیسے برداشت کریں گے؟ کیا میں اس بار بھی قربانی دوں۔ میرا برائے نام سا تعلق بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔“ وہ پہلی بار کافی سنجیدہ اور گم صم سے ٹھل رہے تھے۔ فرحان نے کمرے کی کھڑکی سے دیکھا مدہم روشنی میں بھی ان کے چہرے پر پھیلے تاثرات اس نے دیکھ لیے۔ اس لیے باہر آگیا۔

”بابا!“ اس نے پکارا تو وہ چونکے۔

”ہنہ، ہاں! پیکنگ کر لی۔“ وہ ایک دم ہشاش بشاش لہجے میں بولے۔



”جی کرلی ہے۔ ابھی شاہد صاحب کا فون آیا تھا۔ کل شام چار بجے کی فلائٹ ہے۔“ اس نے ملائشیا جانے سے متعلق بتایا۔

”اچھی بات ہے۔ بزنس ٹرپ ہی نہ سمجھنا‘ سیر بھی کرنا۔ شاہد صاحب تو اکثر جاتے رہتے ہیں۔“

”بابا! خیریت ہے؟“

”ہاں کیوں کیا ہوا؟“

”آپ اس وقت باہر پریشانی سے ٹھل رہے ہیں۔“

”یار! کچھ خاص نہیں ہے‘ بس وہ طبیعت بھاری سی ہو رہی تھی۔“

”بابا! آپ سامعہ اور میری وجہ سے پریشان ہیں۔“ فرحان نے اپنی فہم کے مطابق جو سمجھا وہ کہا۔ تو وہ مزید چونکے۔ یہ تو وہ بھول ہی گئے تھے کہ اس طرح تو سامعہ اور فرحان کے لیے بھی مشکل ہو جائے گی۔ شاہدہ بیگم فرحان کی شادی کا بھی تو ساتھ کیے بیٹھی ہیں۔ سامعہ کا کیا ہوگا؟“ وہ سوچنے لگے۔

”بابا! کیا سوچ رہے ہیں؟“

”کیا زندگی کسی اور میں جیے جانے کا نام ہے؟“ انہوں نے تھک کر اماں جان کے تخت کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ تو محبت کی بات ہے‘ جو محبوب کہے بس‘ ہر ایک میں ہم زندہ نہیں رہتے۔ ہم جس سے محبت کرتے ہیں اس میں رہنا پسند کرتے ہیں۔“ فرحان نے خاصی منطقی بات کی۔ وہ شاہدہ بیگم سے آج بھی اتنی ہی محبت کرتے ہیں۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”مگر بات کیا ہے؟“ وہ اڑا رہا۔

”یار! میں غور کر رہا تھا کہ گھر دامادی قبول کی۔ اپنے گھر اور اکلوتے بھائی کو چھوڑا اور آپ کی ماما کے وجود میں عمر بسر ہو گئی۔ میں نے شاہدہ کو ٹوٹ کر چاہا۔ اس نے جو چاہا وہ کیا۔ یہ سفر کہیں نہیں بدلا۔ میں

اس کی ترجیحات میں کہیں پیچھے رہ گیا ہوں۔“ وہ جانے کیا کچھ بولتے چلے گئے۔ فرحان کو شدید حیرت تھی۔

”بابا! کوئی بات تو ہے جو آپ اس طرح بولے ہیں۔“

”کس طرح یار! چھوڑو بس فکر سی ہے کہ آپ کی ماما سامعہ کو قبول کریں گی یا کہ نہیں۔“

”مجھے پروا نہیں میں سامعہ کو لے کر چلا جاؤں گا۔“ وہ ایک دم تن کر کھڑا ہو گیا۔

”اور ہماری محبت کو صدمہ پہنچائو گے۔“ وہ شرارت سے ہنسنے لگا۔

”بابا! پلیز بہت دیر ہو رہی ہے کچھ بھی کریں۔“ وہ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ گیا۔ وہ بڑی دیر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بہت کچھ سوچتے رہے۔

/.../...

جمعہ کا دن نماز ظہر سے پہلے اسٹور بند کر کے وہ گھر آیا تھا۔ غسل کر کے شلوار کرتا پہن کر جمعہ کی نماز پڑھنے جاتا تھا۔ میاں ستار کا بھی پہلے یہی

معمول تھا، مگر جب سے سانس کی بیماری نے گھیرا تھا تب سے وہ اکثر گھر پر ہی نماز پڑھتے تھے۔ کبھی کبھار ہی مسجد جانا ہوتا تھا۔ آج صبح سے ہی طبیعت خراب تھی۔ عادل جو نہی نماز کے لیے تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو رفیعہ بیگم نے حکم صادر کر دیا۔

”آج تانیہ کی سالگرہ ہے نماز پڑھ کر آؤ۔ شام سے پہلے اسے کوئی تحفہ دے آتے ہیں۔“

”کون سا تحفہ؟“ اس نے رک کر پوچھا۔

”کوئی بھی تحفہ۔“

”تانیہ کو کوئی بھی تحفہ پسند نہیں آئے گا۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ وہ تعجب سے بولیں۔

”آپ نہیں سمجھیں گی۔ میں آکر سمجھاتا ہوں۔ جماعت کھڑی ہونے والی ہے۔“ وہ گھڑی پر نگاہ ڈال کے آگے بڑھنے لگا۔ تو وہ جلدی سے بولیں۔

”ایسا کرو مجھے موبائل پر تانیہ کا نمبر ملا دو“ میں اس سے خود پوچھ لیتی ہوں کہ اسے کیا پسند ہے۔“ مجبوراً اسے کچھ سنجیدگی سے کہنا پڑا۔

”تانیہ نے یہ حق مجھے ابھی نہیں دیا۔“

”اچھا چلو شاہدہ چچی کا نمبر ملا دو۔“ رفیعہ بیگم نے کچھ بھی عذر قبول نہ کرنے کی گویا قسم کھالی تھی۔ اس نے بادل نحواستہ موبائل نکال کر نمبر ملایا اور انہیں تھما کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ مگر گھر سے مسجد تک جتنا بھی فاصلہ تھا وہ یہی سوچتا رہا کہ ”آپ بھولی ہیں“ نہیں جانتیں ہماری سادگی ہمارا جرم ہے۔ یہاں چاہتوں کا صلہ نہیں۔ یہاں ایسی ہوا چلی ہے کہ کوئی وفا نہیں۔ تانیہ کے نزدیک اس کا وجود ہی سب کچھ ہے۔ ہماری ہستی کچھ بھی نہیں۔“ جیسا اس نے سوچا جس کا اسے اندازہ تھا وہی ہوا۔ رفیعہ بیگم بجھی بجھی سی تھیں۔ آنکھوں کے پپوٹے متورم سے تھے۔ وہ بنا پوچھے ہی سب کچھ سمجھ گیا۔ مگر رفیعہ بیگم نے خود ہی اس کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھتے ہوئے بتایا۔

”شاہدہ نے صاف منع کر دیا ہے۔“ نوالا منہ تک جاتے جاتے رہ گیا۔

”کیا مطلب؟“

”کہ تانیہ کو کچھ پسند نہیں آئے گا اور ہم اس کی پسند کے مطابق کچھ دے بھی نہیں سکتے۔“ خاصے دُکھی سے لہجے میں وہ بولیں۔ ماں کو دُکھی دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کھول اٹھا۔

”وہ پرنسز بننے کی ناکام کوشش کرتی ہے۔ عمر بھر یہی عذاب دے گی اور آپ کو کیوں شوق ہے کہ اسے تحفے تحائف دیے جائیں۔ مت خود کو کمتر بنایا کریں۔ ہماری بلا سے سا لگرہ ہے یا نہیں۔ کوئی پروا نہیں ہے ہمیں۔“ وہ نان اسٹاپ بولتا چلا گیا۔

”پتا نہیں یہ شاہدہ کا خیال ہے یا تانیہ کا۔“ وہ معصومیت سے بولیں۔

”دونوں کا“ لیکن آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں؟“ اس نے ان کے ہاتھ تھام کر نرمی سے پوچھا۔

”عادل! اس سے ہمارا تعلق ہے آج نہیں تو کل تانیہ کو یہاں آنا ہے۔“

”نہیں، وہ اس گھر میں قطعاً نہیں آئے گی۔ دیکھ لیجیے گا۔ وہ شرط لگائیں گی۔“  
 ”تو ٹھیک ہے ناں اب تمہارا کاروبار خوب چل نکلا ہے، یہ گھر بیچ کر اور پیسا ملاؤ اس کی پسند کا گھر لے لو۔“

”پھر اس کی فرمائش پر اور کیا کیا بیچ کر کیا خریدیں گے؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔  
 سادہ دل ماں سے۔

”اللہ نہ کرے۔ گھر تو بدلنا چاہیے یہ تو ہم بھی سمجھتے ہیں۔“ انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی کہا۔

”اور ابا کی مرضی معلوم ہے آپ کو۔“

”انہیں میں سمجھا لوں گی۔“ وہ وثوق سے بولیں۔

”اچھا سوچیں گے، فی الحال آپ پُر سکون ہو کر آرام کریں۔“ اس نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی خوش ہو گئیں۔ وگرنہ کافی پریشان اور دکھی تھیں۔

/.../...

زرتاشیہ نے کچھ خوشی اور کچھ حیرت کے ساتھ فرحان کو دیکھا۔ فرحان نے بھی ہلکا سا مسکرا کر خاموش سا جواب دیا اور پھر متلاشی نظروں سے کمرے کے اطراف میں دیکھا۔ سامعہ کہیں نہیں تھیں۔

”سامعہ جی! اپنے کمرے میں ہیں۔ آرام کر رہی ہیں۔“ جانے کس خیال سے زرتاشیہ نے کہا۔ مگر اسے ایسا لگا جیسے دانستہ اسے بتایا گیا ہے۔

”وہ ہاں تھینک یو۔“ بڑی جرأت سے اس نے اعتراف سا کیا اور اگلے دروازے کو ہولے سے کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ زرتاشیہ نے موقع غنیمت جانا جلدی سے کچھ بنانے کے لیے کچن کی طرف بھاگی۔

”کیسی طبیعت ہے؟“ سامعہ کو بیڈ پر لیٹا دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ جا رہے ہیں۔“ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی۔

”ہاں یہی بتانے آیا تھا۔“

”کتنے روز میں آجائیں گے؟“ وہ ٹال گئی۔

”ہفتہ دس دن بعد، مگر روز فون پر بات ہوگی۔ اپنا خیال رکھنا۔“ اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، آپ بھی اپنا بہت سا خیال رکھیے گا۔“

”اوکے، بابا گاڑی نکال کر میرا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ بولا۔

”یہ کیا آپ جا رہے ہیں۔“ اسی لمحے زرتاشیہ کھانے پینے کی چیزوں سے بھری ٹرالی لیے آگئی۔

”جی ہاں!“

”پلیز رکیے نا۔“ وہ ٹھٹکی اور سامنے آگئی۔

”بچوں جیسی حرکتیں نہ کیا کرو۔“ اس نے توقع سے بڑھ کر سخت جملہ کہہ دیا۔ زرتاشیہ شرمندہ ہو کر پرے ہوگئی اور سامعہ اپنی جگہ نادام سی ہوگئی۔

”اللہ حافظ۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ سامعہ نے اٹھ کر اس کے ہاتھوں سے ٹرے تھام لی اور میز پر رکھ کر اسے پیار سے بیڈ پر بٹھایا۔ وہ محبت پا کر رونے لگی۔

”زرتاشیہ! ایسے نہیں کرتے۔ دراصل فرحان صاحب جلدی میں تھے ان کی فلائٹ کا ٹائم ہے۔ وہ صرف ملنے آئے تھے۔“

”کس سے؟“ ایک دم ہی روتے روتے اس نے پوچھا۔ تو سامعہ چونک اٹھی۔

”اگر مجھ سے ملنے آتے تو ایسا کہتے۔“ وہ پھر بولی تو سامعہ سنبھل چکی تھی۔

”ہاں مجھے تو انکل کا پیغام دینے آئے تھے۔“

”میں کیسے مان لوں؟“ اس نے آنکھیں مٹھیلی سے رگڑیں۔

”میرے کہنے سے اور اپنے دل سے پوچھ کر۔“ وہ کہیں پاتال سے بولی۔

”سامعہ جی! فرحان نے شاید کبھی نہیں سوچا کہ کسے عشق ہے اس کی ذات سے، کسے پیار ہے اس کے نام سے، مجھے بے رخی کا گلہ نہیں کیونکہ وفائوں



کا شاید یہی صلہ ہے۔ مگر سامعہ جی کیا یہ میرا جرم ہے کہ ہم دعا سلام سے گئے۔“ وہ بھیگی بھیگی آواز میں بولی۔

”زرتاشیہ! کبھی وصال کی چاہ نہیں کرتے کبھی فراق میں آہ نہیں بھرتے کچھ تو منفرد ہو طریقہ بندگی۔ طریقہ عام سے منفرد رکھو اپنی چاہت کو۔“ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے پھیرتے شاید وہ خود پانیوں میں اتر گئی۔ زرتاشیہ نے سر اٹھا کر دیکھا تو پریشان سی ہو گئی۔

”سوری سامعہ جی! میں بھی کتنی پاگل ہوں آپ کو پریشان کر دیتی ہوں۔ مجھے تو آپ کو خوش رکھنا چاہیے۔ آپ کو کچھ یاد آنے لگا ہوگا۔“

نہیں جان! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس یہ آنکھیں چور ہوتی ہیں۔ جہاں ضبط کا لمحہ کوئی نبھانا ہو تو بالکل ہار جاتی ہیں بہت کمزور ہوتی ہیں۔ ان کی کمزوری پر نہ جائو۔“ وہ کرب چھپا کر مسکرا دی۔“ زرتاشیہ کے دل میں اس کی محبت اور بڑھ گئی۔

/.../...

گیٹ پر اجنبی چہرہ دیکھ کر شوکی ٹھٹکا۔

”جی کس سے ملنا ہے؟“

”آگے سے ہٹو۔“ اسے گیٹ کے درمیان کھڑا رہنے پر اس نے کہا۔ تو وہ ایک طرف ہو گیا۔ وہ موٹر سائیکل سمیت اندر داخل ہوا۔ شوکی ابھی تک حیران پریشان تھا۔ ناجی نے گملوں کو پانی دیتے ہوئے مڑ کر دیکھا اور جھٹ زور سے سلام کیا۔

”سلام عادل صاحب!“

”یہ کون ہے؟“ عادل نے گھوم کر سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے شوکی کے بارے میں پوچھا۔

”یہ شوکت عرف شوکی صاحب ہیں۔“ ناجی نے خاصی شرارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

”اچھا تانیہ اور باقی سب کہاں ہیں؟“

”تانیہ بی بی اپنے کمرے میں شاہدہ بیگم صاحبہ اور میاں فرحان صاحب کو اتر پورٹ چھوڑنے گئے ہیں۔“ ناجی نے ترتیب وار ہی جواب دیا۔

”اور اماں جان۔“

”وہ محلے میں سیدھے ہاتھ والے چوتھے گھر میں میلاد ہے، وہاں گئی ہیں۔“

”تانیہ بی بی سے کہو میں آیا ہوں۔“ وہ وہیں تخت پر بیٹھ گیا۔

”مگر عادل صاحب وہ تو نہیں آئیں گی۔“ ناجی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ مگر

شوکی نے اپنی موجودگی اور اہمیت کا احساس دلانے کے لیے جلدی سے کہا۔

”آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں میں چھوٹی بی بی کو بھیجتا ہوں۔“

”نہیں میں خود مل لیتا ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا تانیہ

کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو اندر سے آواز

آئی۔

”آجائو۔“

”کیا میں اندر آسکتا ہوں۔“ دروازے سے ذرا اندر داخل ہو کر اس نے پوچھا۔ تو وہ کرنٹ لگنے کی حد تک اچھل کر مڑی۔

”اندر آکر پوچھ رہے ہو۔“

”چلو آئندہ اندر آکر نہیں پوچھوں گا۔“ وہ قدرے سادگی سے کہہ کر اور

اندر کی طرف آگیا۔

”میں اس کی اجازت کبھی نہیں دوں گی۔“ وہ تڑخ کر بولی۔

”اور میں کبھی اس کی اجازت نہیں لوں گا۔“ وہ بہت تحمل سے بولا تو وہ

بھڑک اٹھی۔

”مسٹر عادل ستار! کان کھول کر سن لو، ذہن میں محفوظ کرلو کہ میری زندگی

سے تمہیں کچھ ملنے والا نہیں۔“ انگلی کے اشارے سے انتہائی چیلنج دینے

والے انداز میں کہا۔ تو وہ مسکرایا۔

”مرنے کے بعد کچھ ملنے کی امید رکھوں۔“

”شٹ اپ!“ وہ لال ہو گئی۔

”دیکھو تانیہ افتخار! آج آپ کو ساگرہ کی مبارک باد دینے آیا ہوں اور خاص طور پر چچی سے ملنا تھا، مگر وہ نہیں ہیں لہذا یہ تندی تلخی بھول کر مسکرائو آج بہت خاص دن ہے۔ آپ آج کے دن ہمارے لیے اس دنیا میں تشریف لائی تھیں۔“ اس نے بڑے ٹھہر ٹھہر کر کہا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

”یہ خوش فہمی بھی آج دور کرلو، میں تم سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ سنا چکی ہوں“ وہ ادا سے ہنس کر بولی۔

”وجہ پوچھ سکتا ہوں۔“ اس نے خاصے حوصلے سے پوچھا۔

”ہنہ، جا کر اپنا گھر، اپنی ہستی دیکھو، یہ حویلی دیکھ رہے ہو یہ حویلی ہے، لیکن مجھے اس میں رہنا بھی پسند نہیں یہ قدیم قفس نما حویلی بقول ہماری نانو کے انہیں بہت پیاری ہے۔“ وہ ایک دم ہی کمرے میں گھوم گھوم کر طنزیہ جملے بولتی چلی گئی۔

”اے سنو! صرف اپنی ہستی تک رہو مجھے میرا گھر بہت پیارا ہے باقی اس حویلی سے مجھے کچھ سروکار نہیں۔“ وہ خاصی برہمی سے بولا۔

”تو پھر چھوڑ دو یہاں آنا جانا۔“ وہ کندھے اچکا کر بولی۔

”جس رشتے کے تحت آتا ہوں وہ ابھی قائم ہے۔“

”تو توڑ دو وہ رشتا کیونکہ مجھے تمہاری کلاس کے گو رکھ دھندے ہیں نہیں پڑنا۔“

”سوچ سمجھ کر کہہ رہی ہو۔“

”ہنہ! اب آپ تشریف لے جائیں مجھے نیٹ سے کچھ سرچ کرنا ہے۔“ خاصے طنزیہ انداز میں کہہ کر وہ کمپیوٹر ٹیبل کی طرف چلی گئی۔

”تانیہ! میں بہت اچھا سوچ کر آیا تھا مگر...“

”اگر، مگر پھر سہی پلیز اب آپ جائیے۔“

”تمہیں کوٹھی، بنگلے، بینک بیلنس اور اسٹیٹس سے شادی کرنی ہے؟“ جاتے جاتے رک کر پوچھا۔

”مجھے خرم سے شادی کرنی ہے اور کچھ؟“ ریوالونگ کرسی گھما کر وہ بے باکی سے بولی۔ تو ایک دم غم و غصے کی چنگاریاں اس کی آنکھوں سے نکلنے لگیں۔ گرج کر بولا۔

”خ تھو! میں اس رشتے پر تھوک کر جا رہا ہوں۔ عادل ستار تمہیں دھتکار کر جا رہا ہے، لیکن یاد رکھنا جس روز ٹوٹ کر گروگی تو ضرور سوچنا۔“

سکوت کرب میں اُترو تو یاد کر لینا

کبھی جو ٹوٹ کے بکھرو تو یاد کر لینا

مانا کہ تم گفتگو کے ماہر ہو

وفا کے لفظ پہ اٹکو تو یاد کر لینا

”بہت شکریہ کہ آپ مجھے یہ خوشی دے کر جا رہے ہیں۔“ وہ ادا سے اٹھ کر اٹھلائی تو وہ وہاں رکا نہیں۔“

شہر کی خاموش اور ویران سڑکوں پر موٹر سائیکل دوڑاتے دوڑاتے رات ہو گئی، مگر ایک لمحے کو بھی اس خادار جملے نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ”مجھے خرم سے شادی کرنی ہے اور کچھ؟“ اس اعلان اور فیصلے کے بعد اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ ضبط کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ اپنا فیصلہ سنانے کے بعد اس نے باقی چھوڑا ہی کیا تھا۔ وہ تو ایسا نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو اس کی کڑوی باتوں پر بھی کم کم ہی غصہ آتا تھا۔ صرف ماں، باپ کے فیصلے اور خوشی کے لیے مگر آن واحد میں یہ خوشی اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اب کس طرح اس فیصلے کی خبر گھر جا کر دے سکے گا۔ یہ فکر دامن گیر تھی۔ امی نے جاتے ہی جو سوال پوچھنا تھا۔ اس کا جواب کیا ہے؟ شہر سے تقریباً باہر نکل کر ایک جگہ موٹر سائیکل روک کر وہ خود سے یہی پوچھ رہا تھا۔ مگر کوئی سرا ہاتھ ہی نہیں آرہا تھا۔ بھائی کو جدا کر کے ابا بہت دکھی ہوتے رہے۔ یہ رشتا ان کی اس دوری

کو قربت میں بدلنے کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ اس طرح دو بھائی پھر سے قریب آجائیں گے، مگر یہ خواہش آج دم توڑ گئی۔ میں خود کو تو بہلا سکتا ہوں کہ اس نے مجھے چھوڑ دیا اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ حالانکہ اتنے سالوں کی وابستگی نے مجھے اس کا عادی بنا دیا ہے۔ میرا دل بھی تو چپکے چپکے اس کے لیے دھڑکتا ہے۔ اس کو رات کی تنہائی میں کروٹ کروٹ یاد کرتا ہے۔ ملازمت سے اسٹور کھولنے تک وہی تو در پردہ سب سے بڑا محرک تھی۔ بظاہر ابا کی مرضی تھی مگر اندر سے اسے پانے کی آرزو تھی۔

یا خدا! یہ کیسا دورا ہا ہے۔ زندگی کے اس موڑ کی تمنا تو نہیں تھی مجھے اس کی خود سری اور بے اعتنائی بھی میرے پندار کو جس لمس کی مانند چھو کر گزرتی تھی۔ مجھے اس کے کہنے پر اسے چھوڑنا ہوگا یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔ خدا تو نے مجھے آزمانے کے لیے دو رستے رکھے کہ وہ چھوڑ دے مجھے یا میں چھوڑ دوں اسے زمانے کے لیے۔ اے میرے رب! کیسے بھول جانے کی دعا مانگوں ہاتھ اٹھتے نہیں ہیں اسے بھول جانے کے لیے۔ وہ کیوں نہ جان سکی۔

سر درد کی شدت سے پھٹ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر وہ سوچتا ہی چلا گیا۔

وقت دبے پائوں اس کے قریب سے گزرتا گیا جب تارے آسمان پر جھلملانے لگے تب اسے احساس ہوا۔

/.../

رفیعہ بیگم اس کو بستر پر بے سدھ گرا دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ کھانے کی ٹرے میز پر رکھی اور جلدی سے پیشانی چھو کر دیکھی تو اور زیادہ بوکھلا گئیں۔ ”ارے عادل بیٹا تمہیں تو بہت تیز بخار ہے۔“ مگر اس کی طرف سے معمولی سی حرکت بھی نہیں ہوئی تو انہوں نے اس کا سر گود میں رکھ کر سر میں انگلیاں پھیریں ہمیشہ کی طرح انگلیاں پھیرنے سے اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مگر سرخ بوٹی جیسی آنکھیں جو ایک ماں کے لیے کسی ضرب کاری سے بڑھ کر نہیں تھیں۔



”عادل! عادل میرے بچے کہاں تھے؟ بخار کے ساتھ کہاں گھوم رہے تھے۔ اسٹور پر بھی نہیں تھے۔“ مگر وہ کچھ نہ بول سکا تب وہ میاں ستار کو آوازیں دیتی باہر نکل گئیں۔

میاں ستار پریشان ہو کر گئے اور بیس پچیس منٹ بعد ایک ڈاکٹر کو لانے میں کامیاب ہو گئے۔ ڈاکٹر نے اسے چیک کیا۔ ماتھے پر گیلی پٹیاں رکھنے کو کہا۔ انجکشن لگایا اور چند ضروری دوائیں دے کر اٹھا تو رفیعہ بیگم بولیں۔

”ڈاکٹر صاحب! میرا بچہ خیریت سے تو ہے نا۔“

”جی بس بخار ہے ابھی کچھ دیر میں اتر جائے گا کچھ کھلائیں پھر دوا دیں۔“ ڈاکٹر یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ میاں ستار دروازہ بند کر کے اندر آئے اور عادل کے قریب بیٹھ گئے۔

”کیا ہوا ہے میرے عادل کو۔“ رفیعہ بیگم رو دیں۔

”بھئی کمال ہے بخار ہے۔ ہو جاتا ہے رونے کی کیا بات ہے؟“

”مگر یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک گیا تھا اور اتنی دیر کہاں رہا؟“

”کہاں گیا تھا؟“ میاں ستار نے پوچھا۔

”افتخار کی طرف۔“

”تم نے بھیجا تھا۔“ انہوں نے عادل کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دباتے ہوئے پوچھا۔

”تانیہ کی سالگرہ تھی آج۔“ وہ اتنا کہہ کر رک گئیں۔

”سالگرہ، افتخار اور شاہدہ نے بلایا تھا کیا؟“

”نہیں، وہ بس تانیہ کو مبارک باد دینی تھی۔“ وہ کچھ ڈری ڈری سی بولیں۔

”تو تم نے عادل کو بھیج دیا۔“

”تو کیا ہوا، میں چاہتی تھی عادل بھی مل کر آئے۔“ وہ کچھ ہمت کر کے بولیں۔

”پھر پریشان کیوں ہو؟“ وہ ہنسے۔

”عادل کی حالت دیکھ کر۔“

”کچھ نہیں ہے رفیعہ بیگم، جوان بچہ ہے بخار کی وجہ سے بھی کوئی پریشان ہوتا ہے۔“

”مگر میرا دل بہت ہول رہا ہے۔ جانے کیوں بس کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔“  
انہوں نے وفور محبت سے عادل کی پیشانی چوم لی۔

”اچھا اب ایسا کرو اس کے لیے گرم دودھ اور رس لے آؤ۔ پھر دوا بھی دینی ہے۔“

”آنکھیں تو کھولے۔“

”بھئی تمہارے آنے تک آنکھیں کھول لے گا۔ جاؤ۔“ انہوں نے اصرار کیا تو وہ بادل نحواستہ وہاں سے گئیں اور میاں ستار جو اتنی دیر سے مضطرب اور

بے قرار تھے، بیٹے کو چومنے کے، پیار کرنے کے لیے ایک دم اس پر جھکے اور چومنے لگے۔ ان کے مشفق احساس نے اس کی بوجھل پلکوں کو اٹھا دیا اتنا

پیار اس قدر جذب و سرشاری کی کیفیت وہ تڑپ کر بولا۔

”ابا! آپ؟“

”ہاں، ہاں میرے بیٹے ارے عادل کی ماں جلدی آؤ دیکھو عادل جاگ گیا۔“  
آنکھوں میں آئے خوشی کے آنسو چھپا کر وہ زور سے چلائے۔ عادل نے ان کا کمزور ہاتھ تھام لیا۔ انجکشن کی وجہ سے بخار فوری اتر گیا تھا یا باپ کی بے پناہ محبت تھی کہ وہ ان کا ہاتھ لبوں سے لگائے ہوئے تھا۔ سوچ رہا تھا کہ وہ اس سے اتنی محبت کرتے ہیں، پہلی بار پتا چلا تھا ان کی محبت پر تو وہ خود قربان ہو سکتا تھا۔ انہیں وہی صدمہ کیسے پہنچا سکتا تھا۔ یہ خبر سن کر وہ دونوں دکھی ہو جائیں گے۔ نہیں، یہ چھپا بھی تو نہیں سکتا۔“ وہ سوچ رہا تھا۔ جب کہ ماں گرم دودھ کا گلاس لیے اس کے چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

/... /.../

تانیہ عادل آیا تھا؟“ شاہدہ بیگم نے ناجی کے بتانے پر اس کے کمرے میں آکر پوچھا۔

”جی آیا تھا۔“ وہ مسلسل کمپیوٹر کی جانب متوجہ رہی۔

”پھر۔“

پھر، ماما میں نے اس سے خود اپنی جان چھڑالی ہے۔“ وہ شانے اچکا کے قدرے بے پروائی سے بولی۔

”آپ کا مطلب، آپ نے اسے ایسا کچھ کہا؟“ شاہدہ بیگم نے بہت آہستہ سے اس کے قریب آکر پوچھا۔

”ماما! روز روز کا عذاب ختم ہو گیا۔ عادل خاصا خود دار اور انا پرست ہے خرم کا نام سن کر فوراً اپنا فیصلہ سنا گیا۔“ وہ اس طرح بتا رہی تھی جیسے کوئی قلعہ فتح کر لیا۔ شاہدہ بیگم متفکر ہو گئیں۔

”مگر اس جلد بازی کی ضرورت نہیں تھی۔“

”کیوں، کیوں ضرورت نہیں۔ کبھی خود چلے آتے ہیں اور کبھی تایا جی اور تائی جی آجاتے ہیں۔“

”بات بہت بگڑ جائے گی۔ آپ کے تایا جی تو پہلے ہی زہر افشانی کرتے رہتے ہیں اور آپ کے بابا بھی اس بار جانے کیا ری ایکٹ کریں۔ اس لیے کچھ صبر سے کام لینا تھا۔ خرم امریکا بیٹھا ہے اونٹ کس کروٹ بیٹھے کس کو خبر۔“ وہ خاصی پریشان ہو گئی تھیں۔ بیٹی کی خواہش کا احترام تو کرتی تھیں مگر بہت طریقے اور قرینے سے اس مسئلے کو حل کرنا چاہتی تھیں۔

”ماما! جو ہونا تھا ہو گیا۔ میں نے خرم کو ای میل کر دی ہے کہ وہ اپنا ماسٹڈ کلیئر کر لے باقی مجھے کسی کی پروا نہیں۔“ وہ خود سری سے بولی۔

”غلط انداز ہے آپ کا پروا کرنی پڑتی ہے اور اماں جان تو قیامت برپا کر دیں گی۔ انہیں عادل جی جان سے پسند ہے۔“

”تو یہ کیا کروں انہیں تو یہ حویلی بھی جی جان سے پسند ہے۔“ وہ تمسخرانہ انداز میں ہاتھ لہرا کر بولی۔ تو شاہدہ بیگم نے سرزنش کی۔

”دھیرے بولو بات بات پر حویلی کا تذکرہ کیوں لے آتی ہو؟“

”اس لیے کہ یہ رہنے کے قابل نہیں، مزے کی بات یہ ہے کہ یہ آپ کی ہے مگر مالک نانو ہیں۔“ وہ ہنسی۔

”مجھے بھی تو انہوں نے ہی دی تھی۔“

”دی نہیں تھی۔ بس آپ کو پاس رکھنے کا ڈراما کیا تھا۔ آپ کو ہماری خوشی عزیز ہو تو آپ اپنا حق لیں یا پھر یہاں سے باہر چلیں۔ اب تو آپ میری مجبوری سمجھیں۔“ وہ باز آنے والی کہاں تھی۔ شاہدہ بیگم کو ہی لہجے میں تبدیلی لانی پڑی۔

”دیکھو تانیہ! یہ دل کانچ کے گھر ہوتے ہیں۔ ہلکی سی ٹھیس لگے تو چکنا چور ہو جاتے ہیں۔ اماں جان کی پوری زندگی اس حویلی میں گزری ہے۔ انہیں یوں ٹوٹا نہیں دیکھ سکتی۔“

”تو پھر مجھے ہی کوئی فیصلہ کرنا ہوگا۔“ وہ اڑ گئی۔

”مجھے آپ کے فیصلوں سے ڈر لگنے لگا ہے۔ عادل کے ساتھ جانے کیا سلوک کیا ہو؟“

”چھری نہیں ماری، صاف صاف انکار کر دیا ہے اور آپ کو یہ کام نانو کے ڈر سے کبھی نہیں کرنا تھا۔“ وہ بڑے فخریہ انداز میں بولی۔

”کبھی کبھی لگتا ہے کہ اس گھر میں، میں ہی مس فٹ ہوں کس کی کہوں اور کس کی سنوں یہ نیا گڑھا کھودا ہے آپ نے میرے لیے۔“ وہ خاصی رنجیدہ سی ہو کر چلی گئیں۔ جب کہ اس نے کندھے اچکا کر چیونگم چبانی شروع کر دی۔ کیونکہ اب وہ صرف اور صرف خرم کے لیے سوچنا چاہتی تھی۔

/.../

اگلی صبح اسے تیار دیکھ کر رفیعہ بیگم اور میاں ستار نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”عادل! کہاں جا رہے ہو؟“

”امی اسٹور نہیں کھولنا کیا؟“

”مگر رات تک تو تمہیں بخار تھا۔ میں جا کر کھول لیتا ہوں۔“ میاں ستار نے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

”نہیں ابا، اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس امی آپ چائے کا کپ بنادیں۔“ اس نے جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے کہا۔

”ہر گز نہیں۔ اپنی حالت دیکھو۔ ایک رات کے بخار نے کیسے توڑ کے رکھ دیا ہے۔“ رفیعہ نے صاف انکار کر دیا۔ تو وہ رات اور شام یاد کر کے کرب سے ہنس دیا۔

”ٹوٹ پھوٹ بھی زندگی کا حصہ ہے۔ ایک دم اچانک بہت کچھ ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔“

”کیسی مایوسی کی باتیں کر رہے ہو؟“ رفیعہ بیگم پریشان ہو گئیں۔

”نہیں امی جان! آپ کی تربیت نے میرے کردار میں مایوسی نہیں رکھی۔ ٹوٹ پھوٹ میں ہنس کر برداشت کر سکتا ہوں۔“

”خیر تو ہے۔ ایسی باتیں بلا وجہ کے تو تم نہیں کر سکتے۔“ میاں ستار کو کچھ تشویش سی ہوئی۔

”کچھ غیر متوقع نہیں ہوتا۔ مگر آپ فکر نہ کریں۔ امی چائے جلدی دیں ناشتے کا سامان لینے والوں کو بند دکان دیکھ کر پریشانی ہوتی ہے۔“ وہ یکسر ٹال گیا۔ مجبوراً رفیعہ بیگم کو چائے لانے کے لیے جانا پڑا۔

مگر انہیں دل ہی دل میں بہت فکر لاحق ہو گئی تھی۔ ہنستا بولتا گھر سے گیا اور یوں بخار میں پھنکتا گھر لوٹا۔ کیوں آخر کیوں؟ چائے بناتے ہوئے وہ مسلسل سوچتی رہیں۔ اس کو چائے کا کپ پکڑایا تو اس نے ماں کے چہرے پر پھیلی فکر دیکھ لی، مگر اس وقت کچھ بھی کہنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے چائے کا خالی کپ میز پر رکھ کے اسٹور کا بھاری سا چابیوں کا گچھا اٹھا کر باہر چلا گیا۔

”مجھے کچھ اور ہی بات لگ رہی ہے۔“ میاں ستار کے پاس بیٹھتے ہوئے رفیعہ بیگم بولیں۔

”کیا مطلب؟“ میاں ستار نے پوچھا۔



”کل عادل افتخار کی طرف گیا تھا۔ وہاں تو کچھ نہیں ہوا۔“

”افتخار کا وہ گھر نہیں ہے۔ اس لیے وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر کیوں گیا تھا۔“ انہوں نے سانس کو خاصا ہموار کر کے پوچھا۔

”وہ بس میں نے ہی چکر لگانے کو کہا تھا۔“ وہ اصل بات چھپا گئیں۔

”تو پوچھ لو افتخار سے کیا کہا ہے عادل کو؟“ میاں ستار نے اپنے کڑک لہجے میں بولے۔

”نہیں یہ مناسب نہیں، عادل سے ہی پوچھ لوں گی۔“ شاہدہ برا مان جائے گی۔“

”رفیعہ بیگم! بیٹے کی ماں بن کر بات کیا کرو۔“

”اللہ وہ دن تو لائے جب مجھے یہ خوشی محسوس ہو۔“ رفیعہ بیگم نے مسکرا کر جواب دیا۔

”افتخار کے پاؤں جلتے ہیں۔ یہاں آتے ہوئے۔ آئے تو اب کی بار ٹھوک بجا کر بات کروں۔ جانے کیا ٹال مٹول ہے؟“ میاں ستار بولے۔

”ٹال مٹول تو نہیں ہے۔ بس ویسے ہی جانے کیوں دیر کر رہے ہیں؟“

”تم اپنی تیاری مکمل کرلو۔ بس پھر میں افتخار کو ہلنے کو موقع نہیں دوں گا۔“ میاں ستار نے کہا تو رفیعہ بیگم کا چہرہ کھل اٹھا۔

”تیاری تو کر رہی ہوں۔ اکیلی ہوں عادل کے پاس اب فرصت نہیں رہی۔“

”بس ہمت سے کام لو، بھٹی صاحب کی بیوی کو ساتھ لے جایا کرو۔“ میاں ستار نے ہمسائے اکرم بھٹی صاحب کی بیوی کے لیے کہا۔

”کچھ تو کروں گی۔“

”بس سب اچھا ہوگا۔“

”عادل کے ابا ایک بات ہے۔“ وہ بولیں۔

”کیا؟“

”ہم شادی کسی بڑے گھر میں جا کر کریں تو اچھا رہے گا۔“ انہوں نے گھما پھرا کے دل کی بات کہہ دی۔

”یہ کس نے کہا؟“ وہ نخوت سے بولے۔

”کسی نے نہیں میرا خیال ہے۔ گھر چھوٹا ہے۔ گلی بھی تنگ ہے۔ اب تو عادل کا کاروبار اچھا چل رہا ہے۔ تانیہ بھی خوش ہو جائے گی۔“

”اچھا! ایک بار تانیہ کی ماں نے ہمارا گھر توڑا اب تانیہ کی خوشی اس میں ہے۔“ وہ طنزیہ بولے۔

”نہ... نہیں انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔“ وہ ڈر گئیں۔

”مجھے سبزی کی ٹوکری لادو، گوشت سبزی لے آؤں۔“ وہ یک سر ٹال کر کھڑے ہو گئے۔

”ناشتا تو کر لیں اور اپنی دوائیں بھی کھالیں۔“

”آکر کھاتا ہوں۔“ وہ بولے۔ تو وہ چپ ہو گئیں۔

/... /.../

”ہیلو!“ دوسری طرف سے فرحان کی آواز آئی تو وہ کھل اٹھی۔

”تم نے یاد رکھا فون کیا۔ سو سویٹ۔“ زرتاشیہ خوشی سے دیوانی ہو رہی تھی۔ قریب بیٹھی سامعہ نے پہلو بدلا۔

”ہاں کیسے ہیں سب؟“ وہ کچھ الجھن کا شکار تھا۔

”سب، سب ٹھیک ہے۔ تم کب آرہے ہو؟“

”سامعہ جی کیسی ہیں؟ ذرا ان سے میری بات کراؤ۔“ آخر کار اسے کہنا ہی پڑا۔ تو زرتاشیہ نے مسکرا کر فون سامعہ کو تھما دیا۔

”ہیلو!“ سامعہ نے کہا تو اب کی بار فرحان کھل اٹھا۔

”ہیلو جان! موبائل پر بات نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے لینڈ لائن نمبر ملانا پڑا۔ کیسی ہو؟“

”وہ میں بالکل ٹھیک، زرتاشیہ میرا بہت خیال رکھتی ہے۔“ زرتاشیہ کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے بتایا۔

”اور ہمارے بچے کا تم کتنا خیال رکھتی ہو؟“ وہ مخمور لہجے میں بولا۔ تو وہ گڑ بڑا گئی۔

”بہت بہت رکھتی ہوں۔ تھینک یو۔“

زرتاشیہ کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ پریشان سی ہو کر بولی۔

”اوکے، اب آپ زرتاشیہ سے بات کریں۔“ زرتاشیہ کو اور کیا چاہیے تھا وہ تو لپک کر فون کے قریب پہنچ گئی۔ سامعہ بد دلی سے واپس کرسی پر بیٹھ گئی۔

”ہیلو، ہیلو۔“ زرتاشیہ نے دوبار پکارا اور پھر...

”او شٹ! لائن کٹ گئی۔“ کہہ کر برا سا منہ بنایا۔ سامعہ سمجھ گئی کہ فرحان نے دانستہ فون بند کیا ہے۔

”میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔“ سامعہ نے کچھ اداس سے لہجے میں کہا تو زرتاشیہ نے نفی میں گردن ہلادی۔

جی نہیں، آپ کہیں نہیں جا رہی، پیپا ہم دونوں کو باہر کھانا کھلانے لے جا رہے ہیں۔“

”نہیں، مجھے تو کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میری کنڈیشن تو سمجھتی ہو نا۔“ وہ بولی مگر زرتاشیہ نے ایک نہ سنی۔

”کچھ نہیں ہوا آپ کو، باہر بالکل نہیں جاتیں۔ جو آپ کو اچھا لگے گا وہی کھائیں گے۔“

”مگر...“

”اگر مگر کچھ نہیں۔“

”دل نہیں چاہ رہا۔“

”سامعہ جی! فی الحال تو یہ طے ہے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ

خوش رہیں ورنہ میرے پاس بھی دل کی اداسی کا بہت سا سامان ہے۔“

زرتاشیہ نے اس کا ہاتھ تھام کر بہت اپنائیت سے کہا۔ سامعہ کو اس کی آنکھوں میں پھیلی نئی لہجے میں اتری اداسی صاف محسوس ہوئی تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”سوری مجھے خیال نہیں رہا کہ...“

”بس کچھ نہیں آپ کچھ نہ کہیں میری سنیں۔ آج دوپہر میں ماما کا فون آیا تھا۔ وہ اب تک اپنے لیے جیتی ہیں۔ مجھے محسوس کرنا چاہتیں ہیں اپنے پاس بلا کر۔“ وہ حد درجہ دکھی ہو کر بولتی چلی گئی۔

”نہیں، وہ تمہیں اپنے سے الگ کر ہی نہیں سکتیں۔ یہ سب وقتی اور جذباتی

فیصلے ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اور ہاں آج وہ سیاہ شیفون والا سوٹ

پہنواس میں بالکل انگریزی گڑیا لگتی ہو۔“ سامعہ نے اس کے بال شرارت

سے چھیڑے تو وہ مسکرا دی۔

”اور آپ پیچ کھر والی ساڑھی پہنیں۔“

”کیا ساڑھی وہ بھی میں؟“

”جی ہاں۔“

”جی نہیں، میں آپ کا لایا ہوا بلو شلوار سوٹ پہنتی ہوں۔“ سامعہ یہ کہہ کر

کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ مگر زرتاشیہ کے اطراف میں پھر اداسی سی پھیل گئی۔ جسے کافی دیر بعد وہ دور کرنے میں کامیاب ہوئی۔ حالانکہ یہ بھی اس کی ناکام کوشش ہوتی تھی۔ ماں کیسی بھی ہو اولاد کے لیے اس کی ذات ضروری اور اہم ہوتی ہے۔

/.../

باوردی چپراسی نے آفس کا دروازہ کھول کر اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ وہ

بے باکی سے اندر داخل ہو گیا۔ خوب صورت مگر چھوٹے سے آفس میں فائلوں

پر جھکی شاہدہ بیگم نے اپنے مخصوص دھیمے سے پر تبسم انداز میں اسے دیکھا

اور بولیں۔

”بیٹھو عادل۔“

”شکریہ!“ وہ کہہ کر کرسی پر ٹک گیا۔

”کیا لو گے، ٹھنڈا یا چائے۔“ انہوں نے عینک اتار کر پُر سکون لہجے میں پوچھا۔ یہ ان کی شخصیت کا کمال تھا کہ ہمیشہ دھیمی، نرم سی مسکراہٹ اور دبا دبا لہجہ تلخیوں سے سلگتی لکڑیوں پر بھی ٹھنڈے پانی کا چھینٹا مار کے رکھتی تھیں۔

”کچھ نہیں، آپ نے بلایا ہے، یقیناً کچھ بات ہوگی۔ ٹھنڈا گرم پلانے کے لیے تو نہیں بلایا ہوگا۔“ عادل ستار جیسی کڑوی گولی نگلنا بھی کچھ آسان کام نہیں تھا۔

”عادل بیٹا! شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

”چلیے اب کہہ دیجیے مجھے ذرا جلدی ہے۔“

”عادل بیٹا جب آپ کے چاچو نے مجھے پسند کیا تھا اور ہمارے درمیان شادی کے جہاں دوسرے معاملات ڈسکس ہوئے وہاں پہلا مسئلہ گھر داماد بن کر رہنے کا تھا۔ جسے افتخار نے قبول کر لیا تھا۔ اب تانیہ کو اس شرط پر ہی میں بیاہوں گی۔“

”چچی! آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تانیہ نے جو کہا میں نے قبول کر لیا۔ بلاوجہ آپ کو یہ کہانی بنانی پڑی۔ دوسری بات یہ کہ چاچو کی کہانی میں دُہرا بھی نہیں سکتا تھا۔“ ان کی آنکھوں سے آنکھیں ملاتے ہوئے وہ خاصے تحمل اور اعتماد سے بولا۔ شاہدہ بیگم کو ندامت سی ہوئی۔

”تانیہ نے کیا کہا ہے؟“ وہ انجان بن کر بولیں۔

”جو وہ کہنا چاہتی تھی، اس نے کہا اور میں نے مان لیا کہانی ختم۔“

”لیکن، بھائی میاں اور بھابی...؟“ ان کی زبان لڑکھرائی۔

”انہیں بھی آپ کی شرط منظور نہیں ہوگی۔“



”مگر وہ خفا ہوں گے۔“ وہ دھیرے سے بولیں۔

”آپ چاہتی ہیں، رشتے کے خاتمے کی وجہ میں بتائوں۔“ اس نے ہنس کر پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم تانیہ نے کیا کہا، لیکن گھر دامادی یا پھر گھر بدلنے کی خواہش میری ہے۔“ انہوں نے سارا الزام اپنے سر لے لیا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے تانیہ کی خواہش قابل احترام ہے۔ باقی سب باتیں تو بعد میں آتی ہیں۔“

”ابھی آپ کے چاچو سے اس موضوع پر میں نے بات نہیں کی بلکہ اور بھی کسی سے نہیں کی۔“

”یہ آپ کا مسئلہ ہے۔ تانیہ سے بات کرنے کے بعد ہی آپ نے مجھ سے بات کی ہے۔“ اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا تو وہ پہلو بدل کے رہ گئیں۔

”آپ کیسے گھر میں بات کرو گے؟“

”وہ میرا گھر ہے۔ میں جو بہتر سمجھوں گا وہی کروں گا۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

”عادل مجھے آپ بہت پسند ہو، بس کاروبار اور گھر والا مسئلہ درمیان میں حائل ہے۔“ انہوں نے بات بنائی۔

”جھوٹ کا سہارا مت لیں، تانیہ جسے پسند کرتی ہے میں اسے جانتا ہوں اور رہی بات کاروبار کی تو میں الحمد للہ بہت خوش ہوں۔ محنت کی حلال روزی کماتا ہوں۔“ وہ تن کر بولا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ شاہدہ بیگم کو اس سے اسی قسم کے رویے کی امید تھی، مگر اصل مسئلہ تو آگے کا تھا۔ افتخار کو سمجھانا، اماں جان کو خاموش اور بھائی میاں کو راضی کرنا۔ یہ سب بہت مشکل کام تھا۔

”او تانیہ! تم نے میرے لیے ایک ہی وقت میں کتنے محاذ کھول دیے ہیں۔ کیوں ماں کو آزمائش میں ڈالتی ہو؟ وہ سر تھام کے بیٹھ گئیں، مگر اب

تو جو ہونا تھا ہو گیا تھا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ اچھا ہوا یا برا بس ہو گیا تھا۔ آگے کیا ہونا تھا۔ اس بارے میں وہ دلی طور پر فکر مند ضرور ہو گئی تھیں۔

/... /... /

عادل سے بات کر کے دلی طور پر خوش اور مگن تو تانیہ ہو گئی تھی۔ خرم کا فون آیا تو وہ کھل اٹھی۔

”اف خرم تم یہاں ہوتے تو بہت انجوائے کرتے۔ میں نے ایک ہی وار میں عادل کا قصہ تمام کر دیا۔

”ارے‘ ارے تم نے عادل کا مرڈر کر دیا۔“ خرم نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تو وہ ہنسنے لگی۔

”مرڈر کی ضرورت نہیں پڑی ڈیر وہ خاصا سمجھ دار نکلا۔“

”یو مین‘ تم نے اسے انکار کر دیا۔“ اسے کچھ حیرت ہوئی۔

”ہاں۔“ وہ بالکل نارمل سے لب وہ لہجے میں بولی۔

”او کو نگر پچو لیشن! گڈ اس کا مطلب اب تم آزاد ہو۔“ خرم نے ترنگ میں کہا۔

”جی جناب! اب جب میں اوکے کا سگنل دوں تم اپنے پیرنٹس کو بھیجنا۔“ وہ بولی۔

”لیکن یار! میں امریکا میں بیٹھا ہوں یہ کام بھی تم کو ہی کرنا پڑے گا۔“ وہ بولا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا...؟“ اسے ذہنی جھٹکا لگا۔

”کم آن سلی گرل! اب تم اتنی معصوم بھی نہ بنو۔“ وہ شاید چیونگم چبا رہا تھا۔ اس لیے کچھ عجیب سی آواز بن کر اس کی سماعت میں اتری۔

”خرم! کہنا کیا چاہ رہے ہو...؟“

”یار بہت آسان ہے ڈیڈ‘ مام اسلام آباد جا چکے ہیں۔ تم ان سے رابطہ کرو اور اپنا پراہلم بتاؤ۔ میں امریکا میں ہوں۔ کوئی شیخوپورہ میں نہیں۔“

خرم! تم سمجھ سکتے ہو کہ تم نے کیا کہا ہے؟ میرا پر اہلم، یہ صرف ایک پر اہلم ہے وہ بھی میرا اور میں تمہاری ماما کو یا ڈیڈ کو بتاؤں۔“ اس نے چبا چبا کر حیرت و افسوس کے ساتھ پوچھا۔

”تم نے رشتا ختم کیا ہے اب مجھ سے رشتا جوڑنا ہے۔ تو یہ فی الحال تو پر اہلم ہے۔“ وہ سادگی سے بولا۔

”پھر پر اہلم کہا۔“ وہ چلائی۔

”اوکے، اوکے سوری، ڈیئر براڈ ماسٹڈ فیملیز میں شامل ہونے کے لیے ان کی طرح سوچتے ہیں۔ تم جب چاہو جو چاہو میری مام سے بات کرلو۔ پھر وہ جو کہیں وہ مجھے بتا دینا۔“ اس نے خاصی بے پروائی سے کہا۔ اس کو خرم بالکل نیا نیا سا لگا۔ لا اُبابی اور بے پروا تو وہ پہلے بھی تھا، مگر یہ وہ کام تھا جس کے لیے اسے اپنے مام، ڈیڈ سے بات کرنی چاہیے۔

”مگر یہ کتنا برا لگے گا، لڑکیاں بھی کبھی بات کرتی ہیں۔“

”لڑکیاں رشتے ختم کر سکتی ہیں تو یہ کیوں نہیں کر سکتیں اور پھر میں اجازت دے رہا ہوں۔“ وہ زور دے کر بولا۔

”تم ٹیز کر رہے ہو۔“ وہ بگڑی۔

”یار! تم بہت زیادہ بزدل ہو گئی ہو۔“ وہ ہنسا۔

”شٹ اپ!“ اس نے غصے سے کہا۔ تو وہ ہنستا چلا گیا۔

”تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“

”اوہ! سوری اچھا یہ بتاؤ باقی سب لوگ کیسے ہیں خاص کر تمہاری نانو۔“ اس نے موضوع بدلا۔

”سب ٹھیک ہے ابھی تک۔“

”ابھی تک سے کیا مراد ہے؟“

”یہی کہ عادل والی بات ماما کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔“

”ہوں! اس کا مطلب ہے طوفان آنے والا ہے۔“ وہ پھر شرارت سے بولا۔

”جی ہاں جس کا مجھے ہی سامنا کرنا ہے۔“

”آف کورس کیونکہ یہ اچھے بھلے آدمی کی توہین بھی تم نے ہی کی ہے۔“

”کیا...!“

”ہاں! تمہیں معلوم ہے ہم اچھے دوست تھے، ہیں اور رہیں گے مگر تمہیں دوستی رشتے میں بدلنے کے لیے اچھے آدمی کو چھوڑنا پڑا ہے سو فیس بھی تم ہی کو کرنا ہے۔“ اس نے بڑے اطمینان سے گیند اس کے کورٹ میں ڈال دی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ جواب دیتی۔ اس نے اچانک فون بند کرنے کی اطلاع دی یہ کہہ کر۔

”اوکے سویٹ ہارٹ، مجھے کہیں کسی کے ساتھ جانا ہے، تمہارا جو بھی پروگرام بنے بتا دینا بائے۔“ فون بند ہو گیا۔

/.../...

بڑی بیگم صاحبہ نے ہمیشہ کی طرح مہینے کی پانچ تاریخ کو پر تکلف کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ یہ کھانا وہ بہت شوق اور خوشی سے تیار کرتی تھیں۔ زبیر احمد، زرتاشیہ یا اور فیملی ممبر کو کبھی پانچ تاریخ نہیں بھولتی تھی۔ سبزی، گوشت، مرغی، مچھلی، دال چاول، دہی، سلاد اور بہت کچھ تیار کراتی تھیں۔ اس لیے اس کھانے کو سب ہی بہت انجوائے کرتے تھے۔ اس بار فرحان ملک سے باہر تھا۔ سب کے ہوتے صرف تانیہ کچھ بجھی بجھی اور کھوئی کھوئی سی اپنے کمرے میں بند تھی۔ شاہدہ بیگم خود کچھ سمجھ کر شوکی کو اسے بلانے کے لیے کہنے صحن میں گئیں اور واپس آگئیں۔ سامعہ کا دل کچھ کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر زرتاشیہ نے پلو پکڑ کر برابر بٹھالیا۔ وہ بہت خوش تھی۔

”تانیہ بی بی سو رہی ہیں۔“ شوکی نے آکر اطلاع دی۔ تو اماں جان نے ہزار ہا شکنیں پیشانی پر ڈال کر شاہدہ بیگم کو مخاطب کیا۔

”شاہدہ! اچھی بیٹی تو نہ بن سکیں اچھی ماں تو بن جائو۔ کچھ تو بیٹی کو ادب آداب سکھا دو۔ کل پرائے گھر کیا کرے گی۔“ شاہدہ بیگم شرمندہ سی ہو گئیں اور میاں افتخار کو دیکھنے لگیں۔

”اماں جان! وہ پرایا گھر نہیں ہے تانیہ کے تایا جی کا گھر ہے۔“ میاں افتخار نے ذرا سے فخریہ انداز میں بتایا تو شاہدہ بیگم مزید مضطرب سی ہو گئیں۔

”سسرال‘ سسرال ہوتا ہے بر خوردار۔“ اماں جان نے کڑک دار لہجے میں جواب دیا۔

”ارے چھوڑیں اماں جان بچی ہے۔“ زبیر احمد نے اپنی پلیٹ میں کھانا ڈالتے ہوئے کہا۔

”رات فرحان نے مجھے فون کیا تھا۔ سب کو سلام دے رہا تھے۔“ ایک دم ہی زرتاشیہ نے دل میں چٹکیاں لیتی خوشی پیش کردی۔ میاں افتخار کے ہاتھ سے نوالا پلیٹ میں گر گیا۔ اماں جان کھل اٹھیں شاہدہ بیگم مسکرا دیں اور ماں

کو دیکھنے لگیں۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ فرحان کی تربیت بھی وہی کر رہی ہیں۔ سامعہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ بات کچھ سے کچھ بن گئی۔

”شکر اللہ پاک کا۔“ اماں جان بولیں۔

”جی ہاں! الٹی گنگا بہنے لگی ہے۔“ میاں افتخار نے خاصے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

”یہ گنگا کہاں سے بیچ میں آگئی؟“ اماں جان چونکیں۔

”ہمارا مطلب ہے کہ چلو بیٹے کو عقل تو آئی۔“ میاں افتخار بولے۔

”ارے بھائی جان! سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس اب فرحان کی واپسی پر کوئی تاریخ طے کر لیتے ہیں۔“ زبیر احمد نے جلدی سے کہا۔

”بچی کی ماں کے متعلق کیا سوچا آپ نے؟“ میاں افتخار نے دانستہ اچھے وقت پر بڑی تلخ سی بات کہہ دی۔ ایک دم سناٹا چھا گیا۔ زبیر احمد کے چہرے کا



رنگ متغیر سا ہو گیا۔ جب کہ یہ بات زرتاشیہ کو بھی اچھی نہیں لگی۔ وہ ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ کھانا چھوڑ کے اپنے پورشن کی طرف چلی گئی۔

”بھائی جان! وہ تو نرگھس کی مرضی پر چھوڑ چکا ہوں۔ وہ جو چاہے“ جو کہے مجھے اس کے فیصلے کا انتظار ہے۔ زبانی کلامی تو وہ ختم کر چکی ہے۔ شاید قانونی سطح پر دیر ہو رہی ہو، مگر میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میری زرتاشیہ کی شادی سے اس کا کیا تعلق؟“ زبیر احمد خاصے سنجیدگی سے بولے۔

”یار! ویسے ہی پوچھ لیا اور کوئی مقصد نہیں۔“ میاں افتخار شرمندہ ہو گئے۔

”زبیر! آپ فکر نہ کرو میں ایک دو روز میں شاپنگ شروع کر رہی ہوں۔“ شاہدہ بیگم نے بھائی کو اطمینان دلایا۔ سامعہ سے وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ وہ بھی معذرت کر کے اٹھی اور چلی گئی۔

”اور کیا پتا کہ بیٹی کی شادی کی خبر سن کر نرگھس کو ہوش آجائے۔“ اماں جان نے کہا۔

”ایکسیوز می!“ میاں افتخار اٹھے اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

/... /.../

انجم اپنے شاپنگ بیگ لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ تو وہ اپنے کمرے کی طرف جانے کو مڑی، مگر کوریڈور میں افراسیاب نے اپنے کمرے کے دروازے سے باہر نکل کر اسے مخاطب کیا۔

”واہ! ماں ہو تو آپ جیسی ادھر بیٹی بلک بلک کے روئے اور یہ کہے کہ وہ اپنی ماما سے اب نفرت کرتی ہے۔ بتا دو میری ماما کو اور یہاں آپ مگن، خوش باش خریداری میں مصروف ہیں۔“

”کہنا کیا چاہتے ہو؟“ نرگھس کو حیرت نے گھیر لیا۔

”یہی کہ آپ کی بیٹی آپ سے نفرت کرنے لگے گی، اگر آپ نے اسے محسوس نہ کیا تو۔“

”یہ سب کس کے لیے ہے۔ کھول کے دیکھو یہ سب پیکٹ اس میں زرتاشیہ کے لیے ہی سب کچھ ہے۔“ نرگھس نے جذباتی ہو کر کہا۔

”مگر میری پیاری پو‘ اسے ان چیزوں کی نہیں آپ کی ضرورت ہے۔ اس نے فون پر کچھ دیر پہلے اپنے جذبات کا رو کر اظہار کیا ہے۔ اس کی شادی کا فیصلہ ہو رہا ہے اور آپ بے خبر ہے۔“ افراسیاب نے کہا۔

”تو وہ خود بھی تو یہی چاہتی ہے اپنے ددھیال سے رشتا جوڑنا اس کی خوشی ہے۔“

”تو آپ کو اس کی خوش میں خوش ہونا چاہیے۔“

”تم کچھ نہیں جانتے میں نے کیسے ان کے ساتھ وقت گزارا ہے۔ زرتاشیہ کی فرحان سے شادی میں نہیں چاہتی۔“ وہ سارے سامان کے ساتھ آگے آگے چل دی تو وہ بھی پیچھے پیچھے آ گیا۔

”مگر زرتاشیہ فرحان کو چاہتی ہے۔ یہ اس کے دل کا فیصلہ ہے آپ اپنے جھگڑے میں اسے کیوں گھسیٹ رہی ہیں؟“

”مگر میرا انتخاب تم ہو اور زبیر احمد سے کوئی سمجھوتہ میں نہیں کر سکتی۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

”مجھے آپ کا انتخاب نہیں زرتاشیہ کا انتخاب ہونا قبول ہوتا۔“ وہ بہت سنجیدگی سے بولا۔ تو انہوں نے گھوم کر دیکھا۔

”افراسیاب! سب مل کر مجھے ہی غلط کیوں ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔“

”پو! آپ غلط سوچ رہی ہیں۔ ہم سب آپ کے خیر خواہ ہیں، لیکن جو کسی کی مرضی اور خواہش ہو اسے بدلنے کی کوشش میں نہیں کرتا۔ زرتاشیہ بہت اچھی ہے۔ چاہے جانے کے قابل، پرستش کے لائق مگر اس کے سینے میں ایک دل بھی تو ہے جو اسے اپنی مرضی پر چلاتا ہے۔ آپ اپنے جھگڑے میں پلیز اس کے لیے غلط نہ سوچیں۔“ افراسیاب نے اس کو کندھوں سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بہت پیار سے کہا۔

”اچھا، وکیل صاحب کا بتاؤ اب تک میرا کام نہیں کر سکے۔“ وہ بگڑ کر بولی۔

”کل وکیل صاحب کے چمبر کے سامنے سے گزرے ہیں۔ مگر آپ کے بڑے بھیا ہمراہ تھے آج پھر جائوں گا۔“

’جب تک کام نہ ہو بڑے بھیا کو مت بتانا۔‘

”پو! ایک بات کہوں۔“ افراسیاب نے مسکرا کر شریر لہجے میں پوچھا۔

”ہنہ۔“

”اب آپ بڑی اور سمجھ دار ہو ہی جائیں وکیل صاحب سے ابو جان تقریباً روز ہی ملتے ہیں کیا ممکن ہے کہ وکیل صاحب تذکرہ نہ کریں۔“

”پھر ایسا کرو کسی اور وکیل سے ملو۔“ وہ پریشان ہو گئی۔

”یہ آپ نے مجھ پر چھوڑ رکھا ہے میں خود یہ کام کرا لوں گا۔“

”میں زرتاشیہ کا یہ پیکٹ آج ہی کوریئر سروس کے ذریعے بھیجنا چاہتی ہوں۔“

”اس کا کوئی فائدہ نہیں، جتنی وہ مشتعل ہے وہ یہ دیکھ کر مزید بھڑک اٹھے

گی۔ کچھ صبر سے کام لیں، ہو سکتا ہے وہ آجائے۔“ ایک خوش کن امید کے

سہارے اس نے سمجھایا تو وہ سمجھ گئی۔

/.../...

”شاہدہ‘ شاہدہ!“ اماں جان آوازیں ہوئیں ان کے کمرے میں آگئیں شاہدہ بیگم نے لا کر بند کر کے ان کی جانب توجہ کی۔

”جی اماں جان!“ وہ بولیں۔

”کیا کر رہی تھیں؟“ اماں جان نے لا کر بند کرنے کے بعد پوچھا۔

”وہ میں زیورات دیکھ رہی تھی۔ سب تقریباً اولڈ فیشن ہیں۔ انہیں زرتاشیہ کے لیے نئے سرے سے بنانا چاہیے۔“

”اولڈ والا خناس تمہارے ذہن میں بھی گھسا ہوا ہے۔ بھئی گولڈ گولڈ ہوتا ہے۔ زرتاشیہ تو بہت صابر شاکر بچی ہے۔ اس کے لیے سونا سنار کے بھینٹ چڑھانے کی ضرورت نہیں۔“ وہ تنبیہ کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

”پھر بھی زرتاشیہ کی مرضی تو پوچھنی ہوگی۔ اور کنگن کڑے میرے سائز کے مطابق ہیں اس کی نازک کلائیوں کے حساب سے بنیں گے۔“ وہ نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولیں۔

”چلو، چوڑیاں اور کڑے بنالو، باقی زیورات نہ میرے ٹوٹے پھوٹیں گے اور نہ تمہارے۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”اماں جان! زمانے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔ کچھ تبدیلی کے ساتھ چیزیں نئی ہو جاتی ہیں کچھ پرانی چیزیں چھوڑ کر نئی بنانی پڑتی ہیں۔“ شاہدہ بیگم کے لبوں پر کوئی بات آنے کی الجھن کا شکار تھی۔ تانیہ کی حویلی بیچنے کی ضد اور خرم سے رشتا جوڑنے کی فرمائش نے انہیں مضطرب کر رکھا تھا۔ عادل سے تعلق کے خاتمے کا ذکر کسی سے اب تک نہیں کیا تھا۔ شش و پنج میں گرفتار تھیں۔

”صاف صاف کہو جو کہنا ہے۔“ اماں جان نے کہا۔

”اماں جان! ہمارا زمانہ ہم نے گزار لیا۔ اب ہمارے بچوں کو اپنی مرضی سے رہنا ہے اس حویلی سے میرا روحانی تعلق ہے۔ یہ مجھے تو بہت پیاری ہے، مگر اب یہ بچوں کی ضرورت پر پوری نہیں اترتی خستہ حالت ہے، اس کی پیئٹینس پر بہت سا پیسا لگانے کے باوجود کچھ حاصل نہیں ہوگا۔“ نظریں

جھکائے جھکائے وہ اصل موضوع کی طرف آگئیں۔ اماں جان کی پیشانی پر چند سلوٹیں نمایاں ہوئیں۔

”اچھا! تو یہ غبار تمہارے دل میں اٹھایا گیا ہے۔“

”میں نے خود سمجھا ہے۔“

”اور کیا، کیا سمجھا ہے تم نے؟“

”آپ خفا نہ ہوں بلکہ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں۔“ وہ کافی ہمت کر کے بولیں۔

”واہ شاہدہ! خوب ماں کی عزت کی ہے بوڑھی ماں کو چھوڑنے کے بارے میں سوچنے لگی ہو۔“ وہ طنزیہ بولیں۔

”خدا نہ کرے۔“ سچ مچ شاہدہ بیگم کے دل سے نکلا۔

”ارے یہ چھوڑنا ہی ہے، کیونکہ ہمارے جیتے جی یہ حویلی نیلام ہوگی نہیں دوسری صورت میں تم لاڈلے بچوں کے کہنے پر کوٹھی بنگلے میں جائو گی۔ ہم

وہاں جائیں گے نہیں۔“ انہوں نے خوب گھن گرج کے ساتھ عدالتی فرمان جاری کر دیا۔ شاہدہ بیگم کے پاس کوئی جگہ نہ رہی فقط اس میں کہ وہ منت سماجت پر اتر آئیں۔

”پلیز اماں جان ایسے نہ کہیے۔ نہ ہم آپ کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ آپ کے بنا کہیں جا سکتے ہیں۔“

”تو پھر پلو میں گرہ لگاؤ۔ ایسا ہر گز نہیں ہوگا۔ سمجھا دو لاڈلی کو ویسے بھی اسے یہاں سے ستار کے گھر جانا ہے۔ وہ محل نہیں ہے۔ ہماری حویلی سے بہت چھوٹا گھر ہے۔ محلہ بھی بہت چھوٹا ہے۔“

”اسی لیے تو آپ نے مجھے وہاں نہیں بھیجا تھا۔“

”نہیں یہ بات نہیں تھی ہمیں ایسا محسوس ہوا تھا کہ شاید تم وہاں زیادہ دن نہیں رہ سکو گی۔“ وہ صاف گوئی سے کہہ گئیں۔

”تو آپ سمجھتی ہیں کہ تانیہ وہاں رہ لے گی۔“ شاہدہ بیگم دانستہ انہیں اس پٹری پر ڈال رہی تھیں۔ جو تانیہ نے بدل لی تھی۔

”ہاں! اور کل کس نے دیکھا ہے عادل نئی کوٹھی، بنگلہ لے کر رکھ سکتا ہے۔“ وہ وثوق سے بولیں۔

”یہ صرف خواب خیال کی باتیں ہیں۔“ وہ بڑ بڑائیں۔

”بہر کیف! ہم جو بات کرنے آئے تھے وہ بھلا دی۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئیں۔

”تو بیٹھ جائیں یاد آجائیں گی۔“

”ارے بڑھاپے میں مت ماری جاتی ہے۔ ویسے بھی ناجی کو زرتاشیہ نے بلایا تھا۔ سامعہ کے لیے انار کے دانے نکلوا کر شربت بنوانا ہے۔ میں ہانڈی چولہا دیکھوں۔“ وہ یہ کہہ کر باہر چلی گئیں۔ تو شاہدہ

بیگم بچھ سی گئیں۔ اماں جان نے امید کی کرن بجھا دی تھی۔ وہ بے دم سی بیڈ پر گر گئیں۔



یہ وہ مرحلہ تھا جس پر وہ مکمل بے بسی کا شکار ہو گئی تھیں۔ عادل کو چھوڑنے اور خرم کو منتخب کرنے کے فیصلے پر تو وہ خاموش ہو گئیں تھیں، مگر اماں جان کو تو وہ نہیں چھوڑ سکتی تھیں اور اس صورت میں نہ حویلی بیچ سکتی تھیں نہ یہاں سے کہیں اور شفٹ ہو سکتی تھیں، پھر کیا ہوگا؟ تانیہ کو کیسے راہِ راست پر لائیں، اس کو کیسے سمجھا پائیں گی؟ یہ سوچتے سوچتے سر درد سے پھٹنے لگا۔ اپنے دل کا بوجھ کیسے ہلکا کریں؟ یہ سوچ ان کی بے سکونی کا سبب بن گئی۔

ظظظ

وہ باہر نکلنے کو تیار تھا کہ پہلے بوندا باندی شروع ہوئی اور پھر بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اسے فارم ہائوس ابو کے پاس پہنچنا تھا، مگر اب فون کر کے بتانا پڑا۔ عمر دین سے کافی کا مگ منگوا کر بالکونی کی طرف بڑھ گیا۔ باہر برستے پانی کے شور میں نرگھس پو کا مست کر دینے والا جملہ انگڑائی لینے لگا۔ ”تم نہیں چاہتے کہ زرتاشیہ یہاں آئے۔“ اس کے لبوں سے بھاپ اڑاتے کافی کے مگ نے لگے لگے بھی چپکے

چپکے سے بڑ بڑانے پر مجبور کر دیا۔ ”ہاں! مگر ایسا کیسے ممکن ہے کہ میرے چاہنے پر وہ آجائے۔ ایسا ہو بھی سکتا ہے بلکہ کبھی یوں بھی ہو سکتا ہے کہ دریا کا ساحل، پورے چاند کی رات ہو اور وہ آجائے۔ کبھی یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ پیاروں کی محفل ہو، کوئی اس کی بات ہو اور وہ آجائے۔ کبھی یوں بھی ہو سکتا ہے کہ بادل ایسا ٹوٹ کے برسے، میرے دل کی طرح اس کا بھی ملنے کو دل ترسے اور وہ آجائے اور کبھی برسات ہو اور وہ آجائے۔ اسی وقت زور سے بجلی کڑکی تو وہ چونکا۔ ذہن نے ملامت کی۔

”نہیں افراسیاب، ایسا نہیں سوچ سکتے۔ یہ تمہارے کردار اور اخلاق کی توہین ہے۔ جسے وقت اور تقدیر کے فیصلے نے کسی اور کے لیے محفوظ کر دیا۔ وہ تمہارے پاس کیوں آئے؟ پھر اس کی پسند، منزل، تمنا اور خواہش کو تم نے پہلی چٹکی کے ساتھ ہی جان کر پسِ دل و دماغ چھپا دیا تھا۔ وہ اس بھیگے موسم میں کیوں اس طرح یاد آرہی ہے؟“

”افراسیاب!“ پشت سے انجم کی آواز آئی تو وہ ایک دم پلٹا۔

”جی امی!“

”کیا سوچنے لگے ہو؟“ انہوں نے اس کی نگاہوں سے اندر تک جھانک کر پوچھا۔

”کچھ... کچھ نہیں۔“ وہ ہکلا یا۔

”بیٹا! کبھی تم نے نہیں سوچا یہ آنکھیں چور ہوتی ہیں۔ زبان شوق بن جاتی ہیں۔ بالکل کانوں میں دھڑکتی ہیں۔“ انجم نے بہت شیریں لہجے میں اس کے کہا تو وہ کچھ جزبز سا ہوا مگر پھر فوراً سنبھل گیا۔

”امی! مجھے معلوم ہے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں، مگر مجھے ضبط کا لمحہ نبھانا آتا ہے۔ نہ میری آنکھیں ہار سکتی ہیں اور نہ کمزور ہو سکتی ہیں۔“

”بیٹا! میں چاہتی ہوں آپ کسی نہ کسی کے لیے ضرور سوچو، مگر اس گھر سے نظریں بچا کر، نرگھس نے جس طرح بدمزگی پیدا کر دی ہے اس کو ہمیں مزید بگاڑنا نہیں ہے۔ آپ کے ابو نے اپنے دو قریبی دوستوں کی بیٹیوں کے لیے

کہا ہے کہ میں دیکھ لوں۔“ انجم نے بڑی ذہانت سے اس کا کچھ لمحے پہلے کا میلان بدلنے کی کوشش کی۔

”ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے۔“

”مگر...“

”امی پلیز، ابھی نہیں۔ جب میں کہوں۔“ اس نے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔

”ٹھیک ہے میری جان جیسا تم کہو۔“ انجم نے بیٹے کا ہاتھ چوم لیا۔

”آپ اور ابو نرگھس پو کو سمجھاتے رہا کریں۔“

”وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔“

”ادھر زرتاشیہ کی شادی کی تیاری ہو رہی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیا؟ کس نے بتایا۔“ وہ چونکیں۔

”زرتاشیہ نے فون پر بتایا تھا وہ بہت ڈسٹرب تھی، رو رہی تھی اور پو سے

نفرت کا اظہار کر رہی تھی۔“ وہ بہت سنجیدگی سے بولا۔

”اِخاہ! بہت پیاری بچی ہے اور بہت بڑی غلطی نہ گھس کر رہی ہے۔“ انجم نے دُکھ بھری سانس کھینچ کر کہا۔

”بس دعا کریں کہ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے۔ میں یہ غلطی بہتر کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔“

”آمین۔“ انہوں نے صدق دل سے کہا۔ تو وہ مخمور خیالات کو ذہن میں مقفل کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆؟☆☆☆

عدالتی کاغذات کا وزنی سا لفافہ اس نے میز پر رکھ دیا اور خود کپڑے چینچ کرنے کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ رفیعہ بیگم نے اس کے محتاط رویے کے باوجود دروازہ کھلنے، بند ہونے اور موٹر سائیکل لاک

کر کے اندر جانے تک سب جان لیا۔ وہ کچھ دنوں سے اس کے اندر پیدا ہونے والی اس نئی تبدیلی کو محسوس کر رہی تھیں۔ مگر نہ پوچھ سکیں اور نہ اس نے کچھ بتایا۔ رات کو بہت دیر سے آنے لگا تھا۔ کھانے، پینے آرم کرنے

سے غافل ہو گیا تھا۔ وہ خاموشی سے ہمت کر کے اُٹھیں اور سیدھی اس کے کمرے میں آ گئیں۔ وہ واش روم سے آچکا تھا۔ انہیں اتنی رات گئے جاگتا دیکھ کر مسکرایا۔

”ماں، ماں، پیاری ماں۔“

”کوئی مکھن بازی نہیں، مسکا بازی نہیں۔“ وہ کچھ خفگی سے بولیں۔ تو وہ ان کے گلے میں بازو ڈال کر بولا۔

”ماں کے لیے مکھن کی ضرورت نہیں ہوتی وہ تو اپنے بچوں کے لیے خود مکھن ہوتی ہے۔“

”مکھن ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ اولاد آنکھوں میں دھول جھونکنے لگے۔“ انہوں نے دھیرے سے جواب دیا۔

”اللہ نہ کرے، ویسے آپ اب تک کیوں جاگ رہی ہیں؟“

”عادل! تم نے آج تک جھوٹ نہیں بولا میں چاہتی ہوں کہ تم آج بھی مجھ سے سچ بولو۔“ انہوں نے اس کے کمرے میں پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا تو وہ کچھ سمجھ گیا۔ مگر چپ رہا۔

”مجھے سچ بتاؤ۔“ انہوں نے اصرار کیا۔  
 ”کون سا سچ؟“

”تم میں غیر معمولی تبدیلی کی وجہ۔“

”کاروبار کو اتنا وقت دینا پڑتا ہے اور تو کچھ تبدیلی نہیں۔“ وہ ٹال گیا۔

”عادل! میں کیسے مان لوں کہ تم الجھے الجھے اور گم صم نہیں ہو۔“

”امی! کبھی کبھار کوئی مصروفیت اس قسم کی ہوتی ہے یہ، یہ لیں یہ رہائشی پلاٹ میں نے قسطوں پر خریدا ہے۔ مگر اس کا ذکر فی الحال ابا سے نہیں کیجیے گا۔“ اس نے میز پر سے لفافہ اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا۔ تو وہ فکر اور اچانک ملنے والی خوشی کے درمیان جھولنے لگیں مگر پھر خوش ہو گئیں۔

”یہ تو بہت اچھا کیا۔ اب اس پر تعمیر بھی جلدی شروع کرائو۔“

”ہاں لیکن اس کی قسطیں ادا ہو جانے کے بعد۔“ وہ ماں کی بات سن کر آہستہ سے مسکرا کر بولا۔

”پھر تو بہت دیر ہو جائے گی۔“ وہ فکر مند ہو گئیں تو وہ ان کی سادگی پر اور اپنے بہانے پر نادم سا ہو گیا۔

”کوئی بات نہیں جلدی بھی کیا ہے؟“ وہ سنجیدگی چھپا نہ سکا۔

”ارے جلدی کیوں نہیں ہے میں تو ایک ایک دن گن رہی ہوں۔“ وہ ڈپٹ کر اپنی بے قراری کا اظہار کر گئیں۔

”تو مت گنیں۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکیں۔

”چھوڑیں کوئی اور بات کریں بلکہ جا کر سو جائیں۔“

”عادل! صاف صاف کہو۔“

”کچھ نہیں اماں جان، کچھ ہوگا تو بتائوں گا۔“

”یہ بات میرا دل نہیں مان رہا۔“

”امی! کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے۔ آپ کریں تیاری، مگر گھر بنانا تو دقت طلب کام ہے۔“ اس نے ماں کی دل جوئی کی خاطر جھوٹ کا سہارا لیا۔ انہیں یہ حقیقت بتانے کا اس میں حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ حالانکہ اس نے سوچ رکھا تھا کہ جب انہوں نے اصرار کیا تو وہ انہیں بتا دے گا۔ دھوکے میں نہیں رکھے گا۔ مگر یہ ان کے لیے بہت بڑا صدمہ ثابت ہو سکتا تھا، یہ سوچ کر وہ ٹال گیا۔ انہیں یقین سا آگیا۔ خوشی سے پلاٹ کے کاغذات والا لفافہ اس کی الماری میں رکھ کر باہر چلی گئیں۔ مگر اس کی ٹانگیں پھیلانے سے پہلے واپس لوٹ آئیں تو وہ ٹھٹھکا۔

”کل مجھے افتخار کی طرف لے چلو گے۔“ انہوں نے غیر متوقع بات کی۔

”جی نہیں۔“ کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ بولا۔

”کیوں بھی؟“

”امی جان! آپ افتخار چاچو کے گھر کا راستا بھول جائیں۔ کیونکہ میں بھی بھول چکا ہوں۔“ اس نے دھیمے سے کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ ارے مجھے ضروری بات کرنی ہے۔“

”امی، پلیز رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے جا کر سو جائیں۔“ وہ کچھ جھلا سا گیا۔

”بات کیا ہے بتاتے کیوں نہیں؟“

”بات یہ ہے کہ تانیہ افتخار کو بھول جائیں۔ اگر افتخار چاچو کو صرف دیور سمجھ کر ملنا ہے تو میں چھوڑ آؤں گا۔ لیکن تانیہ افتخار کا چیپٹر کلوز ہو چکا ہے۔ میں ابھی نہیں بتانا چاہتا تھا کیونکہ ابا کو صدمہ ہوگا وہ بیمار ہیں پہلے ہی بھائی کی جدائی یہاں تڑپتے ہیں ہمیشہ کے لیے انہیں چھوڑ کر دکھ برداشت نہیں کر سکیں گے۔“ وہ حد درجہ جذباتی انداز میں نچلا ہونٹ چباتے ہوئے تقریر کے سے انداز پر بولتا چلا گیا۔ رفیعہ بیگم سکتے کی حالت ہیں تمہیں۔ کانوں میں بہت سے انجنوں کا شور گونج رہا تھا۔

”پلیز امی! اس صدمے کو حادثہ سمجھ کر بھول جائیں۔“



”ایسا تم کیسے کہہ سکتے ہو، یہ کس نے کہا؟“ وہ تقریباً رو دیں۔

”تانیہ نے“ اس نے مجھے خود مسترد کر دیا ہے اور اس کا کہنا میں نے مان لیا۔“ اس نے اس روز اپنی اور تانیہ کی ملاقات ذہن میں لاتے ہوئے کہا۔

”اور تم نے یہ فیصلہ اپنی مرضی سے کر لیا۔“ وہ چلائیں۔

”نہیں تانیہ کی مرضی سے“ محبت بھیک میں نہیں مانگی جاتی وہ خود مختار ہے کسی اور سے محبت کرتی ہے۔“

”عادل! عادل یہ بچپن کا رشتہ ہے۔ اسے تانیہ یا تم ختم نہیں کر سکتے۔ میں نے یہ اختیار تمہیں نہیں دیا۔“ وہ برہمی سے بولیں۔

”میری پیاری امی“ جسے چاہتے ہیں اس کے کہے کو ایمان سمجھتے ہیں۔ تانیہ نے جو مانگا۔ جو چاہا میں نے فقط ویسا ہی کیا۔ اب آپ اس رشتے پر صبر کی سل رکھ لیں۔ اور ہاں ابا کو کچھ مت بتائیے گا۔ جب بات آگے بڑھے گی تو ان کی طرف سے خود پتا چل جائے گا۔ اس وقت تک تو انہیں صدمے سے محفوظ رکھیں۔“ اس نے ان کے قدموں میں بیٹھ کر بڑے منت آمیز لہجے میں

سمجھایا۔ مگر رفیہ بیگم کو جو اچانک شاک لگا تھا اس کی وجہ سے وہ زور شور سے رو رہی تھیں۔

”پلیز امی! اس نے پیار سے پکارا۔

”عادل! تم نے اتنی فراخ دلی دکھائی۔ اپنا آپ دے آئے۔ اپنے ارمان دے آئے۔“ وہ رقت بھرے لہجے میں بولیں۔

”آپ کا بیٹا بچا لایا ہوں کیا یہ کم ہے۔“ وہ ہنسا۔ تو وہ اثبات میں گردن ہلا کر اس کی پیشانی چومنے لگیں۔

پھر تقریباً ساری رات ہی دونوں ایک دوسرے کو سمجھاتے رہے۔

☆☆☆؟☆☆☆

فرحان کے آنے میں ابھی دو دن باقی تھے۔ سامعہ کا دل اس کی جدائی میں بے قرار تھا۔ فرحان نے ایک دفعہ کے بعد دوبارہ فون نہیں کیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ زیادہ بے تابی بڑھی تو اس

کی پاسپورٹ سائز تصویر اپنے پرس کی خفیہ جیب سے نکال کر باتیں کرنے لگی اس سے باتیں کرتے ہوئے ڈھیر سارا وقت گزر گیا۔ زرتاشیہ، زبیر احمد کے ساتھ ونڈو شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھی۔ وہ تنہا تھی اس لیے فرحان کی تصویر میں محو تھی۔ اسی وقت میاں افتخار آگئے۔ ان کے کھنکھارنے کی آواز پر وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔

”کیا حال ہے ہماری بیٹی کا۔“ وہ بہت محبت سے بولے۔

”الحمد للہ! آپ فرحان کی سنائیں وہ فون بھی نہیں کرتے۔“ اس نے شکایت کی۔

”کرتا تو ہے، زرتاشیہ کو کیا تھا نا۔“ انہوں نے چھیڑا۔

”بس مجھے ان کی خیریت بتائیں۔“ وہ ان کی شرارت نظر انداز کر گئی۔

”ٹھیک ہے فٹ فٹ، آپ اپنی سنائیں۔“

”سب ٹھیک ہے، میری میڈیسن ختم ہوگئی تھیں وہ زرتاشیہ نے منگوا دی ہیں۔“

”گڈ! زرتاشیہ بہت اچھی بچی ہے مگر...“ وہ خوشی سے کہتے کہتے رک گئے۔

”مگر کیا...؟“

”مگر اس وقت اس کا پلڑا بھاری ہے میری عقل جواب دے گئی ہے۔ کوئی سراہاتھ نہیں آرہا کس طرح آپ کی حیثیت بتائوں؟“ وہ بولے۔

”میں تو زرتاشیہ سے نظریں چرانے کی کوشش کرتی ہوں وہ میرا اتنا خیال رکھتی ہے کہ میرا ضمیر ملامت کرتا ہے۔“

”تو زرتاشیہ کو قبول کر لیتے ہیں۔“ انہوں نے شرارتاً کہا۔ وہ ایک دم سفید پڑ گئی۔

”بس، اتنا ہی حوصلہ تھا۔ یہ بہت مشکل مرحلہ ہے کسی طرح سب کچھ بہتر طریقے سے ہو جائے۔“

”انکل! میرا حوصلہ بہت ہے۔ وقت نے آزمایا تو آپ کو شرمندہ نہیں ہونے دوں گی۔“ نم لہجے میں کہہ کر اس نے خود کو مضبوط ثابت کیا۔

”ارے بیٹا اللہ سے دعا ہے کہ وہ کسی کو نہ آزمائے۔“

”مگر انکل یہ ایک حقیقت ہے زرتاشیہ کی جگہ کہاں ہے؟“

”یہ تو ہے، لیکن ہم چارپائی پر چارپائی بھی نہیں رکھ سکتے۔“ وہ ذو معنی جملہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے مگر شاہدہ بیگم کو دروازے کے درمیان کھڑا دیکھ کر سٹپٹا گئے۔ سامعہ گھبرا سی گئی۔

”یہ چارپائی پر چارپائی کس کی رکھ رہے ہو؟“ انہوں نے تیکھی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

”وہ وہ... زبیر اور زرتاشی مارکیٹ گئے ہوئے ہیں۔ مجھے زبیر سے کام تھا۔“ وہ بوکھلاہٹ میں کہہ گئے۔

”ویسے افتخار یہ بھی کمال ہی ہے کہ آپ کے سامنے زبیر اور زرتاشیہ گئے ہیں اور آپ پھر بھی زبیر سے ملنے آگئے۔“ وہ طنزیہ مسکرائیں۔

”ان دنوں سامعہ اور بچے کو خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، کافی دن سے سامعہ کی خیریت نہیں پوچھی تھی۔“ وہ پھر ان کا طنز ٹال گئے۔

”یہ بچہ اور سامعہ کا کیا مسئلہ ہے۔“ انہوں نے کافی خوش دلی سے سامعہ سے پوچھا تو وہ شرمساری ہو گئی۔ کچھ نہ بول سکی۔

”افتخار آپ چلیے میں سامعہ سے کچھ بات کر کے آتی ہوں۔“ شاہدہ بیگم نے سامعہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

”آپ بھی چلیں مجھے بھی آپ سے کام ہے۔“ میاں افتخار نہیں چاہتے تھے کہ شاہدہ بیگم سامعہ سے تنہائی میں بات کریں۔ سامعہ کے چہرے پر بھی پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

”میں نے کہا نا کہ ابھی آتی ہوں۔“ شاہدہ بیگم نے پھر کہا۔

”او کے جلدی آند۔“ بادلِ نخواستہ میاں افتخار کو جانا پڑا۔ شاہدہ بیگم نے مسکرا کر سامعہ کو دیکھا اور پھر بولیں۔

”سامعہ! یہ آپ کا بچہ ہے۔ کم عمر ہو اس وقت اپنوں کی، شوہر کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے، زرتاشیہ خود نا سمجھ ہے۔ کوئی بات کوئی مسئلہ ہو تو فوراً مجھے بتایا کرو ہم اتنے برے میزبان نہیں ہیں کہ اتنی پیاری سی مہمان کو اہم موقع پر لک آفر نہ کریں۔“

”ارے نہیں آنٹی! آپ نے ایسا کیوں سوچا؟ آپ سب تو میرے اپنوں سے بڑھ کر ہیں۔“ شدت جذبات سے اس کی پلکیں بھیگ گئیں۔

”یہ ہمارا اخلاقی فرض ہے اور دعا ہے کہ آپ کا شوہر جلد آجائے ورنہ شادی خطرے میں پڑ جائے گی۔“ انہوں نے محبت پاش نظروں سے اس کے حسین سراپا کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”اللہ نہ کرے۔“ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

”ہاں، اللہ نہ کرے۔“ انہیں بھی کہنا پڑا۔

”میں آپ سب کو زحمت دے رہی ہوں۔“

”سامعہ! ایسی بات نہیں ہے۔ بس اب آپ کو میں زحمت دے رہی ہوں۔ آپ زرتاشیہ کے ساتھ ہو اس کی پسند اور مرضی کے مطابق کپڑوں اور جوتوں کی خریداری کرائو اور خاص کر عروسی لباس کے بارے میں ہر لڑکی کی اپنی خواہش ہوتی ہے۔ آپ زرتاشیہ سے اس کی پسند پوچھ کر مجھے بتائو۔“ وہ بولتی چلی گئیں۔ سامعہ کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ آنکھوں کے آگے دھند سی چھا گئی۔ صرف گردن ہلی وہ بھی اثبات میں شاہدہ بیگم نے اطمینان بھری مسکان سے جواب دیا اور اٹھ کر چلی گئیں۔ سامعہ کا دل اس کے پہلو میں ٹکریں مارنے لگا۔ آنکھوں سے ساون کی جھڑی لگی۔ حلق میں آنسوؤں کا گولا سا اٹک گیا۔ بیڈ پر چت لیٹ کر سسکیاں لیتے ہوئے بڑ بڑائی۔ مجھے سب قبول ہے میرے اللہ، بس غم یار مجھے نہ دے میں اسے کیسے دل سے جدا کروں گی۔ جو میری عمر بھر کی تلاش ہے۔ اے مالک! میرا امتحان یوں نہ لے۔ اے جنون عشق! بتا ذرا مجھے کیوں تماشا بنا دیا؟ یہ غم عشق بھی کتنا عجیب ہے۔ یہ

کوئی میرے دل سے پوچھے یہ تو جنون سے قریب ہے ہر وقت آزمائش کی گھڑی میں سفر کرتے رہنا ہی میرا مقدر بن گیا۔“

بے حال ہو کر فرحان کی تصویر چومنے لگی۔

”فرحان! لوٹ آؤ، سلگتی شام سے پہلے میرے خوابوں کے گلشن میں خزائیں رقصاں ہیں۔ بھگی آنکھوں میں صدائیں رقصاں ہیں، مگر میرے ہونٹوں پر صرف تمہارے لیے وفائیں رقصاں ہیں۔ چلے آؤ، میں اس کرب کے کڑے وقت میں تنہا ہوں۔ لوٹ آؤ فرحان پلیز آجاؤ۔“ اس نے فرحان کی تصویر آنسوؤں ترتر کر دی۔ مگر شاید دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اسی وقت اس کا سیل بج اٹھا انجان نمبر تھا اس نے اٹینڈ کیا۔

”ہیلو!“ رقت بھری لرزتی آواز میں وہ بولی تو دوسری طرف فرحان ڈگمگا گیا۔

”جانِ فرحان! خیریت تو ہے تم رو رہی ہو۔“

”نہیں تو بس ذرا طبیعت عجیب سے ہو رہی تھی۔“ اس کی پریشانی کے خیال سے وہ ٹال گئی۔ مگر خوش ہو گئی۔

”جھوٹ! دوریاں بہت ہیں، مگر اتنا سمجھ لو، پاس رہ کر ہی کوئی خاص نہیں ہوتا تم اس قدر پاس ہو میرے دل کے کہ میں تمہیں محسوس کر سکتا ہوں۔ تم رو رہی ہو کیوں...؟“

”آپ کی جدائی نے رُلا دیا اور کوئی بات نہیں۔“

”تم کہہ رہی ہو تو مان لیتا ہوں، پہلی بار تمہارا نمبر ایک دم سے مل گیا۔“

”کب آرہے ہو؟“

”یار! ایک ہفتہ مزید بڑھ ہو گیا ہے۔ بس یہ دوری اور مجبوری ساتھ ساتھ ہیں۔“ وہ کچھ اداسی سے بولا۔

”کوئی بات نہیں ہفتہ بھی گزر جائے گا۔“

”اپنا اور ہمارے بچے کا خیال رکھنا اوکے۔“

”ہاں جی کیوں نہیں۔“ دل کا درد دبا کر اس نے جواب دیا۔



”لو یو ڈارلنگ!“ وہ جھوم اٹھا اور فون بند ہو گیا۔ اس کا جی بہل سا گیا ایسا لگا کہ وہ اتنی بے بس اور کمزور نہیں ہے۔ فرحان کی بے پناہ محبت اس کے ساتھ ہے۔ لیکن سامعہ! زرتاشیہ کے بارے میں بھی تو سوچو۔ کان میں سرگوشی سی محسوس ہوئی تو وہ ساکت سی صرف زرتاشیہ کے بارے میں سوچنے لگی۔

☆☆☆؟☆☆☆

بڑی دیر سے شوکی پیڈسٹل فین کی صفائی ستھرائی میں مصروف تھا۔ پرانے پیڈسٹل فین کے سوراخ تلاش کر کر کے تیل ڈال رہا تھا۔ ناجی نے چار چھ بار تخت اٹھا کر ذرا سا آگے کرنے کے لیے کہا مگر اس نے سنی ان سنی کر دی۔

”تم بہرے کب سے ہو گئے ہو؟“ وہ قریب پہنچ کر گرجی۔

”دھیرے بولو میں بہرا نہیں ہوں۔“ وہ منہمک رہتے ہوئے چڑ کر بولا۔

”اسی لیے تمہیں میری آواز سنائی نہیں دی۔“

”یہ پرانا پنکھا ہے اس کی گھڑ گھڑ ہیں کچھ سنائی نہیں دے رہا گردن بھی لٹکی ہوئی ہے۔ اسے تو اب ریٹائر کر دینا چاہیے۔“

”آہستہ بولو، بڑی بیگم صاحبہ تمہیں ریٹائر کر دیں گی اور بھول کر بھی کسی چیز کو پرانا نہیں کہنا۔“ ناجی اسے مشورہ دے رہی تھی کہ اماں جان نے سن لیا۔

”اس کے بھی کان بھر دو، سب پرانی چیزیں باہر پھینکوا دو۔“ وہ گرجیں۔

شوکی تو فوراً رفو چکر ہو گیا۔ جب کہ ناجی نے سر جھکا دیا۔

”اب گردن جھکا کر کیوں کھڑی ہو، جائو جا کر اپنا کام کرو۔“

”شاہدہ بیگم صاحبہ کے پاس جا رہی ہوں۔“ وہ منمنائی۔ تو ان کو اچھا نہیں لگا۔ ویسے بھی وہ اس گفتگو کے بعد سے خفا خفا تھیں۔ یہ بات شاہدہ بیگم بھی محسوس کر رہی تھیں، مگر سرد سی خاموشی حائل تھی۔

”جائو، مگر جلدی آکر تخت پوش بدلو۔“

”شوکی، شوکی۔“ انہوں نے شوکی کو آواز دی۔ وہ دوڑا چلا آیا۔

”یہ پنکھا کور چڑھا کر برآمدے میں رکھو۔“

”یہ پنکھا، مگر یہ تو ٹھیک ہی نہیں ہے۔“ وہ کچھ حیرت سے بولا۔

”تو جا کر ٹھیک کراؤ۔“

”کھی، کھی، کھی، کھی۔“ وہ ہنستا چلا گیا۔

”ہش نا ہنجا کہیں کے۔ ہم نے لطیفہ سنایا ہے کیا؟“

”بڑی بیگم صاحبہ! اس میں اب بچا کیا ہے بیچنے جائوں تو ہاتھ سے پیسے دینے پڑیں گے۔“ وہ سادگی میں بول گیا، یہ جانے بنا کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔

”کم بخت! جس نے تمہارے کان بھرے ہیں اس کی خبر تو میں لے چکی

ہوں اب تمہاری باری ہے۔ اٹھائو پنکھا اور مستری کے پاس لے کر جاؤ۔“

انہوں نے حکم صادر کر دیا۔

”نانو! اس غریب کے حال پر تو رحم کر دیں اور اس لینٹیک پنکھے کی خطا بھی معاف کر دیں۔“ مزے سے چیونگم چباتی تانیہ نے آکر کہا تو انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہاری نانو چنگیز خان ہے، ظالم ہے سب پر ظلم کر رکھا ہے۔“ وہ برسیں۔

”انسان مر جاتے ہیں، چیزیں بھی پرانی اور خراب ہو جاتی ہیں آپ نے ایسے غیر ضروری سامان سے گھر بھر رکھا ہے۔“ وہ ٹانگ پر ٹانگ پر رکھ کے کرسی پر بیٹھ گئی۔ تو وہ بھی اس کے برابر بیٹھ کر بولیں۔

”دیکھو تانیہ! خراب چیزیں اسی دنیا میں ٹھیک بھی ہوتی ہے۔ انسان ہی کرتے ہیں، پرانی چیزیں اپنا عادی بنا لیتی ہیں اور عادتیں بدلنے سے تکلیف ہوتی ہے۔“

”انسان اپنی عادت دوسروں پر طاری کرتا رہے، اپنے مزاج پر دوسروں کو چلائے یہ سب آپ کی عادت ہیں۔ اس لیے ہمیں اس کا عادی بنانا ہے۔“ وہ خاصے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”ہمیں اور کچھ نہیں کہنا ہم نے تمہارے پیدا کردہ ہر سوال کا جواب تمہاری ماں کو دے دیا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وہ خود سے کچھ نہیں کہتیں۔ اس لیے ہمیں جو کہنا تھا کہہ دیا۔ بس ایک بات بیٹا جی یاد رکھنا اس نئے پرانے کے چکر میں کوئی ٹھوکر نہ کھا لینا۔ نہ تم اس زمانے کی پہلی نئی لڑکی ہو اور نہ ہم آخری پرانے۔“ وہ یہ کہہ کر مزید کچھ کہے سنے وہاں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں اور تانیہ نے کندھے اچکا کر زبیر ماموں کے گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆؟☆☆☆

فرحان کا ایک ہفتہ آگے کیوں ہو گیا؟“ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر اپنا پرس رکھتے ہوئے۔ افتخار صاحب سے پوچھا۔

”ایسی کاروباری مجبوری تو رہتی ہے، آپ فکر مند نہ ہوں۔“ میاں افتخار نے جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے کہا۔

”خیر، وہ تو آہی جائے گا۔ آپ ہی کچھ وقت نکال لیں، جیولر کے پاس جانا ہے کچھ سوٹ زرتاشیہ کے بننے کے لیے دینے ہیں۔“ وہ بولیں تو میاں افتخار کو کسی نے زور سے چٹکی بھر کے جگا دیا۔

”کیا مطلب...؟“

”فرحان کی شادی کرنی ہے۔“

”اور تانیہ کی...“ انہوں نے تنکے کا سہارا لیا۔

”اسے چھوڑیں۔“ انہوں نے طویل سرد آہ بھر کے مختصراً کہا۔ تو وہ اڑ گئے۔

”اسے کیوں چھوڑیں تانیہ اور فرحان کی شادی اکٹھے ہوگی۔“

”تو سن لیں کہ نہیں ہو سکتی مگر آپ کو سوچنے کی ضرورت نہیں۔“

”شاہدہ کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”کچھ نہیں میں بہت پریشان ہوں، بے سکون ہوں، مجھے اپنی بے بسی پر رونا آنے لگا ہے۔“ وہ ایک دم ہی رو دیں۔ تو میاں افتخار جان گئے کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔“

”شاہدہ! ادھر دیکھو، میری طرف دیکھو۔ گو کہ مجھے عرصہ دراز سے یہ حق تم نے نہیں دیا۔ مگر اس وقت میری طرف دیکھو۔“ انہوں نے اس جذب کے عالم میں کہا کہ شاہدہ بیگم کی نظریں ان پر مرکوز ہو گئیں۔

”شاہدہ بیگم میں تمہاری آنکھوں میں خود کو تلاش کر رہا ہوں کہ شاید اب میرا عکس پھر سے لوٹ آیا ہو۔ تم نے مجھے تہہ در تہہ چھپا دیا ہے۔ میں سرد خانے میں رکھی وہ لاش ہوں جس کے ورثاء کا انتظار ہوتا ہے۔ میں سرد خانے سے نکلنا چاہتا ہوں۔ اپنی پوری کھلی آنکھوں کی پتلیوں کو میرا احساس دو مجھے زندہ کر دو۔ مجھے زندہ سمجھو۔ جن کی خاطر تم نے مجھے بھلا رکھا ہے ان کے لیے میں تمہیں پریشان اور بے سکون نہیں دیکھ سکتا۔ میں آج بھی تم سے

پہلے لمحے والی محبت کرتا ہوں۔“ میاں افتخار نے دھیرے دھیرے، قطرہ قطرہ لہجے کی امرت ان کے تن مضطرب میں بھر دی۔ وہ شرمسار ہو کر رو دیں۔

”تو تم بھی افتخار مجھ سے شاکی ہو، اماں جان کی طرح، تانیہ اور فرحان کی طرح۔“

”نہیں، قطعاً نہیں کیونکہ مجھے ہمیشہ تمہاری خوشی عزیز رہی۔ تم ایک معصوم اور مظلوم عورت ہو۔“ وہ ترحم بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

”افتخار! میں دلدل میں پھنسی ہوں یا بند گلی میں، عمر بھر فرمانبردار بیٹی بننے کی کوشش میں ماں کو راضی نہ رکھ سکی۔ وہ مجھ سے نالاں ہی رہتی ہیں اور اولاد کو ماں کی محبت دی تو وہ ناخوش رہتی ہے۔ میں شاید نہ جنت لے سکوں اور نہ دے سکوں۔ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان ریزہ ریزہ ہو رہی ہوں۔“ وہ پہلی مرتبہ اپنی ذات کا دکھ ان کو سنا رہی تھیں میاں افتخار کو خوشی بھی تھی اور حیرت بھی۔

”چلو چھوڑو، کہو کیوں پریشان ہو؟“ انہوں نے محبت سے ہاتھ دبایا۔

”تانیہ نے مجھے نئی مشکل میں ڈال دیا ہے، اماں جان نے دو ٹوک انداز میں

اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ نہ تانیہ میری سنتی ہے اور نہ اماں جان۔“

”تند آندھیاں زنجیریں نہیں پہنتیں شاہدہ بیگم!“ وہ بولے۔

”مگر آندھیوں سے ہونے والی تباہی کے ہم متحمل نہ ہوں گے۔“

”صاف صاف کہو کیا الجھن ہے؟“

”افتخار! تانیہ نے عادل سے شادی سے صاف انکار کر دیا ہے۔“ وہ ان کے

چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے تیزی سے کہہ گئیں۔ مگر وہ ہمیشہ کی طرح پُر

سکون سے رہے۔

”اسے سمجھاؤ، بتاؤ کیا کچھ بگڑ جائے گا۔“ فقط اتنا بولے۔

”اب ممکن نہیں رہا۔ تانیہ نے عادل سے ڈائریکٹ انکار کر دیا ہے اور عادل کو

تو آپ جانتے ہی ہیں۔ وہ ناک پر کٹھی بیٹھنے نہیں دیتا۔“ انہوں نے اس ساری

گفتگو میں پہلی بار ابرو چڑھا کر بتایا تو میاں افتخار مسکرا دیے۔

”لہذا آپ نے ماضی کا زخم بھرنے کا یہ راستہ بھی بند کر دیا۔“

”میں نے یا آپ کی بیٹی نے اور تانیہ کا موقف کچھ اتنا غلط بھی نہیں۔“

”پھر تو کوئی مسئلہ رہا ہی نہیں، پریشانی کیا رہ گئی؟“ وہ بظاہر تحمل سے کام

لے کر بولے۔

”پریشانی تو ہے، آپ کے بھائی میاں، بھابی، یہاں سے اماں جان۔ سب کو

فیس کیسے کرنا ہے؟“

”یہ آپ کا شعبہ ہے شاہدہ بیگم! مجھے تو کچھ نہیں معلوم۔“

”تانیہ خرم سے شادی کرنا چاہتی ہے تو میں اس پر مرضی کیسے مسلط کر

دوں۔“ انہوں نے صفائی پیش کی۔

”جو جی میں آئے کرو۔“



”مگر اس فیصلے میں اماں جان کی ضد آڑے آرہی ہے۔ وہ یہ حویلی نہ بیچنا

چاہتی ہے نہ چھوڑنا چاہتی ہیں اور تانیہ یہاں خرم کی فیملی کو بلانا نہیں

چاہتی۔“ انہوں نے تفصیل بتائی۔ وہ تب بھی مختصراً بولے۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ یہ آپ کا اور آپ کی اماں جان کا معاملہ ہے۔ آپ

کا اور تانیہ کا معاملہ ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تم مجھے تنہا کر رہے ہو۔“ وہ بگڑ کر بولیں۔

”نہیں، میں نے یہ یقین کر لیا ہے کہ میرا مقام سرد خانہ ہی ہے۔“ وہ یہ

کہہ کر کپڑے تبدیل کرنے کی غرض وہاں سے اٹھ گئے۔ اور شاہدہ بیگم نے

انہیں بتانے کا مرحلہ طے کر لیا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ سن کر بظاہر خاموش

ہو گئے تھے۔ ان کے اندر کی کیفیت سے تو وہ نا آشنا تھیں۔

☆☆☆؟☆☆☆

رفیعہ بیگم صدمے کے باعث بستر سے جا لگی تھیں۔ بچپن سے جو خواب بنے

سب اکارت گئے۔ بیٹے کی خوشی، چہرے پر پھیلی

خواہشیں

ارمان

سب ملیامیٹ ہو گئے۔ یہ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ سب ہمتیں جواب دے

گئی تھیں۔ نہ بخار تھا نہ زکام اور نہ کوئی اور بیماری، مگر پھر بھی بستر سے اٹھنے

کی ہمت باقی نہیں رہی تھی۔ میاں ستار کو ان کے سوچتے رہنے اور آنکھیں

موندے لیٹے رہنے سے تشویش لاحق تھی۔ بار بار پوچھ چکے تھے۔ مگر وہ چپ

تھیں۔ گھر کا سارا نظام الٹ گیا تھا۔ نہ کھانا نہ چائے پانی عادل، ماں کی اس

حالت کی وجہ جانتا تھا۔ دکھی تھا، بے چین تھا مگر کر کچھ نہیں سکتا تھا۔

”یار عادل! تمہاری ماں کو کون سا دکھ چاٹ رہا ہے۔“ میاں ستار نے کمرے

میں آکر شیشے کے سامنے بال سنوارتے عادل سے پوچھا۔

”دکھ کیسا؟“

”یار! کچھ تو ہے میری سمجھ تو جواب دے گئی ہے، طویل رفاقت میں، میں

نے کبھی رفیعہ کو اس حالت میں نہیں دیکھا۔“ وہ بہت فکر مند تھے۔

”آپ فکر مند نہ ہوں اس سے آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔ میں اُن سے پوچھتا ہوں۔“

”ہاں پوچھو، اس کے درد کا علاج کرو وہ بہت پیاری ہے میری زندگی کا قیمتی سرمایہ ہے۔“ وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئے۔ تو عادل حیرت زدہ سا سوچتا رہ گیا۔ یہ ابا ہیں، ہر وقت لڑنے جھگڑنے والے یہ اندر سے اتنے نرم اور نازک ہیں۔ محبت کرنے کا یہ بھی ڈھنگ انہیں آتا ہے۔

اسے اچھا لگا۔ ایک پل بھی ضائع کیے بغیر وہ ماں کے پاس پہنچ گیا اور ان کے سامنے ڈٹ گیا۔

”امی جان! بس بہت سوگ منالیا، اب فوراً بستر چھوڑ دیں۔“

”میں سوگ کہاں منا رہی ہوں۔ یہ اُداسی ہے کسی کے جدا ہونے کا دکھ ہے۔“

”کس بات کی اُداسی اور کس کے جدا ہونے کا دکھ۔“ وہ طنزیہ بولا

”اپنے آپ سے پوچھو۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”جو ملا ہی نہ ہو اس کا غم اور اداسی کیا؟“ وہ کرب ناک لہجے میں بولا۔

”یہی تو مجھے دکھ ہے کہ تم نے جلد بازی میں سب ختم کر دیا۔“

”ماں جی! آپ اپنے بیٹے کو غلط ثابت کر رہی ہیں کاش! میں تانیہ کے الفاظ آپ کو سنا سکتا اور ان کی والدہ کے خیالات بتا سکتا۔“

”شاہدہ نے کچھ کہا۔“ وہ چونکیں۔

”آپ کوئی فضول بات نہ سوچیں گی اور نہ کریں گی۔ ابا آپ کے لیے کس قدر پریشان ہیں اور آپ جانتی ہیں وہ آپ کو کتنا چاہتے ہیں۔ مجھے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔ آپ میرے ابا کی محبت ہیں۔“

میں ان کی محبت کو یوں اُداس نہیں دیکھ سکتا۔“ وہ حد درجہ جذباتی ہو کر ان کا ہاتھ چومنے لگا۔ وہ دکھ سے مسکرا دیں۔

”پگلا! اس عمر میں ابا کی محبت بتانے چلے ہو“ یہ جانتے ہو ایک ماں کی محبت کون ہوتا ہے؟ اس کا بچہ میری محبت میرا عادل ہے۔“ وہ ممتا بھرے لہجے میں بولیں۔

”میں شرمندہ ہوں میری وجہ سے آپ کو دکھ پہنچا مگر اب یہ صفحہ پھاڑ ڈالیں۔ ابا کو پتا نہ چلے، واپس لوٹ آئیں ہماری دنیا میں، یہ آپ کے عادل کی منت ہے۔“

”ماں صدقے، میرا اور ہے ہی کون، بس تانیہ سے دلی وابستگی ہوگئی تھی اب افتخار اور دور ہو گیا۔ یہ افسوس ہے۔“

”کوئی افسوس نہیں، تانیہ سے دلی وابستگی آپ کی بھول تھی۔ اسے اب بھول جائیں۔ وعدہ کریں کہ اب اس کا ذکر بھی نہیں ہوگا۔“

”تم نے کہہ دیا تو ایسا ہی ہوگا۔“ وہ بیٹے کے کہتے ہی اٹھ بیٹھیں۔ عادل خوش ہو گیا۔ ان کا ماتھا چوم کر دھیرے سے بولا۔

”دکھ اس کا کرتے ہیں جب ہم کچھ غلط اور خطا کریں۔ جب کوئی خود دامن چھڑائے تو اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ نہ میں اداس ہوں نہ شرمندہ۔“ وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔

☆☆☆؟☆☆☆

زرتاشیہ کئی دن سے اس کا بغور جائزہ لے رہی تھی۔ سامعہ نہ صرف اپنی ذات سے لا تعلق سی نظر آرہی تھی بلکہ بہت چپ چپ اور کھوئی کھوئی سی بھی تھی۔ وہ جو ہر روز نئے رنگ اور ڈیزائن کا خوب صورت لباس پہن کر، بھیننی سی خوش بو میں خود کو مہکا کر اس کو دیکھتے ہی مسکراتی تھی اب ایک ہی ملگجے سے سلوٹ زدہ لباس میں صوفی کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھی تھی۔ گھنٹہ بھر پہلے ملک شیک کا رکھا گیا گلاس اب تک اس کا منتظر تھا۔ برائے نام سی ٹھنڈک اس میں باقی بچی تھی۔ آنکھوں کی سرخی سے عیاں تھا کہ وہ کئی راتوں سے سوئی نہیں۔

”سامعہ جی!“ فروٹ کی خوب صورت سی ٹوکری ہاتھ میں لیے وہ بولی تو سامعہ چونکی۔

”ہوں۔“ وہ بولی۔

”آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ فروٹ کی ٹوکری سنٹر ٹیبل پر رکھ کر اس نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔

”یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ اس نے مسکرا کر ملک شیک اور فروٹ کی طرف اشارہ کر کے پھر سوال داغا۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟“ وہ نہ سمجھ سکی۔

”بھئی اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے۔“

”خدا نہ کرے، ہم آپ کے گم شدہ شوہر صاحب کو کیا جواب دیں گے؟“ زرتاشیہ نے شرارت سے کہا تو اس کی آنکھیں نم سی ہو گئیں۔

”سوری! میں بھول کر آپ کے شوہر کا ذکر کر دیتی ہوں اور آپ دکھی ہو جاتی ہیں۔“

”میں اتنا پیار سنبھال نہیں سکتی، کیوں میرا اتنا خیال رکھتی ہو؟“ اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

”اسی لیے تو آپ نے ملک شیک نہیں پیا اور یہ فروٹ بھی انتظار کرتے کرتے تھک جائیں گے“ وہ بولی۔

”زرتاشیہ! دل نہیں چاہ رہا۔“

”یہ دل والی بات نہیں چلے گی۔ فوراً ملک شیک ختم کریں اور پھر فروٹ کھائیں۔“ زرتاشیہ نے حکم صادر کیا ہی نہیں بلکہ گلاس اس کے ہونٹوں سے لگایا تو اسے پینا ہی پڑا۔ مگر نگاہیں زرتاشیہ کے چہرے پر ٹکی رہیں۔ خوب صورت کٹورا سی آنکھوں، گلابی ہونٹوں اور گلرنگ رخساروں والی زرتاشیہ کو وہ کیسے یہ دکھ دے سکتی ہے کہ اس کا چہرہ یہ اجازت ہی نہیں دے رہا۔ اپنی ذات سے بڑھ کر سکھ اور خوشی دینے والی زرتاشیہ کو آنسو نہیں دیے جا

سکتے۔ ایسا ممکن ہی نہیں۔ کیا محبت پانے والے محبت دینے میں بخل سے کام لے سکتے ہیں۔ محبت تو دونوں ہاتھوں سے لٹانے کا نام ہے۔

☆☆☆؟☆☆☆

”بس پیاری بیٹی ہمیں تو تم معاف کر دو۔“ شاہدہ بیگم نے ان کی کچھ طبیعت ناسازی کا سن کر خود فوراً کمرے میں آکر ماتھا چھوا تو انہوں نے آنکھیں کھول کے کہا۔

”معاف تو آپ کریں کیوں ناراض ہیں آپ؟“ وہ بہت پیار سے ان کے سینے پر سر رکھ کر بولیں۔

”شاہدہ! صاف صاف کہو کب جا رہی ہو ہمیں چھوڑ کر۔“ انہوں نے انہیں خود سے الگ تو نہیں کیا مگر پوچھ لیا۔

”آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ...“

”بھئی تمہاری اور تمہاری بیٹی کی یہی مرضی ہے۔“ انہوں نے جملہ اچک کر کہا۔

”اماں جان! ہم یہاں سے کہیں بھی شفٹ ہوں آپ ہمارے ساتھ ہی جائیں گی۔“ انہوں نے پھر دل کی بات کہہ ڈالی۔

”یہ تو بھول جاؤ، ہم یہاں سے صرف مر کے جائیں گے۔“ انہوں نے تیزی سے کہا۔

شاہدہ سمجھ گئیں کہ وہ اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی نہیں ہلیں گی۔ اس لیے موضوع بدلا۔

”آپ اٹھیں ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں بخار سا محسوس ہو رہا ہے؟“

”ارے نہیں بھئی معمولی سی حرارت ہے، ہم نے شوکی سے جو شانہ منگوا دیا ہے۔ بڑی دیر سے گیا ہے جانے کہاں رہ گیا۔ ایک تو میاں افتخار بھی چن کر ہیرا لائے ہیں۔“ وہ خاصی ناگواری سے بولیں۔



”اماں جان! اچھا ہے شریف ہے اور کافی کام سنبھال لیا ہے۔ ناجی اب کم شکایت کرتی ہے۔“

”رہنے دو یہ تم دونوں میاں بیوی نے پہلے ناجی کو سر چڑھایا اب یہ شوکی سر پر سوار ہے۔ شریف ہے، نہ گانے سے باز آتا ہے اور نہ بانسری بجانے سے۔“

”چلیں میں سمجھا دوں گی۔ اب آپ آرام کریں، میری چھٹی ہے۔ میں خود سب کام دیکھ لوں گی۔“ شاہدہ بیگم نے انہیں بہت پیار سے مسکرا کر کہا۔ مگر وہ بولیں۔

”ہم ٹھیک ہیں، ہماری فکر نہ کرو۔“

”اللہ آپ کو ٹھیک ہی رکھے۔ اس گھر میں آپ کی خیر و برکت ہے۔“ شاہدہ کو ماں سے شدید محبت تھی۔ اس محبت میں رتی برابر کمی نہیں آئی تھی، مگر دوسری طرف وہ ماں تھیں، اپنے بچوں پر جان چھڑکنے والی ماں۔

”ارے جانے دو یہ کتابی باتیں، آج ہم حویلی کو بیچنے کا اختیار دے دیں، تو سب خیر و برکت دھری کی دھری رہ جائے گی۔ ہمیں جھوٹ اور منافقت

سے نفرت ہے، مگر یہ دونوں چیزیں اپنی اولاد کی خاطر تمہارے اندر موجود ہیں۔“

”اماں جان! بچے تو نادان ہوتے ہیں۔ نادانیاں کرتے ہیں۔“ تانیہ کے حوالے سے ذہن میں لاتے ہوئے وہ مبہم سی بات کر گئیں۔ جسے انہوں نے فوراً مسترد کر دیا۔

”مگر مائیں نادان نہیں ہوتیں۔ نادانی اور ہوتی ہے اور بد تہذیبی اور۔“

”کیا میں بد تہذیب ہوں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”نہیں تم نادان ہو، اولاد کی بد تہذیبی میں تمہاری انتہا درجے کی آزادی شامل ہے۔“

”آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟“ وہ بے بس ہو گئیں۔

”بس ہمیں کچھ نہیں کہنا۔ جو جی میں آئے کرو۔“ انہوں نے کھرا جواب دے دیا۔ وہ اور کچھ نہ کہہ سکیں خاموش ہو گئیں۔

”ہم تو حیران ہیں کہ بغل میں زرتاشیہ ہے، اس میں اور تانیہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔“ شاہدہ بیگم کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ مگر ضبط کر گئیں۔

”ارے کیسے گزارا کریں گی تانیہ بی، میاں ستار کے گھر میں۔“ انہوں نے ان کی گویا چوری پکڑ لی۔ وہ بالکل ہی چپ ہو گئیں۔

”اسے سمجھاؤ شادی کی تاریخ لینے کے لیے جانے کب میاں ستار آجائیں۔“ انہوں نے نرمی سے کہا۔

”اسی لیے تو آپ سے کہا ہے کہ یہ سب یہاں ممکن نہیں، کہیں اور رہتے ہیں۔“ نظریں چراتے ہوئے وہ دل کی بات کہہ گئیں۔

”پھر تم نے وہی بات کی، اب جاؤ چلی جاؤ۔ جیسا بیٹی کہتی ہے گھر ڈھونڈو اور رہو، مگر ہم کہیں نہیں جائیں گے۔“ انہوں نے کافی سختی سے کہا اور سلیپر پہن کر باہر نکل گئیں۔ شاہدہ بیگم مزید الجھن کا شکار ہو گئیں۔

☆☆☆؟☆☆☆

مرے سجدوں کے تسلسل کو تو کیا جانے اے میرے محبوب

سر جھکایا تری خوشی مانگی، ہاتھ اٹھائے تری زندگی مانگی

سفید دوپٹے کے ہالے میں کملایا کملایا چہرہ، بند آنکھوں سے بہتے آنسو تھر تھراتے لبوں پر ایک ہی دعا۔ جائے نماز پر بیٹھی وہ رب کائنات کو پکار رہی تھی اور مانگ رہی تھی۔ اے میرے رب! مجھے مضبوط کر دے، میرے احساس سے فرحان کی محبت ختم کر دے۔ آزمائش کی گھڑی ہے۔ مجھے بے لوث کر دے۔ میرے وجود کو زرتاشیہ کے لیے باعث خوشی کر دے۔ اے اللہ! فرحان کے دل میں زرتاشیہ کی محبت بھر دے۔ میں نہ نمک حرام ہوں اور نہ خود غرض۔ مجھے کم ظرف نہ بنا۔ میرا حوصلہ تو ہے میرے پروردگار، میری قوت، میری محبت ہے جو مجھے بتا رہی ہے کہ محبت صرف محبت ہے اور محبت خود کو قیدی نہیں بناتی۔ اے میرے مالک! مجھے راستہ دکھا۔ میں کیسے فرحان کو نہ دیکھوں؟ کیسے اس کے راستے سے خود کو الگ کروں؟“ وہ سسکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

”کیا ضرورت ہے خود کو الگ کرنے کی۔ کیا تم نے ٹھیکہ اٹھایا ہے سامعہ ڈارلنگ! اپنے اوپر کیوں زندگی کے واسطے زندگی بند کرتی ہو۔“ مسز جیری کی سرگوشی کانوں میں اتری تو وہ ہڑبڑا کر چاروں طرف دیکھنے لگی وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ انہیں یاد کر کے اسے اور رونا آیا۔ وہ روتے روتے بڑبڑائی۔

”مسز جیری! زندگی ایک چاہت کا سلسلہ ہے۔ کوئی مل جاتا ہے کوئی بچھڑ جاتا ہے۔ جسے ہم مانگتے ہیں اپنی دعائوں میں وہ کسی اور کو بنا مانگے مل جاتا ہے۔“

”نو مائی ڈاٹر! اب اپنی دعائوں کا پھل کسی اور کے واسطے مت چھوڑانا“ ورنہ تم بہت روئیں گے اور اپنا امتحان نہ لو۔ تم کو ہماری قسم۔“ مسز جیری تو جیسے اس کے اندر سانس لے رہی تھیں۔ اسے اپنے اندر سے ان کی آواز آرہی تھی۔

”پھر میں کیا کروں؟ معصوم، پیاری سی زرتاشیہ کو ہمیشہ کے لیے آنسو دے دوں۔ اسے اس کی محبت کا صلہ کیا دوں؟“ وہ طویل سرد آہ بھر کے جائے

نماز سے اٹھی تو رات بھر کی ہی نہیں کئی روز کی بے چینی اور بے قراری میں کمی آگئی تھی۔ صبح کی نماز تو اسے ماں کی آغوش کی طرح اپنے اندر سمو لیتی تھی۔ سکون دیتی تھی وہ دوپٹا سینے پر پھیلا کے باہر چھوٹے سے لان میں آگئی۔ زبیر احمد بھی نماز پڑھ کر آگئے تھے اور چہل قدمی کر رہے تھے۔ وہ واپس کمرے کی طرف مڑی تو زرتاشیہ نے ملک شیک کا گلاس لہراتے ہوئے ہانک لگائی۔

”ملک شیک والا بھئی۔“

”آپ کیوں یہ تکلیف کرتی ہو؟“ اس نے مسکرا کر اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور کوریڈور میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”اس لیے کہ آپ میری سامعہ جی ہیں۔ اس لیے بھی کہ آپ بہت پیاری ہیں۔“ وہ شوخی سے بولی اور دھم سے دوسری کرسی پر گر سی گئی۔

”اندازے نہیں لگاتے، کبھی کبھی ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم سوچتے ہیں۔“ وہ چھوٹے چھوٹے سپ لیتے ہوئے بولی۔

”تو نصیب اپنا اپنا۔“ وہ بے پروائی سے بولی۔

”نصیب کا اعتبار کس کو ہے۔ مل جانے پر ہے۔ مل جائے اگر خوشی تو انکار کس کو ہو سکتا ہے۔“ وہ جذب کے عالم میں کہہ گئی۔

”پھر بھی نصیب پر اعتبار تو کرنا پڑتا ہے۔“

”اگر فرحان کے بنا زندگی دیکھو تو کیسی لگتی ہے۔“ دوپٹے کو مٹھی میں دبا کر وہ پوچھ بیٹھی۔ تو وہ یہ کہہ کر وہاں سے اٹھ گئی۔

”سامعہ جی!

اس کی قربت تو مقدر ہے ملے یا نہ ملے

اس کی یادوں سے بھی ہو جاتی ہے تسلی دل کو“

☆☆☆؟☆☆☆

کسی کے دل میں تری دھڑکن

آج بھی ہے

کسی کی نظر میں ترا دیدار

آج بھی ہے

اگر زندگی سے ہو شکایت تو

یاد کرنا کسی کی زندگی میں تری کمی

آج بھی ہے

وارڈ روب کا دروازہ کھولے۔ خوب صورت ریشمی لباس دیکھتے ہوئے وہ شاید

پہلی بار بہت افسردہ ہوئے تھے۔ نرگس جاتے ہوئے چند جوڑے شاید انہیں

اپنی یاد دلانے کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر انہوں

نے وارڈ روب بند کر دی۔ ایزی چیئر پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ ماضی تلخ

یادوں سے مزین سہی مگر کچھ تو ہنگامہ اور حرارت تھی۔ کمرے کی تنہائی

ہیں وہ انہیں اپنے لیے نہیں، زرتاشیہ کے اکیلے پن کے لیے یاد آرہی تھی۔

”فیصلے کے پل صراط پر کتنے دن اور چلو گے۔“ اماں جان نے ان کے الجھے الجھے بالوں میں انگلیاں پھیریں تو وہ چونکے۔

”آپ بیٹھے اماں جان۔“

”زبیر احمد! تنہائی گھن لگا دیتی ہے۔ جو فیصلہ کرنا ہے جلد کرو۔ دوسرا گھر بسالو۔“

”ہا، ہا، ہا۔“ وہ ہنسنے لگے۔

”ہم نے لطیفہ نہیں سنایا۔ اُسے فیصلہ بھیجو ہم چٹکی بجاتے ہوئے لڑکی بیاہ لائیں گے۔“ انہوں نے گھن گرج کے ساتھ کہا۔

”اماں جان! اب ہمیں زرتاشیہ کا گھر بسانے کی فکر ہے۔ فیصلہ تو نرگھس نے کر دیا۔ مجھے تو صرف دستخط کر کے کاغذات بھیجنے ہیں۔“ وہ بولے۔

”زرتاشیہ کی کیا فکر، شاہدہ نے تیاری شروع کر دی ہے۔ نرگھس کی مرضی یہاں نہیں چلے گی۔ ہم اسے فون پر کہتے ہیں کہ جلد کاغذات بھیجے بس۔“

”وہ ضدی عورت ہے، کاغذات تو بھیجے گی، اور آپ قطعاً فون پر بات نہیں کریں گی۔“

”مگر زبیر احمد! مجھے تمہاری بھی تو فکر ہے۔ زندگی ایسے کیسے گزرے گی؟“ وہ رنجیدہ ہو گئیں۔

”میری زندگی اب بچی ہی کتنی ہے؟ بس میری زرتاشیہ کی شادی ہو جائے۔“

”ماں صدقے، ماں کی عمر لگ جائے۔ اللہ سلامت رکھے۔“ اماں جان کی ممتا نے انہیں سینے سے لگالیا۔ وہ ماں کے سینے سے لگ کر مسکرا دیے۔

”بس اللہ آپ کا سایہ ہم پر سلامت رکھے (آمین)۔“ انہوں نے ان کے ہاتھ چوم کر اپنی آنکھوں سے لگائے۔ اماں جان کی آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے جو ان کے سر کے بالوں میں سما گئے۔

”کاش! میں نے نرگھس کا انتخاب نہ کیا ہوتا؟“

”اماں جان! ماں کبھی غلط نہیں ہوتی، نرگھس سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔“



”مگر ہم خود کو مجرم سمجھتے ہیں۔ کاش، کاش! تمہاری کلاس فیلو کے بارے میں فیصلہ کرتے۔“ انہوں نے جذب کے عالم میں زبیر احمد کے دل کے تار چھو لیے۔ وہ تڑپ کر اٹھے اور کمرے میں ٹہلنے لگے۔

”اماں جان! پلیز روپی کا ذکر مت کریں، اس کا مجرم میں خود کو سمجھنے لگتا ہوں۔ آپ نے جو کہا میں نے مان لیا۔ اسے میں نے جو کہا اس نے مان لیا۔ اس کی آنکھوں کو خواب دے کر واپس مانگ لیے۔ اب تو اس کو یاد کرنے کا حق بھی نہیں ہے میرے پاس۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

”جہاں آرا بیگم پتھر کی صورت بیٹھی رہ گئیں۔ ماضی کے کرب ناک دکھ سے بیٹے کو گزرتا دیکھ کر وہ کافی دیر آنسو بہاتی رہیں۔ آج پہلی بار زبیر احمد نے روپی کے ذکر پر اس طرح کا طرز عمل اختیار کیا تھا۔ وہ سچ مچ اپنے فرمانبردار بیٹے کے لیے غلط فیصلہ کر کے مجرم بن چکی تھیں۔

☆☆☆؟☆☆☆

”دیکھیں سامعہ بھابی آپ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گی۔“ صائمہ نے کہا۔  
 ”یہی بات بیٹا میں راستے بھر سامعہ کو سمجھاتا آیا ہوں۔“ میاں افتخار بولے۔  
 ”بابا! پھر مسئلے کا حل کیا ہے؟ آنٹی نے شادی کی تیاری کی ذمہ داری بھی مجھے سوپنی ہے۔“ وہ حد درجہ بے بسی سے بولی۔

”انکل! اب یہ شادی ڈکلیئر ہو جانی چاہیے۔“ ایاز نے کہا۔

”نہیں ایاز بھائی۔ یہ ابھی ٹھیک نہیں ہوگا۔“ میاں جی سے پہلے سامعہ بول اٹھی۔

”کیوں، کیوں ٹھیک نہیں ہے؟ کیا جب شادی ہو جائے گی پھر بتائیں گی آپ۔“ صائمہ نے پوچھا۔

”عقل تھک گئی ہے۔ میں بہ یک وقت دو الجھنوں میں گرفتار ہوں، سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔“ میاں افتخار بہت سنجیدگی سے بولے۔ انہیں تانیہ کی طرف سے جو الجھن ملی تھی وہ مسلسل الجھائے ہوئے تھی۔

”آپ پریشان نہ ہوں، فرحان کل آرہے ہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس کو بابا کی سنجیدگی کسی طور قبول نہیں تھی۔

”انکل! آپ آئی کو اعتماد میں لے کر بتائیں۔ تیاریاں ہونے سے پہلے۔“ ایاز نے پھر وہی مشورہ دیا۔ تو میاں جی کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر دھیرے سے بولے۔

”یہ اعتماد تو اس دن ہی میری زندگی سے نکل گیا تھا جس دن میں نے اپنا گھر چھوڑا تھا۔ فرحان کے لیے تانیہ کی شادی ہیلپ فل ثابت ہو سکتی تھی، مگر اس نے عادل کو ریجیکٹ کر دیا ہے۔ یہ دکھ میرے اندر اتر کے مجھے کھا رہا ہے۔ میرے خونی رشتے ایک بار پھر مجھ سے جدا کر دیے گئے۔“

”کیا؟ تانیہ نے رشتہ ختم کر دیا۔“ سامعہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”جی ہاں، جس کا ذکر کسی سے نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔“ وہ دکھ بھری ہنسی ہنس کر بولے۔

”یہ تو اچھا نہیں ہوا کیا وجہ ہوئی؟“ صائمہ نے تاسف سے پوچھا۔

”اللہ جانے، مجھے فیصلے سنائے جاتے ہیں۔“

”مگر بات تو پھر وہیں رہ گئی۔ فرحان اور سامعہ بھابی کا کیا ہوگا؟“ ایاز بولا۔

”انتظار، وقت کے فیصلے کا انتظار، شاید اب وقت ہی فیصلہ کرے۔“

”نہیں انکل! آپ دیر نہ کریں بتا دیں۔ ویسے بتا دینے سے فوری طور پر کیا ہوگا؟“ صائمہ نے کہا۔

”جو تانیہ کے بتانے سے نہیں ہوا، کیونکہ عادل میرا بھتیجا ہے اور زرتاشیہ شاہدہ بیگم کی بھتیجی اور اماں جان کی پوتی ہے۔ سامعہ اور فرحان کو فی الحال فیور ملنا مشکل ہے۔ قیامت تو آسکتی ہے، جلدی سے۔“

”پھر تو بہت ہی برا ہوا، فرحان تو یہ فیصلہ قبول نہیں کرے گا۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ٹکرا جائے گا اور ٹکرانا بھی چاہیے کسی کی پسند اور شخصی آزادی پر بڑے قبضہ جما کے کیوں بیٹھیں؟“ ایاز کے لہجے میں تلخی اور اشتعال آگیا۔

”میں صرف بچے کی ولادت تک یہ شادی ٹالنا چاہتا تھا کہ پھر جیسے بھی حالات ہوئے یہ دونوں آسانی سے ایڈجسٹ کر سکیں گے۔ اس حالت میں سامعہ کے لیے مشکل ہوگا۔ بچے کی وجہ سے بھی برف پگھلنے کی قوی امید ہے۔“ میاں افتخار نے کہا۔ وہ تینوں چپ ہو گئے۔

”چلیں بابا، اللہ مالک ہے۔ اللہ کار ساز ہے۔ آپ کو پریشان نہیں ہونے دوں گی۔“ سامعہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ کیا؟ کھانا تیار ہے۔“ صائمہ نے کہا۔

”ارے نہیں بیٹا! کو تو ال کو بینک سے لینا ہے، یہ تو سامعہ کے چیک اپ کا بہانہ کام آجاتا ہے۔“ میاں افتخار نے شرارت سے کہا اور خود بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆؟☆☆☆

”بابا!“ تانیہ ناشتے کی میز کے قریب آکر بولی اور ان کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اماں جان نے خاصی حیرت سے اسے دیکھا۔ بہت عرصے بعد وہ بر وقت سب کے ساتھ ناشتے کے لیے آئی تھی۔

”جی بیٹا۔“ وہ بولے۔

”اب آپ سب بھول جاتے ہیں۔“ اس نے تند لہجے میں پوچھا۔ وہ کچھ نہ سمجھے بس سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے۔

”کل کیا ڈیٹ ہے؟“

”11 اپریل، ہماری بیٹی کی ڈیٹ آف برتھ۔“ وہ ٹوسٹ پر جام لگاتے ہوئے بولے۔

”تو کیا کوئی سلیبریٹ کرنے کا پروگرام نہیں؟“

”ننانیہ! ہر سال سالگرہ مناتے ہیں۔“ شاہدہ بیگم نے یاد دلایا۔

”گھر میں قورمہ، زردہ، کھیر پکا کے۔“ وہ طنزیہ بولی۔

”واہ بھئی! یہ حملہ تو ہم پر کرنے کے لیے تانیہ آئی ہیں۔“ اماں جان بگڑیں۔

”یہی سمجھ لیں، مگر اس بار سا لگرہ باہر فائیو اسٹار ہوٹل ہیں ہوگی۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر اپنے لیے چائے بنانے لگی۔

”ہوٹل میں کیا سرخاب لگ جائیگا۔ یہ دین سے دوری ہے۔ اللہ نبی کے نام کو چھوڑ کر مغربی طور طریقے اختیار کر لیے۔ بجائے صدقہ خیرات کرنے کے دکھاوے کے ہنگامے صرف فضول خرچی ہے۔

”دیکھیے نانو! یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہر سال آپ سا لگرہ پر پکوان پکا کر مسجد میں بھیجتی ہیں۔ محلے کے گھروں میں بھجوا دیتی ہیں۔ سا لگرہ اور چیز ہے۔ میری کلاس فیولوز یہاں کھیر تنجن کھانے نہیں آسکتیں۔“ وہ خاصے غیر مہذب انداز میں بولی۔

”اچھا اب اس بحث کو بند کرو۔ اماں جان جیسے کرتی ہیں وہ کریں۔ آپ اپنی کلاس فیولوز زرتاشیہ سامعہ کو ہوٹل میں انوائٹ کرلو۔“ شاہدہ بیگم نے

مہارت سے بات سنبھال لی اور بیٹی کو اجازت بھی دے دی۔ اماں جان کی روایت کو بھی ٹھیس نہیں پہنچائی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ دیکھ رہے ہو میاں افتخار، اس گھر میں بیٹی کی تربیت کس طرح کی جا رہی ہے۔ ابھی سوچ لو، کل کو بڑے بھائی سے جوتے صرف تمہارے سر پر پڑیں گے۔“ انہوں نے براہ راست میاں افتخار کو مخاطب کیا تو وہ بڑے بھائی کے ذکر پر ملول سے ہو کر وہاں سے اٹھے اور اندر چلے گئے۔

”آپ بابا کو بڑے بھائی کے طعنے اب مت دیا کریں کیونکہ...“

”تانیہ! جانو جا کر اپنی کلاس فیلو کو انویٹیشن دو۔“ تانیہ کے کچھ انکشاف سے پہلے ہی شاہدہ بیگم نے تانیہ کا فقرہ اچک لیا۔

”ماما! نانو سے اپنی یہ حویلی مکمل اختیار کے ساتھ لیں۔“ تانیہ نے لفظ ”اپنی حویلی“ پر خاصا زور دے کر کہا اور چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی اماں جان نے ناجی کو میز سے برتن سمیٹنے اور شوکی کو بان سلجھانے کی ہدایت کی۔ شاہدہ بیگم

نے رسٹ واپس پر دانستہ نگاہ ڈالی اور دفتر جانے کی جلدی ظاہر کی، مگر اماں جان نے کڑک دار آواز میں بیٹھے رہنے پر مجبور کر دیا۔

”خوب ہوا لگاؤ نادان بیٹی کو، مگر اتنا سمجھا دو کہ یہ حویلی ہم قبر میں نہیں لے کے جائیں گے۔“

”اماں جان! دراصل یہ بہت پرانی اور خستہ حال ہو چکی ہے۔ اگر اس کی مرمت کرائیں تو لاکھوں روپے خرچ ہوں گے۔ پھر زمانے کے ساتھ ساتھ سب کچھ تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ حویلی بے شک آپ کی ہی رہے، مگر یہاں سے اٹھنے کا ارادہ تو کریں۔“ شاہدہ بیگم نے بہت دھیمے اور رسیلے لہجے میں ماں کو قائل کرنا چاہا مگر انہوں نے کڑے تیوروں سے گھورا اور کہا۔

”کان کھول کے سن لو، ہمارے جیتے جی یہ حویلی نہ بکے گی نہ چھوٹے گی۔“ ہزار بار وہ یہ پہلے بھی کہہ چکی تھیں۔ شاہدہ بیگم اسی جواب کی منتظر تھیں۔ پھر بنا کچھ کہے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”فرحان میاں کتنے بچے پہنچیں گے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”شام چار بجے کی فلائٹ سے۔“ وہ مختصراً کہہ کر آگے بڑھ گئیں۔

”ناجی!“ انہوں نے ناجی کو آواز دی۔

”جی۔“

”خیر سے فرحان شام کو آرہا ہے، زردہ پکے گا۔ محلے میں بھیجنا ہے زردے کا چاول تین چار گھنٹے بھیکے گا۔ برتن دھو کر چاول صاف کرو، بھگو دو اور سارے میوے کتر کے رکھو۔ کل کے لیے دودھ والے کو دس کلو دودھ اضافی لانے کا یاد سے کہنا ہے۔“ انہوں نے تفصیلاً ناجی کو احکامات دیے اور اپنی دوائیں کھانے کی غرض سے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ ناجی نے حکم کے بندے کی مانند احکامات پر گردن ہلا کر مہر ثبت کر دی۔

☆☆☆؟☆☆☆

ایک روپ کے ساگر میں نہاتی رہیں آنکھیں

کچھ خواب میرے دل میں سجاتی رہیں آنکھیں



یادوں کے درتچے پہ وہ دیتی رہیں دستک

کل رات بہت مجھ کو ستاتی رہیں آنکھیں

پلکوں سے ٹپکنے نہ دیا ایک بھی آنسو

یہ رسم محبت بھی نبھاتی رہیں آنکھیں

نہ اس نے کمرے سے قدم باہر رکھا۔ نہ ناشتا کیا اور نہ جوس پیا۔ پیا کو آفس

کے لیے رخصت کر کے زرتاشیہ نے کمرے میں آکر دیکھا۔ ناشتا ٹھنڈا ہو چکا

تھا اور جوس گرم ہو چکا تھا۔ وہ بستر پر کسلمندی سے لیٹی چھت کو گھور رہی

تھی۔ جبکہ زرتاشیہ حد درجہ خوش اور بے قرار تھی۔ فرحان کی آمد کی اطلاع

نے اسے شب بھر بے دار رکھا تھا۔ شام کو پہننے والے لباس کا انتخاب اور

تیاری پر سوچتے سوچتے صبح ہو گئی تھی، مگر سامعہ کی حالت تو خلاف معمول

تھی۔ زرتاشیہ کچھ پریشان ہو کر اس پر جھکی۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے سامعہ جی؟“

”ہوں ہاں آئی ایم فائن۔“ وہ چونک کر مسکرائی، مگر اس مسکراہٹ میں جو فکر

اور اداسی شامل تھی۔ اس نے زرتاشیہ کو مضطرب کر دیا۔

”آپ کسی کو یاد کرتی رہی ہیں۔ آپ کی آنکھیں اور چہرے کی حالت بتا رہی

ہے۔“

”یاد تو اسے کرتے ہیں جسے بھول جائیں، بھلا کبھی دن بھی سورج کے بغیر

آغاز کرتا ہے۔ آپ جسے یاد کرنے کی بات کر رہی ہو وہ تو روح میں حلول

کیے ہوئے ہیں۔ اندیشہ تو کچھ اور ہے۔“ جانے کیوں سامعہ کی نم ناک نگاہوں

میں آج بالکل نیا تھا۔

”کیا آپ بھائی کے لیے فکر مند ہیں۔“

”آپ کو کیا بتائوں کسی کو الوداع کہنا کتنا تکلیف دیتا ہے۔ کچھ دکھائی نہیں دیتا

کچھ سنائی نہیں دیتا۔ فقط کپکپاتے لفظ ہونٹوں پر ٹھہر جاتے ہیں۔ پلکوں پر فقط

چند جھلملاتے اشک لرزے لگتے ہیں۔ یہ پاگل دل مچل مچل جاتا ہے۔ مگر اس

کڑے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔“ سامعہ نے بوند بوند اپنے اندر کی نمی زرتاشیہ کے حساس دل میں اتار دی۔

”خدا نہ کرے کہ آپ کو کسی کو الوداع کہنا پڑے۔ آپ مایوس تو نہیں ہوتیں پھر اب کیا ہوا کہ آپ اس قدر افسردہ اور غیر مطمئن سی ہیں۔“ زرتاشیہ نے بے کل ہو کر پوچھا۔

”چھوڑو کیا قصہ لے بیٹھیں۔ آپ سے کچھ ذاتی باتیں پوچھنی ہیں۔“ سامعہ نے بہادری سے نگاہوں کو شریر سا رنگ دے کر پوچھا۔ زرتاشیہ کچھ نہ سمجھی۔

”آپ اپنی باتیں کریں مجھے آپ کی فکر ہوگئی ہے۔“

”ارے نہیں بھی مجھے کچھ نہیں ہوا۔ آپ تو خوش خوش آئی تھیں۔“

”ہاں وہ‘ فرحان آرہے ہیں۔ پیپا اور شاہدہ پھوپھو کچھ تاریخ والی بات کر رہے تھے۔“ اس نے لجا کر بتایا۔

”اوہ اچھا! یہ تو خوشی کی بات ہے۔“ وہ اس کی خاطر مسکرائی۔

”میں نے وہ پیچ کلر کا ڈریس نکالا ہے۔ رات کا کھانا دادو زبردست سا بنوا رہی ہیں۔ آپ کے لیے کون سے کپڑے نکالوں؟“ وہ اپنی ترنگ پیس بولتی چلی گئی۔ جب کہ سامعہ کے دل کی حالت بھی کچھ ایسی تھی۔

”اے دل آیا نہ تجھے راس کوئی گھر بھی قفس بھی۔“

زرتاشیہ نے خود کلامی میں کچھ نہ سنا بس خود ہی اس کے کپڑے نکالنے کے لیے وارڈ روب کھول لی۔ وہ بجھی بجھی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی لیکن کچھ کہہ نہ سکی۔ حقیقتاً وہ زرتاشیہ کی خوشی ماند کرنا نہیں چاہتی تھی۔ حالانکہ اسے فرحان کی آمد پر زرتاشیہ سے زیادہ خوش ہونا چاہیے تھا۔ اس کے انتظار میں پل پل تڑپ کر گزارا تھا۔ بے اختیار ہی اس کے لبوں سے دعا نکلی۔

خدا کرے وہ تری عمر میں گئے جائیں

وہ دن جو ہم نے ترے ہجر میں گزارے ہیں

ہلکی گلابی لباس میں، گلابی لپ اسٹک کی ہلکی سی تہہ چڑھانے کے بعد وہ ایک ٹک آئینے میں اپنا ہی سراپا دیکھ رہی تھی۔ زرتاشیہ کے اصرار پر اس نے لباس پہن لیا تھا۔ بال بھی سنوارے تھے۔ کاجل کی باریک سی لکیر بھی آنکھوں کی مستی میں اضافے کا باعث بنی تھی۔ بس نہیں پہنے تھے تو اتر رنگز نہیں پہنے تھے۔ فرحان کے آنے کی خوشی حد سے زیادہ تھی مگر ایک افسوس اور اُداسی کی کیفیت اپنی جگہ تھی۔ اس کا سامنا کرنے اور خود سے دور ہوتا دیکھنے کا احساس دونوں اسے خود کو دیکھنے پر مجبور کیے تھے۔ چونکی تو اس وقت جب اپنی گردن پر جھکا فرحان کا چہرہ دیکھا۔ وہ اس کی کمر کے گرد بازو جمائل کیے اسے بہت قریب کیے محبت نچھاور کر رہا تھا۔ وہ سب کچھ بھول گئی۔ اس کے سینے کی وسعت میں سما گئی۔ کچھ دیر بعد وہ مخمور آواز میں بولا۔

”میری سامعہ کو اللہ نے کتنی فرصت اور توجہ سے بنایا ہے صرف میرے لیے۔“

”بس، بس اسی لیے اتنے دن لگا کر آئے ہو۔“ وہ کچھ لجا کر بولی۔

”جانم! مجبوری تھی۔ بس یہ سب تمہارے لیے ہی تو کر رہا ہوں۔“

”خیر، آپ چلیں زرتاشیہ اور میں وہیں آتے ہیں۔“ وہ لوٹ کر انجان سی دنیا میں گئی۔

”نہیں ابھی تو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں، پیار بھی نہیں کیا۔“

”اوہو نہ کوئی آنے کی خبر اور نہ سفر کا احوال۔“ اس نے موضوع بدلا۔

”قسم لے لو جو گھر پہنچ کر ایک منٹ سے زیادہ کسی کو دیا ہو۔ ماما نماز پڑھ رہی تھیں۔ بابا گھر ڈراپ کر کے باہر چلے گئے۔ تانیہ سے ہلکی سی ہیلو ہائے۔ نانو سے باورچی خانے میں مختصر سی بات چیت اور پھر دوڑتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔“ وہ ایک سانس میں بولتا چلا گیا۔

”اور زرتاشیہ سے۔“ مختصر سا جملہ اس کے ہونٹوں سے نکلا۔

”زرتاشیہ سے کیا؟“ وہ کچھ نہ سمجھا۔

”وہ حد درجہ تمہارے آنے کی وجہ سے خوش ہے، بہت خوب صورت لباس پہنا ہے بہت پیاری لگ رہی ہے۔ اس سے...“

”بس، بس سمجھ میں آگیا مگر ہماری جان سے زیادہ پیاری اور حسین کوئی ہو نہیں سکتا۔“

”اچھا، اچھا اب جائو کوئی آجائے گا۔ ویسے یوں بے باکی سے میرے کمرے میں مت آیا کرو۔“ وہ کچھ غیر معمولی سی سنجیدگی کے ساتھ کہہ گئی تو وہ اور شوخ ہوا۔

”اجی باتیں نہ بنائیے ہمیں کسی سے ڈر نہیں لگتا اور چند روز میں مم اعلان کرنے والے ہیں۔“

”نہیں آپ ایسا کچھ نہیں کریں گے، پلیز میرے کچھ کہنے تک خاموش رہیں گے۔“ وہ جلدی سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ چند ثانیے وہیں کھڑا رہا پھر واپس باہر نکل آیا۔ سامعہ تو جانے کہاں تھی۔ البتہ زرتاشیہ سے اس کی

مڈ بھیڑ ہو گئی۔ وہ بلاشبہ بہت خوش بھی تھی اور اچھی بھی لگ رہی تھی۔ مگر وہ ایک منٹ کو بھی وہاں رکا نہیں۔ زرتاشیہ دوڑ کر پیچھے آئی تو وہ ٹھہر گیا۔

”کیسے ہو؟ بنا بات کیے جا رہے ہو؟ پھر آئے کیوں تھے؟“ تین سوال ایک ساتھ پوچھ کر اسے مشکل میں ڈال دیا۔

”پاگل ہوں، سر پھرا ہوں، دماغ میں کمیڑے نے کاٹا تھا اس لیے آگیا تھا۔“ وہ تقریباً بھٹنا اٹھا۔ اس کے اس انداز پر زرتاشیہ کو ہنسی آگئی اور اسے لگا۔ جیسے فرحان کے کہنے کا مطلب یہ ہو کہ ”احتمق لڑکی تم سے ملنے آیا تھا اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“ وہ سوچ کر مسکرا نے لگی۔ مگر وہ گردن کو جھٹکا دے کر وہاں سے چلا گیا۔ زرتاشیہ دل تھام کر رہ گئی۔ اسے یقین ہو گیا کہ فرحان دو ہفتوں کے بعد بے قرار ہو کر اس سے ملنے آیا تھا، مگر وہ اپنے کمرے میں گھسی ہوئی تھی۔ وہ تو ملاقات کو آیا۔ اس کی آنکھوں میں بے تابی تھی یا بے قراری وہ کچھ نہ کچھ تو کہہ رہی تھیں۔

اس نے آنکھوں سے کہی بات بہت چپکے سے

جس نے کی دل سے ملاقات بہت چپکے سے

کیا بتائوں کہ کیا ہے آج کی شام

کچھ کہنے لگے ہیں جذبات بہت چپکے سے

بہت چپکے سے

بہت چپکے سے

☆☆☆☆

کھانے کی میز پر سب سے پہلے شاہدہ بیگم نے بیٹے کی شادی کی بات کی تو  
فرحان چونکا...

میاں افتخار پلیٹ پر جھک گئے...

سامعہ کے ہاتھ میں چمچ لرزنے لگا...

صرف زبیر احمد کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔ زرتاشیہ کی پلکیں  
بارِ حیا سے رخساروں پر جھکی تھیں۔ اماں جان تو اس فیصلے کی منتظر تھیں۔ رہ  
گئی تانیہ تو وہ بے پروائی سے سلاد کھانے میں مصروف تھی۔

”ماما! یہ فیصلہ آپ مجھ پر ٹھونس رہی ہیں یا پوچھ رہی ہیں؟“ فرحان نے  
خاصی سنجیدگی سے پوچھا۔

”فرحان! فیصلہ تو ہو چکا تھا۔ اب تو شادی کی گھڑی آئی ہے۔“ شاہدہ بیگم نے  
وضاحت کی۔

”اچھا۔ آج وہ آیا ہے تھکن تو اترنے دیجیے جس مقصد کے لیے گیا تھا ابھی  
اس پر کام ہونا ہے۔“ میاں افتخار نے مزید بات بگڑنے سے پہلے ہی سنبھالنے  
کی کوشش کی۔

”افتخار! فرحان کو کچھ نہیں کرنا۔ بس سب کام ہمیں کرنے ہیں۔ شادی کی  
تاریخ تو زبیر کو دینی ہے۔ یہ اپنا کام کریں۔“ شاہدہ بیگم نے ان کی رائے  
مسترد کر دی۔



”بس میاں ستار اور رفیعہ کو بھی کہلا بھیجو کہ تاریخ لے جائیں آنے والے جمعہ کو۔“ اماں نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا اور تانیہ، شاہدہ بیگم کو گڑبڑا دیا۔

”اماں جان! فی الحال فرحان کی شادی ہو گی۔ تانیہ کی بعد میں۔“ شاہدہ بیگم نے بڑی ہمت کر کے کہا تو اماں جان کی چھٹی حس بیدار ہوئی۔

”یہ کیا کہانی ہے۔ رفیعہ اور ستار نظریں لگائے بیٹھے ہیں۔“

”نانو! یہ میرا مسئلہ ہے۔ میری شادی میری مرضی سے ہو گی۔“ تانیہ نے کڑک کر براہ راست جواب دیا اور اٹھ کر چلی گئی۔

”ماما! میری شادی میرا مسئلہ ہے۔ لہذا میری مرضی سے ہو گی۔“ فرحان نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔ بالکل تانیہ کے انداز میں کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

میاں افتخار نے زیر لب مسکرا کر اسے داد دی جب کہ کھانے کی میز بدمزگی کا شکار ہو گئی۔ زبیر احمد کو فرحان کی بات پسند نہ آئی۔ زرتاشیہ کا بھی صدمے سے برا حال ہو گیا۔ وہ اٹھ کر چلی گئی۔ سامعہ شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

معذرت کر کے وہ بھی اٹھ گئی۔ شاہدہ بیگم پر اس خجالت بھرے ماحول میں اماں جان نے تیروں کی بارش کر دی۔

”لو بھئی۔ ماں کے منہ پر زوردار طمانچہ مار کے بچے چلے گئے۔ آج تک ماں کو یہ نہیں پتہ چلا کہ اس کی اولاد کتنی بے لگام ہے۔ شاہدہ کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ خود ماں ہے یا بیٹا بیٹی اس سے بڑے ہیں۔ لے لو تاریخ اور کر لو شادی کی تیاری۔ منہ زور بچے اللہ کسی کو نہ دے۔ جانے دونوں کے اندر کیا پلان چل رہا ہے؟“

”پلیز اماں جان! مجھے پوچھ تو لینے دیں۔“ شاہدہ بیگم نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

”بس بس۔ رہنے دو۔ ٹکا سا جواب دے گئے۔ اب انتظار کرو جب راج دلارے کہیں گے تب ہی شادی ہو گی۔ ہماری تو عقل جواب دے گئی ہے۔“ اماں جان اچھا خاصا کف اڑا کے چلی گئیں۔ زبیر احمد بددلی سے اٹھ کر چلے گئے۔

صرف میاں افتخار اور شاہدہ بیگم ہی رہ گئے۔ میاں افتخار اطمینان سے راستہ پی

رہے تھے۔ شاہدہ بیگم کی حالت خراب سی ہونے لگی۔ بڑی مشکل سے خود ہی سہارے سے کھڑی ہوئیں اور میاں افتخار کی بے حسی کو نشانہ بنا کر بولیں۔

”واہ۔ آپ کی بلا سے بیوی کا جو بھی حال ہو۔“

”بیگم! آج کھانا بہت مزے دار تھا۔“ وہ پورا چسکا لے کر غیر متعلقہ جواب دے کر کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

انہیں کمرے سے نکلنے کی اجازت نہ ملی تو وہ لمبی سرد آہ بھر کے شاہدہ بیگم کے بیڈ کے قریب پڑی کرسی پر ٹک گئے۔

”شاہدہ! تم نے کبھی شاخ پر پرندے کو دیکھا ہے۔ وہ شاخ کی کمزوری یا اس کے جھولنے سے نہیں ڈرتا کیونکہ اس کو شاخ پر نہیں اپنے پروں پر اعتماد ہوتا ہے مگر تم شاید شاخ پر اعتماد کرتی ہو۔“ وہ بہت خاموش اور سنجیدہ لگ رہے تھے۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟“ وہ کچھ نہ سمجھ سکیں۔

”میرا مطلب ہے میرے یہاں بیٹھنے نہ بیٹھنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو کبھی بھی قابل اعتماد نہیں رہا پھر کیوں باہر نہیں جانے دے رہیں؟“

”یہی تو آپ کی اجنبیت مجھے بیزار کرتی ہے۔“

”اس وقت میں آپ کا مسئلہ نہیں اس لیے مجھے جانے دو۔“

”پر کہاں...؟“ وہ جھنجلا سی گئیں۔

”شاہدہ بیگم! انسان اس مقام کی طرف ہی لوٹنا چاہتا ہے جہاں وہ پیدا ہوتا ہے۔“

”تو...؟“ دبا دبا غصہ ابھرا۔

”تو یہ کہ کچھ دیر کے لیے مجھے آزاد کر دو۔ میں وہاں اپنے باپ جیسے بھابھی اور ماں جیسی ماں سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ مجھ پر بند ہو جائے۔“ وہ اٹھ کر ان کی طرف پشت کر کے بولے۔ شاہدہ بیگم تڑپ کر تکیہ پھینک کر کھڑی ہو گئیں۔

”کیا کہا تم نے... پھر سے کہو...؟“

”شاہدہ پلیز! ایک بار جانے دو کیونکہ وقت نہیں ہے۔ آپ نے اور تانیہ نے وہ گھر، میرا گھر ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔ مجھے کچھ نہیں کہنا۔ میں ندامت کی دیواروں سے سر پھوڑ کر آجائوں گا۔“

”میں نے کب وہاں جانے سے روکا ہے...؟ تانیہ کے دماغ کا خلل میں کیسے دور کروں؟“ وہ بے بس ہو گئیں۔

”میں نے کچھ کہا کیا؟ کوئی ایک لفظ ایک جملہ... بس آپ نے جو کہا وہی قبول کیا۔“

”ٹھیک ہے جائو۔ بیٹی اور بیوی کے خلاف زہر افشانی سننے کے لیے جائو۔“

”تم مجھے موقع تو دو اعتبار بنانے کا۔ خدا کی قسم تھک جائو گی میری وفا کے ساتھ چلتے چلتے۔“ وہ محبت بھرا شکوہ کر کے باہر نکل گئے۔

شاہدہ بیگم دھپ سے صوفے پر گر گئیں۔ میاں افتخار نے جو کہا وہ دل چھید گیا۔ یہ کیسا کڑا وقت آیا تھا کہ سایہ بھی جدا ہونے لگا تھا... کتنی بڑی قیامت آ گئی تھی... کسی کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ ناجی نے دھلے ہوئے خشک کپڑے الماری میں رکھنے کے لیے کمرے میں قدم رکھے تو انہوں نے پوچھا۔

”ناجی! اماں جان کہاں ہیں؟“

”وہ اور زبیر صاحب چپ چپ سے بیٹھے ہیں۔ بڑی بیگم صاحبہ نے بہت برا مانا ہے۔“

”بات ہی ایسی ہے۔ فرحان نے اچھا نہیں کیا۔“ وہ بولیں۔

”بیگم صاحبہ جی! تانیہ بی بی نے بھی تو اچھا نہیں کیا۔“ ناجی نے دل کی بات کہہ دی۔

”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا کہ میں کیا کروں؟“ وہ ایک بار پھر بیڈ پر لیٹ گئیں۔

”سر دباؤ وں؟“ ناجی نے ہمدردی سے پوچھا۔

”نہیں تم جائو اماں جان کا خیال رکھو۔ زبیر کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”اللہ جانے۔ میں تو کپڑے استری کر رہی تھی پھر سب کے کپڑے کمروں میں پہنچائے ہیں۔“

”اچھا جائو بس۔“ انہوں نے کروٹ لے لی۔

خ...ز...خ

”مجھے اپنی قسمت سے بس یہی گلہ ہے کہ...“ سامعہ کی گود میں سر رکھے وہ سسکی۔

”ایسے نہیں کہتے۔ اللہ بارش کی طرح تم پر خوشیاں برساتا رہے۔ بارش کی ہر بوند تمہارے دل سے ہر اک غم مٹا دے آمین۔“ سامعہ نے محبت سے چور لہجے میں اسے دعا دی۔

”کیوں کہا فرحان نے ایسا...؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ رشتے اور دل کا بیچ کے بنے ہوتے ہیں۔ یہ ٹوٹنے پر چبھتے ہیں۔ انہیں ہتھیلی پر سنبھال کر رکھنا ہوتا ہے۔ یہ پل بھر میں ٹوٹ جاتے ہیں۔“

”نہ رشتے ٹوٹنے چاہئیں اور نہ دل... ایسا تو فرحان صاحب نے کچھ نہیں کہا۔ دل پر مت لو۔“ سامعہ نے بہت پیار سے اس کے بال سنوارے۔

”میرا تجربہ یہی ہے۔ ماما نے رشتہ توڑ لیا۔“ وہ رو دی۔

”انہوں نے بھی رشتہ نہیں توڑا۔ فرحان نے بھی ایسا کچھ نہیں کیا بھروسہ رکھو۔“

”کس چیز پر بھروسہ رکھوں...؟ فرحان کا لہجہ کس قدر اجنبی تھا...“

”اپنی محبت پر... محبت جس کو کہتے ہیں وہ نعمت اور ہوتی ہے۔ عقیدت اور مروت کو محبت نہیں کہتے۔ محبت میں تو قیامت خیز منظر نگاہوں سے گزرتے ہیں۔ دل پر قیامت ٹوٹتی ہے مگر اس قیامت کا لطف بھی اور ہوتا ہے۔ محبت

اس لطف کو کہتے ہیں۔“ محبت کے کس دیس کی وہ لمحوں میں سیر کر آئی۔ یہ زرتاشیہ نہ جان سکی۔

”سامعہ جی! کچھ بھی کہیں مگر فرحان کی وجہ سے پیپا بھی دکھی ہو گئے ہیں۔“

”حوصلہ رکھو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں فرحان چاہیے وہ ملے گا کیوں کہ تم اسے شاید سب سے زیادہ چاہتی ہو۔ وہ تمہارے بچپن کا معصوم تصور اور جوانی کا خواب ہے۔“ دل پر پتھر رکھ کر اس نے یقین دہانی کرا تو دی مگر ساون کی جھڑی جو نگاہوں سے لگی تو خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ بیٹھنا محال ہو گیا تو مشکل سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ جس حالت میں اسے خوشی اور سرشاری کی ضرورت تھی اس میں وہ غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ سب خواب بکھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ فرحان کو اپنے احساس سے الگ کر کے دیکھنے کا حوصلہ پیدا ہونا مشکل ضرور تھا مگر ضروری

ہو گیا تھا۔ کس طرح اس سے اپنا رشتہ ختم کرے کہ جس کو صرف سوچتی ہے تو ساری دنیا بھول جاتی ہے۔

”مگر سامعہ! بھولنا تو شرط ٹھہرا ہے۔ زرتاشیہ کو اس کا بچپن... اس کی جوانی فرحان سے منسوب ہی رکھنے کا یقین دینا ہے۔ میری محبت فرحان ہے تو محبت ہی بائنی ہے۔ فرحان زرتاشیہ کو لوٹانا ہے۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا اور پلکیں آنچل کے پلو سے رگڑ کر صاف کر لیں۔ اسی لمحے زرتاشیہ اپنے ہاتھ سے تیار شدہ آئس کریم لے کر آ گئی۔ سامعہ نے مسکرا کر اسے طمانیت بھرا احساس دیا۔ وہ سچ مچ بہت اچھی تھی۔ کوئی اپنا بھی ان حالات میں اس کا اتنا خیال نہیں رکھ سکتا تھا جتنا وہ رکھتی تھی اپنی بے پناہ توجہ اور محبت سے اس نے اس کی محبت جیت لی تھی۔

خ...ز...خ

واپسی پر گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ عجب سے منحصر میں پھنسے ہوئے تھے۔



نہ بھائی میاں نے گرج برس کر گھر سے نکلنے کی دھمکی دی... نہ رفیعہ بھابی نے شربت کا گلاس بڑھاتے ہوئے غصیلی نظروں سے دیکھا... نہ گھر سے باہر گاڑی تک چھوڑنے کے لیے ساتھ آنے والے عادل کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی... سب کچھ ویسا ہی کیوں تھا...؟

اسٹیرنگ پر ہاتھ جمائے وہ مسلسل اپنے آپ سے سوال کر رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ بہت برے طریقے سے ان کی آٹو بھگت ہو گی۔ بھائی میاں کہیں گے۔

”اب کیا لینے آئے ہو تمہاری بیٹی نے تو سب ختم کر دیا...؟“ بھابی دھیمے لہجے میں شکوہ کریں گی۔

”افتخار! یہ تم نے کیا کر دیا... ہمارے پیار اور انتظار کا یہ صلہ دیا...؟“

اور عادل احتجاج کرے گا۔ ”چاچو! آئندہ کبھی یہاں مت آئیے گا کیونکہ آپ نے ہمارا مذاق اڑایا ہے۔ ہماری غیرت اور خودداری کا تمسخر اڑایا ہے۔“

مگر وہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

”کیا عادل نے بھابی اور بھائی میاں کو کچھ نہیں بتایا... اگر نہیں بتایا تو عادل بیٹا آپ بہت عظیم ہو ورنہ میں کیا کرتا...؟ کیسے آپ سب سے نظریں ملاتا...؟ کیسے سر اٹھاتا... کیا وضاحت دیتا...؟ کیا معذرت کرتا...؟“ انہوں نے خود کلامی کے ذریعے جواب دیا لیکن یہ جواب تسلی بخش نہیں تھا۔ اگر آج ایسا نہیں ہوا تھا تو آخر کب تک ایسا نہیں ہوگا... آج نہیں تو کل یہ حقیقت کھل جائے گی اور پھر میرے اپنے میرے مختصر سے خونی رشتے مجھ سے جدا ہو جائیں گے... میرے گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گے۔ شاید اور پھر میری زندگی میں بھائی مجھے معاف نہ کریں۔ ان کے غصے اور جاہ و جلال سے معافی کی امید بھی نادانی ہے۔ عادل جیسے ہیرے کے کھونے کا قلق اپنی جگہ... کہاں اور کیسے ایسے ہیرے ملتے ہیں...

میاں افتخار بہت ڈسٹرب تھے جس وقت گھر پہنچے۔ شوکی نے گیٹ کھولا تو وہ گاڑی لاک کر کے سیدھے کچن میں گھس گئے۔ فریج سے ٹھنڈی بوتل نکالی اور ڈھکن کھول کے منہ سے لگالی۔ غٹا غٹ سا پانی تقریباً پی کر کچھ سکون سا

ملا۔ کمرے میں آئے تو زیرو پاور کے بلب کی روشنی میں شاہدہ بیگم بیڈ پر پر سکون نیند سوئی ہوئی تھیں۔ ان کے قدموں کی آہٹ پر آنکھیں کھول کر دیکھا مگر وہ جوتے اتار کر سیلپر پاؤں میں ڈال کر واش روم میں گھس گئے جب کچھ دیر بعد واپس آئے تو انہوں نے چبھتا ہوا سوال کیا...

”مل آئے اپنے بھائی اور بھابی سے...؟“

”ہاں۔“

”خوب اپنی اور ہماری برائیاں سنی ہوں گی۔“

”شاہدہ! چال چلتے ہوئے شطرنج کی بازی کے اصول بھول جاؤ گے تو پھر مات بھی ہو سکتی ہے۔“

انہوں نے جواب دیا اور بیڈ پر لیٹ کر کروٹ لے لی۔ شاہدہ بیگم ان کے جواب کے انداز اور لہجے کے زیروبم میں کھو سی گئیں۔ بڑی دیر تک ان کی پشت تکتی رہیں عجیب سا سوال تھا اور غیر معمولی سا انداز تھا...

خ...ز...خ

کشیدہ اور کھنچی کھنچی صورت حال کے پیش نظر شاہدہ بیگم نے دو روز کی چھٹی کی درخواست میاں افتخار کو تھما دی۔ وہ بالکل کچھ نہیں بولے اور خاموشی سے چلے گئے۔ شاہدہ بیگم نے خود کو بہت زیادہ الجھن میں گرفتار پایا تھا۔ طبیعت بھی اسی وجہ سے متاثر ہوئی تھی۔ فرحان سے گزشتہ روز کے برتاؤ کے بارے میں بات کرنے کا فیصلہ وہ کر چکی تھیں مگر وہ ناشتہ کیے بنا ہی اپنے کاروباری کام کی وجہ سے جا چکا تھا۔ تانیہ نے اپنی فرمائش کے مطابق فائیو اسٹار ہوٹل کے پارٹی ہال میں بیس افراد کے لیے ارتنج منٹ کرائے تھے۔ شاہدہ بیگم نے اپنا ذاتی اے ٹی ایم کارڈ اس کی مٹھی میں تھما دیا۔ وہ خوش ہو کر ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر جھومنے لگیں۔

”تھینک یو ماما!“ وہ یہ سن کر بھی چپ رہیں۔

”زرتاشیہ اور سامعہ باجی نے معذرت کر لی ہے۔ آپ کو اور بابا کو ضرور آنا ہے اور فرحان بھائی کو بھی میں فون کر دوں گی۔“ وہ یہ پروگرام سنا کر چلی

گئی اور اماں جان نے انہیں اپنی عدالت میں طلب کر لیا۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ کیا بات کریں گی مگر جانا تو ضروری تھا...

اماں جان نے حسبِ روایت کھیر پکا کر ہاتھ دھوئے اور اپنے کمرے میں آ گئیں۔ شاہدہ بیگم وہیں آ گئیں۔

”آپ نے بلایا تھا؟“

”ہاں بیٹی! بیٹھو اور کھل کر بتاؤ تمہارے لاڈلے کے کیا ارادے ہیں؟“

انہوں نے خاصے تند لہجے میں پوچھا۔

”دراصل کاروبار کی مصروفیت ہے۔ پریشانی والی کوئی بات نہیں۔“ انہوں نے روایتی سا جواب دے کر انہیں تسلی دینا چاہی مگر وہ کہاں ان باتوں سے بہلتی تھیں۔

”ہمیں تو یہ بیساکھیاں پکڑاؤ نہیں، بیٹے سے دو ٹوک بات کرو بلکہ اس سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟“

”اماں جان! جوان بیٹے کو مار تو نہیں سکتے۔“

”ارے بھئی مارنا بھی پڑتا ہے۔ سب بڑوں کے منہ پر میاں صاحب زادے نے طمانچہ دے مارا اور بس...“

”میں بات کروں گی دراصل بات کرنے کا وقت ہی نہیں ملتا۔“

”ٹھوک بجا کر بات کرو کیا وجہ ہے؟ کوئی چکر ہے کیا...؟ میاں صاحب باہر کی دنیا دیکھ کر آئے ہیں...“

”ارے نہیں اماں جان! ایسی کوئی بات نہیں۔ بس جذباتی ہے۔ تانیہ کی ٹون میں کہہ گیا۔“

”ہاں اور یہ تانیہ بی بی کیا فرما رہی تھیں...؟ ان کا بھی ارادہ کچھ نیک نہیں لگ رہا۔“ انہیں ایک دم تانیہ یاد آ گئی تو شاہدہ بیگم جزبز سی ہو گئیں۔ ابھی اماں جان کو بتانا ٹھیک نہیں تھا۔ جتنا وقت گول مول باتوں میں گزر سکتا ہے وہ بہتر ہے انہوں نے سوچا اور کہا۔

”وہ ابھی نادان ہے۔ بس ابھی شادی کے جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتی۔“

”اور ہمارا خیال ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو اسے رخصت کرو۔“

”اماں جان! کوئی ایک مسئلہ بھی تو حل نہیں ہو رہا۔ آپ کی ضد ہے حویلی میں رہنا ہے۔ یہیں سب کام ہوں۔ تانیہ کی خواہش ہے کہ کسی پوش ایریا میں کوٹھی لی جائے اور پھر شادی ہو۔“ مناسب وقت جان کر ایک بار پھر انہوں نے اماں جان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ہم تو تمہیں عقل مند سمجھتے تھے مگر تمہاری بیٹی نے اتنی مت ماری ہوئی ہے کہ تم یہ نہیں سمجھتیں کہ وہ بیٹی ہے اسے رخصت ہو کر اپنے گھر جانا ہے اور اب تو شادیاں ہوٹلوں اور ہالوں میں ہوتی ہیں۔“ انہوں نے سچ بچ پتے کی بات کر کے انہیں لاجواب کر دیا تھا۔

”میں سب جانتی ہوں مگر وہ خود سر اور ضدی ہے۔“ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اور ہاں افتخار میاں سے پوچھو کہ ان کی مہمان اور کتنے دن یہاں ٹھہریں گی... گھر کے سو بھید ہوتے ہیں۔ سب کھلتے ہیں اور جس طرح تمہارے بچے بد تمیزیاں کرتے ہیں اس سے تو ہم اس کی نظروں میں شرمندہ ہو جاتے ہیں۔“ ان کا واضح اشارہ سامعہ کی طرف تھا... شاہدہ بیگم کے دل کو بات لگی۔ انہیں کبھی کبھی اپنی گھریلو پرائیو سی کی وجہ سے کوفت ہوتی تھی۔

”لیکن اماں جان! اس حالت میں اسے باہر بھی تو نہیں نکال سکتے۔ ڈلیوری ہو جائے تو کہا جا سکتا ہے۔“ تہذیب اور اخلاقیات کے تقاضوں کا وہ ہمیشہ خیال رکھتی تھی۔

”بہر حال اس کا مزید رہنا کچھ خرابی پیدا کر سکتا ہے۔ وہ میاں افتخار کے پاس کیوں نہیں اپنے ساتھ رکھ لیتے...؟“

”اچھا آپ ٹینشن نہ لیں۔ میں سب معاملات دیکھتی ہوں۔“ انہوں نے خاصے تحمل سے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئیں۔

خ... ز... خ

سامعہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔

وہ بستر پر دراز تھی۔ زرتاشیہ اس کے قریب بیٹھی سیب چھیل رہی تھی تب ناجی نے آکر شاہدہ بیگم کا پیغام دیا۔

”شام سات بجے تانیہ بی بی کی سالگرہ کے لیے تیار ہو جائیے گا۔“

”میری تو طبیعت خراب ہے۔“ سامعہ نے کہا۔

”اور میں سامعہ کی تیار داری میں مصروف ہوں۔“ زرتاشیہ نے کہا۔

”جی نہیں۔ آپ کو جانا ہے۔ ناجی تم جائو۔ زرتاشیہ بی بی تیار ہو جائیں گی۔“

سامعہ نے ناجی کو بھیج دیا۔

”میں کیوں جائوں تانیہ کی سالگرہ میں...“ زرتاشیہ پہلی بار ناک منہ چڑھا کر بولی۔

”اس لیے کہ وہ فرحان کی بہن ہے۔“ سامعہ نے دانستہ چھیڑا۔

”مگر آپ نے کبھی اسے سیدھے منہ بات کرتے دیکھا...؟“

”اپنی اپنی عادت ہوتی ہے۔ آپ تو ایسے محسوس نہیں کرتیں۔ آج حیرت انگیز تبدیلی نظر آ رہی ہے۔“

”فرحان کی طرف سے آپ سیٹ ہوں۔ پپا کی طرف سے فکر مند ہوں۔ کس سے اپنا خوف اور اندیشہ شیر کروں...؟“ ماما کو تو ویسے ہی میرا خیال نہیں ہے۔“ سیب کی قاشیں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولی۔

”کبھی خوف اور اندیشوں کو دل میں جگہ نہیں دیتے کیونکہ جب یہ رہنے لگیں تو اپنے خود بخود نقل مکانی کر لیتے ہیں۔“

”سامعہ جی! اب تو سب کچھ خواب لگتا ہے۔ یہ خوف اور اندیشے کسی کے کہنے پر تھوڑا آتے ہیں۔ بس حالات کا دھارا اپنے مڑنے سے بتاتا ہے۔“

”فرحان سے دل کی بات کبھی کی...؟“ اس نے اپنے دل کی ڈوبتی ابھرتی دھڑکنوں پر مضبوط کنٹرول کرتے ہوئے پوچھا۔

”بچپن سے فرحان کا تذکرہ اپنے ساتھ سنتے سنتے کچھ اور کہنے سننے کی ضرورت پڑی اور نہ ایسا اتفاق ہوا۔ فرحان کا سراپا آنکھوں سے دل میں اتار



کے میں جوان ہوئی ہوں۔ وہ ایسا ہی تھا لیکن اب زیادہ اکھڑا اکھڑا رہتا ہے۔“

وہ خاصی رنجیدہ سی ہو گئی۔

”پھر ایک بار اس سے کھل کر بات کر لو۔“ اس نے کھوئے کھوئے مشورہ

دیا۔

”کیسی بات؟ تاریخ طے ہونے والی ہے اور اب میں پوچھوں۔“ وہ خاصی

حیرت سے بولی۔

”پھر بے فکر ہو کر تاریخ طے ہونے کا انتظار کر لو۔“

”لیکن فرحان نے تو ایک طرح سے ایسا کرنے سے روکا ہے۔“

”پھر اس سے پوچھ لو یہ بہتر ہے۔“ سامعہ نے پھر وہی مشورہ دیا تو اس نے

اثبات میں گردن ہلا دی۔

”اب شام کو اچھی طرح تیاری کرنا۔ وہاں فرحان بھی ہوں گے۔“ وہ یہ سن

کر شرما گئی۔

”ہونہہ۔ آپ نے جیسا کہا ہے ویسا ہی کروں گی۔“

”زرتاشیہ پلیز! انکل کو یہ پیغام دے دینا کہ مجھے ڈاکٹر سے ملنا ہے۔“ اس

نے کہا۔

”کب چلنا ہے... میں پپا کو کہہ دیتی ہوں؟“

”تھینک یو۔ انکل کو بس یہ پیغام دے دینا۔“ اس نے انکار کر دیا تو زرتاشیہ

خاموش ہو گئی۔

”اب آپ آرام کریں۔ میں پپا کے لیے کپڑے دیکھ لوں اور اپنے کپڑوں کی

سلیکشن بڑا مشکل کام ہے۔“ وہ ہنس کر کہتی ہوئی باہر چلی گئی۔ سامعہ نے لمبی

کرب ناک سانس کھینچ کر آنکھیں موند لیں۔

خ... ز... خ

زبیر احمد دفتری مصروفیت کی وجہ سے سالگرہ میں شرکت کے لیے نہ آ سکے۔

فرحان نے بھی فون کر کے ماما سے معذرت کر لی۔ میاں افتخار اور زرتاشیہ

کو لے کر شاہدہ بیگم چلی گئیں تو کچھ ہی دیر بعد فرحان آ گیا۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی۔ دبے قدموں سامعہ سے ملنے چلا آیا۔

وہ مغرب کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر متعجب سی ہو گئی۔  
”آپ گئے نہیں؟“

”نہیں۔“ وہ مختصراً کہہ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ سامعہ کو صاف محسوس ہوا کہ وہ کچھ الجھا الجھا سا ہے۔ نہ لہجے میں شوخی ہے اور نہ انداز میں والہانہ پن... وہ اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”کیوں نہیں گئے؟“

”پلیز سامعہ! صرف اپنی اور میری بات کرو۔“

”فرحان! تانیہ بہن ہے آپ کی اور آپ...“

”فارگاڈ سیک! میں الجھنوں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میں نے تم سے شادی ان الجھنوں اور فاصلوں کے لیے نہیں کی تھی۔“ وہ خاصے جنونی انداز میں بولا۔

”آپ نے محبت کی ہے۔ شادی محبت کی انتہا تو نہیں ہے۔“ سامعہ نے بہت مدہم لہجے میں جواب دیا۔

”دوسروں کی مرضی پر چلنے کا نام بھی تو محبت نہیں ہے۔“ اس نے جرح کی۔

”محبت تو یہ ہے کہ میں آپ کے بنا یہاں رہائش پذیر ہوں۔ محبت تو یہ بھی ہے کہ زرتاشیہ آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہے۔“ سامعہ نے کچھ پوچھا اور کچھ بتایا۔

”یہ زرتاشیہ والا سبق کہاں سے ہماری محبت کے درمیان آ گیا؟“ اس نے خاصے تلخ لہجے میں پوچھا۔

”زرتاشیہ پہلے سے موجود ایک حقیقت اور سچ ہے۔“

”مجھے معلوم ہے مگر میں بچپن کی زنجیر سے بندھ کر یہ فیصلہ نہیں تسلیم کر سکتا۔“

”اب یہ جھگڑا فضول ہے۔ کرنا تو اب یہ ہے جس میں دوسروں کو نقصان نہ پہنچے۔“

”سامعہ! میں اب مزید خاموش نہیں رہ سکتا۔“

”یہ وعدہ کر کے بھی جب تک میں نہ کہوں...“ اس نے یاد دلایا تو وہ نرم پڑ گیا۔

”سامعہ! پابندی نہ لگاؤ حالات بہتر ہونے کے بجائے خراب ہو رہے ہیں۔“

”مگر مصلحت کا تقاضا کچھ اور ہے۔“

”اوکے۔ تم مصلحت پسندی کے تقاضے سوچو میں چلتا ہوں۔“ وہ خاصا اکتا کر تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

سامعہ دروازے سے باہر نکل کر اس کو جاتے دیکھتی رہی۔ دل پر اختیار نہ رہا۔ پلکوں سے موتی ٹوٹنے لگے۔ زندگی کس موڑ پر آ کر سکوت سے ہمکنار ہوئی تھی کہ ہستی ذروں میں بٹی محسوس ہو رہی تھی۔ فرحان جس محبت کا

ذکر کر رہا تھا وہ محبت تو اس کا مقدر بن کے بھی نہ بن سکی تھی۔ وہ اسے سمجھانے سے قاصر ہو گئی تھی۔ اسے بتانے سے معذور ہو گئی تھی۔ وہ یہ جانے بنا ہی اٹھ کر چلا گیا تھا۔ غلط تو وہ بھی نہیں تھا اور... غلط وہ بھی نہیں تھی۔ یہ محبت بھی عجب شے ہے۔ کبھی اس کی جیت ہوتی ہے مگر یہ ہار جاتی ہے۔ کبھی دل سوز لمحوں سے، کبھی بے کار رسموں سے، کبھی تقدیر والوں سے، کبھی مجبور قسموں سے، کبھی دل پسند خواب ہوتی ہے، کبھی بے تاب کرتی ہے، کبھی بے تاب ہوتی ہے، کبھی یہ جنونِ عشق دیتی ہے کبھی مار ڈالتی ہے... اور یوں بھی ہوتا ہے کہ کبھی یہ مسرور کرتی ہے، سرشار کرتی ہے... کسی کا چین و قرار بنتی ہے تو کسی کو روگ لگا دیتی ہے جہاں اس کی تذلیل ہو وہاں بار بار جاتی ہے پھر کسی کے پاؤں میں رہ کر فلک کے پار جاتی ہے... دعا بنتی ہے، اشک بنتی ہے... امتحان لیتی ہے اور امتحان بنتی ہے۔

یہ سب باتیں وہ بے تاب بہتے اشکوں کے ساتھ صرف سوچ کر رہ گئی۔ کاش فرحان سن سکتا... کاش زرتاشیہ جان سکتی... کہاں وہ مجرم تھی اور کہاں قصور وار...؟

خ... ز... خ

شدید غصے کے باوجود شاہدہ بیگم اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں فرحان سے مخاطب تھیں۔ انہیں تشویش بھی تھی اور غم بھی تھا کہ وہ سالگرہ میں کیوں نہیں آیا اور کھانے کی میز پر شادی کو ذاتی مسئلہ قرار دے کر جانا یہ دونوں باتیں اہال کی طرح ذہن میں اٹھ رہی تھیں جب کہ فرحان کا موڈ آف تھا، چہرے پر تناؤ تھا۔ اس موقع پر صرف میاں افتخار کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے پرسکون اور خاموش تھے۔ وہ دونوں کو دیکھتے دیکھتے زچ ہو گئیں۔

”فرحان! میں آپ سے مخاطب ہوں۔“

”اما! جو سوال آپ کر رہی ہیں اس کا جواب میرے پاس ہے مگر میں کسی وجہ سے دینا نہیں چاہتا۔“

”لیکن جواب دینا ہے جو وجہ بھی ہے بتاؤ۔ گھر میں آپ کی وجہ سے کتنی خاموشی ہے۔ میرا بھائی ہارٹ پیشنٹ ہے۔“

”پلیز اما! میں نے انہیں ہارٹ پیشنٹ نہیں بنایا۔“

”آپ کیا چاہتے ہو...؟“

”میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔“ اس نے بابا کی طرف بے بسی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بھی اتفاق سے اس کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔

”افتخار! آپ ہی بیٹے سے پوچھیں۔“ انہوں نے انہیں کھینچا تو وہ حسب معمول مسکرا دیے اور بولے۔

”اجی ہم نے پوچھنے، سننے، کرنے کرانے کی سب خصوصیات نکاح نامے پر دستخط کرنے سے پہلے آپ کے نام تفویض کر دی تھیں۔“

”افتخار پلیز! مذاق نہیں...“

”اس میں مذاق کیا ہے؟ کیا میں نے تانیہ کے انکار پر کسی سے کچھ پوچھا...؟“  
 کچھ کہا فرحان آپ کے سامنے ہے اس سے بھی آپ ہی پوچھیں...“ وہ یہ  
 کہہ کر پھر کمپیوٹر کی طرف محو ہو گئے۔ شاہدہ بیگم ان سے مزید کچھ کہنے سے  
 باز رہیں۔

”فرحان! جو بھی بات ہے مجھے بتاؤ۔“

”ماما! میں زرتاشیہ سے شادی نہیں کر سکتا۔“ ایک دم اس نے کہا۔ شاہدہ بیگم  
 ہکا بکا رہ گئیں۔ اس جواب کی تو انہیں توقع بھی نہیں تھی۔

”آپ خود زیر ماموں کو بتانا چاہیں تو بتا دیں ورنہ میں خود کہہ دیتا ہوں۔“  
 وہ بے باکی سے واضح طور پر اپنے فیصلے سے آگاہ کر کے اٹھنے لگا تو شاہدہ بیگم  
 کی مردہ سی آواز آئی۔

”یہ جانتے ہوئے بھی کہ اماں جان پر کیا گزرے گی؟ زرتاشیہ کے دل پر کیا  
 بیتے گی...؟ اور میری کیا عزت ہوگی؟“

”سوری ماما! ان سب چیزوں پر آپ لوگوں کو اس وقت سوچنا تھا جب ایسا  
 فیصلہ کر رہے تھے۔“  
 ”مگر...“

”مگر کچھ نہیں ماما! یہ میری زندگی ہے۔ میری پسند اور مرضی کی اہمیت ہے۔  
 آپ نے ہمیشہ ہر خواہش پوری کی صرف اور صرف نانوں کی بیٹی بن کر...“ وہ  
 خاصا بد تمیزی کا مظاہرہ کر گیا۔

”اس کا مطلب ہے یہ بھی میرا جرم ہے۔ میں کیسے اس فیصلے سے اماں جان  
 کو آگاہ کروں...؟“ وہ تقریباً رو دیں مگر فرحان بنا کسی جواب کے اٹھ کر چلا  
 گیا تب میاں افتخار نے پلٹ کر ان کی جانب دیکھا۔ وہ بے بسی سے انہیں ہی  
 دیکھ رہی تھیں مگر ان کے پاس ان کی بے بسی کا کوئی حل نہیں تھا۔ وہ تو  
 خود کو بھی اب تک اس احساس ندامت سے نہ نکال سکے تھے جو تانیہ کی وجہ  
 سے اپنے بھائی، بھابی کو دکھ پہنچا چکے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے شطرنج کی بساط ہی  
 پلٹ گئی تھی۔ تانیہ کے فیصلے پر معمولی سی شرمندگی سے کئی گنا بڑھ کر



اطمینان سا تھا مگر فرحان کے انکار سے تو جو پہاڑ ان پر آن گرا وہ ناقابل برداشت

تھا۔ اس کا اندازہ ان کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں سے ہو رہا تھا۔

خ...ز...خ

بریف کیس اٹھا کے میز پر رکھا اور گاڑی کی چابی اٹھائی تھی کہ چپراسی نے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔ انہوں نے گردن کے اشارے سے بھیجنے کو کہا اور عینک اتار کے دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے آنکھوں کے کونے ہلکے سے دبا کر تھکن دور کی...

”آداب پھوپا جان!“ بھاری سی آواز پر انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔

”افراسیاب بیٹا۔“

”جی پھوپا جان۔“ وہ تیزی سے چل کے گلے ملا اور مصافحہ کیا۔

”ہمارے درمیان کیسے؟“

”ضروری کام کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ آپ سے بھی ایک گزارش کرنی ہے۔“ وہ خاصے مدہم لہجے میں زبیر احمد کے چہرے پر نظریں مرکوز کیے ہوئے بولا۔

”ہاں کیوں نہیں مگر گھر کیوں نہیں آئے اور اطلاع کر دیتے۔“

”گھر آنے والے حالات نہیں ہیں۔ فی الحال ہوٹل میں ٹھہرنا ہی مناسب تھا۔“

”اگر بیٹا آپ کا اشارہ اس طرف ہے تو وہ کوئی نئی بات نہیں رہی۔ گھر آپ کا ہے میرے ساتھ چلو۔“

”نہیں پھوپا جان! بس مجھے آپ سے گزارش کرنی ہے کہ آپ مفاہمت کا کوئی راستہ نکالیں۔ نرگس پو کبھی کبھی کمزور لمحے کی زد میں آتی ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ان کی واپسی ہو سکتی ہے۔“ اس نے کہا۔

”بیٹا! میں نے کبھی سمجھوتے اور امن کے راستے کو ترک نہیں کیا۔ آپ کی پو‘ نے کھلے لفظوں میں فیصلے کا کہا ہوا ہے۔ جانے کیوں میں نے اب تک کاغذات نہیں بھیجے...؟“

”کاغذات کے معاملے میں تو وہ خاصی گرمجوشی کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ صرف ہلکی سی لچک زرتاشیہ کے حوالے سے آتی ہے۔“

”زرتاشیہ تو کبھی بھی نرگھس کو عزیز نہیں رہی۔“

”جدائی اور فاصلے بسا اوقات عزیز بنا دیتے ہیں۔ میں ایسا ہی ایک تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ بس آپ ایک بار زرتاشیہ سے کہیے مجھ سے مل لے۔“

”مگر میرا خیال ہے کہ وہ اس موضوع پر بات نہیں کرے گی۔“

”آپ پلیز! اجازت دے دیں۔“ وہ بضد ہو گیا۔

”افراسیاب! جو رشتے دل سے تسلیم نہ کیے جائیں پھر ان کے ہونے نہ ہونے کا احساس باقی نہیں رہتا۔“

”مگر رشتوں کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔“

”اچھا ٹھیک ہے میں زرتاشیہ سے کہہ دوں گا۔ اس کے لیے گھر چلو۔“

”سوری۔ اسے سپریم ہوٹل کے کمرہ نمبر 103 میں بھیج دیں یا ریسپشن پر کہہ کر نیچے لابی میں بلا لیں۔ آنے سے پہلے اس نمبر پر اطلاع دے دیں۔“ اس نے مفصل پروگرام دیا۔

”ٹھیک ہے میں اسے وہاں ڈراپ کر دوں گا۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”شکریہ پھوپا جان۔“

”اچھا اب یہ بتاؤ کیا لو گے چائے، کافی یا کھانا...؟“

”کچھ بھی نہیں۔ میں کھانا کھا کر ہی آیا ہوں۔“

”باقی گلریز بھیا، بھابی سب خیریت سے ہیں؟“

”جی اللہ کا شکر ہے۔ بس وہ دونوں تو پو‘ سے خفا خفا ہیں۔ انہیں سمجھا بھجا کے

دیکھ لیا ہے۔ اب وہ خاموش ہیں۔“

”یہی تو میں آپ کو کہہ رہا ہوں کہ نرگھس ضدی ہے۔“

”چھوڑیں، ضدیں بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔“ وہ وثوق سے بولا۔

”مان لیتا ہوں۔“ وہ کرب سے مسکرائے۔

”اب اجازت دیں۔ رات آٹھ بجے یاد رہے۔“ وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑا

ہوا۔ ہاتھ ملایا اور چلا گیا۔ زبیر احمد نے خالی خالی ذہن کے ساتھ بریف کیس

اٹھایا اور گھر کے لیے باہر نکل آئے۔ چپراسی نور محمد نے دفتر لاک کر دیا۔

خ...ز...خ

آٹھ بج کر پانچ منٹ پر دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو اس نے اخبار رکھ

کے دروازے کا رخ کیا۔ دروازہ کھولا وہ عین وسط میں کھڑی تھی۔ اسے دیکھ

کر ہولے سے مسکرائی۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام آئیے پلیز!“ اس نے انتہائی مؤدب لب و لہجے میں دروازے

کے ایک طرف ہو کر اندر آنے کی دعوت دی۔ وہ جو بڑی مشکل سے پیپا کے

کہنے پر اس ملاقات کے لیے راضی ہوئی تھی اس کے باوقار سے انداز پر کچھ

مطمئن ہو گئی۔

”شکریہ تشریف لانے کا۔“ وہ بولا۔

”شکریہ کس بات کا، پیپا نے آپ سے ملنے کے لیے اتنا اصرار کیا۔ وہ چھوڑ کر

گئے ہیں۔“ وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”یہ تو پھوپا جان کا بڑاپن ہے۔“ وہ ذرا فاصلے پر رکھے صوفے پر بیٹھتے

ہوئے بولا۔

”آپ کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ اس نے گھنیری پلکیں اٹھا کر کہا تو اس نے

فوراً اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

”زرتاشیہ! آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی ماما واپس آ جائیں؟“

”کسی ماں کو اس طرح جانا ہی نہیں چاہیے۔“ ہلکی سی تبدیلی کو افراسیاب نے واضح طور پر محسوس کیا۔

”فی الحال ایسا ہو گیا۔ آگے کیا ہونا چاہیے؟ آپ کی شادی ہو جائے گی۔ پھوپا جان کا کیا ہوگا؟“

”یہ تو ماما کو سوچنا چاہیے۔ میرے پاپا کو کس جرم کی سزا دے رہی ہیں...“

”زرتاشیہ! آپ چاہیں تو سب ٹھیک ہو سکتا ہے۔“

”وہ کیسے...؟“

”ایک بار کچھ دنوں کے لیے ان کے پاس جا کر رہو۔ انہیں یہ احساس دلاؤ کہ آپ پاپا کی طرح انہیں بھی چاہتی ہو۔ انہیں مِس کرتی ہو۔“

”اور میرے پاپا کا کیا ہوگا؟“ اس نے طنزیہ پوچھا۔

”صرف چند دنوں کے لیے جیسے تیسے گزار لیں۔“ وہ بولا۔

”نہیں سوری۔ میں ایسا نہیں کر سکتی۔“

”پلیز غور کرو۔ آپ کے لیے انہوں نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔ میں ساتھ لایا ہوں۔“

”مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ ایک بچے کے لیے ماں کی ممتا سب سے اہم ہوتی ہے۔ اتنے عرصے سے وہ گئی ہوئی ہیں۔ پاپا سے علیحدگی کا فیصلہ کر چکی ہیں۔ مجھے ان کی کوئی چیز قبول نہیں۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”آپ کی سب باتیں سر آنکھوں پر مگر کسی بھٹکے ہوئے کو راہ پر لانے کی کوشش تو کرنی چاہیے۔ یہ سب شاپنگ انہوں نے صرف ممتا کی خاطر کی ہے اور یہ آپ کو قبول کرنی ہوں گی۔“ وہ آخری جملے پر خاصے تحکم سے کہہ گیا جس کا بعد میں اسے احساس بھی ہوا۔

”آپ حکم دے رہے ہیں... اتنے عرصے سے آپ انہیں سمجھا کیوں نہ سکے؟“ وہ برا مان گئی تو وہ نجل سا ہو گیا۔

”سوری! میں حکم دینے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ میں تو صرف آپ کی ماما کی واپسی چاہتا ہوں۔“

”تو ان کو جا کر سمجھائیں۔ میں وہاں نہیں جاؤں گی۔ یہاں میرے اپنے میرے ساتھ ہیں۔“ وہ کورا چٹا جواب دے کر اٹھ کھڑی ہوئی تو وہ جلدی سے بولا۔

”وہاں بھی آپ کے اپنے ہیں ٹرسٹ کرو۔“

”مجھے اچھی طرح معلوم ہے مما کیا چاہتی ہیں... وہ فرحان کو پسند نہیں

کرتیں۔ وہ فرحان کے بدلے رشتے بدلنا چاہتی ہیں۔ یہ شرط ہے ان کی۔“ وہ صاف صاف بتا کر پھر قدم اٹھانے لگی تو وہ سامنے آگیا۔

”ایسی کوئی شرط آپ کو مجبور نہیں کر سکتی۔ اپنا دل اور ذہن صاف رکھیں۔ رشتے قسمت میں نہ ہوں تو الگ بات ہے۔ رشتے بدلنے کے ہم قائل نہیں۔ بیٹھو ڈنر کر کے جاؤ۔“

”شکریہ۔ پیپا آچکے ہوں گے اور مجھے ان کے ساتھ ڈنر کرنے کی عادت ہے۔“

”پلیز! کھلے ذہن کے ساتھ، فرحان کے بھرپور احساس کے ساتھ ایک بار آؤ تاکہ آپ کا پیارا گھر برقرار رہے۔ ہمیں اپنا خیر خواہ سمجھو۔ وہ شک ذہن سے نکال دو۔“ اس نے آخری بار قائل کرنے کی کوشش کی۔

”اس پر سوچوں گی۔“ وہ مختصر کہہ کر باہر نکل گئی اور وہ اس بات پر ہی خوش ہو گیا کہ وہ سوچنے کو تو راضی ہوئی...

خ...خ...خ

اسے عجلت میں ناشتہ کرتا دیکھ کر میاں ستار بولے۔

”یار! یوں جلد بازی کس لیے؟ لاؤ اسٹور کی چابیاں مجھے دو میں جا کر کھولتا ہوں۔“

”اباجی! یہ تو اب میرا مسئلہ ہی نہیں رہا۔ تین لڑکے ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ گوگی اور وہ مل کر اب تک اسٹور کھول چکے ہوں گے۔“



”واہ۔ یہ تو بڑی کامیابی ہے۔“ میاں ستار خوش ہو گئے۔

”بس آپ دعا کرتے رہیں۔ بہت سی کامیابیاں دیکھیں گے۔“ چائے کا کپ رफीہ بیگم کے ہاتھ سے لیتے ہوئے وہ بولا تو میاں ستار کو اپنی بیگم کی اس عمر میں مددگار کی یاد آگئی۔

”یار! اور کامیابیاں تو ملتی رہیں گی اپنی ماں کی تنہائی اور عمر کا خیال کر لو۔“ عادل ٹھٹکا۔ رफीہ بیگم بھی بھانپ گئیں اور جلدی سے بولیں۔

”مجھے کیا ہوا ہے؟“

”بھئی یہ شادی والا معاملہ کچھ ٹھنڈا ٹھنڈا سا لگ رہا ہے۔ تم دونوں کیا تیاری کر رہے ہو؟“ وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ پوچھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگے۔

”آپ یہ پانی پیئیں۔ سب تیاری ہو جائے گی۔“ رफीہ بیگم نے پانی کا گلاس ان کے ہونٹوں سے لگایا۔ عادل نے ان کی پیٹھ سہلائی۔

”کب ہو جائے گی میرے مرنے کے بعد...؟“ وہ چلائے۔

”اللہ نہ کرے۔ ہم کر رہے ہیں بلکہ امی یہ دس ہزار روپے لیں۔ آپ جو سوٹ لانا چاہ رہی تھیں وہ لے آئیں۔ رات واپسی پر مزید پیسے لے آئیں گا۔“ عادل نے باپ کی تسلی کی خاطر شاندار اداکاری کی۔ رफीہ بیگم پیسے لے کر ملول سی اندر چلی گئیں۔

”اس بار افتخار بہت خاموش خاموش تھا۔ اس سے پہلے میں نے اسے کبھی خاموش نہیں دیکھا۔ وہ تو میرے کہنے پر بھی کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔“ میاں ستار نے تکتے کے سہارے لیٹتے ہوئے ایک دم ہی افتخار میاں کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

”کوئی وجہ ہو گی؟“

”نہیں سمجھو گے۔ وجہ تو ہو گی مگر کیا...؟ ورنہ افتخار تو میت کے گھر میں بھی پھلجھڑی چھوڑے بنا نہیں رہتا تھا۔“ وہ فکر مند تھے۔

”چلیں چھوڑیں اب آپ آرام کر لیں۔ یہ تیاری امی کا شعبہ ہے۔ موسم کے تیور خراب ہیں۔ مجھے مارکیٹ میں کئی گھنٹوں کا کام ہے۔“ عادل نے آسمان پر چھائے سیاہ بادلوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”عادل! تم ڈفر ہو پہلے ان سے تاریخ تو لو، تیاری پہلے۔ بنیاد رکھی نہیں۔“ وہ جھنجلا گئے۔

”بنیاد تو آپ لوگوں نے بہت پہلے رکھ دی تھی۔ یہ سوچے بنا کہ مضبوط بنیاد رہے گی یا کمزور۔“ وہ دھیرے سے بولا تو میاں ستار نے غور سے اس کے پُرملال چہرے کو دیکھا۔

”اب آپ آرام کریں۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ موٹر سائیکل کی طرف بڑھا اور دانستہ انہیں دیکھے بنا دروازہ کھول کے باہر نکل گیا۔

کمرے کے دروازے میں کھڑی رفیعہ بیگم نے بھیگی پلکیں صاف کیں اور گندے برتن دھونے کے لیے بیٹھ گئیں۔ بیٹے کے لہجے کو تو وہ سمجھ سکتی تھیں۔ ماں تھیں اندر ہی اندر یہ دکھ کھا رہا تھا۔ آخر کب تک وہ یہ پردہ رکھ

سکیں گی۔۔۔ میاں ستار سے کچھ بہت عرصے تک چھپانا کتنا مشکل تھا۔ کئی بار انہوں نے سوچا کہ سب کچھ بتا دیں مگر عادل نے انہیں قسم دے رکھی تھی کہ انہیں یہ صدمہ نہ پہنچائیں جب تک ممکن ہو اسے چھپایا جائے۔ اس پر ہی وہ عمل پیرا تھیں ورنہ میاں افتخار کے آنے پر ہی پھٹ پڑتیں۔۔۔ لیکن کمال ضبط کا مظاہرہ انہوں نے کیا کہ خود میاں افتخار ان کی آنکھوں میں سوال اور نفرت ڈھونڈنے کی کوشش میں ناکام لوٹے تھے۔

خ... ز... خ

مسلسل دو گھنٹے کی مصروفیت جوں ہی ختم ہوئی تو اس نے واپسی کے لیے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور ریس دی لیکن بمشکل تمام دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ بارش شروع ہو گئی۔۔۔ لمحہ بہ لمحہ بارش کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے بارش تھمنے یا کچھ ہلکی ہونے تک ایک شاپنگ پلازہ کے شیڈ تلے پناہ لی۔ گیلے بالوں کو ہاتھوں سے سنوارا۔ جیب سے رومال نکال کر چہرہ صاف کیا۔۔۔ اسی اثنا میں ایک سرمئی گاڑی بالکل اس کے قریب رکی۔ باوردی ڈرائیور

نے بارش کی پروا کیے بغیر اتر کر پچھلا دروازہ پہلے دائیں طرف والا کھولا اور پھر پھرتی سے بائیں طرف والا کھولا۔

عادل کو جھٹکا لگا۔ شوڈر کٹ بالوں کو جھٹکا دے کر ادا سے پرس لہراتی وہ تانیہ ہی تھی۔ اس کے ہمراہ بالکل اسی کی طرح کی وضع قطع والی ایک اجنبی لڑکی تھی جس نے بالوں کی کٹنگ میں تانیہ سے زیادہ فیاضی کا مظاہرہ کیا تھا یعنی بوائے کٹ میں جینز اور کُرتے کے ساتھ معمولی سے فرق کے علاوہ بالکل لڑکا ہی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں شانِ بے نیازی سے ہنستی ہوئیں اس کے سامنے سے پلازے کے فرسٹ فلور والی سیڑھیاں چڑھنے لگیں مگر دو منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ دو آوارہ لڑکے ان دونوں کے پرس لیے سیڑھیاں پھلانگ کر باہر کودے اور ایک پھٹیچر سی موٹر سائیکل پر سوار ہو کر بھاگ گئے۔

شور مچ گیا۔ ”پکڑو... پکڑو... روکو...“ کی آوازیں لگاتی وہ دونوں بھی بھاگتی ہوئی آئیں۔ پلازے میں موجود بہت سے مرد و خواتین جمع ہو گئے۔ وہ گاڑی تک آئیں۔ ڈرائیور نے بدحواسی میں

باہر نکل کر ان کی بات سمجھی۔ وہ چیخ رہی تھیں۔ ایک دم تانیہ کی نظر عادل پر پڑی تو وہ بے ساختہ اس کی طرف آئی۔

”وہ... وہ لڑکے ہمارے پرس چھین کر لے گئے ہیں۔ میرے پرس میں دس ہزار روپے اور موبائل فون ہے اور کرن کے بیگ میں تو بیس ہزار روپے ہیں۔ گولڈ کی چین ہے۔ انہیں پکڑو، جلدی کرو۔“ وہ ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔ عادل نے اجنبی نامہربان نظروں سے بارش میں بھگیکتی پریشانی سے چیختی چلائی تانیہ کو دیکھا۔

”بٹ وائے؟“ وہ اجنبی بن گیا۔

”وہاٹ ڈونٹ یو نو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ تمہارے سامنے وہ بھاگے ہیں اور...“

”مگر آپ ہیں کون...؟“ اس نے مزید اجنبیت کا مظاہرہ کیا۔

”اوہ اب سمجھی... تم لوگ اپنی فطرت سے مجبور ہوتے ہو۔“ وہ اپنی فطرت کے مطابق بولی تو وہ شعلہ بار نگاہوں سے دیکھتے ہوئے چلا پڑا۔

”اے مِس! مزید باتیں میں اب تم سے نہیں سن سکتا۔“

”کیوں؟ اب تم منسٹر لگ گئے ہو؟“ وہ گرجی۔

”شٹ اپ۔ جاؤ اجنبی لوگوں کے منہ نہیں لگتے۔“

”اوہ یو شٹ اپ۔ میں لعنت بھیج چکی ہوں تم پر۔“

”تو پھر جاؤ اپنی راہ لگو... لیکن سنو مِس اجنبی اور ہاں آپ بھی سنیں مِس کرن۔ وہ وقت کبھی تو آئے گا جب کوئی میرے ان قدموں پر گرے گا۔ آنسو کی طرح تمہاری آنکھوں سے غم کا دریا نکلے گا۔ دل موم کی مانند پگھلے گا اور پیار کا دامن چاہو گی لیکن کچھ نہیں ملے گا... پچھتاوے تڑپائیں گے... تنہائی رلائے گی۔ کاغذ پر کچھ بھی لکھو گے تو سب سے پہلے نام ہمارا آئے گا۔“ یہ

زہر میں بُجھے تیر چلا کر بھرے مجمع میں، اس کی سہیلی کرن کو مخاطب کر کے وہ تیزی سے موٹر سائیکل نکال لے گیا۔ تب وہ پتھرائی نظروں سے ارد گرد جمع لوگوں کی طنزیہ مسکراہٹ اور نگاہوں کے چبھتے سوالات پر پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ کرن اپنا غم بھول بھال کر روتی دھوتی تانیہ کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اپنی بے بسی اور بے چارگی پر سب کے سامنے ہونے والی ذلت پر تانیہ کی تو ہچکی بندھ گئی۔ کرن نے ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا اور خود اسے تسلیاں دینے لگی کرن کے لیے اپنے لیے وہ اجنبی نوجوان سوالیہ نشان تھا۔ وہ قطعاً نہیں جانتی تھی۔

”یہ کون تھا تانیہ؟“

”گردِ راہ۔“ وہ نفرت سے بولی۔ کرن کچھ نہ سمجھ سکی بے اختیار بولی۔

”گردِ راہ اور اتنا ہینڈ سم اسمارٹ۔“ تانیہ نے بھیگی آنکھوں سے کرن کو ایسے دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شک ہو۔

”ہونہہ۔ میرا ریکلڈ ہے۔ میرا ایکس فیالسی اسٹوپڈ۔“ تانیہ رونا دھونا بھول کر انتہائی تضحیک آمیز انداز میں بولی۔

”اوہ اب سمجھی۔ یار! تم اتنی احمق لڑکی ہو گی یہ مجھے پتا نہیں تھا۔“ کرن عادل کی سحرانگیز شخصیت کے اثر سے باہر نکل ہی نہیں پا رہی تھی۔

”وہاٹ؟“

”یار! سوچو چمکتے رنگ، بھوری گھنی مونچھیں، ڈارک برائون آنکھیں اور الجھے الجھے بالوں سے ٹپکتی بارش کی بوندیں... اوہ مائی گاڈ کیا بولتا تھا؟“ کرن کی آنکھوں میں عادل کا سراپا ٹھہر گیا تھا۔

”فار گاڈ سیک! کرن مجھے ڈراپ کر دو۔ یہ بے تکی باتیں خود سے کر لینا۔“

تانیہ نے بے زاری سے کہا۔

”یار تم نے کس کے لیے یہ ڈائمنڈ چھوڑ دیا؟“ اُس کی کرن سے کچھ عرصے پہلے گہری دوستی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ عادل سے ناواقف تھی۔

”تم نے اس کا گھر اور محلہ دیکھ لیا ہوتا تو تم یہ نہ پوچھتیں... موٹر سائیکل پر سوار یہ مڈیا کر تمہیں کیوں متاثر کر رہا ہے؟“ وہ نخوت سے بولی۔ کچھ دیر پہلے کے واقعے کے باعث شدید نفرت لہجے میں آگئی تھی۔

”یار بندہ دیکھو۔ گھر محلے تو بعد کی باتیں ہیں۔“ کرن نے کہا تو تانیہ کندھے جھٹک کر باہر دیکھنے لگی۔ گاڑی اس کے گھر کے راستے پر دوڑ رہی تھی۔ کرن آنکھیں موند کر صرف اس وجیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جس کا نام بھی کبھی تانیہ نے نہیں لیا تھا اور چاہتے ہوئے بھی اس وقت اس سے نام پوچھنا مناسب نہیں تھا۔ تھوڑے عرصے میں وہ زیادہ تانیہ کے بارے میں نہیں جان سکی تھی۔

خ...ز...خ

سیاہ چھوٹا سا بیگ افراسیاب نے نرگس کے بیڈ پر رکھا تو نرگس نے حیرت سے بھاری بھر کم بیگ کو دیکھا... استفہامیہ نگاہیں سوال کر رہی تھیں۔



”پو! جو آپ پوچھنا چاہتی ہیں اس کا جواب یہ واپس آنے والا سامان سے بھرا بیگ ہے۔“

”کیا مطلب ہے؟“ وہ بولی۔

”زرتاشیہ نے ممتا کے بدلے ان چیزوں کو لینے سے معذرت کر لی۔“

”آپ نے اسے آنے کو نہیں کہا؟“ وہ بے قرار سی ہو گئیں۔

”کہا تھا مگر اس کے پاس نہ آنے کا مضبوط جواز بھی تھا۔“ وہ صوفے پر بیٹھ کر اطمینان سے بولا۔

”مجھے معلوم ہے باپ اور پھوپھی، دادی نے اسے پتھر بنا دیا ہوگا۔“ وہ حسبِ معمول خاصے متنفر انداز میں بولی۔

”نہیں آپ کی سوچ غلط ہے وہ نرم و نازک پھول پتھر نہیں ہے۔ بس اپنے سینچنے والے سے محبت کرتا ہے۔“ وہ زرتاشیہ کا سراپا نگاہوں میں لاتے ہوئے بولا۔

”ماں سے بڑھ کر...“

”آپ نے ماں بن کر دیکھا کبھی... وہ تو خود یہ سوال پوچھتی ہے کہ کہاں ہے میری ماں؟“ افراسیاب نے کہا تو وہ نچلا ہونٹ کاٹنے لگی۔

”پو! ذرا سوچئے بات کچھ بھی نہیں جو اتنی بڑھ گئی۔ زبیر انکل کا قصور کچھ نہیں۔ زرتاشیہ کا گناہ کوئی نہیں پھر آپ نے ایسا فیصلہ کیا؟“ وہ بہت دھیرے سے بولا۔

”بس۔ میں زبیر کو کبھی قبول ہی نہ کر سکی۔ مجھے اب زرتاشیہ چاہیے۔ وہ میرے پاس آئے۔“ وہ ایک دم ہی بکھر سی گئیں۔

”تو پھر زرتاشیہ کا جواب یہ واپس آنے والا بیگ ہے۔ وہ غلط نہیں ہے۔ اسے رشتوں کو بکھیرنے کا ہنر مت سکھائیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”زرتاشیہ سے مل کر یہ جواب لے کر آئے ہو؟“ بڑا ذومعنی سوال تھا۔ افراسیاب نے لمحہ بھر کو سوچا اور پھر مسکرا دیا۔

”ہاں کیونکہ وہ پور پور محبت کے نشے میں ڈوبی ہوئی ہے۔ ویسے بھی میں اسے اُس طرح ملنے نہیں گیا تھا جیسا آپ سوچتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے اگر زرتاشیہ نہیں تو پھر زبیر احمد بھی نہیں۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی تو وہ ٹھٹکا۔

”کیا... کیا کہا آپ نے یعنی آپ زبیر انکل کو زرتاشیہ سے مشروط کر رہی ہیں پھر ایک اور غلطی... رشتے مشروط نہیں ہوتے۔ آپ زرتاشیہ کے لیے اس کے پاس چلی جائیں۔“

”نہیں۔ مجھے یہاں زرتاشیہ چاہیے پھر کچھ سوچا تو سوچوں گی۔“ وہ تناؤ کے بعد خاصی نرم پڑ گئی تھیں۔ افراسیاب کو کامل یقین ہو گیا کہ ان کے اندر ممتا جاگ رہی ہے... بس ذرا اور صبر سے کام لینا ہوگا۔

”مجھے حیرت ہے کہ زبیر احمد نے زرتاشیہ سے ملنے دیا۔“

”زبیر انکل بہت گریٹ ہیں۔ وہ خود زرتاشیہ کو ہوٹل چھوڑ کر گئے اور خود لے کر گئے۔ انہوں نے زرتاشیہ کو ہر فیصلے کی مکمل آزادی دے رکھی ہے۔“

”تو پھر آپ اسے اپنی طرف متوجہ تو کرتے۔ کچھ ایسا کرو کہ وہ آپ میں دلچسپی لے۔“ دل کی بات زبان پر آئی مگر افراسیاب کے چہرے پر کوئی تاثر نہ پا کر وہ پھر بولیں۔

”کیا زرتاشیہ آپ کو پسند نہیں...؟“

”آپ غلطی پر غلطی کرتی ہیں۔ زرتاشیہ فرحان کو پسند کرتی ہے۔ منگیترا ہے فرحان کی۔ ان کی شادی ہونے والی ہے۔ میں زرتاشیہ کے ساتھ کہاں سے آگیا؟“ وہ خاصی سنجیدگی سے کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ نرگھس نے صاف محسوس کیا کہ وہ زرتاشیہ کے ذکر پر اسی طرح کے ردِ عمل کا اظہار کرتا ہے۔ شاید اپنی خالہ زاد عینی میں انٹر سٹڈ ہو کیونکہ انجم بھابی کئی بار عینی کے لیے پسندیدگی کا اظہار کر چکی تھیں۔

”اگر ایسا ہے تو پھر زرتاشیہ تو مجھے کبھی نہیں ملے گی...“ بے بسی سے سوچ کر وہ بیگ سینے سے لگا کر بیٹھ گئیں حالاں کہ بیگ میں زرتاشیہ کے لیے

خریدے ہوئے کپڑے اور چھوٹی موٹی جیولری تھی مگر جانے کیوں اس کی دھڑکنیں زرتاشیہ کا لمس محسوس کر رہی تھیں۔

خ...ز...خ

کئی روز خود سے ہمت حاصل کرنے کی جنگ کے بعد وہ اس وقت فرحان کے کمرے میں پہنچ گئی جب وہ کچھ کاروباری فائلیں دیکھ کر بریف کیس میں رکھ رہا تھا اور ذہنی طور پر تو پہلے ہی وہ مسلسل الجھا ہوا تھا ہی... اسے دیکھ کر پیشانی پر چند سلوٹیں ابھریں اور پھر معدوم ہو گئیں۔

”جی فرمائیے!“ کام میں مصروف مختصراً کہا تو اس کا دل کٹ کے رہ گیا۔

”فرحان! مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔“ بڑی بے بسی سے وہ کچھ آگے بڑھ کر بولی تو اس نے ابرو چڑھا کر اسے دیکھا اور جھٹکے سے بریف کیس بند کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا اب تمہیں بھی کچھ پوچھنا ہے؟ ایسا کرو سب مل کر پوچھنے کا پروگرام بنا لو۔“

”پلیز فرحان!“ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ سسکی سی محسوس ہوئی۔

”جی پوچھئے۔“

”وہ... وہ...“ وہ صرف ہکلا کر رہ گئی۔

”زرتاشیہ پلیز! میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔“ وہ جانے کی تیاری کے ساتھ بولا۔

”مگر مجھے ابھی اسی وقت پوچھنا ہے۔ میرے پیّا اداس ہیں، میرا دل ڈوب رہا ہے۔“ جانے ایک دم ہمت اس میں کہاں سے آگئی تو وہ چلا پڑی۔ فرحان کو حیرت ہوئی مگر سفاکی سے بولا۔

”نہر بات کا تعلق مجھ سے نہیں ہے۔ جائو کہو اپنے پیّا سے کہ پوچھیں اپنی اماں جان سے اور بہن سے۔“

”کیا... کیا...؟ یہ سب آپ کہہ رہے ہیں؟ اتنے اجنبی...؟“ وہ رو دی۔

”اوہ گاڈ! کیا مصیبت ہے؟ جائو میری ماما سے بات کرو۔“ وہ جھلا اٹھا۔

”فرحان! آئی لو یو ویری مچ بلکہ وی لو یو ویری مچ۔“ اس نے پرزور طریقے سے احساس دلانے کی کوشش کی مگر بے سود۔

”تو پھر...؟“ وہ سادگی سے بولا تو وہ پھٹ پڑی۔

”مجھے جاننا ہے پلیز بتاؤ تم مجھے چاہتے ہو؟“ وہ ٹھٹکا، دل تو چاہا سب کچھ صاف صاف سنا دے مگر اس کا مزاج آشنا تھا جانتا تھا کہ وہ چھماچھم رونے لگی گی۔

”اگر ایسا نہ ہو تو...؟“ کچھ سوچ کر کڑے تیور کے ساتھ پوچھا۔

”تو... تو میں سمجھوں گی کہ میری دعائوں میں... میری وفائوں میں کمی تھی حالاں کہ میں تو خدا کے بعد تمہیں یاد کرتی ہوں۔ کبھی صبح سے پہلے... کبھی شام کے بعد... دل کی دیواروں پر تمہارا نام لکھتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ

میرے مرنے کے بعد بھی لوگ تمہیں پکاریں گے کبھی میرے نام سے پہلے اور کبھی میرے نام کے بعد...“ وہ پہلی مرتبہ اظہارِ محبت سسکیوں کے ساتھ کر کے تیز قدموں سے واپس پلٹ گئی۔ فرحان نے ایک طویل سانس بھری اور بڑی بے بسی سے اس کی عدم موجودگی میں اپنی مجبوری بیان کی۔

”زرتاشیہ! قصور تمہارا ہے نہ میرا۔ بچپن کی وابستگی کو تم نے محبت کا نام دے کر یقیناً اپنی زندگی وقف کر دی، مگر مجھے بچپن کی وابستگی کے سوا کبھی کچھ اور محسوس نہیں ہوا۔ اگر محبت ایسے گوند سے چپکا کر جاتی تو میں بھی یقیناً بڑوں کے فیصلے کو محبت کا مقام دیتا مگر پاگل... مجھے تو خود نہیں پتا چل سکا اچانک انجانے میں یوں ہی سامعہ سے رفاقت ہو گئی۔ شدید چاہت ہو گئی۔ وہ میری محبت، میری الفت، میری عادت ہو گئی۔ وہ نہ ہو تو میں شاید خود سے الجھ الجھ کر مر جائوں۔ میرے وجود میں وہ لہو بن کر گردش کرنے لگی۔ میرے پاس نہ ہو تو مجھ پر قیامت گزرتی ہے۔ میری ہر سانس اس کی امانت ہو گئی ہے۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ زندگی کیا ہے...؟ مگر اسے چاہنے کے بعد زندگی

کی ضرورت ہو گئی ہے۔ تمہارے قریب میں نہیں، میری محبت رہتی ہے۔ کاش محبت رشتوں کی پابندی کے باعث یقینی بنائی جاسکتی۔ بہتر ہے کہ تم یہ راز جان لو کہ میں صرف اور صرف سامعہ کا ہوں۔“ اپنے آپ سے طویل گفتگو کا سلسلہ اس وقت موقوف ہوا جب موبائل فون بج اٹھا۔

شاہدہ بیگم پہلی بار مسلسل کئی روز سے بستر سے لگی تھیں۔

فرحان نے انہیں شدید صدمے سے، شرمندگی سے دوچار کر دیا تھا۔ برائے نام بات چیت اور برائے نام کھانے پینے کے باعث وہ بے حد کمزور ہو گئی تھیں۔ اماں جان ان سے خفا تھیں مگر یہ حالت ان کے لیے بھی پریشان کن تھی۔ وہ سب کچھ بھول بھال کر صبح صبح ان کے لیے جو کا دلیہ بنا کر لے آئیں۔

”لو بھئی اٹھو یہ دلیہ ہمارے ہاتھ سے کھاؤ۔“

”اماں جان! دل بالکل نہیں چاہ رہا۔ ویسے بھی شوگر چیک کرانی ہے۔ افتخار تیار ہو رہے ہیں۔“ شاہدہ بیگم نے تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”بھئی خود ہی سمجھ لو شوگر تو تمہاری بڑھ گئی ہوگی۔ اولاد نے کم صدمے دے رکھے ہیں۔“ اماں جان نے دلیے کا پیالہ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ شاہدہ بیگم کو یہ بات اس وقت نہ اچھی لگی نہ بری لگی بس وہ چپ رہیں۔

”آپ نے ٹھیک فرمایا اماں جان! شوگر کی گولی یہ مجھے سمجھتی ہیں۔ آسانی سے نکل لیتی ہیں۔“ عین اسی وقت میاں افتخار واش روم سے گیلے بال تولیے سے خشک کرتے ہوئے نکلے۔

”ارے میاں آپ تو بس چپ ہی رہو۔ شکر کی بوری تو آپ ہی ہو۔“ اماں جان نے ان پر حملہ کر دیا۔ میاں افتخار کب چوکنے والے تھے۔

”آپ کی صاحب زادی نے مٹھیاں بھر بھر کر ساری بوری ختم کر دی۔ اب تو چٹکی بھر شکر ہی بچی ہے۔“

”افتخار!“ شاہدہ بیگم نے ٹوکا۔

”جی جان افتخار۔“ وہ چمکے۔



”دیر ہو رہی ہے چلیں؟“

”چلئے جناب!“ ہمیشہ والی رضامندی کے ساتھ جواب دیا گیا۔

”ہم ناشتہ لگوا رہے ہیں جلدی آنا۔“ اماں جان نے کہا۔

”آج ناشتہ رہنے دیتے ہیں۔ آنے جانے میں خاصی دیر ہو جائے گی اور آپ کے ٹائم ٹیبل کے مطابق میز پر سے برتن اٹھا لیے جائیں گے۔“ میاں افتخار نے ٹکڑا لگایا تو اماں جان نے مسکرا کر کہا۔

”ہمارے ٹائم ٹیبل کا ملال تو میاں آپ کو بھی ہے۔“

”نہیں اماں جان! ہم ملال کے سب موسم پیچھے چھوڑ آئے تھے۔“ وہ ایک دم دھیمے سے کہہ گئے۔

”آپ کو افسوس ہونے لگا ہے کہ...؟“ شاہدہ بیگم اٹھ کر بولیں۔ انہیں اچھا نہیں لگا تھا۔

”اجی چھوڑیے اور چلئے۔“ میاں افتخار ٹال گئے۔ شاہدہ بیگم نے گھور کر دیکھا۔ پرس اٹھایا اور دو قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ تانیہ آگئی۔ اس کا موڈ آف تھا۔

”ماما بابا! مجھے بھی گاڑی چاہیے۔ مجھے گاڑی دلوا دیں۔ میری بھی کوئی لائف ہے، کتنی منت کے بعد بھی سوری کر کے چلے گئے۔“ وہ دونوں سے مخاطب ہوئی۔ اماں جان تو طنزیہ سی ہنسی کو کنٹرول نہ کر سکیں۔

”کون کہاں چلا گیا اور یہ صبح صبح گاڑی کا دورہ کیوں پڑ گیا؟“ شاہدہ بیگم نے ماں کی ہنسی کا مطلب بھانپ لیا تھا۔

”فرحان بھائی چلے گئے۔ آج زرلٹ آ رہا ہے۔ مجھے یونیورسٹی جانا ہے۔“

”فرحان ناشتہ کیے بغیر کہاں چلا گیا؟“ شاہدہ بیگم کی تشویش میں اضافہ ہو گیا۔

”وہ بتا کر تھوڑا جاتے ہیں۔ فیصلہ سناتے ہیں جیسا کہ شادی کا فیصلہ سنا دیا اور تم نے سن کے خاموشی اختیار کر لی۔“ اماں جان نے اچھا خاصا جواب دے

ڈالا تو شاہدہ بیگم نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر دھم سے صوفے پر گر گئیں۔  
میاں افتخار بھی ان کے برابر بیٹھ گئے۔

”اماں جان! کوئی خاموشی نہیں ہے۔ میری طبیعت تو ٹھیک ہو جائے۔ ہمیں کون سا دوسرے شہر جانا ہے...“ شاہدہ بیگم نے کہا۔

”مرضی ہے جو چاہو کرو۔ دلائو اب لاڈلی کو گاڑی جو یہ آسمان پر کھڑی کریں گی۔“ اماں جان کہہ کر باہر چلی گئیں۔ شاہدہ بیگم نے کچھ سکھ کا سانس لیا۔

”تانیہ بیٹا! رزلٹ آپ ویب سائٹ پر دیکھو۔ جانے کی کیا ضرورت ہے...؟“  
میاں افتخار نے اماں جان کے جملے کا اثر تانیہ کے چہرے پر دیکھ کر نہایت قرینے سے کہا۔

”بابا! سب کلاس فیلوز جا رہی ہیں۔ وہاں کا مزہ اور ہے اور پھر سب سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔“

”رکشتے پر چلی جائو۔“ شاہدہ بیگم نے جل کر کہا۔

”کیوں... کیوں جائوں رکشتے پر...؟ مجھے بھی گاڑی چاہیے۔“ وہ ضد پر اتر آئی۔  
”بیٹا! آپ کی نانو کے بقول گاڑی آسمان پر کھڑی کریں گی کیا؟“ میاں افتخار نے اماں جان کی تائید کی۔

”پہلے یہاں سے نکلیں۔ پوش ایریا میں کوٹھی کرائے پر لیں اور پھر گاڑی دلوائیں۔“ وہ اپنی دانست میں خود کو سمجھ دار گردانتی تھی جب کہ اس کی اس بچکانہ تجویز پر میاں افتخار ہنس دیے۔

”تانیہ پلیز! میں پریشان ہوں۔“ شاہدہ بیگم نے کہا۔

”معلوم ہے مجھے آپ کیوں پریشان ہیں...؟ آپ یہاں سے جانا ہی نہیں چاہتیں۔ نانو آپ کو اس حویلی سے عاق کر دیں گی۔“ اس نے تمسخرانہ انداز اختیار کیا۔

”تانیہ! زبان کو لگام دو۔ میری طبیعت پہلے ہی خراب ہے۔“ شاہدہ بیگم نے خاصے سخت لہجے میں کہا اور اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ میاں افتخار اٹھنے لگے تو تانیہ ان کے سر ہو گئی۔

”بابا! آپ ہی ماما کو سمجھا دیں۔ ہمیں یہاں سے جانا ہے۔“

”اپنی ماما کو آپ مجھ سے بہتر سمجھا لیتی ہیں۔“ وہ بولے۔

”بابا! ورنہ یہاں سے ہو سٹل بہتر ہے۔“ اس نے دھمکی دی۔

”اس کو ہو سٹل ہی سمجھ لو۔“ وہ باہر نکلتے ہوئے کہہ گئے۔ تانیہ تلملا کے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ اس نے کمرے میں قدم رکھے تو موبائل فون کی بیل گونج رہی تھی۔ دوسری طرف خرم تھا۔

”ہیلو مائی ڈیر!“

”ہیلو۔ شکر ہے تمہیں فون کرنے کا خیال آیا۔“ اس نے جھٹ گلا کر دیا۔

”مائی ڈیر! یہ امریکا ہے یہاں اپنا خیال نہیں رہتا۔“

”اس کا مطلب ہے تمہیں میری یاد نہیں آئی۔“ وہ برا مان گئی۔

”آتی ہے مگر تھوڑی تھوڑی کیونکہ میں بزنس کے بکھیڑوں میں پھنسا ہوں۔“

اس نے قہقہہ لگا کر وضاحت کر دی۔

”تم بزنس مائنڈ تو نہیں تھے۔“

”بہت کچھ بدلتا رہتا ہے۔ خیر تم بولو وہ اینگری ینگ مین والا معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا...؟“

”وہ تو ٹھنڈا ہی ٹھنڈا ہے مگر میں عجب مشکل میں گرفتار ہوں۔“

”یار تم زلٹ کی سنائو۔“ وہ یکسر بے پروائی سے بولا۔

”تو تم نے صرف زلٹ کے لیے فون کیا ہے؟“ اسے دکھ ہوا۔

”پھر آپ کہتیں کہ پہلے مجھے دکھائے کیوں نہیں۔“ شوکی نے ان ہی کے لب و لہجے میں کہا۔

”ہیں! بھئی اس کو بھی زبان لگ گئی، بلکہ اس گھر کے نمک میں ہی کچھ اثر

ہے کہ ہر ایک کی زبان چلتی ہے۔“

”جانے دیجئے اماں جان! ہماری اچھی خاصی زبان تھی آپ کی سرپرستی میں آئے تو ایسی گئی کہ آج تک نہیں آئی۔“ میاں افتخار نے حسب عادت گفتگو میں حصہ لیا۔

ناجی کی ہنسی نکل گئی۔ اماں جان نے گھورا تو وہ جلدی سے نظریں چُرا گئی۔

”ارے نہیں میاں! آپ تو بہت موڈب اور تہذیب یافتہ ہو، ہمیں اپنے زیر کی طرح عزیز ہو۔ ہم تو اوروں کی بات کر رہے تھے۔“ انہوں نے وسیع القلبی کا اظہار پیار بھرے لہجے میں کیا۔

”صاحب جی! اس پر تو مٹھائی ہونی چاہئے۔“ شوکی نے اپنے دانتوں کی نمائش کی تو وہ اس پر اور فروٹ والے معاملے کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”اچھا کس بات کی مٹھائی... لاؤ بل دو ہمیں۔“

”یہ لیں پورے سات سو پچاس روپے کا سارا پھل آیا ہے۔“ شوکی نے باقی پیسوں کے ساتھ بل انہیں تھماتے ہوئے کہا۔

”اس مہنگائی نے تو کمر ہی توڑ ڈالی ہے، بھلا ہو حکمرانوں کا سب کچھ ہمارا اور ہمارے لیے ہی مہنگا۔“ وہ بولیں۔

”یہ فروٹ اب باہر لے جائوں۔“ شوکی نے پوچھا۔

”نہیں تم جاکر ہمارے غسل خانے کے اندر چھت سے لگے جالے صاف کرو۔ ناجی ادھر آ یہ سارا فروٹ اچھی طرح دھو کر، فروٹ صاف کرنے والے ململ کے کپڑے سے صاف کر اور پھر آڑو شاہدہ کے لیے لاکر یہاں کمرے میں رکھو۔ باقی فریج میں رکھو۔“ انہوں نے ایک ہی سانس میں شوکی اور ناجی کو کام سمجھا دیئے۔ شاہدہ بیگم نے پیار بھری نظروں سے ماں کو دیکھا۔ میاں افتخار نے دیکھ لیا تو شروع ہو گئے۔

”بھاگوان ہیں شاہدہ بیگم آپ، ایسی ماں مقدر والوں کو ملتی ہے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں۔“ شاہدہ بیگم نے اتنی دیر میں پہلی بار زبان ہلائی۔

”جانے دو شاہدہ بی، دلی طور پر تم کو ہم سے شکر رنجیاں ہی رہتی ہیں اور تمہاری تانیہ تو ہمیں ازلی دشمن گردانتی ہے۔“ اماں جان نے دل کی بھڑاس نکالی میاں افتخار دائیں آنکھ دبا کر منہ کے سامنے اخبار کر کے مزہ لینے لگے۔

”اماں جان ایسا کچھ نہیں ہے، بچے نادان ہوتے ہیں، درگزر سے کام لینا پڑتا ہے۔“ انہوں نے تاویل پیش کی۔

”رہنے دو، بچوں کو نادانیاں کرنے سے ماں ہی روکتی ٹوکتی ہے، اب تانیہ اور فرحان کو تمہارے بے جا لاڈ پیار نے کیا سے کیا بنادیا؟ بڑوں کے فیصلے پامال کرنے لگے ہیں، ہم پوچھتے ہیں تانیہ کو سمجھایا تم نے۔“ انہوں نے چند روزہ فکرو تشویش کی بھٹی کا منہ کھول دیا۔

”سمجھایا ہے بہت سمجھایا ہے مگر اماں جان عادل بھی کچھ مناسب نہیں ہے۔“ انہوں نے کچھ دیر پہلے بازار میں پیش آنے والے واقعے کے پس منظر میں کہا۔ جو تانیہ خوب گھن گرج کے ساتھ انہیں سنا کر گئی تھی۔

”اللہ کی شان، چاند پر خاک ڈالنے کا فن بھی تانیہ کو ہی آتا ہے۔“ وہ ابرو چڑھا کر بولیں۔

”اماں آپ نہیں جانتیں، آپ بتائیے نا افتخار، عادل نے تانیہ سے کیسی بدسلوکی کی...؟“ شاہدہ بیگم نے بات کو سہارا دینے کے لیے شوہر کو ہی پکارا۔ میاں افتخار نے اخبار منہ کے آگے سے ہٹایا اور بولے۔

”بیگم صاحبہ! میں تو نہ کل تانیہ کے ساتھ تھا اور نہ آج، رہی بات عادل کی تو وہ ایسا ہیرا ہے جس کی پرکھ عام آدمی کو نہیں ہو سکتی۔“

”بالکل ٹھیک کہا... عادل جیسا داماد چراغ لے کر ڈھونڈو گی تو نہیں ملے گا۔ مت بیٹی کی نادانی کو اس کی بد قسمتی بنائو، ان دونوں میاں بیوی کے دل پر کیا قیامت گزر رہی ہوگی۔ ناگہاں کسی کی آہ نہیں لیتے۔“ اماں جان کو تو موقع مل گیا۔

”میں ہی غلط ہوں، کوئی میری بھی تو سنے۔“ شاہدہ بیگم بے بسی سے کروٹ لے کر لیٹ گئیں۔



”اب تنہا بچی دوسرے شہر جائے گی، کیا عزت ہے ہماری؟ کیسا دور آگیا؟“  
 سب قدریں بدل گئیں۔“ اماں جان سخت کبیدہ خاطر سی کہتی ہوئی باہر چلی  
 گئیں۔ ان کے جانے کے بعد شاہدہ بیگم نے افسردہ نظروں سے میاں افتخار کو  
 دیکھا۔

”اماں جان کا تجربہ ایسا ہی ہے، ان کی پوتی ماں کے بنا بیکل اور مضطرب ہے  
 ان کی نواسی ماں کے ساتھ خود سر، ضدی اور ہٹ دھرم ہے۔“ وہ بولے۔

”مجھے نرگس سے کمپیئر مت کرو۔“ وہ چڑ گئیں۔

”کمپیئر نہیں کر رہا، فرق ڈھونڈ رہا ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولے تو شاہدہ بیگم  
 کو چپ ہونا پڑا۔

...☆☆☆...

کافی عرصے بعد ڈاکٹر سے معائنہ کرا کے باہر نکلی تو صائمہ بھابی اور ایاز بھائی  
 سے ملنے کو دل مچلا۔ میاں افتخار نے بخوشی اس کی فرمائش پوری کر دی۔ گھر  
 میں بند رہنے سے بور ہو گئی تھی۔ اسے ”ایاز ولا“ پر چھوڑ کر وہ اس کی نئی  
 میڈیسن لینے چلے گئے۔ اس کے پاس تقریباً آدھا پونا گھنٹہ تھا۔ صائمہ بھابی سے  
 لپٹتے ہی اس کی آنکھیں ہمیشہ کی طرح بھر آئیں۔

”ارے یہ کیا بھابی آپ تو رُو، رُو کر بہت دُلی ہو گئی ہیں۔“ ایاز نے کہا تو وہ  
 روتے روتے مسکرا دی۔

”یہ آپ کا دوست خیال نہیں رکھتا ہوگا۔“ صائمہ نے ٹکڑا لگایا۔

”اچھا آنے دو اس بار، مگر یہ ہے کہاں بہت دنوں سے نہ فون نہ رابطہ۔“  
 ایاز نے کہا۔

”نہیں معلوم، میں تو خود ہفتہ ہونے کو آیا نہیں ملی، فون کر کے بلایا تب  
 بھی خاموشی ہے۔“ وہ دُکھی ہو گئی۔

”ایسی کیا وجہ ہے۔“ صائمہ نے تشویش ظاہر کی۔

”ویسے تو نئے کاروبار کی اپنی مصروفیت ہوتی ہے، تاہم ان دنوں اسے بھابی کا خیال رکھنا چاہئے۔“ ایاز نے جواب دیا۔

”آپ جانتے ہیں فرحان مصروف ہو سکتے ہیں مگر غافل نہیں۔“ سامعہ بولی۔

”مگر آخری بار جب ملاقات ہوئی تھی تو وہ بہت چڑچڑا ہوا تھا، آنٹی سے کوئی کلکیش چل رہا ہے شاید۔“ ایاز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”کلکیش تو فرحان بنا رہے ہیں ورنہ بات سیدھی سی ہے۔“ سامعہ نے بہت دھیرے سے مضبوط سا جواب دیا۔

”کیا مطلب...؟“

”اچھا بھئی بے چاری بھابی کو کچھ کھانے پینے دیں۔“ صائمہ نے زچ آکر مداخلت کی۔

”ہاں ہاں، یاد آیا آپ کے کچھ کاغذات منسٹری آف ایجوکیشن سے آئے ہوئے ہیں اور رات مسز جیری کی ای میل بھی آئی ہے۔“ ایاز نے بتایا تو وہ مسز جیری کی ای میل کے لیے بے قرار ہو گئی۔

”کیا، کیا لکھا ہے...؟“

”یہی کہ“

!Samina Dear

Between a thousand Yesterdays a million  
tomorrows there is only one Today I will not let  
it Pass without remembring U in my Prayers

ایاز نے لفظ بہ لفظ ای میل اس کو سنا دیا۔ وہ بہت خوش ہوئی۔

”ویسے ایاز! اگر یہاں کے حالات بہتر ہونے کے بجائے خراب ہو رہے ہیں تو بہتر ہے سامعہ بھابی مسز جیری کے پاس چلی جائیں۔“ صائمہ بھابی نے کچھ سوچ کر کہا۔

”نہیں، نہیں میں فرحان کی مرضی کے بغیر ایسا سوچ بھی نہیں سکتی، ہاں فرحان کے گھر کو مشکلات سے نکلنے کے لیے جانا پڑا تو ضرور جائوں گی۔“ سامعہ نے کہا۔

”آپ اکیلی کیوں جائیں، فرحان کو اب ڈسیسن لینا چاہئے۔“ ایاز بولا۔

”فرحان تو ایسا ہی کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ مناسب نہیں، شاہدہ آنٹی ہاسپٹالائزر ہی ہیں مان کے لیے ذہنی صدمہ ٹھیک نہیں اور زبیر انکل ہارٹ پیشنٹ ہیں، زرتاشیہ بہت سے خواب دیکھ چکی ہے۔ تانیہ نے ویسے ہی من مانی کر کے بابا کو، سب گھر والوں کو مشکل میں ڈال دیا ہے۔ ایسے میں اس گھر کے احسانات مزید مصائب پیدا کر کے چکانے کا مطلب ہے، میں خود غرض

ہوں۔“ سامعہ نے دھیرے دھیرے بات مکمل کی تو صائمہ سے چپ نہ رہا گیا۔

”پھر تو آپ فرحان بھائی اور زرتاشیہ کی شادی کرا دیں۔“

”بھابی! میرے لیے، فرحان کیا ہیں یہ آپ سے بہتر کون جانتا ہے، فرحان جیسا چاہنے والا کوئی اور نہیں، دل سے پیار کرنے والا کوئی اور نہیں، پر جب گھر کو آگ لگی ہو تو پیارے ہی آگ بجھاتے ہیں۔“ سامعہ نے کہا۔

”ٹھیک ہے بھابی آپ اور فرحان اب ہماری سمجھ سے باہر ہیں، میرا تو اپنا دل ہے کہ جائوں اور شاہدہ آنٹی کو آپ دونوں کے رشتے کے بارے میں

بتاؤں۔“ ایاز نے جذباتی انداز اختیار کیا۔ تو اس نے منت بھری نظروں سے ایسا نہ کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ کمرے کی طرف چلا گیا۔ تب صائمہ نے گلزاری کو کچھ کھانے پینے کے لیے لانے کو کہا اور خود سامعہ کا ہاتھ تھام کر پیار سے سمجھانے کی کوشش کرتی رہیں۔ جب اس پر اثر نہ ہوا تو وہ زور سے بولیں۔

”تانیہ اپنی من مانی کر سکتی ہے۔“

”تانیہ بہت ہی مختلف ہے، میں اتنے عرصے میں بھی اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جان سکی۔ شاہدہ آنٹی کی جانے کیا مجبوری ہے کہ انہیں تانیہ کو سپورٹ کرنا پڑتا ہے۔“

”اور فرحان ...“

”فرحان سے بھی وہ بہت پیار کرتی ہیں، مگر زرتاشیہ ان کی بھتیجی ہے۔ فرحان کی ضد پر وہ سمجھوتہ تو کر لیں گی، مگر ان کی صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہوگا۔“

”آپ کے ساتھ تو پھر وہی ہوا آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ یا پھر بھاڑ سے نکلے تندور میں جا گرے۔“ صائمہ نے بے بسی سے کہا۔ وہ صرف اثبات میں گردن ہلا سکی۔

”ڈاکٹر نے کیا کہا...؟“

”بہت کمزوری ہے، خون کی کمی ہے، میڈیسن بڑھائی ہیں، ڈائٹ چارٹ بھی دیا ہے۔“ وہ بولی۔

”وہ تو نظر بھی آرہا ہے۔“ صائمہ نے غور سے دیکھ کر ڈاکٹر کی تائید کی۔

”حالانکہ، زرتاشیہ میرا بہت خیال رکھتی ہے، زبردستی کھلاتی پلاتی ہے۔“

”اصل چیز ذہنی آسودگی ہے وہ آپ کو میسر نہیں۔“

”شاید۔“

اسی اثناء میں گلزاری جوس، فروٹ اور سینڈوچز لیے آگئی... کچھ ہی دیر میں ایاز اس کی ساری ڈاک لیے آگئے۔ وہ پوری تسلی سے جوس کے سپ لیتے ہوئے ہر دستاویز غور سے دیکھنے لگی۔ محکمے کی طرف سے اس کے واجبات کی تفصیل تھی کب اور کیسے ملنے ہیں اس کے بارے میں انسٹرکشن تھیں۔

...☆☆☆...

تانیہ نے پیکنگ مکمل کر کے ناجی کو ایک کپ کافی لانے کو کہا تو وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی۔

”کیا مسئلہ ہے...؟“

”وہ بڑی بیگم صاحبہ بڑی دیر سے بلا رہی ہیں۔“

”کیوں...؟“

”چاول کی بوری میں ہلدی اور نمک ڈالنا ہے۔“

”شوکی کس مرض کی دوا ہے۔“

”وہ زرتاشیہ بی بی کا کچھ سامان لینے بازار گیا ہے۔“

”اچھا دفعہ ہو جائو ورنہ قیامت آجائے گی۔“ وہ اجازت دے کر موبائل فون کی طرف متوجہ ہو گئی۔ کرن کی چار میسجیں بیل تھیں۔ اس نے نمبر ڈائل کیا۔

”سوری یار! میں پیکنگ میں مصروف تھی۔“

”اٹس اوکے! لیکن، کہاں جا رہی ہو؟“ کرن نے پوچھا۔

”اسلام آباد۔“

”اچانک...“

”نہیں پری پلان تھا ماما اب راضی ہوئی ہیں۔“ اس نے خوش گوار موڈ میں

بتایا۔

”خیریت...؟“

”سرپرائزنگ وزٹ ہے واپسی پر بتاؤں گی۔“

”اوکے! وش یو آل دا بیسٹ۔“ کرن نے کہا۔

”اور کیا ہو رہا ہے...؟“

”کچھ نہیں یار میری ممی مجھے انگلینڈ میں میس کر رہی ہیں، یہاں دادا جی میرے بغیر اُداس ہو جاتے ہیں، بس دادا جی کے ساتھ باہر گئی تھی کچھ شاپنگ کی۔ ایک کام سے تمہیں فون کیا۔“ کرن نے تفصیل بتائی۔

”مجھ سے بولو۔“

”یار! اس گردِ راہ کا کوئی آتہ پتہ مل سکتا ہے؟“ کرن نے بنا کسی ہچکچاہٹ

کے پوچھا... تانیہ کچھ سمجھ نہ سکی۔



”وہاٹ؟“

”یار! اسی ہینڈسم کا کوئی فون نمبر یا پتہ وغیرہ بتاؤ، جسے تم نے چھوڑ دیا ہے۔“ کرن نے خاصے بے باک انداز میں ہلکی سی چوٹ لگائی تو تانیہ کی سمجھ میں فوراً آگیا۔

”کرن! خدا کے لیے اس بے وقوف آدمی کا نام بھی میرے سامنے مت لو۔“ تانیہ کو سڑک پر پیش آنے والا تازہ واقعہ یاد آگیا۔

”میں نے نام کب لیا ہے۔“ کرن ہنسی۔

”کوئی اور بات کرو۔“ وہ چڑ گئی۔

”میرے لیے آج کل وہی ایک بات ہے۔“

”گویا تمہیں پورے پاکستان میں وہ فضول عادل قابل توجہ لگا۔ بھوکا ننگا ایک اسٹور کیپر۔“ تانیہ نے بہت بُرا سا منہ بنا کر ناگواری سے پوچھا۔

”یہ تو یار تمہارے نظریات ہیں نا، میں تو اپنے نظریے کو ترجیح دوں گی۔“ کرن نے کھرے لہجے میں کہا تو تانیہ کو اچھا نہیں لگا۔

”اس کا مطلب تمہیں وہ مجھ سے بھی پیارا ہو گیا۔“

”مجھے تو ایسا پکا یقین اس وقت ہو گیا ہے کہ وہ ہے ہی اچھا، جو تم اتنا ڈسکس کر رہی ہو اور ہاں شاید تم نے پوری طرح اسے چھوڑا ہی نہیں ہے۔“ کرن کی اس بات نے تو اسے تیلی دکھا دی وہ بھڑک اُٹھی۔

”مائی فٹ، وہ میری زندگی سے نکل چکا ہے اب چاہے کسی کا ہو، میں اسے کیوں ڈسکس کروں گی...؟“

”تو پھر بتادو اس کا نمبر اور پتہ۔“ کرن بھی بہت ضدی تھی۔

”نمبر شمبر میرے پاس نہیں ہے، ہاں محلہ کوئی بھارتیاں ہے اس میں ہی اس کا گھر ہے اور وہیں کہیں اسٹور ہے۔“

”تھینکس۔“

”یو ویلکم، مگر یاد رہے میرا ذکر بھی کبھی نہ ہو۔“ وہ بولی۔

”انتہائی احمق لڑکی ہو، بھئی میں اس سے اپنی بات کروں گی یا تمہاری۔“  
کرن نے اپنے مخصوص بے باک انداز میں خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا۔ تانیہ کو  
اس کی بات کچھ اچھی نہ لگی تاہم برداشت کر گئی۔

”اوکے ٹیک کیئر، مجھے ماما سے کچھ ضروری بات کرنی ہے، کل صبح نو بجے  
میری فلائٹ ہے۔“ اس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

”اوکے! واپسی پر تم مجھے سرپرائز دے رہی ہو اور شاید میں بھی سرپرائز  
دوں۔“

”تم! کیسا سرپرائز...؟“

”مذاق کر رہی تھی، اوکے بائے۔“ کرن نے اپنے ہی جملے کی تردید کی اور  
فون بند کر دیا۔ تانیہ نے کچھ بُرے سے طریقے سے فون بیڈ پر اُچھالا اور ماما  
سے ملنے کے لیے ان کے کمرے کی طرف چل دی۔

...☆☆☆...

فرحان سخت طیش زدہ سا کمرے سے نکلا اور تانیہ سے ٹکراتا ہوا آگے بڑھ  
گیا۔ تانیہ کو اس کے موڈ کی خرابی کے باعث کچھ تشویش سی ہوئی۔ یہی سوچ  
کر کمرے میں قدم رکھا تو شاہدہ بیگم آنکھیں موندے بہت ڈسٹرب سی لیٹی  
تھیں۔ میاں افتخار اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھے دفتری کام میں مصروف تھے... تانیہ  
کو پہلی بار ماں بہت کمزور سی نظر آئی۔

”شاہدہ بیگم! آنکھیں کھولیں اب آپ کی عدالت میں صاحبزادی حاضر ہیں۔“  
مصروفیت کے باوجود میاں افتخار نے کچھ لمحات پہلے والی تلخ سی فضا کو چاک  
کرنے کی کوشش کی۔

”افتخار! اتنی دیر آپ بیٹے کی خود سری خاموشی سے برداشت کرتے رہے،  
ایک بار بھی آپ نے اسے نہیں سمجھایا کہ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔“ شاہدہ بیگم  
نے جھٹ دل میں دبا غم و غصہ اُن پر اُنڈیل دیا۔

”شاہدہ بیگم! میں شاید پہلا اور آخری آدمی ہوں جس پر تم یہ حق استعمال کر لیتی ہو۔“

”کون سا حق...؟“ ان کی سلگتی ہوئی بات پر وہ سلگ اٹھیں۔

”بابا! آپ مجھے ماما سے بات کرنے دیں گی؟“ تانیہ نے مداخلت کی۔

”او سوری بیٹا جی...“ میاں افتخار نے جلدی سے خود کو پھر سے مصروف کر لیا۔

”ماما! آپ بھائی کی وجہ سے کیوں پریشان ہیں؟“ تانیہ ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے ایسے پوچھ رہی تھی جیسے اسے کچھ معلوم نہ ہو۔

”صرف بھائی کی وجہ سے نہیں اور بھی تو کچھ اپنے ہیں۔“

”او آئی سی! نانو کی وجہ سے آپ سب سے زیادہ پریشان ہو جاتی ہیں۔“ وہ بڑی بے پروائی سے بولی۔

”گھما پھرا کر نانو نظر آئیں، آپ کے بھائی کی وجہ سے معلوم ہے کیا ہوگا؟ زبیر یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکے گا، زرتاشیہ رُو کر مر جائے گی۔“

شاہدہ بیگم نے تقریباً گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”کم آن ماما! سب کچھ اولتا بدلتا رہتا ہے، فرحان بھائی کو پسند سے جینے کا حق حاصل ہے، زرتاشیہ کو میں سمجھا دیتی ہوں۔“ اس نے اس حد تک بے پروائی سے کہا کہ شاہدہ بیگم سے زیادہ میاں افتخار کی آنکھیں پھیل گئیں... مضحکہ خیز لہجے میں بولے۔

”بیٹا جانی! زرتاشیہ کے ساتھ عادل، عادل مت کھیلو۔“

”بابا! عادل کا نام بھی میرے سامنے مت لیا کریں، وہ چیپٹر کلوز ہو چکا ہے۔“ وہ ایک دم سیخ پا ہو گئی۔

”تانیہ! آگ کا کھیل، کھیلنے چلی ہو تو تنکوں سے دشمنی مول مت لو۔“ شاہدہ بیگم نے مدہم مگر بہت سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”بہر کیف! آپ فرحان بھائی کو بچپن کے فیصلے کی سزا کیوں دے رہے ہیں...؟“ اس نے بھائی کی وکالت کی۔

”زرتاشیہ آپ کی ماموں زاد ہے وہ صرف بچپن کا فیصلہ نہیں ہے۔“ شاہدہ بیگم نے یاد دہانی کرائی۔

”تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“

”فرق بہت پڑتا ہے مگر آپ نہیں سمجھو گی، مجھے تو آپ کی بھی فکر ہے، نئی سی بات ہے، ایک بار پھر سوچ لو، کہیں ارمانوں اور خود پسندی کی جنگ میں شکست پر آنسو بہانے پڑیں۔“ شاہدہ بیگم نے ایک آخری کوشش اسے سمجھانے کی اور کی... مگر وہ تو مصر تھی۔

”اما! آپ خرم کو سمجھنے کی کوشش کریں، اس کی فیملی ان کا طرز زندگی بہت اچھا ہے... وہ سب لبرل ہیں۔“

”ننانیہ! یو آر ویری پوز سیو۔“ وہ بولیں۔

”ننانیہ! ہم خوابوں میں رہتے ہیں، لیکن اکثر خوابوں کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔“

میاں افتخار نے اپنے کام میں مگن رہتے ہوئے فقط اتنا کہا۔

”آپ میرے لیے ایسا سوچتے ہیں۔“ اس نے دونوں کی طرف دیکھا تو شاہدہ بیگم نے جلدی سے میاں افتخار کی طرف دیکھا، وہ اشارہ بھانپ کر بہت دھیمے انداز میں بولے۔

”ننانیہ اللہ تمہارے خواب پورے کرے۔“

”تھینک یو بابا!“ وہ بابا کے اندر کچوکے لگاتے دکھ کو نہ دیکھ سکی۔

”ننانی! میرا دل کہیں نہیں ٹھہر رہا، ماں ہوں فرحان اور آپ کی ماں... مگر مجھ سے آپ دونوں اپنا حق مانگتے ہو اور یہ بھول جاتے ہو کہ میری بھی ماں ہیں، میں بھی کسی کی بیٹی ہوں، میرے بھی کچھ فرائض ہیں اور تقاضے ہیں۔“ شاہدہ بیگم کو یلکھت اماں جان کی محبت نے بے چین کر دیا۔

”اوہو! ماما! اب بھی کوئی کمی ہے، یہ گھر نانو کا، یہاں ہر کام نانو کی مرضی سے ہوتا ہے اور کیا کرنا چاہتی ہیں آپ؟“ تانیہ کو تو جیسے یہ سبق ازبر تھا۔

”بس میں ان سے ماں ہونے کا حق نہیں چھین سکتی، اگر یہ گھر چھوڑا تو وہ تنہا ہو کر بکھر جائیں گی۔“ شاہدہ بیگم نے من کی بات کی۔

”اچھا! اس کا مطلب ہے کہ آپ کو ٹھی کرائے پر نہیں لینا چاہتیں...؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ بہت زیادہ کرائے کی ہے ہم کیسے افورڈ کر سکتے ہیں، ایک لاکھ ایڈوانس پر بھی مالک دینے کو تیار نہیں، پانچ لاکھ کہاں سے لا کر دوں۔“ شاہدہ بیگم نے ولیم بہت کم رکھتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ماما! ویل فرنشیڈ بھی تو ہے، یہاں سے کچھ لے کر نہیں جانا، اس کی انٹریئر دیکھی ہے آپ نے۔“ اس نے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”بس اس کے لیے سب چھوڑ دینا کیوں ضروری سمجھ رہی ہو...؟“

”ماما! خرم کے ساتھ میرا فیوچر جڑا ہے اور اس کے اسٹیٹس کا کچھ خیال رکھیں۔“ وہ چڑ کر بولی۔

”بس اس بیماری نے ہمارے معاشرے کو نگل لیا۔ ہم قدروں کو اسٹیٹس کے بدلے گنوا چکے ہیں۔“ میاں افتخار نے گویا خود کلامی کی۔

”اوکے ماما آپ کو بس اسے ہاتھ سے نہیں جانے دینا۔“  
”کسے...؟“

”کو ٹھی کو اور کس کو۔“ تانیہ جھنجلائی۔

”تانیہ! اماں جان سے بات کروں گی، جو کہ لا حاصل ہوگی مگر۔“

”اگر مگر کچھ نہیں، آپ کو ایڈوانس دینا ہے بس نانو کو یہیں رہنا ہے تو رہیں۔“ وہ بڑی آسانی سے فیصلہ کن انداز میں کہہ گئی۔

”پیسہ کہاں سے آئے گا؟“ شاہدہ بیگم نے بھی جھنجلا کر ہی جواب دیا۔



”مجھے نہیں پتہ‘ بابا جانی سمجھالیں ماما کو۔“ وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔ میاں افتخار نے دانستہ تانیہ کی بات پر شاہدہ بیگم کو دیکھا۔ جن کے چہرے پر دُور دُور تک تفکرات کے سائے منڈ لارہے تھے۔ تانیہ کا فیصلہ اور فرحان کی ضد نے کچھ ایسی صورت حال اختیار کر لی تھی کہ نہ وہ حلق میں پھنسی ہڈی تھوک سکتی تھیں اور نہ نکل سکتی تھیں۔

...☆☆☆...

اداس شاموں کی سسکیوں میں

کبھی جو میری آواز سننا

تو بیتے لمحوں کو یاد کر کے

انہی فضاؤں میں لوٹ آنا

تم آیا کرتے تھے خواب بن کر

کبھی مہکتے گلاب بن کر

میں خشک ہونٹوں سے

جب پکاروں

انہیں آدائوں میں لوٹ آنا

میری وفائوں کا

پاس رکھنا‘ میری دعائوں کا پاس رکھنا

میں خالی ہاتھوں کو جب اٹھائوں

میری دعائوں میں لوٹ آنا

میری دعائوں میں لوٹ آنا!!

ہاتھ خدا کے سامنے پھیلے تھے۔ پلکوں سے اشک ٹوٹ ٹوٹ کر رخساروں سے

پھسل رہے تھے۔ لبوں پر اس کے لیے دعائیں تھیں جو شاید اس سے ہی

ناراض تھا‘ حد درجہ کٹھور ہو چکا تھا۔ نہ چاہنے پر اور نہ بلانے پر اب تک آیا

تھا۔ مغرب کی نماز پڑھ کر اس نے گڑ گڑا کر رب سے اسے بھیجنے کی دعائیں

کیں۔ قبولیت کی گھڑی تھی، قدموں کی آہٹ پر گردن گھمائی تو چند لمحے ساکت رہ گئی۔ وہ کچھ تنا تنا سا تھا۔

”دعاؤں کی نہیں اب دوا کی ضرورت ہے۔“ اس کے مسکرا کر اٹھنے پر وہ بولا۔

”شکر ہے پروردگار کا آپ آگئے۔“

”ہاں! آخری بار۔“ وہ بولا۔

”ایسا نہ کیئے۔“ وہ بے قرار ہو گئی۔

”سامعہ! اپنا سامان سمیٹ لو، ہمیں یہاں سے جانا ہے۔ اس گھر سے یا شاید اس شہر سے، یہ بھی ممکن ہے کہ اس ملک سے۔“ آج وہ اس قدر بدلے ہوئے لہجے میں بات کر رہا تھا کہ سامعہ پریشان ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی، کیونکہ زرتاشیہ چائے بنانے کا کہہ کر گئی تھی۔ وہ کسی بھی لمحے آسکتی تھی۔

”کیا ہو گیا ہے فرحان؟“

”اگر یونہی بزدلوں کی طرح خاموش رہے تو کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔“ وہ سختی سے بولا۔

”فرحان! یہ مسئلے کا حل نہیں ہے، یہ آپ کا گھر ہے۔ آپ کی ماما کے لیے ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟ ہمارے جانے سے یہ دو گھر ٹوٹ جائیں گے... رشتے پیوند خاک ہو جائیں گے۔“ وہ جلدی جلدی اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی... تو اس نے اسے کندھوں سے اپنے مضبوط ہاتھوں میں جکڑا... اور بولا۔

”سامعہ! میں ماما، بابا کو اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں، زرتاشیہ میری محبت نہیں ہے، وہ بضد ہیں یا مجبور ہیں تو اس کے لیے میں اپنی محبت قربان نہیں کر سکتا۔“

”خدارا! دھیرے بولو، پلیز سمجھنے کی کوشش کرو، یہ غور کرنے کا وقت ہے، خود غرضی کی وجہ سے پہلے ہی گھر متاثر ہے... تانیہ کا فیصلہ بھی نامناسب ہے۔“

”سو وہاٹ! سب جہنم میں جائیں، ہمیں ہماری محبت کے ساتھ رہنا ہے۔“ وہ چیخا۔

”پلیز... پلیز... آہستہ بولیں، زرتاشیہ نے سن لیا تو مرجائے گی۔“ اس نے منت کی۔

”دیکھو! سامعہ، میں تمہارے لیے کسی آخری حد تک جاسکتا ہوں۔“

”محبت خود غرض نہیں ہوتی فرحان۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”سامعہ! ادھر دیکھو یا میری مان لویا پھر خود کوئی رستہ نکالو۔ بولو کیا کروں؟“ بے بس ہو کر اس نے سرگوشی کی تو وہ کپکپا اٹھی۔

”بولو... کیا کروں؟“

”آپ نے مشورے کا حق دیا ہے یا فیصلے کی اجازت؟“

”جان من! ہم نے تو اپنا آپ، آپ کو سونپ دیا ہے، آپ کے حکم کی تعمیل کا عہد کر چکے ہیں۔“

عین اسی وقت زرتاشیہ چائے کے مگ لے کر اندر آگئی۔ فرحان کو اچانک دیکھ کر وہ کچھ خوش اور کچھ حیرت زدہ سی ہو کر بولی۔

”فرحان! آپ! ہم اتنے دن بعد آپ کو دیکھ رہے ہیں۔“

”بڑے دنوں سے تو میں نے اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھا۔“ بات ادھوری رہنے پر وہ مضطرب ہو گیا۔

”فرحان! کیوں، کیوں آپ نے سب کا خیال نہیں کیا۔“ اپنی سادگی میں وہ کچھ عجیب سا بول گئی تو وہ چڑ گیا۔

”میں سب کا خیال رکھنے کا پابند نہیں، کیوں سامعہ جی...؟“

”پپا! پھوپو سب غیر نہیں ہیں۔“ زرتاشیہ کو برا لگا۔

”ارے کیا مذاق بھی نہیں سمجھتی ہو، فرحان خصوصی طور پر آپ سے ہم سے ملنے آئے ہیں، نئے بزنس میں مصروف تھے۔“ سامعہ نے آنکھ کے اشارے سے فرحان کو خاموش کیا اور زرتاشیہ کو دلی تسلی سے معمور کر دیا۔

”یہ لیں چائے۔“ زرتاشیہ نے ایک مگ فرحان کی طرف بڑھایا۔

”تھینکس...“ فرحان نے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر، گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ دونوں کی سوچ مختلف تھی۔ مگر سوچ کا مرکز ایک ہی تھا فرحان۔

...☆☆☆...

”شیراز! جونہی شیراز ہمدانی ناشتے کے لیے میز پر آئے تو مسز ہمدانی نے مخاطب کیا۔

”جی...“ وہ تیزی سے کرسی کھینچ کر بیٹھے اور بولے۔

”آپ کی گاڑی اور ڈرائیور دونوں چاہئیں۔“

”وہ کیوں...؟ آپ کی گاڑی کہاں ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میسنگ کر رہی ہے، گاڑی دس بجے ایئر پورٹ بھیجی ہے، خرم کی کلاس فیلو تانیہ آرہی ہے۔“ مسز ہمدانی نے بتایا۔

”خرم کی غیر موجودگی میں۔“ انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

”ہُنسہ! خرم نے ہی اسے کہا ہے شاید، بہر کیف آپ کو گاڑی بھیجی ہے بس۔“ انہوں نے اس طرح جملہ ختم کیا کہ ہمدانی صاحب نے اثبات میں گردن ہلادی اور مزید کچھ نہ پوچھا۔ ناشتہ کیا اور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد انہوں نے خانسا ماں کو دوپہر کے کھانے کے لیے خاص ہدایت کی، اپنے بیڈ روم کے ساتھ والا بیڈ روم کھول کر اچھی طرح صاف کرنے کے احکامات حمیدہ کو دیئے۔ اسی اثناء میں خرم کا فون آگیا۔

”مام!“ وہ چہکا۔

”خرم اطمینان سے کام کرو تانیہ ابھی آئی نہیں۔“ انہوں نے اس کا مطلب بھانپ کر خود ہی بتادیا۔

”اوکے! بس مام پلیز اس کا خیال رکھیے گا۔“ خرم نے کہا۔

”اس تشویش سے تو لگتا ہے کہ تانیہ بہت خاص ہے آپ کے لیے...؟“ انہوں نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔

”نہیں مام! وہ دراصل...“ وہ اٹکا۔

”خاص نہیں ہے۔“ انہوں نے جملہ مکمل کیا۔

”مام! شی از مائی بیسٹ فرینڈ، خاص تو ہے، ایکجیولی وہ بہت جذباتی ہے۔“  
خرم نے وضاحت کی۔

”اوکے مائی چائلڈ! پھر بات ہوگی۔ مجھے ذرا آپ کی دوست کے لیے کھانے  
کا جائزہ بھی لینا ہے۔“

”مام! ڈیڈ کو بتادینا میں فی الحال پاکستان نہیں آرہا، اب میں نیویارک جا رہا  
ہوں، واپسی پر بات ہوگی۔“

”اچھا! اپنا خیال رکھنا۔“ انہوں نے کہا اور فون بند ہو گیا۔ مسز ہمدانی وہیں ٹی  
وی لائونج میں بیٹھ گئیں۔

”میڈم! کمرہ اچھی طرح صاف کر دیا ہے، بیڈ کور بھی بدل دیا۔“ حمیدہ نے  
آکر اطلاع دی۔

”مالی سے کہو فریش گلاب کا گلدستہ بنا کر کمرے میں رکھے۔“ انہوں نے  
مزید کام بتایا۔

”میڈم! کوئی خاص مہمان آرہا ہے؟“ حمیدہ نے پُر تجسس انداز میں پوچھا۔  
”مہمان، مہمان ہوتا ہے، جانو جا کر کام کرو۔“ انہوں نے مختصر مگر بر محل  
جواب دیا۔ حمیدہ چلی گئی تو وہ اٹھ کر کچن کی طرف چل دیں۔

”سہراب! کھانے میں کوئی کمی اور معمولی سی بھی بدمزگی نہ ہو۔“ انہوں نے  
مکس سبزیاں اٹھا کر دیکھیں جو سہراب نے کاٹنے کے لیے رکھی تھیں۔  
”کبھی کسی کے آنے پر کوئی کمی چھوڑی ہے، مجھے معلوم ہے اس گھر کی  
روایت۔“ سہراب نے چکن فریزر سے نکالتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا دیں۔

”مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے، بس وہ خوش ہو کر جائے یہی ہمیں سکھایا گیا  
ہے۔“ انہوں نے خود مسالا لگی مچھلی کا جائزہ لیتے ہوئے بتایا۔ سہراب نے ان کی  
بات کی تائید اثبات میں گردن ہلا کر کی۔ وہ مطمئن ہو کر باہر نکلیں حالانکہ  
ابھی کھانے کا وقت نہیں تھا، مگر اہتمام زیادہ تھا اس لیے سہراب مسلسل کام



میں مصروف تھا۔ وہ گھر کی روایت اور مسز ہمدانی کی مہمان نواز فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔۔۔ بلکہ دیگر دس بارہ ملازمین کی بھی یہی رائے تھی۔

...☆☆☆...

ایئر پورٹ سے ”شیراز پیلس“ تک کا راستہ تقریباً پینتیس منٹ کا تھا، وہ خوب صورت شہر کی خوب صورت عمارتوں کو دیکھ کر بہت خوش ہو رہی تھی، مگر جونہی رسٹ اور سکائی بلو کلر کے پتھروں کے حسین امتزاج سے بنی کوٹھی کے گیٹ سے گاڑی اندر داخل ہوئی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جدید طرز تعمیر کا شاہکار ”شیراز پیلس“ بلاشبہ صاحب ذوق اور صاحب جمال فطرت مکینوں کی ترجمانی کر رہا تھا۔ باوردی ڈرائیور نے دروازہ کھولا تو چمکیلے فرش پر اس نے قدم رکھے۔ نظریں وسیع و عریض خوب صورت لان کی جانب اٹھیں، پھسلتے قدموں پر بوکھلا کے توجہ دی۔ اندرونی داخلی قوی ہیکل دروازہ کھلا، سرمئی لباس میں گریس فل سی مسز ہمدانی نے مسکرا کر اس کا

استقبال کیا۔ بلو جینز پر وائٹ بلو کٹراس شرٹ میں کندھے پر بیگ لٹکائے وہ ان کی طرف بڑھی انہوں نے ناقدانہ جائزہ لیا اور پیار سے گلے لگا کر کہا۔

”تانیہ! سفر میں کوئی دشواری تو نہیں ہوئی۔“

”جی نہیں آنٹی، بہت مزے کا سفر رہا۔“ اندر ان کے برابر چلتی تانیہ کی نظریں قیمتی سجاوٹی اشیاء سے لے کر بہت منفرد اور کلرا سکیم سے میچنگ فرنیچر پر ٹک گئیں۔

”ڈیس گڈ... بیٹھو۔“ انہوں نے کہا اور بیٹھتے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”آپ کا گھر بہت خوب صورت ہے۔“ دل میں مچلتی بات لبوں پر آگئی۔ وہ ہولے سے ہنسیں اور کھرا سا بولیں۔

”کوئی نئی بات نہیں، سب ان قیمتی چیزوں کی، گھر کی ایسے ہی تعریف کرتے ہیں، کوئی یہ نہیں کہتا کہ گھر کے رہنے والے کیسے ہیں؟“

”سوری میرا یہی مطلب تھا۔“ وہ کھسیا گئی۔

”بیٹا! آپ کا جو بھی مطلب ہو، میں تو ہمیشہ یہی کہتی ہوں کہ بھئی فرانس سے لایا گیا فانوس جرمنی کے کرسٹل گلدان، امریکی سنگ مرمر کے یہ دودھیا مجسمے، انگلینڈ سے لایا گیا وال کلاک، یہ سائوتھ افریقہ سے آئی آبنوسی میز، قالین ہمارا کمال نہیں، یہ پیسے کا بدل اور ماہر فن حضرات کے فن کا اظہار ہیں۔“ وہ نان اسٹاپ بولتی چلی گئیں۔ تو وہ کچھ نجل سی ہونٹ چبانے لگی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے...؟

”بیٹا! اصل تعریف تو انسان کی ہونی چاہئے جسے اللہ نے ان سب چیزوں پر فوقیت دی ہے۔“ تانیہ کے ذہن کو برقی جھٹکے لگ رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ تھوڑے سے فرق کے ساتھ سوچے تو کسی لیکچرار کا لیکچر سُن رہی ہے یا پھر نانو کی روح ان میں حلول کیے ہوئے ہے۔ آتے ہی ایسی ثقیل تعارفی گفتگو نے اس کی خوشی کو کافی دھچکا لگایا۔

”جی! آپ نے شاید میری بات محسوس کی ہے۔“

”ارے نہیں بیٹا! بلکہ میں نے آپ کو آتے ہی کیسی باتوں میں اُلجھا دیا۔ آپ اپنے کمرے میں جائو، آرام دہ لباس پہن کر آؤ، خرم کی دادی کہتی تھیں، آرام، آرام، آرام دہ لباس میں ملتا ہے، آرام کو بستر کی نرمی میں نہیں ڈھونڈنا چاہئے۔“ انہوں نے اس کو غور سے دیکھنے کے بعد کہا، وہ کچھ نہ بولی، بلکہ اس کی تیز قینچی جیسی چلنے والی زبان کو گویا کسی نے زنگ آلود کر دیا تھا۔

”حمیدہ! حمیدہ...“ انہوں نے آواز دی۔

”جی میڈم!“ مودب سی حمیدہ آن واحد میں حاضر ہو گئی۔

”بی بی کو کمرے تک چھوڑو، اور اچھی سی چائے بنوا کر بھیجیو۔“ انہوں نے خاصے تحکم سے کہا۔ حمیدہ نے سر جھکا کر یس کا اشارہ کیا اور تانیہ کے ہمراہ کمرے تک گئی۔ کمرے کا دروازہ کھلا۔ تانیہ نے اندر قدم رکھا تو آتش کر اُٹھی، کمرہ کیا تھا، کسی خوابناک ماحول کا حصہ تھا۔ حمیدہ واپس چلی گئی تو وہ جھوم اُٹھی اسے اپنے انتخاب پر رشک آنے لگا۔ ایسے گھر کا ہی تو ارمان لے کر جوان ہوئی تھی۔

”اے کاش! وقت تھم جائے۔“ اس نے خوش ہو کر سوچا اور کمرے کی ایک ایک چیز چھو چھو کے دیکھنے لگی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے کہا۔  
 ”ایس...“

”یہ آپ کا بیگ...“ باوردی ملازم نے بیگ ڈریسنگ روم میں رکھا اور چلا گیا۔ اس نے بیگ کھول کر کپڑے نکالے اور وارڈ روب میں لٹکا دیئے۔ اس وقت کے لیے پھر کاٹ رائی سکین ٹائٹ جینز کے ساتھ پین کرتا نکالا اور واش روم میں گھس گئی۔

...☆☆☆...

پلاٹ کی قسط جمع کرا کے، اپنے دوست نوید کے آفس گیا۔ نوید شہر کے مصروف آرکیٹیکچرز میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے گھر کے نقشے کے لیے اسے کہا۔ اس سارے کام میں تقریباً تین گھنٹے لگ گئے... اسٹور پہنچا تو گوگی اور دونوں سیلزمین خریداروں میں گھرے تھے، وہ سیدھا کاونٹر پر پہنچا۔ گوگی نے اسے دیکھ کر دائیں طرف انگوٹھے کا اشارہ کیا اور کہا۔

”یار! وہ لڑکی کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“ عادل نے اس کے انگوٹھے کی سمت دیکھا، پلاسٹک کے اسٹول پر وہ بہت اطمینان سے بیٹھی تھی۔ مگر اسے اچھا نہیں لگا، بادل خواستہ وہ اس کی پاس جا کر دوسرے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

”میس کرن! آپ کو یہاں آکر تماشا نہیں بننا چاہئے تھا۔“

”تماشے کے بعد ملنے والا انعام بہت اچھا ہوتا ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”یہ میرا محلہ، میرے لوگ ہیں، پلیز آپ جائیں۔“

”مشکل سے آپ کا محلہ تلاش کیا ہے، آپ کے لوگوں سے آپ کا پتہ پوچھا ہے۔“

”اس مشکل سے گزرنے کی ضرورت...؟“

”مجھے آپ اچھے لگے ہیں، مجھے خود کو مکمل کرنے کے لیے آپ کا ساتھ چاہئے۔“ وہ خاصی جرأت کا مظاہرہ کر گئی۔ عادل نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ اسے دیکھا، اس کی آنکھوں سے کچھ یقین بھی نظر آیا، مگر وہ سختی سے بولا۔

”پلیز! یہ فضول باتیں میں آپ سے شیر نہیں کر سکتا، آپ جانیے۔“

”کیسے چلی جائوں...؟“

”جیسے آئی ہیں۔“

”مجھے غلط نہ سمجھیں۔“ وہ منمنائی۔

”مجھے آپ اچھا نہ سمجھیں۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”پلیز! یہ سچ مان لیں مجھے آپ پسند آئے ہیں۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

”محترمہ! حیرت ہے میں آپ کی سہیلی کا مسترد کردہ ہوں، آپ اس کے ساتھ مل کر مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہیں۔“ وہ طیش میں آگیا۔ آواز ذرا سی

بلند ہوئی تو گاہکوں نے مڑ مڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ اسے یہ بھی اچھا نہیں لگا۔ جھلا کر بولا۔

”جائیں آپ، پلیز مجھے آپ کے ساتھ کوئی محبت کا کھیل نہیں کھیلنا۔“

”اوکے! مگر میں مایوس ہو کر نہیں جا رہی۔“ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”یہ سوچ کر جائیں کہ میں آپ کو نہیں جانتا، آپ جس کی سہیلی ہیں میں تو اب اس کو بھی نہیں جانتا۔“

”اس سے تو آپ کا تذکرہ بھی نہیں کیا، مجھے آپ، میرے لیے چاہئیں۔“ انگلیڈ میں رہنے کا اعتماد تھا یا بے باکی وہ روبرو ہو کر بولی۔

”آپ اس قدر بے باک اور بے شرم ہیں، یہ یوں کھلم کھلا آپ کوئی کھلونا لینے کی فرمائش نہیں کر رہیں۔“ وہ حد سے زیادہ بدتمیز ہو کر بولا۔ اسے پھر بھی بُرا نہ لگا۔

”کھلونے تو خرید لیے جاتے ہیں، میں تو آپ کو پانا چاہتی ہوں، انگلیڈ سے جس کی تلاش یہاں لائی وہ آپ ہیں۔“

”اچھے خاصے فلمی ڈائلاگ انگلیڈ میں بھی بولے جاتے ہیں۔“ اس نے تمسخرانہ انداز میں اُبرو چڑھا کر کہا اور کائونٹر کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کچھ دیر کھڑی رہی پھر چلی گئی۔ گوگی نے سوالیہ نظروں سے عادل کی طرف دیکھا، وہ عجیب سی شکل بنا کر ٹال گیا۔

؟...ئی...؟

اسے گم صم بیٹھا دیکھ کر، خواجہ امتیاز علی کی حسیں تشویش جاگی۔

”کرن علی کے چہرے پر سورج غروب ہونے کی وجہ۔“ وہ پاس بیٹھ کر بولے۔

”دادا جی! نہیں لگتا، بالکل نہیں لگتا کہ میں اسے جیت پائوں گی۔“ وہ ٹھنکی۔

”اُوں ہُسنہ! پہلے یقین ٹھیک کرو، انسان اور قلعہ فتح کرنے میں فرق ہوتا ہے اور اگر وہ انسان نہیں قلعہ ہے تو پھر چھوڑو کیا ضروری ہے کہ تم اسی کے پیچھے پڑ جاؤ۔“ وہ بولے تو وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

”دوسرے لفظوں میں آپ مجھے ناکام دیکھنا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے میری سیٹ اوکے کرادیں۔“

”ارے ارے دادا جی صدقے، ہمارا یہ مطلب نہیں تھا۔“ انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”تو پھر، پھر آپ سمجھتے کیوں نہیں...؟“

”بھئی اور ہم کیا کریں، آپ نے گاڑی ڈرائیور مانگے وہ آپ کے حوالے

کر دیئے، اسے ڈھونڈنے میں اور کیا کریں...؟“

”ڈھونڈ تو لیا میں نے...“

”او ویری گڈ!“ وہ خوش ہو گئے۔



”مگر وہ جانے کس میٹرل سے بنا ہے، اس نے مجھے کھری کھری سنائی ہیں۔“ وہ رونے کے قریب تھی۔

”تو دفع کرو اس بد تمیز کو۔“

”مگر، وہ مجھے اسی لیے تو اچھا لگا ہے، مجھے وہ پسند آگیا ہے۔“ وہ ان کے سینے میں منہ چھپا کر بولی تو انہوں نے پیار بھری چپت اس کے سر پر لگائی۔

”بھئی وہ ایسا کیا ہے کہ ہماری انگلیڈ سے آئی کرن کو پسند آگیا۔“

”وہ تانیہ کا ایکس فیانی ہے، تانیہ نے اسے چھوڑا ہے۔“

”میاں افتخار کی بیٹی کا منگیتر؟“ وہ سخت حیرت میں مبتلا ہوئے۔

”ہنہ!“

”خیر، افتخار کی بیٹی نے جسے چھوڑا اسے ہم کیوں اچھا سمجھیں، کوئی وجہ تو ہوگی۔۔۔“

”وجہ، پسند اپنی ہے تانیہ کے چھوڑنے کی وجہ اس کی مڈل کلاس ہے۔“

”یعنی، غریب ہے، جاب لیس ہے۔“

”نہیں، اپنا کام کرتا ہے، تانیہ کی اپنی سوچ ہے، جتنا میں نے اسے شارٹ ٹائم میں جانا ہے وہ کچھ اور ٹائپ کی ہے۔“

”افتخار سے پوچھ لیتے ہیں۔“

”نہیں اس کی ضرورت نہیں، وہ تو لفٹ ہی نہیں دیتا۔“ وہ اُداس سی ہو گئی۔

”ارے میرا بچہ! اس کی یہ مجال کہ وہ لفٹ نہ دے، ایک دو کوششیں اور کرلو، پھر مجھے بتائو، میں اسے خود کہوں گا کہ بھئی لفٹ دے دو آسمان سے زمین پر آؤ۔“ وہ شرارت آمیز لہجے میں بولے۔ تو وہ ہنس دی۔

”اسے تو ناز کرنا چاہئے کہ گرین کارڈ ہولڈر کرن علی نے اسے پسند کیا ہے۔“ اس کا حوصلہ بڑھانے کو وہ بولے۔

”ایسی باتوں میں وہ آنے والا نہیں لگتا۔“

”ارے سب ٹھیک ہو جائے گا، بس یہ سوچ سمجھ لو کہ واقعی وہ تمہیں پسند آگیا ہے۔“

”بس ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے لیے اہم ہے۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”چلو، چلو، ڈونٹ وری۔“ انہوں نے تھپکی دی۔ تو وہ مطمئن ہو گئی۔ مگر دل اس کے لیے بے قرار کرتا رہا۔ وہ جسم میں لہو کی مانند لازم سا کیوں ہو گیا تھا؟ یہ سوال وہ بار بار خود سے کر رہی تھی۔ مگر ہر بار دل یہی جواب دے رہا تھا کہ وہ ہے ہی چاہے جانے کے قابل...

...☆☆☆...

اس نے ماما سے فون پر بات کر کے موبائل فون رکھا ہی تھا کہ مسز ہمدانی وہیں کمرے میں آ گئیں۔

”بھئی! آپ تو بہت دیر تک سوتی ہو۔“ وہ بولیں۔

”وہ بس عادت سی بن گئی ہے۔“ وہ شرمندہ ہونے کے بجائے ہنس کر بولی۔

”اور کسی نے آپ کی یہ عادت بدلوائی نہیں، دراصل ہمدانی ناشتے کی میز پر آپ کا انتظار کر کے گئے ہیں۔“

”وہ نانو ہیں ہر وقت بولتی رہتی ہیں، یہاں تک کہ ناشتا، چائے کچھ بھی بعد میں بنوا کر نہیں دیتیں۔“

”اچھا، ناشتے کے برتن تو یہاں بھی سمٹ چکے ہیں، پھر بھی میں نے حمیدہ کو کچھ لانے کو کہا ہے...؟“

”بس ٹی کافی ہے۔“

”بھئی خالی پیٹ چائے تو میں کسی کو پینے نہیں دیتی، خرم کو جانے کیسے یہ عادت پڑ گئی تھی، میں نے ایسی کلاس لی کہ اب بھول کے بھی بیڈ ٹی کا نام نہیں لیتا۔“ وہ بولیں۔

”بے پروا ہے خرم۔“

”نہیں، میرا بیٹا بہت کیئر فل اور ذمہ دار ہے۔ بہت کم جانتی ہو آپ اسے۔“ انہوں نے اس کی نفی کر کے کچھ تعجب سے کہا۔ وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔

”رات آیا تھا فون، آپ کا پوچھ رہا تھا“ میں نے کہا کہ تانیہ ہماری مہمان ہے، ہم اس کا خیال رکھنا جانتے ہیں۔“ مسز ہمدانی نے بتایا تو تانیہ کو کچھ دکھ سا ہوا، اسے ڈائریکٹ بات کرنی چاہئے تھی، دوسرا دن تھا وہ انتظار کر رہی تھی۔

”اور کیا، کیا مشاغل ہیں آپ کے۔“

”کچھ خاص نہیں، خرم کے بعد تو بس بوریت ہی بوریت رہتی ہے۔“ سلاٹس پر مارجرین لگاتے ہوئے بولی۔

”بھئی آج کل تو بوریت کا زمانہ ہی نہیں رہا، سب اتنے مصروف رہتے ہیں۔“

”میں ذرا مختلف ہوں، نانو بھی ہر وقت یہی کلمہ پڑھتی رہتی ہیں۔“ اس نے تمسخر اڑایا۔

”آپ کے مختلف ہونے کا اندازہ ہے مجھے۔“ انہوں نے کچھ ذو معنی انداز میں کہا۔

”ہنسنہ! یقیناً خرم نے بتایا ہوگا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”خرم نے کچھ خاص نہیں۔“ وہ ٹال گئیں۔

”اچھا وہ بات تو بتائی ہوگی۔“ اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

”کون سی بات...؟“

”وہ، میرے آنے کی...“

”ہاں! یہی کہ آپ آرہی ہو۔“ وہ لیے دیئے انداز میں بولیں۔

”بس اتنا ہی...“ اسے شاک لگا۔

”اور آپ خود بتادو۔“

”آئی! میں کسی وجہ سے یہاں آئی ہوں۔“ وہ بولی، مگر مسز ہمدانی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”بیٹا! باقی باتیں شام میں کریں گے، میں ذرا کھانے کی تیاری کا جائزہ لے لوں۔“

وہ بیٹھی رہ گئی... پھر اسے خرم پر شدید غصہ آنے لگا۔ کتنی سسکی والی بات ہے وہ اس کی آمد کے مقصد سے قطعاً لاعلم ہیں۔ جب کہ ماما کو فون پر اس نے سب کچھ فائن اور اوکے ہونے کی رپورٹ بھی دے دی تھی۔ یہاں تک کہ انہیں ہر طرح سے مطمئن کر دیا تھا۔ عادل اور خرم کا واضح فرق ازبر کرادیا تھا۔ مگر یہاں تو اب تک دوسرے فریق کو کچھ بھی علم نہیں تھا۔

”خرم! تم اتنے اسٹوپڈ ہو، میں تمہیں کچا چبا جائوں گی۔“ غصے میں اس نے خرم کو بُرا بھلا کہا اور چائے کا کپ ادھورا چھوڑ کے کمرے میں ٹہلنے لگی۔“

...☆☆☆...

کھٹ سے دروازہ کھلا۔

فرحان نے کمرے میں قدم رکھے تو سامعہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ آج اس کا فیصلہ سننے کے لیے آیا تھا اور وہ بیڈ پر بیٹھی نچلا ہونٹ چباتے ہوئے اس کے سوالیہ چہرے کو پڑھ رہی تھی۔

”جاناں! اب بولو کیا چاہتی ہو؟“ اس نے سرگوشی کی تو اس کا دل چاہا کہ اس کے کشادہ سینے میں چھپ جائے۔ مگر موقع مناسب نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ سب کچھ اسے خود سے دور کرنا ہے۔ یہی فیصلہ اس نے کر رکھا تھا۔

”فرحان! جانتے ہو عورت گھر کیوں بساتی ہے؟ تاکہ وہ تا حیات اس میں محفوظ رہ سکے، مگر میں وہ بد نصیب عورت ہوں جس نے دوبارہ گھر بسایا، مگر جب سر اٹھا کر دیکھا خود کو کھلے آسمان تلے پایا۔ یہ تیسرا گھر میرا حقیقی ارمان ہے۔ معاشرے کی نظر میں تین شادیاں کرنے والی عورت ایک طعنہ اور گالی سمجھی جاتی ہے، مگر میں خوش ہوں کہ میرا فیصلہ اچھا ہے۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”تھینک یو میری جان! مجھے تم سے یہی امید تھی۔ اب یہ زندگی ہم اپنے گھر میں جئیں گے۔“

”پلیز! خیال رکھیے زرتاشیہ نہ آجائے۔“

”وہ ماما کے پاس ہے، میں اطمینان کر کے آیا ہوں۔“

”فرحان! یہی تو ہمارا گھر ہے۔ ہمیں یہیں رہنا ہے۔ مصلحتوں کے ساتھ، سمجھوتوں کے ساتھ۔“

”کیا مطلب؟“

”فرحان آپ چاہتے ہیں کہ سب رشتے ناتے سبوتاژ ہو جائیں۔ ہم دونوں خود غرض بن جائیں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ حقیقت کیا ہے۔ دنیا میں کوئی چیز اپنے خود کے لیے نہیں ہوتی۔“

”سامعہ! پہلیاں مت بھجواؤ، بس کہو کیا کرنا ہے۔ میں اپنی مرضی تم پر مسلط کرنا نہیں چاہتا تم جو کہو وہ میں کرنے کو تیار ہوں۔“ وہ خاصی روانی میں بولا۔

”فرحان! یہ آپ کی محبت ہے اور آپ کی محبت صرف آپ کے لیے نہیں ہے دریا خود اپنا پانی نہیں پیتا، درخت خود اپنا پھل نہیں کھاتے، سورج اپنے لیے حرارت نہیں دیتا، پھول اپنی خوش بو اپنے لیے نہیں بکھیرتے۔ کیونکہ دوسروں کے لیے جینا ہی اصل محبت ہے۔ ابدی زندگی ہے۔“

”کیا چاہتی ہو؟“ اسے کھٹکا سا ہوا۔

”فرحان! زرتاشیہ نے مجھے یعنی آپ کی محبت کو اپنی محبت سے تسخیر کیا ہے۔ پلیز اسے اس کی محبت دے دو۔ اسے جینے کے لیے تمہاری چاہت چاہیے۔ وہ اسے دے دو۔ میں یہی چاہتی ہوں۔“

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سامعہ ایسا کچھ سوچ بھی سکتی ہے۔ کہنا تو درکنار۔ اس کی آنکھوں میں غیر یقینی کی چمک، سامعہ کے کندھوں میں مضبوط



دھنسی ہوئی انگلیوں کی گرفت شدید درد کے احساس سے آنکھوں میں پانی بھرے ایک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھتی جا رہی تھی، مگر وہ کہاں تھا؟ یہ اس کا وجود تو نہیں تھا۔ اس کا چہرہ تو نہیں تھا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس تو نہیں تھا۔ وہ حیرت زدہ تھی۔ فرحان تو اس کے قریب نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد اس کے کندھے آزاد کر کے وہ اٹے قدموں لوٹ گیا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اس کی انگلیوں کے احساس کو محسوس کرتے ہوئے دکھ سے مسکرا دی۔

”سامعہ! شاید اسی کو کہتے ہیں مجبوری حیات، رک سی گئی ہے زندگی۔“ خود سے کہہ کر وہ صوفے پر ٹک گئی۔ ذہن میں سوالات کا طوفان اٹھ آیا۔ فرحان سے جو کہہ دیا وہ ساری زندگی کی تلافی کے بعد بھی اس کے حق میں بہتر نہیں تھا۔ فرحان کو یقین نہیں آیا تو اس نے اپنی خاموش نگاہوں سے یقین دلا دیا تھا اور وہ... وہ خاموش نگاہوں کا لباس زیب تن کر کے خود بھی خاموشی سے نکل گیا تھا۔ نہیں معلوم خفا ہوا تھا یا بدگمان۔ وہ نہ پوچھ سکی تھی اور نہ جان سکی تھی۔ بس اتنا ضرور تھا کہ وہ اس کے کہے کو رد نہیں کر گیا۔

”سامعہ!“ یہ کیا کیا، اپنے فرحان کو خود سے جدا کر دیا۔ بانٹ دیا اسے۔ اب خود کیا کرو گی۔ یہ گھر تو اس فاصلے کے بعد تمہارے لیے بالکل اجنبی ہو جائے گا۔ کہاں جائو گی؟“ ذہن نے اکسایا تو وہ مضطرب ہو کر ٹہلنے لگی۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا تھا۔ ایسے فیصلے جن کا تعلق دوسروں کی خوشیوں سے جڑا ہو انہیں کسی بھی حالت میں بدلا نہیں جا سکتا۔ اس نے ذہن کو تاویل پیش کی اور دھیرے سے فرحان سے معافی مانگ لی۔

”مجھے معاف کر دو فرحان۔“ مگر فرحان تو وہاں سے اس وقت بہت دور تھا۔

...☆☆☆...

شہر سے دور سنسان سڑک پر گاڑی جھٹکے سے روک کر اس نے بابا سے پوچھا۔

”یہ‘ یہ سامعہ چاہتی ہے۔ میری سامعہ‘ مجھے حیرت ہے۔ اس نے میری محبت کو اتنا کمزور اور بے بس سمجھا ہے۔“

”محبت مضبوط لوگوں کو آزماتی ہے، کمزور تو محبت کا ایک تھپڑ برداشت نہیں کر پاتے۔ سامعہ نے در حقیقت اپنی محبت کو آزمائش میں ڈالا ہے۔ آپ کی خاطر۔“ میاں افتخار نے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگانے کے بعد کہا۔

”کیوں؟ کیوں سامعہ خود کو آزما رہی ہے۔ میری خاطر کیوں؟ میں اسے لے کر کہیں بھی جا سکتا ہوں مجھے کسی کی پروا نہیں۔“ وہ سخت اشتعال انگیز لہجے میں بولا۔

”یار! ہمیں سامعہ کی اپنے ہونے والے بچے کی پروا ہے۔ سامعہ کو آپ کی، آپ کے گھر والوں کی پروا ہے۔ سچویشن ہی ایسی ہے اس نے ایسا سوچا۔“

”بابا! سامعہ نے تیسری مرتبہ گھر اس لیے تو آباد نہیں کیا کہ اس کے صحن میں نئی دیوار کھڑی ہو جائے۔ آپ اسے سمجھائیں۔“ وہ تقریباً بے بس ہو چکا تھا۔

”آپ منع کر دو اور اپنی ماما کے سامنے ڈکلیئر کر دو۔ پھر دیکھا جائے گا۔“

”یہی تو رونا ہے کہ میں سامعہ کے کہے کو کیسے لوٹا دوں۔ وہ پُر اعتماد تھی، پُر اعتماد ہوگی۔ وہ جانتی ہے کہ مجھے اس کا کہا کس طرح قبول ہے۔“

”عجب دورا ہے پر زندگی آگئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تنکے بکھر جائیں گے۔“

میاں افتخار بہت افسردگی سے بولے تو وہ چونکا۔

”بابا! آپ بھی مایوس ہو گئے ہیں اب؟“

”نہیں لیکن حالات بگڑتے ہی جا رہے ہیں۔ بھائی، بھابی، بھتیجا چھوٹ گئے۔ بیوی بیمار رہنے لگی۔ بیٹا ڈسٹرب ہے۔ بیٹی انجان رستے پر چل رہی ہے۔ معصوم سی زرتاشیہ پر ترس آتا ہے۔ زبیر احمد کی شرافت پر شرمندگی سی ہوتی ہے اور سامعہ سے تو نظریں ملاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ کوئی وعدہ پورا نہیں ہو سکا۔“

میاں افتخار احساسِ ندامت کی کتنی تکلیف سے گزر رہے تھے۔ یہ فرحان جانتا تھا۔

”بابا! یو آر گریٹ۔ آپ ہی سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں، کاش بچپن میں ہونے والے ایسے فیصلوں کی بھینٹ آپ سب ہمیں نہ چڑھاتے۔“

”یہ خانگی زندگی بھی پل صراط سے کم نہیں ہوتی۔ اس کا اندازہ بعد میں ہوتا ہے۔“

”بابا! میں سامعہ کو لے کر چپ چاپ یہاں سے چلا جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”ہونہہ! اور اگلے ہی دن ماں کے پر سے کے لیے آنا پڑے گا۔ آپ کی ماما

نہایت بہادر، نرم خو اور وضع دار سہی اولاد کے معاملے میں بہت حساس

ہے۔ اپنی ماں کے لیے بہت حساس بیٹی ہے۔ نہ چیخے گی، نہ چلائے گی۔ بس

خاموش ہو جائے گی۔“ میاں افتخار نے شاہدہ بیگم کے بارے میں خاصی فکر

مندی کے ساتھ اظہار کیا۔

”بابا پلیز! آپ مجھے اور سامعہ کو بھی یاد رکھیں۔ دیکھیں زرتاشیہ کی شادی کسی

سے بھی ہو جائے گی۔ سامعہ کا گھر بن چکا ہے۔“ وہ چلا پڑا۔

”یار! یہ سب مجھے معلوم ہے لیکن اب سمجھا سکتے ہو تو سامعہ کو سمجھاؤ۔“

”فی الحال تو میں اس کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہتا۔ ریلی مجھے ندامت ہوتی ہے کہ میں نے مرد ہو کر اس کو آزمائش میں ڈال دیا۔ یہ تیسرا گھر بھی اس سے چھین لوں، کیسے؟“ وہ بے بسی سے سر تھام کر بیٹھ گیا۔

”اس سے ملو اگر وہ راضی ہو جائے تو آپ دونوں کہیں چلے جاؤ، جب گرد

بیٹھے گی تو دیکھا جائے گا۔“

”اور ماما!“

”کچھ تو قربان کرنا پڑے گا۔“

”او گاڈ! اتنا برا وقت مجھ پر کبھی نہیں آیا تھا۔“

”اچھا یار! اب گاڑی تو اسٹارٹ کرو مغرب کا وقت ہو گیا ہے۔“ میاں افتخار

نے باہر پھیلے جھٹ پٹے کے ذریعے وقت کا اندازہ لگایا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ

کی۔

بابا کے سمجھانے کے بعد بڑی ہمت کر کے وہ گھر پہنچا تھا اور دل ہی دل میں یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ سامعہ کو سمجھانا ہے۔ انکار نہیں تو اقرار بھی کرنے پر دل آمادہ نہیں تھا۔ مگر اس کے فیصلے پر اوس پڑ گئی۔

شوکی نے گیٹ کھولتے ہوئے بتا دیا تھا کہ زرتاشیہ بی بی، سامعہ بی بی اور نانو زبیر ماموں کے ساتھ مارکیٹ گئے ہیں۔ ہکا بکا سا وہ بابا کا منہ تکتے لگا۔ انہوں نے نارمل رہنے کا اشارہ کیا تو وہ بے دلی سے گاڑی لاک کر کے ان کے ہمراہ اندر آگیا۔ بابا اپنے کمرے کی طرف جانے لگے اور وہ اپنے کمرے کی طرف۔ اسی وقت ناجی نے شاہدہ بیگم کا پیغام دیا کہ وہ بلا رہی ہیں۔ بادل نحواستہ وہ بابا کے ہمراہ کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ کافی خوش اور مطمئن سی لگیں۔ کئی ہفتوں کے بعد انہیں اس طرح دیکھ کر میاں افتخار کی رگ ظرافت پھڑکی۔

”ماشاء اللہ۔ آج ہماری عدم موجودگی میں کس خوش نصیب کی زیارت فرمائی ہے۔“

”بوڑھے ہو گئے ہو، مگر عقل نہ آئی۔“ وہ دبی دبی مسکراہٹ لیے بولیں۔

”ارے بیگم صاحبہ! عقل تو کم بخت کبھی ہاتھ لگی ہوتی تو ہم اس حالت میں ہوتے۔“ وہ مزید شریر لہجے میں بولے۔

”اچھا بس، مجھے اپنے بیٹے سے بات کرنے دیں۔“ انہوں نے فرحان کو قریب بیٹھنے کو کہا۔

”خیریت؟“ فرحان نے فقط اتنا پوچھا۔

”شکر اللہ پاک کا۔ آپ کی ماما جی اٹھی ہیں۔“ وہ خوش ہو کر بولیں۔

”سب کہاں گئے ہیں؟“ دل میں کھٹکتی بات زبان پر آگئی۔

”مارکیٹ، زرتاشیہ کی پسند سے شاپنگ کرانے۔ سامعہ بہت پیاری بیٹی ہے۔ اس نے میری پریشانی دور کر دی۔ زرتاشیہ تو ویسے ہی اس پر جی جان سے فدا ہے ویسے اماں کا خیال برا نہیں ہے۔ کیوں افتخار؟“ وہ ایک سانس میں بولتے بولتے اچانک میاں افتخار سے مخاطب ہوئی تھیں۔ وہ چونکے۔

”کیسا خیال...؟“

”جوان جہان ہے۔ بچے کی ذمہ داری تنہا کیسے اٹھائے گی۔ شوہر لا پتا ہے۔ فتویٰ لے کر اس کی نئی زندگی شروع کرادیں۔ زبیر کا گھر بھی آباد ہو جائے گا۔“

”بس، بس یہ ہاتھ جڑے ہیں آپ کے سامنے آج کیا اماں جان کی روح آپ میں حلول کر گئی ہے۔ ان کی طرح بولتی جا رہی ہیں۔“ میاں افتخار نے ہاتھ جوڑ دیے۔ فرحان کچھ نہ سمجھا۔ تو میاں افتخار نے اسے باہر جانے کو کہہ دیا۔ وہ چلا گیا۔

”اس میں حرج کیا ہے؟“

”خدارا! رشتوں کے مقام کو سمجھو، شکر کرو فرحان کچھ سمجھا نہیں ورنہ قیامت آجاتی۔“ وہ بولے۔

”ارے کیوں؟ فرحان کو کیا لینا دینا۔“

”چھوڑیں اس قصے کو۔ بس میں سامعہ کو باس کے حوالے کر دیتا ہوں۔ اس کے شوہر کے زندہ ہونے کے شواہد مل گئے ہیں۔“

”اچھا فی الحال فرحان اور زرتاشیہ کی شادی تک تو رہنے دو۔“ وہ کچھ نہ سمجھ کے بولیں۔

”فرحان کی ہاں سے بالا بالا آپ نے شادی کی شاپنگ شروع کرادی۔“

”سامعہ کا خیال ہے کہ فرحان کی خاموشی رضا مندی ہے۔“

”یہ سامعہ کو بقراط کس نے بنا دیا ہے۔ یہ جام جمشید میں حالات کیسے دیکھنے لگی ہے۔“ وہ جھنجلا کر بولے۔

”ارے آپ کو کیا ہو گیا ہے؟“ انہیں حیرت سی ہوئی۔

”دماغ کو بخار چڑھ گیا ہے۔“ وہ یہ کہہ کر مضحکہ خیز شکل بنا کر واش روم کی طرف بڑھ گئے۔ شاہدہ بیگم نے گردن جھٹک کر نئے سرے سے خریداری کے سامان کی فہرست بنانی شروع کردی۔



ماما کو اپنی خیریت سے باخبر کرنے کے بعد فون آف کیا ہی تھا کہ مسز ہمدانی کا بلاوا آگیا۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے تیزی سے بالوں میں برش کر کے ٹی وی لائونج میں آگئی۔ بلوجینز پر لائٹ کریم کلر کی شرٹ میں جاذب نظر لگ رہی تھی۔ مگر مسز ہمدانی نے مسکرا کر تنقیدی لہجہ اختیار کیا۔

”مجھے حیرت ہے کہ ملتان خاصا موڈ ہو گیا ہے۔ صرف چند سالوں میں ورنہ یہ جینز شرٹ کا بے ہودہ استعمال لاہور، اسلام آباد اور کراچی تک محدود تھا۔“

تانی شرمسار سی ہو گئی۔

”بیٹھو۔ اچھی بھلی لڑکی ہو، اچھا سا لباس پہنا کرو، خرم بتا رہا تھا کہ آپ کا منگیتر درمیانے طبقے کا ہے۔ یہ طبقاتی فرق بڑی بری طرح محسوس ہوتا ہے۔“

وہ بڑے لاابالی پن سے بولیں۔

”خرم نے یہ کب بتایا؟“ اسے کچھ اچھا نہیں لگا۔

”کیا؟“ وہ انجان بن گئیں۔

”کہ میرا منگیتر بھی تھا۔“

”تھا، کیا مطلب؟“

”میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔“ وہ بالوں کو جھٹکا دے کر فاخرانہ انداز میں بولی۔

”اچھا۔ خرم نے یہ نہیں بتایا۔“ وہ خاصے تعجب سے بولیں۔

”خرم نے مجھے بھی یہ نہیں بتایا کہ وہ ہر بات آپ کو بتاتا ہے۔“ خاصا جل بھن گئی۔

”یہ بتانے کی بات تو نہیں ہوتی۔ کیا ماں کا اپنے بیٹے سے اتنا بھی اعتما کا رشتہ نہیں۔“

”آنٹی! میرا مطلب تھا کہ جو کچھ خرم کو بتانا چاہیے تھا وہ اس نے نہیں بتایا۔“

”ہاں! لاابالی ہے، مگر فرمانبردار بیٹا ہے۔“

”جی!“

”خیر! کس بحث میں پڑ گئے۔ یہ دیکھو یہ میں نے آپ کے لیے شاپنگ کی ہے۔“

”شکریہ! مگر اس تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔“ بد دلی سے کہا۔

”کوئی تکلف نہیں، خرم کی فرینڈ ہو۔ دور سے آئی ہو۔ یہ تو مہمان نوازی ہے۔“ انہوں نے ڈپٹ کر کہا تو اسے اپنائیت سی محسوس ہوئی۔ دھیرے سے مسکرا دی۔

”ننانیہ! میری تائی جی یعنی خرم کی دادی ہمیشہ ایک ہی بات سمجھاتی تھیں گھر آئے رزق اور مہمان کی بہت عزت کرو۔ کسی ایک کو بھی ناراض نہ کرو۔“

”اب وہ کہاں ہیں۔“

”اللہ غریق رحمت کرے۔ ان کی وفات کے بعد ہی تو ہم اسلام آباد شفٹ ہوئے تھے۔ جب تک وہ زندہ رہیں ہم ملتان اندرون شہر رہے اپنے آبائی گھر میں۔“

”اندرون شہر۔“ وہ چونکی۔

”یہ بھی خرم نے نہیں بتایا ہوگا۔“ وہ ہنسیں۔

”نہیں شاید بتایا تھا آپ کے سیٹ اپ سے یقین نہیں آتا۔“ وہ ٹال گئی۔

”سیٹ اپ تو بعد کی بات ہے۔ انسان تعلیم یافتہ ہو بس پھر سیٹ اپ بن ہی جاتا ہے۔ پرانے محلے دار، جان پہچان والے پہچان نہیں پاتے، انہیں یقین دلانا پڑتا ہے بس تائی جی کی دعائوں کا صدقہ ہے۔ ان کے قدموں کی برکت ہے۔“ وہ وفور محبت سے ساس کو یاد کر کے رو پڑیں۔

”آپ پلیز دکھی نہ ہوں۔“ وہ بوکھلا کر بولی۔

”قیمتی نقصان پر عمر بھر دکھی رہنا پڑتا ہے۔“ وہ آنکھیں پلو سے رگڑ کر وہاں سے اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں اور وہ جزبز سی شاپنگ بیگ وہیں چھوڑ کے کمرے میں آگئی۔

...☆☆☆...

کوئی مجھے رلانے کی ضد میں ہے

شاید مجھے آزمانے کی ضد میں ہے

جس کی چاہت ہے شدت سے مرے دل میں

وہی مجھے بھول جانے کی ضد میں ہے

بہت مضبوط ارادہ باندھ کے ایک بار پھر وہ سامعہ کے رو برو ہونے آیا تھا۔ وہ

بیڈ پر دراز تھی۔ زرتاشیہ اس کے قریب بیٹھی سیب چھیل رہی تھی۔ یقیناً

سامعہ کے لیے۔

”زرتاشیہ! ایک کپ چائے تو پلاؤ۔“ پہلی بار براہ راست اس نے زرتاشیہ کو مخاطب کیا۔ وہ کھل اٹھی فوراً اثبات میں گردن ہلا کر چلی گئی۔ سامعہ سمجھ چکی تھی کہ وہ کس ارادے سے آیا ہے۔

”چار سے پانچ منٹ میں زرتاشیہ چائے بنا لائے گی۔ اس مختصر وقت میں میری بات کا جواب دو۔“ وہ بولا۔

”تو آپ منکر ہو گئے ہیں اپنے قول سے کہ میں جو کہوں آپ مانیں گے۔“ وہ خاصی سنجیدگی سے بولی۔

”سامعہ! میں نہ منکر ہوں، نہ بد عہدی کرنے والا مجھے صرف یہ بتائو کہ کیا تمہارا وجود صرف قربان گاہ پر سچ دھج کے ساتھ قربان ہونے کے لیے بنا ہے۔“ اس نے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”میرا وجود صرف میری محبت سے ہے مجھے اپنی محبت پر بہت غرور ہے۔ آپ سے محبت بے پناہ محبت کی ہے مگر محبت سے محبت کرنا ہی کمال نہیں ہوتا۔“

”میری محبت صرف تم ہو سامعہ! صرف تم اور مجھے حصوں میں خانوں میں تقسیم مت کرو۔“ وہ خاصا جذباتی ہو کر اس پر جھکا۔

”اس کا مطلب‘ میں نے الفاظ کی حرمت گنوا دی۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اسے پرے کیا۔

”نہیں مگر فیصلے کے بعد اپیل تو دائر کی جا سکتی ہے۔“

”پلیز! میری جان نہ لیں۔ میں ٹوٹنا نہیں چاہتی۔“

”اوکے! میں تمہاری جان لے سکتا ہوں۔ میں تمہیں توڑنے والا ہوں۔ یہ بھی

تم نے ہی کہا ہے نا۔“ وہ ایک دم اشتعال انگیز لہجے میں بول کر آندھی

طوفان کی مانند کمرے سے نکل گیا۔ وہ آوازیں لبوں کے درمیان دیتی رہ گئی۔

مگر وہ تو جا چکا تھا۔ وہ پلکوں سے ٹوٹے اشک پلو سے رگڑ کر صاف کرنے

لگی۔ زرتاشیہ فرحان کے بقول پورے پانچ منٹ بعد ہی آئی تھی۔ مگر فرحان کی

عدم موجودگی پر استفامیہ نگاہوں سے سامعہ کو دیکھا۔ وہ اس کی نگاہوں کا

مطلب جان کو جھوٹ بولنے پر مجبور ہو گئی۔

”فرحان کا کوئی فون آیا تو وہ جلدی میں چلے گئے۔“

”چلیں یہ چائے پیا کو دے آتی ہوں۔“ زرتاشیہ نے غیر معمولی انداز میں کہا اور چائے دینے چلی گئی۔ تو وہ فرحان کے لہجے اور جملوں پر غور کرنے لگی۔

...☆☆☆...

گلریز صاحب کے کہنے پر افراسیاب نے زبیر احمد کے گھر کا فون نمبر ملایا۔  
زرگھس، انجم دونوں اس اچانک کی کارروائی پر ایک دوسرے کو دیکھ کر خاموش  
ہو گئیں۔

”ہیلو! زرتاشیہ کیا حال ہے؟“ افراسیاب نے فون پر پوچھا۔

”میری بات کراؤ۔“ گلریز صاحب نے کہا تو افراسیاب نے فون باپ کی  
طرف بڑھا دیا۔

”ہیلو بیٹا کیسی ہو؟“ انہوں نے محبت بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ماموں جانی میں ٹھیک ہوں۔ بس پپا کو فلو ہوا ہے اور شاہدہ پھوپھو کی کچھ

طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے سارے گھر کی رپورٹ دے دی۔

”اوہ! اللہ خیر رکھے، ماموں سے“ ماما سے ملنے کو دل نہیں چاہتا ہے کیا؟“

وہ کچھ شوخی سے بولے۔

”چاہتا ہے مگر کیا کروں؟“

”تو آجائو میں سیٹ کنفرم کروادیتا ہوں۔“

”نہیں ماموں پپا تو اکیلے نہیں رہ سکتے۔ پھر ویسے بھی اب تو اور مصروفیت

ہے۔“ آخری جملہ اس نے کچھ شرما کر کہا۔

”اب تو کیا۔“

”شادی کی تیاری ہو رہی ہے۔“

”اوہ اچھا۔ بہت خوشی کی بات ہے۔ ماما کے بغیر؟“

”ماما، ماما تو آپ کے پاس ہیں۔“ وہ ایک دم افسردہ سی ہو گئی۔

”نہیں وہ اپنے پاس ہیں۔“ انہوں نے چبھتی سی نگاہ نرگھس پر ڈالی۔

”ماموں جانی، آپ انہیں ایک بار بھیج دیں۔ میں پپا سے صلح کرادوں گی۔“ وہ

بڑی معصومیت سے بولی۔

”اوکے، آپ خوش رہو۔ پھر بات ہوگی۔“ گلریز صاحب نے پیار سے سمجھایا

اور فون بند کر دیا۔

”اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ جائو اور جا کر بیٹی کو ممتا کی چھانٹوں میں رخصت

کرو۔ فضول ضد چھوڑ دو۔“ گلریز صاحب نے نرگھس کو مخاطب کیا۔

آپ نے سن لیا کہ زرتاشیہ کی شادی فرحان سے کر رہے ہیں۔ مجھے بلانے کی

خواہش ہوتی تو رشتہ ختم کر دیتے۔“

”کیوں کر دیتے؟“ رشتے موم سے نہیں بنائے جاتے۔ پھر یہ بہت پہلے کا فیصلہ

اب تمہاری ضد کیوں بن گیا ہے؟ بات کچھ بھی نہیں تم صرف پانی میں

مدانی پھیر رہی ہو۔ بیٹی کو ضد کی سزا مت دو۔ وہ رخصت ہو گئی تو عمر بھر

تمہارا نام سننا بھی پسند نہیں کرے گی۔“ گلریز صاحب نے سختی سے کہا۔



”پو! آپ کی اور منزل ہے نہ راستہ پھر کیوں ایسا کر رہی ہیں۔“ افراسیاب نے کہا تو وہ خاصی مشتعل ہو گئی۔

”مجھے تو اپنے گھر میں ہی مخالفت کا سامنا ہے۔ انجم بھابھی کیوں چاہیں گی کہ میری زرتاشیہ اس گھر میں آئے۔ انہیں تو اپنی عینی لانی ہے۔“

”نرگھس! یہ بہتان تو مت لگاؤ۔ افراسیاب کے لیے عینی کا انتخاب میں نے سوچا ضرور، وہ بھی زرتاشیہ اور فرحان کے فیصلے کے بعد۔ اگر افراسیاب کے لیے زرتاشیہ کا رشتہ ہو سکتا تو مجھے کیا اعتراض تھا۔“ انجم کی حالت بہت عجیب سی ہو گئی۔ اچانک غیر متوقع الزام پر وہ دکھی ہو کر وہاں سے چلی گئیں۔

”دل بڑا رکھو“ افراسیاب ہو یا فرحان کیا فرق پڑتا ہے۔ انہیں اپنا سمجھو تمہاری گھریلو زندگی اسی لیے ڈسٹرب رہی کہ تم نے انہیں سسرالی رشتے تسلیم کیا اور تنگ نظری کی نگاہوں سے دیکھا۔“ گلریز صاحب بھی یہ سنا کر چلے گئے۔ افراسیاب نے اس کے قریب بیٹھ کر کہا۔

”پو! آپ نے سوچنے کی مدت مانگی تھی۔ اب وقت گزر گیا ہے کیا کرنا ہے؟“

”بس کہہ دو زرتاشیہ کو، زبیر کو، میرے بغیر وہ بیٹی کی شادی کر سکتے ہیں تو پھر میری کیا ضرورت؟ اگر زرتاشیہ کی شادی توڑ دیں تو میں چلی جائوں گی۔ ورنہ نہیں۔“ وہ روتے روتے چلا کر بولیں۔

”اس کا مطلب۔“

”مطلب جو بھی ہو، زرتاشیہ کا فیصلہ میں کروں گی۔“ وہ غصے سے کہہ کر پٹ پٹ کرتی اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ افراسیاب منحصرے میں پھنسا بیٹھا رہ گیا۔

...☆☆☆...

دروازے پر ہونے والی مسلسل دستک سن کر رفیعہ بیگم نے گیلے ہاتھ تو لیے سے خشک کیے اور دروازہ کھولا۔ سفید لباس میں سر پر دوپٹہ جمائے دروازے کے عین درمیان اجنبی چہرہ دیکھ کر وہ ٹھٹکیں۔

”السلام علیکم!“

”وعلیکم السلام جی۔“ رفیعہ بیگم نے کہا۔

”وہ‘ یہ عادل کا گھر ہے نا۔“

”ہاں‘ ہاں۔“

”کیا میں اندر آسکتی ہوں۔“

”جی آؤ۔“ وہ دروازے سے ایک طرف ہو گئیں۔ تو وہ اندر آگئی۔

”عادل۔“ اس کی زبان پر اٹکا۔

”عادل اپنے ابا کے پیر دبا رہا ہے۔ آؤ یہاں بیٹھو۔ میں بلاتی ہوں۔“

رفیعہ بیگم نے صحن میں تخت پر بیٹھنے کو کہا اور ابھی اندر کی طرف جانا ہی چاہتی تھیں کہ عادل خود باہر آگیا اور کرن کو دیکھ کر متحیر رہ گیا۔

”تم یہاں؟“

”بڑی مشکل سے پتہ پوچھتی پوچھتی آئی ہوں۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”تو کیا ضرورت ہے اس مشکل سے گزرنے کی۔“ وہ تلخ ہو گیا۔

”عادل؟“ رفیعہ بیگم نے بد اخلاقی محسوس کر کے ٹوکا۔

”امی آپ ابا کے پاس جائیں۔“

”کون ہے یہ؟“ انہوں نے پوچھا۔

”میں تانیہ کی سہیلی کرن ہوں۔“ اس نے تانیہ کا حوالہ دے کر تعارف کرایا تو رفیعہ بیگم خوش ہو گئیں۔

”اچھا اچھا۔“ وہ اصل بات سمجھے بنا ہی چائے بنانے کے لیے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

”آپ پلیز! جائیں اس سے پہلے کہ میرا دماغ الٹ جائے۔“ اسے سخت غصہ آرہا تھا۔

”میری بات سن لو پلیز۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔

”کون سی بات؟“ وہ چلایا۔

”میں جانتی ہوں کہ آپ تانیہ کے ایکس منگیتر ہیں۔ مجھے جس مضبوط سہارے کی تلاش پاکستان لائی ہے وہ آپ ہیں۔ مجھے غلط نہ سمجھیں میرے دادا جی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“ اس نے جلدی جلدی اپنا مدعا بیان کیا۔

”مس کرن! لیکن کیوں؟ کیا میرے چہرے پر اشتہار لگا ہے کہ یہ شخص کرائے کے لیے حاضر ہے؟“ وہ بگڑا۔

”نہیں، آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے میں دادا جی سے ملوانا چاہتی ہوں۔“ وہ پریشان سی ہو کر بولی۔ انداز بے باکانہ تھا۔

”ہونہہ! محبت تو آپ جیسی کلاس کی لڑکیاں ایسے کرتی ہیں جیسے اعلیٰ برینڈ کی چیونگم خرید کر منہ میں ڈال لی۔“ اس نے تمسخر اڑایا۔

”آپ کو کسی سے تو محبت کرنی ہے۔“ وہ قطعاً بد دل نہ ہوئی۔

”محبت، بار بار نہیں کی جاتی۔“ وہ بڑبڑایا۔

”اوہ اس کا مطلب آپ نے تانیہ سے محبت کی۔“

”اس کا کوئی مطلب نہیں اور ہاں آپ کو میرے پرسنل معاملات میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ آئندہ مجھ سے کبھی نہ ملیے گا۔“ وہ اونچے لہجے میں بول گیا۔ رفیعہ بیگم نے چائے کی ٹرے لاتے ہوئے سنا تو قریب آکر عادل کو ڈانٹا۔

”گھر آئے مہمانوں سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں۔“

”امی آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔“

”میں ٹھیک سمجھ رہی ہوں۔ یہ ہماری تانیہ کی سہیلی ہیں۔ تانیہ شرمندہ ہوگی اس لیے یہ آئی ہیں اور تم آسمان پر نہ چڑھو۔“ رفیعہ بیگم نے کچھ سے کچھ سمجھ لیا۔ کرن کو چائے کا کپ دیا اور خود اس کے برابر بیٹھ گئیں۔

”امی! تانیہ نہ شرمندہ ہے۔ نہ اس کی اب کسی شرمندگی سے مجھے کوئی مطلب ہے۔ یہ محترمہ بے کار وقت ضائع کر رہی ہے۔“ وہ یہ کہہ کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ کرن پہلو بدل کر رہ گئی مگر چاہتے ہوئے بھی اسے آواز نہ دے سکی۔

جو موقع صبح نہیں ملا اس کی کسر رفیعہ بیگم نے رات کو نکال لی۔ کرن کے لیے ان کی دلچسپی پر وہ جھنجلا اٹھا۔

”امی! آپ بہت سادہ ہیں۔ کرن جیسی آزاد خود مختار لڑکیوں سے کوئی توقع نہیں رکھی جاسکتی اور کیا ہے کرن؟ ہمیں کچھ بھی تو نہیں معلوم اور اب میرے ہاتھ خالی ہیں۔ کسی پر لٹانے کو کچھ بچتا تو لٹا دیتا۔ کسی اور سے نہ کوئی واسطہ ہے نہ سوال نہ ملال۔“

”تانیہ کو تو تم بھولے ہی نہیں۔“ وہ اس کے اندر تک اتر گئیں۔ وہ نظریں جھکا کر بیٹھ گیا۔

”امی! یہ ایک الگ بات ہے مجھے اسے یاد رکھنے کا سبق آپ نے ازبر کرایا تھا۔ اس لیے وہ آج بھی مجھے ازبر ہے۔ مجھے بھولنے کا سبق جس نے پڑھایا وہ ہستی بھی مجھے یاد ہے۔“ اس نے دل کھول کر ان کے سامنے رکھ دیا۔

”مگر عادل اس حقیقت کے بعد بھی یہ ایک حقیقت ہی ہے کہ کرن تمہیں چاہتی ہے۔ چاہتیں بار بار نہیں ملتیں۔“ انہوں نے کافی نرمی سے کہا۔

”چاہت! چاہتے ہیں‘ بے انتہا چاہتے ہیں۔ پر چاہنا کسی کو نہیں آتا۔ جسے ہر پل دعاؤں میں مانگتے ہیں حقیقت یہ بھی ہے کہ اسے مانگنا ہی نہیں آتا۔“

”پھر ایک بار اپنے ابا کو افتخار سے بات کرنے دو۔“ رفیعہ بیگم نے کچھ سوچ کر کہا۔

”کیا؟ کس لیے؟ تانیہ کے لیے؟ آپ بھول رہی ہیں کہ تانیہ نے آپ کے بیٹے کو رد کر دیا ہے۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”تو پھر کرن مجھے اچھی لگی ہے۔ اس کے دادا سے ملو۔“ انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”وہ تانیہ کی سہیلی ہے‘ تانیہ نہیں۔“ وہ کچھ اس طرح کہہ کر باہر گیا کہ رفیعہ بیگم اس کے دل کی کیفیت جان کر آبدیدہ سی ہو گئیں۔

”میرے چاند! میرے اختیار میں ہوتا تو میں سارے زمانے سے لڑ کر تمہاری خوشی لے آتی۔“ انہوں نے خود سے کہا۔

”کیا ہوا عادل کی ماں؟“ میاں ستار اسی طرف آگئے۔

”ک...ک... کچھ نہیں۔“ وہ ٹال گئیں۔

”اتنی عمر کے بعد چاہو بھی تو جھوٹ بولنا نہیں آتا۔“ وہ ہنسنے اور قریب بیٹھ گئے۔

”جھوٹ اور سچ سب گڈ مڈ ہو گئے ہیں شاید۔“ وہ دھیرے سے بڑبڑائیں۔

”رفیعہ بیگم کچھ تو ہے جو تم چھپا رہی ہو۔“

”عادل کے ابا‘ میں عادل کے لیے فکر مند ہوں۔“ وہ جذباتی ہو کر کہہ گئیں۔

”ہیں! کیا ہوا ہمارے شیر جوان کو۔“ وہ حیرت سے بولے۔

”چھوٹی سی عمر میں کاروبار کی دیکھ بھال نے صحت خراب کر دی ہے نہ وقت پر کھاتا ہے نہ آرام کرتا ہے۔“ وہ اصل موضوع دبا گئیں۔

”اوائے نادان بیگم صاحبہ! اسی لیے تو کہتے ہیں کہ خیال رکھنے والی جلدی لے آؤ۔“

”وہ‘ ہاں بس ایسا ہی کرنا پڑے گا۔“

”بڑے دن سے نہ افتخار آیا‘ نہ کوئی خیر خبر آئی۔ ہم ہی چلتے ہیں۔“

”وہ‘ وہ دراصل افتخار تو میٹنگ میں کراچی گیا ہوا ہے۔ آئے گا تو چلیں گے۔“

”اب تاریخ لے لو‘ کتنا بھروسہ بڑھ گیا ہے۔ میری سانسوں پر۔“ وہ دیکھ کر افسردگی سے بولے تو رفیعہ بیگم ہول سی گئیں۔

”اللہ آپ کو سلامت رکھے آپ کو عادل کے بچے کھلانے ہیں۔“

”پاگل! یہ سفید جھوٹ تو نہ بولو۔“

”اچھا میں آپ کے لیے چپاتی ڈالوں۔“ وہ جلدی سے بہانہ بنا کر اٹھ گئیں۔  
میاں ستار نے اٹھ کر واش بیسن کا رخ کیا۔



...☆☆☆...

حمیدہ نے کارڈلیس لا کر اسے دیا اور خرم صاحب کا فون کہا تو وہ ایک دم خوش ہو گئی۔ حمیدہ کے جاتے ہی اپنے مخصوص انداز میں چلائی۔

”خرم! خرم میں تمہارا قتل کردوں گی۔“

”اوہو“ دھیرے بولو اسلام آباد میں ہو کسی نے سن لیا تو جیل کی ہوا کھانی پڑے گی۔“ وہ بھی اپنے ہی مخصوص لب و لہجے میں بولا۔

”یو اسٹوپڈ! تم نے کتنی گڑ بڑ کی ہے۔ آنٹی کو کچھ نہیں پتا کہ میں یہاں کیوں آئی ہوں؟“ وہ چلائی۔

”انہیں یقین ہے کہ تم چوری ڈاکے کی نیت سے نہیں آئیں۔“ وہ چڑاتے ہوئے بولا۔

”پلیز! سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہاں فرحان بھائی کی شادی ہونے جا رہی ہے ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں یہاں کسی کو کچھ خبر نہیں۔“ وہ خاصی پریشان کن کیفیت سے دو چار تھی۔ خرم کو کچھ اندازہ ہوا تو بولا۔

”کم آن! ایسا کرو فون مام کو دو میں ابھی کہہ دیتا ہوں۔“

”پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ وہ چلائی۔

”یار! تم چاہتی کیا ہو؟ جب میں نے مام کو ڈائریکٹ تمہارے گھر بھیجنے کا کہا تو تم نے منع کر دیا اور کہا میں خود آنا چاہتی ہوں۔ اب اتنی بولڈ ہو تو خود انہیں کہہ دو۔“ وہ بھی اشتعال میں آگیا۔

”تو گویا تم میرا امتحان لے رہے ہو۔“ وہ برا مان گئی۔

”سوئٹ ہارٹ! اب خفا مت ہو۔ مام بہت سوفٹ ہارٹڈ ہیں۔“

”تو ٹھیک ہے میں آنٹی کو فون دیتی ہوں تم انہیں بتاؤ باقی جو وہ مجھ سے پوچھیں گی وہ میں بتا دوں گی۔“

”او کے! بات کراؤ۔“ وہ راضی ہو گیا۔

وہ تقریباً دوڑتی ہوئی مسز ہمدانی کے کمرے میں پہنچی۔ انہیں ریسپور دیا اور بات کرنے کا اشارہ کیا۔

”جی جان!“ وہ بہت دلار سے بولیں۔ وہ ان کے قریب پڑی کرسی پر ٹک گئی۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی کبھی ان کے چہرے پر نظر ڈالتی اور کبھی ہونٹ چبانے لگتی۔ مسز ہمدان کے چہرے پر سنجیدگی تھی اور زبان پر صرف ہونہ، ہاں، جی، ہوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تانیہ کے لیے تجسس تھا جو نہی فون بند ہوا تو اس نے جھینپتی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

وہ کچھ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”تانیہ! جانتی ہو مائیں اپنے بچوں میں زندگی بسر کرتی ہیں۔ ان کے اندر اتر کر سانس لیتی ہیں ہر موسم کو محسوس کرتی ہیں۔ خرم کو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس نے جو کچھ اب کہا۔ وہ میں آپ کے آنے پر سمجھ چکی تھی۔“ وہ

بولتے بولتے رکیں تو تانیہ نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے منع کر دیا یہ کہہ کر کہ

”تانیہ میری بات مکمل ہونے دو، اس کے بعد کچھ کہنا۔“

”سوری، جی بتائیے۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”آپ کو خرم سے محبت ہے۔ مگر خرم کو آپ سے محبت نہیں۔ وہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہوا کے دوش پر اڑنے والا بادل۔ کسی کے اصرار پر ناپسندیدہ۔ معمولی سی چیز بھی اپنے کمرے میں سجا لینے والا۔ چائے اور پانی مکس کر کے چسکے کے ساتھ پی جانے والا اس کے کہنے کے مطابق وہ صرف آپ کی خواہش کا احترام کر رہا ہے۔ میں اگر منع کر دوں تو وہ میرا بھی احترام کرے گا۔ آپ جس کے لیے گھر سے اتنی دور آئی ہو مجھے حیف ہے بلکہ افسوس ہے۔“ وہ طویل گفتگو کے بعد خاموش ہوئیں۔ تو حیرت زدہ سی تانیہ کے خشک لب پھڑ پھڑائے۔

”آئی! کیا خرم نے کہا کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا؟“

”ہاں وہ فرینڈ شپ کو رشتے میں بدلنے کی بات تو کر رہا تھا مگر اس میں محبت اور خواہش نہیں ہے۔ آپ کے کہنے پر وہ آپ کی خواہش پوری کر سکتا ہے۔ مگر وہ میرے حکم پر ملتان کے مچھلی بازار کے بساندھ زدہ ماحول سے اپنی پھوپھی زاد کو بھی بیاہ کر لا سکتا ہے۔ اسے ہر طرح سے ایڈ جسٹ کرنے کی عادت ہے۔“ وہ کچھ فخریہ انداز میں بولیں۔ تانیہ کو انسلٹ فیل ہوئی۔

”آئی! آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

”میں صرف آپ کو سمجھانا چاہتی ہوں کہ آپ اور میرے خیالات میں کس قدر تضاد ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ مجھے آپ کی تربیت پر حیرت ہے۔ آپ آج میں جینا چاہتی ہو اور میں آج کے لیے گزرے دنوں کی حرارت کا سہارا لیتی ہوں۔ نہ مجھے آپ کی آزادی پسند آئی اور نہ بے باکی۔ مجھے آپ کی جگہ نسرین کی خاموش سی شرم و حیا زیادہ عزیز ہے۔ نسرین کو اسی حالت میں خرم امریکا لے کر جائے

گا۔ اس میں کوئی ہتک اور شرمندگی محسوس نہیں کرے گا اور پھر وہ نسرین سے محبت کرے گا۔ کیونکہ نسرین کی خواہش خرم نہیں۔ آپ تو اپنا احساس تک نہیں رکھتیں۔“ مسز ہمدانی نے خاصے سنجیدہ لہجے میں بہت کچھ کہہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپاٹپ موتی ٹوٹنے لگے۔ پہلی بار، پوری اب تک کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی نے اس طرح آئینہ دکھایا تھا۔ مسز ہمدانی کچھ سوچ کر اس کے قریب آئیں اور بولیں۔

”تانیہ! مجھے خوشی ہوتی خرم آپ کے گھر مجھے بھیجتا۔ ہم بظاہر نئے ہیں لیکن ہمارے اندر پرانی روح موجود ہے۔“

”آئی خرم نے کیا کہا ہے؟“ وہ آنسو صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔

”اس نے کہا ہے کہ تم دونوں اچھے دوست ہو۔ باقی تانیہ جو چاہتی ہے وہ ویسا کر سکتا ہے اگر ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو تو...“ انہوں نے حقیقت بیان کر دی۔

”اور آپ کو اعتراض ہے؟“ اس نے جملہ اچک کر مکمل کیا۔

”ہاں کیونکہ آپ میرے معیار پر پوری نہیں اتریں خرم کی فرینڈ تک تو ٹھیک ہے مگر اس کے بعد خرابی ہے۔ آپ سمجھ دار ہو خود سمجھو۔“ انہوں نے بنا کسی ہیر پھیر کے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”میں خرم سے محبت کرتی ہوں اس نے کہا تھا کہ آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“ وہ روتے روتے بولی۔

”پیاری بیٹی! کسی کے کچھ بھی کہنے پر لڑکیوں کو تو اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔ رشتے یوں یک طرفہ محبت سے نہیں بنتے۔“ انہوں نے پیار سے اسے بانہوں میں لیتے ہوئے کہا۔ وہ سسکیاں لینے لگیں۔

”خرم نے مجھے یوں لائٹ سا لیا۔“ اس نے ان کی طرف بے یقینی کی کیفیت سے دیکھا۔

”ہاں اب سوچو کیا اب بھی اس پر بھروسہ کرنا چاہیے۔“ انہوں نے پوچھا تو وہ چپ سی ہو گئی۔

”جاؤ اپنے کمرے میں جا کر منہ دھو کر آرام سے سوچو محبت چاہیے یا سر سری سا تعلق۔“ انہوں نے پیار سے کہا تو وہ دلبرداشتہ سی ہو کر سسکیاں لیتی ہوئی وہاں سے کمرے کی طرف آگئی۔

پہلی بار چوٹ لگی۔

پہلی بار توہین ہوئی... توہین بھی ایسی جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ خرم تو اس کی محبت تھا۔ اس کا دوست تھا۔ وہ ایسی ناقدری کرے گا یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے کہنے پر تو وہ یہاں آئی تھی اور اس نے کہا تو فقط اتنا کہ وہ اس کی خواہش کا احترام کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ اس سے رشتہ بنانا چاہتی ہے۔ اوہ گاڈ۔ شدت جذبات سے اس کے لبوں سے نکلا اور تواتر سے آنسو بہنے لگے۔

”تم میرے نہیں تھے تو کیوں اپنی باتوں سے میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ میں یہی سمجھتی رہی کہ تم میرے ہو۔ کاش میں نے ایک بار ہی پوچھا ہوتا کہ میں تمہاری ہوں نا اپنی آزاد رنگین باتوں سے یہ اعتبار کیوں دیتے رہے تم۔ تم

نے میری توہین کی ہے۔ میری انسٹ کرائی ہے۔ کاش! میں یہاں آئی ہی نہ ہوتی۔ کاش! تمہارا اعتبار برقرار رہتا وہ روتے روتے ندامت سے بول رہی تھی۔

موبائل فون بجنے لگا تو ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا۔

”ہاں، ہیلو!“ دل نادان نے خرم کا نمبر پہچان کر امید کا جگنو تھام لیا۔

”ہائے سوئٹ ہارٹ۔“ وہی شوخ لہجہ وہی شوخ سا انداز۔

”خرم، خرم یہ سب کیا ہے تمہاری مام نے جو کہا وہ غلط ہے نا۔“

”تنانیہ! مجھے اس سب کا اندازہ نہیں تھا۔ مام اندر سے اتنی کنزرویٹو ہوں گی یہ مجھے اس سے پہلے نہیں پتا تھا۔ دراصل انہیں تمہارے اسٹائل والی لڑکیاں پسند ہی نہیں ہیں۔ وہ نسرین جیسی لڑکیوں کو پسند کرتی ہیں۔“

”اور تم، تم کیا پسند کرتے ہو؟“ اس نے جملہ چھین کر جذباتی انداز میں پوچھا۔

”اصل میں تو میں تمہارے جیسی جیون ساتھی کو پسند کروں گا، مگر مام اور ڈیڈ کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکتا۔“ اس نے انتہائی صاف گوئی کے ساتھ اعتراف کیا۔

”اور میں جو سب کی مرضی کے خلاف فیصلے کر کے یہاں آئی ہوں۔“ وہ صدمے سے چلائی۔

”سوئٹ ہارٹ یہی تو غلط ہوا اور تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے اس طرح کے فیصلے کے لیے تمہیں کبھی پرموٹ نہیں کیا۔“

”شٹ اپ! یہاں آنے کا تو تم نے ہی کہا تھا۔“ وہ دھاڑی۔

”تنانیہ یاد کرو تمہیں وہاں مام کے بلانے پر اعتراض تھا۔ پرانی حویلی، گلی محلہ وغیرہ وغیرہ۔“ اس نے یاد دلایا۔

”اب صاف صاف کہو کیا ہوگا؟“ وہ پسینہ سی گئی۔



”ہم اچھے دوست تھے اچھے دوست رہیں گے۔ مام اور کسی بات کے لیے راضی نہیں ابھی چند منٹ پہلے دوبارہ میں نے ان سے بات کی ہے۔“

”تم اپنی مام سے اپنے حق میں ایک فیصلہ نہیں کرا سکتے۔“

”نہیں“ یہ ضد میں ان سے نہیں کر سکتا۔ وہ میری مام ہیں کوئی محلّے دار نہیں۔ ان کی پسند کے ساتھ ہی سب کچھ ہوتا۔“ وہ بہت سنجیدگی سے کہہ گیا۔ تانیہ کے ذہن کو شدید جھٹکے سے لگے۔

”اوکے“ آئی ہیٹ یو۔ آئی ہیٹ یو... یو چیٹر یو فراڈ۔“ وہ روتے روتے چلاتی چلی گئی۔

”تانیہ“ تانیہ۔“ دوسری طرف سے خرم کی آوازیں آتی رہیں، مگر اس نے فون دور فرش پر دے مارا اور ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔ کافی دیر تک دور پڑے فون سے بھی خرم کی آواز آتی رہی۔ پھر خاموش ہو گئی۔ اس نے آنکھیں مل کے فون کی طرف دیکھا۔ اس خیال سے یہ آخری آواز تھی۔ آخری گفتگو تھی... اب کبھی نہیں ملنا۔

کبھی نہیں...

...☆☆☆...

ایاز اسے بازو سے کھینچتا ہوا کمرے میں لایا۔ صوفے پر گرا کر خود اسٹول کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”کہاں رہتے ہو؟ کیوں چھپتے پھر رہے ہوں۔ بولو کیا جرم ہے سامعہ بھابی کا؟ میں اس شادی کا گواہ ہوں۔“ وہ سخت جذباتی انداز میں بولا تو فرحان کو طیش آگیا۔

”یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ بتائو جا کر اپنی سامعہ بھابی کو، میں تو اس کے حکم نامے کو لیے خود سے بھی نظریں چراتا پھر رہا ہوں۔ وہ میرے گھر میں میری شادی کی تیاریاں کر رہی ہے۔“

”تو تم بزدل کیوں بنے ہو اعلان کردو ان کی کم فہمی کی سزا مت دو۔“ اباز چلایا۔

”یار تم مجھے اتنا ہی جانتے ہو کیا؟ وہ کم فہم نہیں ہے اسے زرتاشیہ سے میری ماما سے ہمدردی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ مجھ سے کیا کروا رہی ہے۔“ وہ بھی اسی انداز میں بولا۔

”تو ختم کر دو یہ کشمکش، زبان کھولو، پھر وہ کیا کہیں گی؟ اور انہیں لے کر یہاں آجائو۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں عہد دے چکا ہوں۔ اب میری زبان کھلی تو وہ مجھ سے دور ہو جائے گی۔ بس سب کچھ الٹ ہو گیا۔ میری اور اس کی زندگی میں فقط ترتیب کا فرق آیا ہے۔ اس کی زندگی میں، میں شاید سب کے بعد آتا ہوں اور میرے ہاں سب سامعہ کے بعد آتے ہیں۔“ وہ اضطرابی کیفیت میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

”پھر کوشش کرو سمجھانے کی، یا میں اور صائمہ بات کریں۔“ ایاز نے اس سے ہمدردانہ انداز میں پوچھا۔

”بے سود، بے فائدہ بہت بے کیف سی زندگی ہو گئی۔ عجب بوجھل سے لمحات ہیں۔ نہ غم سے دل بہل رہا ہے۔ نہ خوشیوں کی آس رہی ہے نجانے کیوں زندگی ہم دونوں کو ایسے آزما رہی ہے۔“

”حوصلہ رکھو، میرے خیال میں سامعہ بھابھی غلطی کر رہی ہیں۔ یہ قربانی انہیں مہنگی پڑے گی۔“

”یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی۔ اس لیے تین دن سے گھر نہیں گیا۔ کوئی فون اٹینڈ نہیں کیا۔“

”یہ مسئلے کا حل نہیں ہے دوست۔“ ایاز نے کہا۔

”ہے یا نہیں، سامعہ کی بات میں رد نہ کرنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔ وہ میری جان ہے میں اسے مایوس نہیں کر سکتا۔“ ایک دم ہی وہ دھیرے سے بولا۔

”تو تم ویسا کرو گے جیسا سامعہ بھابھی نے کہا۔“ ایاز متحیر رہ گیا۔

”ہاں تین دن کی مسلسل جنگ میں یہی نتیجہ نکلا ہے یہی بتانے آیا ہوں۔“  
وہ دھواں دھواں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”او خدایا! فرحان تم کس قدر بدل گئے ہو؟“ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔

”اوکے‘ میں جا رہا ہوں۔“ وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلا ایاز پیچھے لپکا۔

”فرحان پلیز کوئی کام جلد بازی میں مت کرنا۔ بابا سے بھی مشورہ کرلو۔“

”پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“ وہ مڑ کر بولا

اور باہر نکل گیا۔

گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو ایاز نے طویل سانس بھر کے خود کو

صوفے پر گرا سا لیا۔ عزیز دوست کی یہ حالت اس کے لیے ناقابل برداشت تھی۔

...☆☆☆...

شاہدہ بیگم کے بہت مجبور کرنے پر میاں افتخار ایڈوانس دینے کے لیے پراپرٹی ڈیلر کے پاس گئے تھے۔ تمام معاملات طے کرنے کے بعد وہ باہر نکلے تو خواجہ امتیاز علی نے سامنے سے گاڑی لا کر ان کے سامنے روکی۔

”میاں افتخار صاحب! بڑی پُر مسرت سی آواز پر میاں افتخار نے ان کی طرف دیکھا اور گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ خواجہ امتیاز علی گاڑی لاک کر کے باہر نکلے،

”کیسے ہیں حضور؟“ میاں افتخار نے کہا۔

”بس جی رہے ہیں آپ کی نگری میں۔“ خواجہ صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔

”اور یہاں کیسے؟“

”وہ میرا ماڈل گارڈن والا پلاٹ ہے نا۔ اسے بیچنا ہے۔“

”خیریت اتنا اچھا موقع کا پلاٹ بیچنا ہے۔“

”دراصل میں بھی بچوں کے پاس جانا چاہتا ہوں۔“

”اچھا! یہ ارادے ہیں۔“

”یار میں نے تم سے ضروری بات کرنی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ یوں ملاقات ہو گئی۔“ وہ بولے۔

”جی حکم، بولیے۔“

”کہیں بیٹھتے ہیں۔“ خواجہ صاحب نے ذرا سے فاصلہ پر موجود ایک کافی شاپ کے باہر رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا اور دونوں اسی طرف چل دیے۔

”کرن بیٹی کیسی ہے؟“ کرسی پر بیٹھتے ہوئے میاں افتخار نے پوچھا۔

”بالکل ٹھیک ٹھاک۔ یہ بتائو تم نے تانیہ بیٹی کا رشتہ جس لڑکے سے ختم کیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟“

”تانیہ کا رشتہ ہاں اس کی وجہ میں ہوں تمہیں کس نے بتایا۔“ وہ بولے۔

”تم... کیا مطلب؟“ خواجہ صاحب نے حیرت سے پوچھا۔

”جی ہاں میں۔ وہ میری ہستی کا حصہ ہے۔ بیوی، بیٹی کو میرے سوا میرا اور کوئی رشتہ قبول نہیں۔“

”مطلب؟“

”خواجہ! وہ میرا بھتیجا ہے مگر میری طرح نہیں ہے۔ بہت خود دار ہے۔“ انہوں نے اپنا تمسخر خود اڑایا۔

”یعنی رشتہ ختم ہونے کی وجہ خود داری ہے۔“

”نہیں اور بھی مسائل ہیں، مگر اصل مسئلہ یہی ہے۔ ہماری بیگم کو بہت امیر کبیر گھر داماد چاہیے۔“

”اوہ! اچھا پھر تو اس لڑکے کے بارے میں کسی اور سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔“

”عادل سے ملے ہو؟“ میاں افتخار نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

”نہیں، مگر کرن کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہوں۔ کرن نے ذاتی طور پر خود اسے پسند کیا ہے تم جانتے ہی ہو کرن کا پاکستان آنے کا مقصد بھی یہی ہے۔ سو بات بڑھائو۔“ خواجہ صاحب نے خاصے وثوق سے کہا تو ہنسنے لگے۔

”بہت خوب! بھائی میاں ہزار جوتے مار کر ایک نہیں گنیں گے۔ انہیں تو رشتہ ختم ہونے کی خبر بھی نہیں ہے یار۔“

”یعنی یک طرفہ۔“ خواجہ صاحب حیرت زدہ سے بولے۔

”ہاں عادل کو کہہ کر ختم کیا ہے اور میرا اندازہ ہے کہ ابھی تک عادل نے گھر میں نہیں بتایا ورنہ قیامت آچکی ہوتی۔“

”او آئی سی۔ ہماری کرن کو عادل بہت پسند آگیا ہے۔ اب کیا کیا جائے۔“

خواجہ صاحب نے فراخ دلی سے اعتراف کیا۔

”وہ ہے ہی پسند آنے کے قابل، مسئلہ یہ ہے کہ میں تو اس سے نظریں بھی ملانے کے قابل نہیں۔“ میاں افتخار نے بے بسی ظاہر کی تو خواجہ صاحب چپ ہو گئے۔

”تم خود جا کر مل لو اور اس کی مرضی معلوم کرلو۔ پھر کچھ آگے سوچیں گے۔“ میاں افتخار نے چپ ہونے پر مشورہ دیا۔

”کچھ اچھا نہیں لگتا۔ خیر کرن کی خوشی کے لیے کچھ تو کرنا ہے۔“

”اوکے! پھر ان شاء اللہ ملاقات ہوگی۔ شاہدہ کو بنک سے لینا ہے۔“ میاں افتخار رسٹ وایچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”اوکے اللہ حافظ۔“ خواجہ امتیاز نے بھی کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

...☆☆☆...

بہت عرصے بعد گھر کے ماحول میں خوشی جاگی تھی۔

امان جان ہر آنے والے کے منہ میں خود مٹھائی ٹھونس رہی تھیں۔ فرحان موبائل پر غیر ضروری نظریں جمائے مصروفیت شوکر رہا تھا۔ جب کہ زبیر احمد، شاہدہ بیگم شادی سے آگے کی منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔ میاں افتخار کا انتظار تھا۔ وہ جیسے ہی آئے تو انہیں شوکی نے اماں جان کے کمرے میں بھیج



دیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی سارا معاملہ سمجھ گئے۔ فرحان کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی بتا رہی تھی کہ وہ اس وقت کس کیفیت میں ہے۔ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئے۔

”لو، میاں منہ میٹھا کرو۔“ اماں جان نے قلاقند کا ایک بڑا سا ٹکڑا ان کے منہ میں دیا جسے وہ صرف نگل سکے۔

”یہ مٹھائی کس خوشی میں؟“ وہ دانستہ انجان بن کر بولے۔

”فرحان اور زرتاشیہ کی شادی کی خوشی میں۔ یہ دیکھو اس کیلنڈر میں سے دو دن نکالے ہیں کوئی بھی تاریخ منتخب کرلو۔“ اماں جان نے ٹیبل کیلنڈر ان کی طرف بڑھایا۔ تو وہ ایک دم فرحان کی طرف دیکھنے لگے۔

”فرحان کا کیا پروگرام ہے؟“ انہوں نے فرحان کو جھنجھوڑا۔

”فرحان نے ہی تاریخ طے کرنے کو کہا ہے۔ میرا بیٹا ماں کی بات کیسے ٹال سکتا ہے۔“ شاہدہ بیگم نے جلدی سے بتایا۔

”آپ کی بات کوئی بھی نہیں ٹال سکتا۔“ وہ دبا دبا طنز کر کے اٹھے اور کمرے سے چلے گئے۔

”ارے آپ کہاں جا رہے ہیں۔“ شاہدہ بیگم نے پیچھے سے آوازیں دیں مگر وہ رکے نہیں۔ فرحان بابا کے برتاؤ سے سمجھ گیا۔ اس لیے خود اٹھ کر ان کے پیچھے کمرے میں آگیا۔

”فرحان یار پلینز مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ وہ خاصے بے زاری سے بولے۔

”اور میں کیا کرتا۔ یہ سب آپ کی سامعہ کی مرضی ہے۔“ وہ بولا۔

”کم آن یار! شادی آپ دونوں کی مرضی اور پسند سے ہوئی ہے اس فیصلے میں آپ نے اسے تنہا کر دیا۔“ میاں افتخار پہلی بار اس قدر سنجیدہ اور رنجیدہ ہوئے تھے کہ فرحان کو بھی حیرت سی ہوئی۔

”بابا! آپ بھول رہے ہیں میں نے کچھ اور سوچ کر شادی کی تھی کچھ اور ہی فیصلے کرنا چاہتا تھا۔ مگر قدم قدم پر کس نے مجھے روکا آپ نے اور سامعہ نے۔“ وہ خاصے بلند لہجے میں بولا۔

”اس کا مطلب یہ نہیں کہ اتنا نا معقول فیصلہ کرلو۔ سوچو سامعہ کا بچے کا کیا ہوگا؟“ وہ بہت مضطرب تھے۔

”سامعہ نے اپنے فیصلے کے آگے دیوار کھڑی کر دی ہے۔ مجھے نہیں معلوم دراصل اسے اس گھر میں اس طرح لانے سے اسے خراج دینا پڑا ہے۔ ماما کی بیماری، زرتاشیہ کی خدمت، تنہائی، زبیر ماموں کی پریشانی سب، وہ حساس سی سامعہ برداشت نہیں کر سکی۔“ وہ بہت افسردہ سا ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

میاں افتخار اس کی دلی کیفیت سے بخوبی آشنا تھے۔ اس وقت وہ جس کرب کے دریا کو عبور کر رہا تھا وہ جانتے تھے۔

”یار! آپ سامعہ کو لے کر یہاں سے چلے جائو۔ چپ کر کے کہیں بھی چلے جائو۔ اس معصوم لڑکی کو مجرم نہ بنائو۔“ وہ قریب بیٹھ کر دھیرے سے بولے تو وہ چونکا۔

مگر بابا! سامعہ ایسا نہیں مانے گی۔ بلکہ وہ مجھے نظروں سے گرا دے گی۔“

”یار! پھر سوچ لو، یہ آگ کا دریا ہے۔“ انہوں نے آخری بار سمجھایا۔

”وفا اس کو ہی کہتے ہیں، محبت کی ادا اسی کو کہتے ہیں۔“ وہ یہ کہہ کر باہر چلا گیا اور میاں افتخار احساس جرم کے ساتھ بڑی دیر کمرے میں ٹہلتے رہے۔

انہیں دلی طور پر شدید کرب اور تکلیف کا سامنا تھا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں اتنا اچانک فرحان فیصلہ کرے گا۔ مضحک سے آنکھیں موند کر بیڈ پر دراز ہو گئے۔ بے بسی کا یہ وہ مقام تھا جس پر وہ عرصہ دراز سے جمے کھڑے تھے۔

...☆☆☆...

بہت ٹوٹے ہوئے ہیں ہم ابھی دستک نہیں دینا

ہماری آنکھ ہے پُر نم ابھی دستک نہیں دینا

ابھی دل میں ہے بہت غم ابھی دستک نہیں دینا

یہ پہلا موقع تھا کہ سامعہ نے کمرے کا دروازہ شام ڈھلے ہی لاک کر لیا تھا۔

زرتاشیہ کو دو تین دستک دینی پڑیں۔ تب سامعہ نے دروازہ کھولا اور نظریں چرا

کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ وہ مٹھائی کا ڈبہ ہاتھ میں لیے اندر آکر بولی۔

”یہ کیا؟ کمرے میں اندھیرا ابھی سے۔ مٹھائی بھی نہیں کھائی مبارک باد بھی نہیں دی۔“

”وہ“ ہاں بس کچھ طبیعت خراب سی ہے اس لیے لیٹ گئی تھی۔“ سرخ آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے آنکھیں ملتے ہوئے ہکلائی۔

”تو بتانا تھا نا۔ طبیعت خراب کیوں ہے؟“ زرتاشیہ نے مٹھائی کا ڈبا پتائی پر رکھا اور پریشان ہو کر بولی۔

”ارے اب ٹھیک ہوں۔ لائو مٹھائی تو کھانے دو۔“ وہ ہنس کر بولی اور خود ہی گلاب جامن توڑ کر منہ میں دبا لیا۔ زرتاشیہ خوشی سے لپٹ گئی۔

”بہت“ بہت مبارک ہو تاریخ کیا ہے؟“ اسے خود سے لگائے لگائے پوچھا۔ تو وہ شرما کر بولی۔

”اس مہینے کی چھبیس تاریخ ہے۔ سامعہ جی آج میں بہت خوش ہوں فرحان اب سے میرا ہے۔“ وہ بے خودی میں کہہ کر خود ہی گلابی پڑ گئی۔ سامعہ نے مسکرا کر اسے دیکھا اور دعا دی۔

”اللہ آپ کو، آپ دونوں کو خوش رکھے آمین۔“

”تھینک یو! سامعہ جی، اب ساری شاپنگ کل مکمل کرنی ہے۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”میں اور اب بازار کیا بُرا نہیں لگے گا۔“ سامعہ نے اندر کے کرب کو چھپا کر ذو معنی انداز میں پوچھا تو وہ سمجھ گئی۔

”اوکے! میں سمجھ سکتی ہوں۔ میں پپا کو ہی لے جائوں گی۔“

”زرتاشیہ ایک کام کرو۔“

”ہونہہ بولیے۔“

”مما کو فون کرو تاریخ بتائو اور بلاؤ مائیں خریداری کرتی ہیں۔“ اس نے نرمی سے کہا تو زرتاشیہ کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ آنکھیں بھیگ گئیں۔

”وہ بہت ضدی ہیں نہیں آئیں گی۔“ رقت آمیز جواب دیا۔

”نہیں، بیٹی کی شادی ماں کی زندگی کا اہم مقصد ہوتی ہے۔ دیکھ لینا وہ آجائیں گی۔ پھر بات کچھ بھی نہیں ہے۔ غیر ضروری ضد اور انا نے انہیں روک رکھا ہے۔“ سامعہ نے اس کی پلکیں صاف کرتے ہوئے سمجھایا۔

”وہ ایک فون تک تو کرتی نہیں۔“ وہ رو دی۔

”خوشی کے موقع پر روتے نہیں۔ کوئی بات نہیں بڑے کبھی کبھی بظاہر تنے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اندر سے نرم ہو چکے ہوتے ہیں۔“

”آپ سچ کہہ رہی ہیں سامعہ جی۔“ وہ غیر یقینی کی سی کیفیت میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ آپ کو مایوس نہیں کریں گی۔“

”دلوں کو مثال بنا کر اکثر اوقات ہم دھوکا دے رہے ہوتے ہیں۔“ اسی اثنا میں فرحان کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا۔ زرتاشیہ تو شرما کر باہر بھاگ گئی جب کہ سامعہ کی دھڑکنوں کے شور کو فرحان نے بھی محسوس کیا۔

”اب آگے کی زندگی کا بھی فیصلہ سنا دو۔“ وہ سامنے آکر بولا۔  
”کیا مطلب؟“

”کہ میری محبت اور میرے بچے کی منزل کیا ہے؟“ وہ آنکھیں چار کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

”فرحان! مجھے نہیں معلوم لیکن یہاں سے تو جانا ہوگا۔“ وہ بلاتامل کہہ گئی  
”وہاٹ یعنی تم یہاں سے چلی جاؤ گی۔“

”ظاہر ہے یہ سب صرف بچے کی پیدائش تک مجھے برداشت کر رہے ہیں۔ پھر تو آپ کا جھوٹ نبھانا ہے۔“

”میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“

”چلیے یوں ہی سہی۔ بابا کے پاس سے کبھی بھی کہیں بھی کسی کا سامنا ہو سکتا ہے۔“

”تو ہو جائے۔“

”میری محبت کی توہین مت کراؤ۔ میں مسز جیری کے پاس چلی جاؤں گی یا پھر کسی اور شہر میں گھر لیا جاسکتا ہے۔“

”کیا بچکانہ باتیں ہیں۔ تم یہاں سے کہیں نہیں جاؤ گی۔“

”اوکے، ابھی تو آپ یہاں سے جائیں۔ اچھا نہیں لگتا۔“

”جا رہا ہوں مگر اس احساس کے ساتھ کہ میں تم بن جی نہیں سکتا۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا چلا گیا اور وہ دل تھام کر بیٹھ گئی۔ آنکھوں سے جھڑی لگ گئی۔ حالت متغیر سی ہونے لگی۔ بیڈ پر گری تو کچھ ہوش نہ رہا۔

...☆☆☆...

تین دن کے تیز بخار کے بعد صبح سات بجے کی فلائٹ سے وہ پہنچی تھی۔ میاں افتخار ائر پورٹ سے باہر نکلتا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ زرد کملا یا ہوا چہرہ سیاہ حلقوں کی زد میں دھنسی ہوئی آنکھیں۔ بے ترتیب الجھے الجھے بال اور ملگجاسا شلوار سوٹ۔

”تنانیہ بیٹا ٹھیک تو ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی بابا!“ وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

”تین چار روز سے فون کیوں نہیں کیا۔ آپ کی ماما بہت پریشان تھیں۔“

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بتایا۔

”بس بخار ہو گیا تھا اس لیے۔“ وہ یہ کہہ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

”یہ حالت صرف بخار کی وجہ سے ہے؟“ انہوں نے دھیمے سے پوچھا۔

”جی بابا!“ جواب پھر مختصر اور دو ٹوک آیا۔

”اسلام آباد کی آب و ہوا تو بیماروں کو تندرست کر دیتی ہے۔“

”ہاں! میری بھی بیماری دور ہو گئی ہے۔“ وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ تو میاں

افتخار نے اسے غور سے دیکھا اور کافی کچھ ان کی سمجھ میں آ گیا۔

”آپ کی ماما تو پریشان ہو جائیں گی آپ کو دیکھ کر۔“

”انہیں پہلے پریشان ہونا چاہیے تھا۔“ اس نے کچھ عجیب سا جواب دیا۔



”تنانیہ کیا بات ہے؟“ انہوں نے بہت محبت سے پوچھا۔

”پلیز بابا، گھر چلیں کچھ مت پوچھیں۔“

”او کے!“ انہوں نے گھر والی سڑک پر گاڑی موڑ دی۔

”سب کیسے ہیں؟“

”وضاحت کرو سب سے کیا مراد ہے؟“

”نانو، ماما، بھائی، زبیر ماموں، زرتاشیہ وغیرہ وغیرہ۔“

”سب ٹھیک ہیں آپ کے بھائی کی شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے۔“ انہوں نے طنزیہ ہنس کر اطلاع دی۔

”کیا میرے بغیر؟“

”روٹین کے مطابق۔“ انہوں نے گیٹ کے باہر پہنچ کر ہارن دیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔

”شوکی نے گیٹ کھولا گاڑی اندر داخل ہوئی تو صحن میں چہل قدمی کرتے ہوئے شاہدہ بیگم خوش ہو گئیں۔ وہ ان سے لپٹ گئی۔

”اطلاع تو پہلے دیتے ہیں۔ ائرپورٹ پہنچ کر بتایا۔“ شاہدہ بیگم نے دُلا ر سے پیشانی چومتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی حیرت سے آنکھیں پھیل سی گئیں۔ وہ ان کی نگاہوں کا مطلب سمجھ کر پہلی بار نانو، نانو، پکارتی ہوئی ان کے کمرے تک گئی۔

”اجی بیگم صاحبہ! دیکھا آپ نے کمال ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں اسلام آباد کی ہوا۔“ میاں افتخار نے ان کی توجہ باٹنے کے لیے شوخی سے کہا۔ تو وہ منحصر میں گرفتار اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ میاں افتخار وہیں صحن میں بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگے۔

...☆☆☆...

وہ ڈھیر سارے کاغذات بستر پر پھیلائے بڑے سے رجسٹر میں کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ رفیعہ بیگم آ گئیں۔

”عادل۔“

”جی۔“ اس نے مگن رہتے ہوئے جواب دیا۔

”یہ کام بند کردو۔ میں کچھ بات کرنے آئی ہوں۔“ پہلی بار انہوں نے سختی سے کہا تو عادل نے جھٹ ر جسٹر بند کر دیا۔

”امی! یہ خریداری کے بل ہیں ان کو رجسٹر میں لکھنا ہوتا ہے۔ پچھلے دو مہینوں سے فرصت نہیں ملی۔ ڈھیر سارے جمع ہو گئے ہیں۔“

”یہ زندگی بھر کی مصروفیت ہے اس کے علاوہ بھی کچھ چاہیے۔“

”جی بولیے۔“

”دیکھو تمہارے ابا کو بہت عرصے انجان نہیں رکھا جا سکتا۔ وہ ہر روز افتخار کی طرف جانے کا پروگرام بناتے ہیں۔ وہاں چلے گئے تو سخت ذہنی صدمے سے دو چار ہوں گے۔“

”امی! میں کیا کروں؟ میرا قصور کیا ہے؟“

”اب کوئی دوسرا فیصلہ کرنا ہوگا میرا مطلب ہے کہیں اور رشتہ ہو جائے۔“ وہ اٹک اٹک کر بولیں۔

”جو جی میں آئے کریں میں نے منع تو نہیں کیا۔“ اس نے محبت سے ان کے ہاتھ تھام کر کہا وہ کھل اٹھیں۔

”تو کرن کی طرف جائیں۔“

”کر، کرن یہ کرن آپ کو کہاں سے یاد آگئی۔“ وہ حیرت سے بولا۔

”عادل وہ روز آتی ہے۔ ڈھیروں اچھی اچھی باتیں کرتی ہے۔ اس کی سوچ اتنی اچھی ہے کہ مجھے حیرت ہوتی ہے۔“

”وہاٹ، وہ روز آتی ہے اور آپ نے مجھے بتایا تک نہیں۔“ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ تو روز اسے بھی فون کرتی ہے لیکن وہ تو کوئی رسپانس نہیں دیتا تھا۔ پھر بھی وہ یہاں آتی ہے۔

”اس نے ڈر سے منع کر دیا تھا۔“ وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

”امی! وہ جس کلاس کی ہے، ہمیں سوٹ نہیں کرتی۔“

”بیٹا! وہ تمہیں بہت چاہتی ہے کہہ رہی تھی کہ اگر عادل نہیں مانا تو میں واپس باہر چلی جاؤں گی پھر کبھی پاکستان نہیں آؤں گی۔“ انہوں نے اچھی خاصی کرن کی طرف داری کی۔ تو اسے تانیہ یاد آگئی۔

”امی تانیہ نے خود کو چھوڑنے کا کہا تھا یہ تو نہیں کہا تھا کہ کسی اور کو اپنالوں۔“

”بھول جاؤ اسے، ہمیں اس کے فیصلے پر نہیں چلنا۔ کرن بہت اچھی ہے۔ میری مان لو اس سے ایک بار مل لو۔ اس کے دادا بھی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ پھر جو فیصلہ کرو مجھے منظور ہے۔“ رفیعہ بیگم نے اس کے لہجے کی اداسی کو محسوس کر کے پیار سے سمجھایا۔

”امی! ابا کو یہ بات بھی صدمہ ہی پہنچائے گی۔“

”ارے نہیں اگر یہاں معاملہ ہو جائے تو انہیں تانیہ اور شاہدہ کی اصلیت بتائی جاسکتی ہے۔ وہ تو تمہارے سر پر سہرا دیکھنا چاہتے ہیں۔“ ان کی یہ بات سن

کر وہ خاموش ہو گیا۔ رفیعہ بیگم نے اس کی پیشانی چومی اور کمرے سے چلی گئیں اور وہ مضطرب سا دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے ناخن چبانے لگا۔ سکون نہ ملا تو اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

”تانیہ! تم نے اچھا نہیں کیا۔“ دل سے آہ سی اٹھی۔ زندگی کے اس موڑ کا تو اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ اسے تو یقین تھا کہ

پچھڑ کے پھر ملیں گے

تھا تو اک خواب حسین

مگر، میرے زوال سے پہلے مجھے چھوڑ دیا

کس قدر حسین تو تھا ہی

مگر ذہین بھی کتنا تھا

...☆☆☆...

زبیر احمد نے شادی کارڈ کے چند نمونے لا کر شاہدہ بیگم کو دیے تھے۔ وہ میاں افتخار کو دکھانے کے لیے کمرے میں آ گئیں۔ وہ اپنی کمپیوٹر ٹیبل کے سامنے کرسی کی پشت گاہ سے سر ٹکائے، آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔

”افتخار! یہ وقت ہے یوں کمرے میں ٹھس کر بیٹھنے کا۔“

”حکم کرو“ میں باہر صحن میں ایک ٹانگ پر کھڑا ہو جاتا ہوں۔“ اضطراب سے باہر نکلنے کے لیے ظرافت کا سہارا لیا۔

”خدارا! مذاق کا بھی کوئی وقت ہوتا ہے۔“ انہوں نے کارڈ ان کے سامنے میز پر رکھے۔

”بس یہ قلق رہا عمر بھر کہ ہمارا کوئی وقت ہی نہیں۔“

”فارگاڈ سیک بیٹے کی شادی سر پر ہے اور والد صاحب کو قلق ہو رہا ہے۔“ وہ جھنجھلائیں۔

”شاہدہ قلق سے واسطہ ابھی آپ کا پڑا نہیں۔ کیونکہ آپ اس کے معنی سے ناواقف ہیں۔“ وہ کارڈ پر نظر ڈالتے ہوئے بولے۔

”مسئلہ کیا ہے؟“ وہ بھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

”فرصت نکال کے۔ تانیہ کے کمرے میں جھانک لیں کہ اب وہ کیوں کمرہ میں بند رہتی ہے؟“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکیں۔

”کوٹھی کا ایڈوانس دے دیا گیا ہے پلاسٹک بک گئے۔ تانیہ پھر بھی خوش نہیں۔“ انہوں نے خاصے ذوق معنی انداز میں کہا۔

”خوش نہیں ہے آپ کو کس نے بتایا؟“

”میرا خیال ہے مجھے تو کبھی کوئی کچھ نہیں بتاتا۔ فرصت نکال کر پوچھ لو۔ وہ آپ کے تو قریب ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے اس کی حالت سے ہی کچھ انداز ہے لیکن فرصت نہیں ملی کچھ پوچھنے کی۔“ شاہدہ بیگم کو چہیتی بیٹی کی فکر ہوئی۔

”کاش، آپ بیٹے سے بھی پوچھ لیتیں۔“ وہ دل کی تکلیف زبان پر لے آئے۔

”فرحان کو کیا ہوا؟“ وہ کچھ تعجب سے بولیں۔

”ابھی تو کارڈ پسند کر لیں۔“ وہ بے دلی سے کہہ کر باہر چلے گئے۔ انہوں نے جھلا کر کارڈ خود دیکھنے شروع کر دیے۔ پھر خیال آیا کہ زرتاشیہ اور سامعہ کو دکھائے جائیں۔ وہ ابھی اٹھنا ہی چاہ رہی تھیں کہ اماں جان آ گئیں۔

”ارے بھئی تانیہ کی کچھ خبر لو۔ وہ جانے کس کو فون پر برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اول فول بک رہی تھی۔ شوکی اور ناجی نے آکر بتایا تو میں بھاگی۔ فون فرش پر دے مارا ہے اور تکیے میں منہ دیے رو رہی ہے۔“ اماں جان نے نان اسٹاپ ہانپتے کانپتے بتایا تو شاہدہ بیگم کو میاں افتخار سے ہونے والی گفت گو یاد آگئی۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئیں۔

”تانیہ!“ انہوں نے اس کے سرہانے بیٹھتے ہوئے پکارا۔

”ماما پلیز لیومی الون۔“ وہ چلائی۔

”تانیہ کیا بات ہے؟“ وہ جذباتی ہو گئیں۔

”کچھ نہیں، بس آپ جائیں۔“

”لیکن کیوں؟“

”اس لیے کہ میں ڈسٹرب ہوں اپنا سامنا کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ پلٹ کر بولی۔ انہوں نے تڑپ کر اس کے بھگے رخسار صاف کیے۔

”کیوں؟ میری جان مجھے بتاؤ۔“

”ماما، پلیز پہلے مجھے خود کو تو کچھ بتانے دیں۔ آپ کو بتانے سے کیا فائدہ؟“ وہ کچھ بگڑے تیور کے ساتھ کہہ کر دوبارہ رخ موڑ کر لیٹ گئی۔

”تانی! ماں کی حیثیت کا کوئی مقام ہے آپ کی نظر میں۔“



”کون سی حیثیت؟ آپ نے کبھی یاد دلایا کہ آپ میری ماں ہیں۔“ وہ طنزیہ ہنس کر بولی۔

”ماں کو ہو رڈنگ بورڈ لگانا چاہیے گھر میں کب آپ کو اپنی محبت سے محروم کیا ہے؟“ انہیں ایک دم غصہ آگیا۔

”صرف محبت دے کر فرض پورا کر دیا آپ نے۔“ وہ دو بدو ہو گئی۔ تب

شاہدہ بیگم سکتے میں آ گئیں۔ ایسا غیر یقینی انداز وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اور کھلے منہ سے دیکھتی رہ گئیں۔

”ایسے مت دیکھیں یہ میں نے نہیں کہا۔ یہ خرم کی مام نے احساس دلایا ہے۔“ وہ یقین دہانی کرانے کے لیے چبا چبا کر بولی۔

”کیا احساس دلایا ہے کہ آپ کی ماما ماں نہیں ہے۔ عادل کے مقابل خرم تو آیا ہی تھا۔ ماں کے بدلے ماں بھی لے آئیں۔“ انہوں نے خاصے غصے کے ساتھ پوچھا۔

”آپ کو کیا معلوم کیسے میری انسلٹ ہوئی ہے۔ جو آپ نے مجھے بتانا تھا وہ انہوں نے بتایا۔ مجھے آئینہ دکھایا۔ آپ کی وجہ سے انہوں نے مجھے ریکٹ کیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ شاہدہ بیگم کا دل دھچکا کھا کے رہ گیا۔

یہ اطلاع تو ان پر بجلی بن کر گری۔ وہ مزید سکتے میں آ گئیں۔ ان کی زبان گویا ہلنے کی بھی صلاحیت کھو گئی۔

”آپ نے وہ سب کیوں نہیں سیکھا آپ نے کیوں نہیں غصے سے مجھے جانے سے منع کیا؟“ وہ اندر کے طوفان کو دھیرے دھیرے باہر نکال رہی تھی۔“ شاہدہ بیگم کے ضبط نے زور سے چٹکی بھری تو وہ آنسو بہاتی وہاں سے اٹھ کر باہر آ گئیں اور سیدھی اماں جان کے کمرے میں گئیں اور ان کے بستر پر گر کے پھوٹ پھوٹ کے رو دیں۔ ناجی کتھا لینے کمرے میں آئی تو ان کی اس حالت کو دیکھ کر وہ اماں جان کو بلا لائی۔ اماں جان بوکھلا گئیں۔

”شاہدہ‘ شاہدہ...!“

”اماں جان! جو آج سنا ہے تو کلیجہ پھٹ گیا ہے۔ میں کس قدر بد نصیب ماں ہوں۔“ وہ ان سے روتے روتے کہنے لگیں۔ تب اماں جان کو کچھ اندازہ سا ہوا۔

”چلو آج سن لیا۔ اب ماں کی باتوں پر یقین آگیا ہوگا۔“ اماں جان نے بہت نرمی سے کہا اور ان کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ انہیں کچھ اطمینان سا ملا۔

فرحان نے جو خوشی دی تھی وہ تانیہ نے ذہنی صدمے میں بدل دی تھی۔ وہ ایک بار پھر بستر سے جا لگیں۔ تانیہ کمرے تک محدود تھی۔ اس کی حالت بھی ہر روز کے بعد خراب ہی ہو رہی تھی۔ کئی روز سے میاں افتخار شدت سے یہ سب محسوس کر رہے تھے۔ آخر کار آج بنک سے واپسی پر انہیں لیتے ہوئے پوچھ بیٹھے۔

”بیٹے کی شادی کی خوشی منا رہی ہو یا غم۔“ وہ چونکیں۔

”میری خوشیوں کو تو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔“ وہ سرد آہ بھر کے بولیں۔

”ویسے پوچھنے کا حق تو میرے پاس نہیں لیکن پھر بھی تم کچھ چھپا رہی ہو۔“ انہیں واقعی تانیہ سے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ تانیہ کے لگائے تازہ زخم تو وہ اندر ہی خود چاٹ رہی تھیں۔ اس کی زبان کا زہر تو برداشت بھی کر لیتیں، مگر صدمہ اس بات کا تھا کہ خرم نے ریجکٹ کر دیا۔ جس کی محبت نے تانیہ کو پاگل بنا رکھا تھا۔ اسے چھوڑنے کے بعد باقی کیا بچا تھا۔ خسارہ ہی خسارہ۔

”کیا سوچنے لگیں؟“

”تانیہ نے اپنا مجرم مجھے قرار دے دیا ہے۔ خرم کی مام نے اس کو یہی کہہ کر خالی ہاتھ لوٹایا ہے۔“ وہ بہت دھیرے سے بولیں۔

”بیٹیوں کے لیے والدین جھولیاں پھیلاتے ہیں، کوئی بھر دیتا ہے کوئی خالی لوٹا دیتا ہے، مگر والدین اس کا مان ٹوٹنے کا صدمہ بیٹیوں تک نہیں جانے دیتے۔ اس کا مطلب تانیہ اس صدمے سے دوچار ہے۔“ وہ بہت مضطرب اور دکھی ہو کر بولے۔

”ہاں مجھے یہ صدمہ ہے کہ اب کیا ہوگا؟“

”جی ہاں نہ کوٹھی کا ایڈوانس واپس ہوگا، نہ پلاسٹس واپس ہوں گے اور نہ عادل لوٹ کے آئے گا۔“ انہوں نے طنزیہ انداز میں جملہ توڑ توڑ کر مکمل کیا۔ شاہدہ بیگم تڑپیں مگر نظریں جھکا لیں۔

”پھر کیا سوچا ہے؟“

”کچھ نہیں کچھ اندازہ نہیں۔“ وہ بے بسی سے بولیں۔

”مجھے دکھ ہے کہ سب سے بڑی قربانی میں نے دی ہے اور ثواب سے بھی محروم رہا۔“ انہوں نے کہا تو شاہدہ بیگم نے کچھ عجیب نظروں سے انہیں دیکھا۔

”پچھتا رہے ہو؟“

”نہیں بس پریشان ہوں کہ کچھ بھی ٹھیک نہ کر سکا۔“

”ٹھیک ہو سکتا ہے تانیہ کی یہ حالت وقتی ہے۔ آپ بھائی میاں کو مل آئیں۔“ انہوں نے خاصے جھجکتے ہوئے انداز میں کہا تو میاں افتخار حیرت سے چونکے۔

”بیگم کاش زندگی اتنی آسان ہوتی۔“

”کیوں؟“ وہ بولیں۔

”کوئی اور طریقہ ڈھونڈیے۔ میں اپنے بھتیجے کو اچھی طرح جانتا ہوں اس میں میری ایک بھی خوبی موجود نہیں۔“ وہ مسکرا کر بہت کچھ کہتے ہوئے چلے گئے۔ شاہدہ بیگم اپنے اور عادل کے درمیان ہونے

والے مکالمے کو یاد کر کے سخت مایوس ہو گئیں۔ انہیں بھی اندازہ تو تھا کہ عادل تو جا چکا ہے، اسے واپس لانا محال ہے۔

...☆☆☆...

”پلیز! عادل بُرا نہ مانے کیونکہ میں آپ سے پیار کرتی ہوں، گناہ تو نہیں ہے پیار کرنا۔ میری سمجھ میں اب کچھ نہیں آتا، میں جو بھی کر رہی ہوں بے اختیار ہو کر کرتی ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ پیار کتنا کرنا چاہئے۔ میں جتنا بھی ممکن ہے اتنا پیار کرتی ہوں۔“ شام کے ڈھلتے سائے میں، انجان رستے پر اس

کے برابر چلتے ہوئے ایک دم رُک کر کہا تو عادل کرب سے مسکرا دیا اور  
آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

”واہ مولا! تیری تُو جانے، جو جس کے لیے بناتا ہے اسے دوسرے رستے  
دکھاتا ہے۔“ دھیرے سے بولا۔

”کیا کہا...؟“ وہ گھنے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔  
”کچھ نہیں...“ وہ سنجیدگی سے ٹال گیا۔

”عادل! مجھے یقین نہیں آرہا کہ آپ میرے ساتھ ہو۔“

”یقین کر لیجئے کہ میں ماں کا کہا کبھی نہیں ٹالتا۔“ اس نے سچ بیان کیا۔

”یُو مین... آپ آنٹی کے کہنے پر ملے ہو ورنہ میرے لیے نہیں۔“ ایک دم  
ہی اس کی آنکھوں کی روشنی ماند سی پڑ گئی۔

”ورنہ کو چھوڑیئے کیونکہ زندگی کے اکثر فیصلے ہم کسی کے کہنے پر تبدیل  
کرتے ہیں۔“

”عادل! آپ سے ایک بات کہوں۔“ وہ کچھ نہ سمجھ سکی۔  
”ہُنہ فرمائیے۔“

”میرے دادا جی سے مل لیجئے۔“

”اچھا...“ کچھ توقف کے بعد اس نے جواب دیا اور بڑھتے اندھیرے کے  
احساس سے واپسی کے لیے قدم اٹھائے۔

”میں بہت خوش ہوں، آپ کتنے اچھے ہو، جانے کیوں تانیہ نے آپ کو  
ریجیکٹ کیا...؟“ وہ بے دھیانی میں کہہ گئی تو وہ جھٹکے سے رُکا۔

”پھر کبھی اس کا ذکر نہیں کرنا۔“ وہ سختی سے بولا۔

”سوری، دراصل آپ اتنے اچھے ہو کہ...“ وہ شرمسار ہو گئی۔

”اس زمانے میں صرف اچھا ہونا کافی نہیں سمجھا جاتا۔“ وہ بولا۔

”یہ تو کوئی میرے دل سے پوچھے۔“ وہ چپکی۔

”کیا...؟“

”یہی کہ آپ کیا ہو؟ گفتگو اچھی لگی، ذوق نظر اچھا لگا، مدتوں بعد، سچ مدتوں بعد کوئی ہم سفر اچھا لگا۔ آپ کے آنے سے تو مجھے اپنا آپ اچھا لگا ہے۔“ وہ بولتی چلی گئی، پہلی بار عادل کے لبوں پر مسکراہٹ اس کے لیے آئی۔

”لگتا نہیں کہ باہر کی دنیا میں پلی بڑھی ہو، اتنی اچھی زبان، لب و لہجہ۔“ وہ بولا، تو وہ کھل کھلا کے ہنسنے لگی۔

”مجھے وہاں رہتے ہوئے بھی پاکستان میں رہنے کی تعلیم ملی ہے، ورنہ کیا وہاں شادی نہیں ہوتی۔“

”اچھی بات ہے پاکستان میں رہنے والوں کو بھی کاش یہ تعلیم مل جائے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”یہ لباس میں نے آپ کے انتخاب کے بعد پہننے شروع کیے ہیں۔“ وہ کچھ شرما کر بولی تو پہلی بار اس نے سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کا مسکراتا چہرہ دیکھا۔ بلاشبہ وہ خاصی حسین لگ رہی تھی۔ اس نے دل میں اعتراف کیا۔ مگر زبان سے اقرار نہیں کیا۔

، ؟

افراسیاب نے زرتاشیہ کی شادی کی خبر سب سے پہلے انجم اور نرگھس کو سنائی۔ وہ دونوں ٹی وی لائونج میں موجود تھیں۔ نرگھس کے ہاتھ میں ٹی وی کا ریموٹ تھا جو اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ افراسیاب کو اس وقت کی کیفیت کا اندازہ تھا۔ کیونکہ اسے خود اس خبر کی اتنی جلدی توقع نہیں تھی، مگر آفس میں گلریز احمد کے پاس فون آیا تھا۔ سو اس نے بھی سُن لیا۔

”مبارک ہو نرگھس...“ انجم نے سادگی اور خوشی کا مظاہرہ کیا۔ مگر نرگھس طیش میں آگئی۔

”زبیر احمد کو مبارک باد دیں، اپنے آپ کو مبارک باد دیں کیونکہ آپ یہی چاہتی تھیں۔“

”نرگھس! خدارا رشتوں کو مقام سے مت گرایا کرو، خوشی کا موقع اس معصوم کی زندگی میں آیا ہے تو ماں بن کر اسے خوشی منانے کا موقع دو۔ ایک چھوٹی سی ضد اور ہٹ دھرمی سے گھر برباد مت کرو۔ اعتبار



کرو وہ اپنوں میں جارہی ہے۔“ انجم نے غصہ کنٹرول کرتے ہوئے کافی سمجھداری سے کام لیا۔

”وہ اپنے نہیں ہیں، زبیر ساری زندگی ماں بہن کے چکروں میں رہے۔“  
 ”ماں بہن کا رشتہ فطری رشتہ ہے، یہ چکر والا رشتہ کیوں سمجھتی ہو؟ کبھی سوچا ہے کہ یہاں کب سے ہو؟ کیا اپنے بڑے بھیا سے بھی ایک چکر والا رشتہ ہے...؟“ انجم نے کچھ سختی سے پوچھا تو وہ آئیں بائیں شائیں کر گئی۔  
 ”پو! آپ ابھی زرتاشیہ کو وش کریں اور واپسی کی خبر سنائیں، یہ موقع ہے واپسی کا۔“ افراسیاب نے اس کا ہاتھ تھام کر پیار سے کہا۔

”یہ میرے لیے اب مشکل ہے، زبیر نے اپنی مرضی ہی کی، زرتاشیہ نے باپ کی پسند قبول کر لی۔ بس اب کچھ نہیں بچا۔ آپ کب نوٹس بھیجو گے؟“  
 وہ ایک دم ہی اشتعال میں آگئی۔

”کل بھیج دیں گے، کیونکہ ابو کو میرے نیو یارک کی سیٹ کرانی ہے، میں جلد جانا چاہتا ہوں۔“ افراسیاب اپنا فیصلہ سنا کر چلا گیا۔ تب انجم نے نرگھس

کے بالکل قریب بیٹھ کر پیار سے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور محتاط انداز میں کہا۔

”اپنے بھتیجے کے اندر احساس محرومی مت جگاؤ، اس نے جس حقیقت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے، اس پر شرمسار نہ کرو۔ مجھے زرتاشیہ بہت پیاری ہے، مگر بچپن میں کیے گئے فیصلے ایسے تبدیل نہیں کر سکتے۔“ نرگھس نے انجم کی باتیں غور سے سُنیں اور اُٹھ کر کمرے کی طرف چلی گئی۔ انجم طویل سانس بھر کے رہ گئیں۔ انہیں بیٹے کے چہرے سے سب کیفیتوں کا اندازہ ہو رہا تھا۔ انہیں ادراک تھا کہ زرتاشیہ، افراسیاب کے لیے کبھی بھی غیر اہم اور ناپسندیدہ نہیں تھی، مگر اسے والدین کی تربیت نے اتنا موڈ رکھا کہ باپ کو اور تو چھوٹی موٹی شکایت رہیں مگر ایسا شکوہ کبھی نہیں کرنا پڑا۔ پچھلے ایک ماہ سے گلریز اس کو نیویارک جاکر بزنس سیٹ کرنے کے لیے سمجھا رہا تھا، مگر اس نے ایک دم جانے کا فیصلہ کر لیا۔ بیٹے کے لیے دل دُکھی سا ہو گیا۔ مگر ضبط نے سنبھال لیا۔

...☆☆☆...

یادوں میں تری ہر بات رہے گی

زندگی تری محبت سے آباد رہے گی

چاہے بھلا دیں زمانے کو ہم

تری پیاری سی صورت ہمیشہ یاد رہے گی

بچپن کی یادوں سے سجا الہم دیکھتے ہوئے بڑی دیر وہ اسے یاد کرتا رہا۔ مگر پھر

دُکھ سے مسکرا دیا... یہ سوچ کر کہ وہ تو تھی ہی پرانی، یہ سب یادیں تو بچپن

کی آباد تھیں، ورنہ دوسری طرف بچپن سے ہی وہ کسی اور کے نام منسوب

ہو گئی تھی پھر وہ یادیں الہم میں صرف اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں

محفوظ رہ گئی تھیں نہ وہ اُن یادوں سے نکلی اور نہ ہی وہ ان یادوں کو حقیقت

کا رنگ دے سکا۔ بس دل سے اس کی خوشی قبول کر لی تھی۔ اب اس کی

خوشی پوری ہونے جا رہی تھی تو وہ سچے دل سے اس کے لیے دعا گو تھا۔ یہ

الگ بات تھی کہ یہاں سے دور جانے کا فیصلہ بھی لمحوں میں کر لیا تھا جس

کے پس منظر میں کیا تھا یہ وہ کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر ماں کی آنکھ

سے کچھ بھی چھپانا مشکل تھا۔ اس لیے وہ ان سے کترا کر کمرے میں بند تھا۔

تبھی نرگھس پو کو اپنے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر اس نے الہم جلدی سے

تکیے کے نیچے دبایا اور احترام سے کھڑا ہو گیا۔

”خیریت...؟“

”افراسیاب! ابھی وہ نوٹس نہیں بھیجا۔“ کپکپاتے شکستہ لہجے میں زرتاشیہ کی یاد

لرزاں تھی، وہ خوش ہو گیا۔

”اوکے! اور پھر...؟“

”میں کوشش کر رہی ہوں خود کو سمجھانے کی۔“ وہ نظریں چڑا کر بولی۔

”سیدھی سی بات ہے آپ سب کچھ بھول کر زرتاشیہ کے لیے چلی جائیں،

کوئی رنج اور ملال درمیان نہ لائیں۔ وہ کس قدر میس کر رہی ہوگی آپ

کو...؟“ اس نے بہت اپنائیت سے کہا تو وہ ہولے سے گردن ہلا کر رہ گئی۔

”پو! دیر نہ کیجئے۔“

”افراسیاب! کاش... میں تمہاری خوشی تمہیں دے سکتی۔“ وہ اس کی کشادہ پیشانی چومتے ہوئے بولی تو اس نے عقیدت سے اس کی بات کا مطلب جانتے ہوئے ہاتھ چوم لیے۔

”پو! محبت اور خوشی میں فرق ہوتا ہے، میرا ایمان محبت ہے اور محبت نہ مانگی جاتی ہے نہ چھینی جاتی ہے۔“

”مجھے یہی تو غصہ ہے زبیر پر۔“ وہ کچھ سوچ کر پھر سے مشتعل ہو گئی۔

”ارے ارے، پھر غصہ، نفرت، زرتاشیہ کی شادی ہو رہی ہے۔ اس کے لیے سرپرائزنگ شاپنگ کریں، وہ خوش ہو جائے گی۔“ اس نے جلدی سے دھیان بانٹا۔

”ہاں! کل مارکیٹ چلیں گے۔“ وہ بہل سی گئی۔

”شکر ہے آپ نے اچھا فیصلہ کیا۔“

”یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے، ورنہ دیکھ لو زبیر احمد کو ایک بار بھی انہوں نے فون تک نہیں کیا۔“

”آپ نے جیسا کہا انہوں نے مان لیا، یہی تو محبت ہے۔“ اس نے چھیڑا۔  
”خاک محبت ہے، اپنے گھر والوں سے محبت کرتے ہیں بس۔“ عادتاً شکوہ زبان پر آگیا۔

”پو! گھر والے بھی گھر کا حصہ ہوتے ہیں، ان سے بھی محبت ہوتی ہے۔“  
”لیکن...؟“

”لیکن کچھ نہیں بس آپ اب کچھ منفی نہ سوچیں۔“

”بس میری زرتاشیہ خوش رہے۔“ ایک دم ہی وہ موم کی مانند پگھلتی چلی گئی۔

”بس اتنا سا غصہ اور اتنی سی ضد تھی کہ بیٹی کی شادی کے ذکر پر ہی ہار مان لی۔“ وہ خفت سے مسکرا دی۔

...☆☆☆...

زرتاشیہ، اماں جان اور شاہدہ بیگم بازار گئی ہوئی تھیں۔ تانیہ اپنے مخصوص انداز میں کمرہ بند تھی۔ فرحان نے سب کے بارے میں ناجی سے پوچھا اور سیدھا، سامعہ سے ملنے کے لیے چلا آیا۔ وہ ایزی چیئر پر آنکھیں موندے بیٹھی تھی، پیروں سے کمر تک کمبل پھیلا تھا، بے ترتیب سے بال اور سُتا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ تڑپ اُٹھا۔ دروازے کی چٹخنی لگا کر اس کے قریب کرسی رکھ کے، سینے پر رکھا سرد ہاتھ تھاما تو اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اسے اپنے اتنے قریب دیکھ کر ایک دم مسکرائی، کتنے دنوں کے بعد وہ آیا تھا۔ کس قدر اس کی دید کو ترسی تھی۔ بے اختیار اس کی ہانپیں پھیلیں اور وہ اُن میں سما گئی، خوشی میں آنکھوں نے موتی برسائے تو وہ اور بے قرار ہو گیا۔

”یہ پیار، یہ جذبات بانٹ کر پچھتاؤ گی، اپنی حالت پر غور کرو۔“

”فرحان! جذبات بانٹ نہیں رہی، اصل حق دار کو دے رہی ہوں۔“ اس نے حوصلے سے جواب دیا۔

”اور زرتاشیہ نے پہرہ لگادیا تو، تو کیسے رہ پائو گی...؟“ وہ خود بے کل ہو کر بولا۔

”جیسے پہلے رہتی تھی، اب تو میرے ساتھ تمہارا وجود ہو گا۔“ اس کا اشارہ ہونے والے بچے کی طرف تھا۔ مگر لہجے میں ویرانی تھی۔

”کیا یہ شادی ڈکلیئر نہیں کرنی...“

”فی الحال تو نہیں ہو گی، آگے حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔“

”سامعہ! مجھے اس طرح گناہ گار مت کرو، میں اپنی بیوی اور جائز اولاد کو گنہگار رکھوں یہ نہیں ہو گا۔ میں زرتاشیہ کو سب سے پہلے یہ بات ہی بتا کر عہد لوں گا۔“ وہ بال سنوارتے ہوئے بولا۔

”نہیں، پلیز اتنی جلدی نہیں، اسے خوشیاں مشکل سے ملتی ہیں، کچھ عرصے بعد۔“

”سامعہ! تم کس مٹی سے بنی ہو، اتنی بڑی قربانی وہ بھی میری مرضی کے خلاف۔“ وہ سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

”آپ ایسے نہ سوچیں، میں بہت خوش نصیب ہوں، میری تکمیل ہو گئی ہے۔ اس گھر کا مجھ پر حق ہے۔“ وہ بھی سمٹ کر بیٹھتے ہوئے بولی...

”میں تمہارا مجرم ہوں، اپنے بچے کو کیا منہ دکھائوں گا۔“ وہ یہ کہہ کر جذباتی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب آپ جائیں، کوئی آنہ جائے۔“ اس نے بھیجنے کے لیے بہانہ تلاش کیا۔ تو وہ ایک ٹک اسے دیکھتا رہا اور پھر اس کا ہاتھ چوم کر دروازے سے باہر نکل گیا۔ تکیے پر سر رکھ کے وہ اس کے اور زرتاشیہ کے نئے رشتے اور تعلق کے بارے میں دیر تک سوچتی رہی۔

...☆☆☆...

ڈھیر ساری خریداری کے بعد شام ڈھلے وہ گھر پہنچی تھیں۔

زرتاشیہ اپنے بہت سارے شاپنگ بیگ شوکی کی مدد سے اپنی طرف لے گئی۔ شاہدہ بیگم نے اسے مکمل شاپنگ کرا دی تھی۔ بلکہ جو کچھ اس نے سامعہ کے لیے پسند کیا وہ بھی خرید کر دیا۔ تین خوب صورت ساڑھیاں، چار نئے اسٹائل کے ہلکے پھلکے کا مدار سوٹ اس نے سامعہ کے لیے پسند کیے تھے۔ جوتے بھی اپنی پسند سے لیے۔ اس کے علاوہ اور بھی چھوٹی موٹی بے شمار اشیاء تھیں۔ اس لیے شوکی کی مدد چاہئے تھی۔ گھر میں پہلی شادی ہو رہی تھی، اماں جان نے ناجی اور شوکی کے لیے بھی بہت اچھے کپڑے اور جوتے خریدے، بلکہ ناجی کے لیے کانچ کی چوڑیاں، ہار بندے، انگوٹھیاں بھی خریدیں۔ شاہدہ بیگم نے اماں جان کے لیے، میاں افتخار کے لیے بھی خریداری کی، مگر تانیہ اور فرحان کے لیے کچھ نہیں خریدا۔ تانیہ کو اپنی پسند سے شاپنگ کی عادت تھی اور فرحان نے دوست کے ساتھ پسند سے شادی کے لباس اور جوتے خریدنے تھے۔ وہ تانیہ کو یہی کہنے کے لیے اس کے کمرے میں آ گئیں۔



تانیہ بے ہنگم میوزک کے شور میں آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ کمرے میں سب چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ کمپیوٹر آن تھا۔ انہوں نے جو نہی سائونڈ سسٹم آف کیا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں، اور کچھ بیزار سی صورت بنالی۔

”یہ کیا انداز ہے تانیہ...؟“

”یہی انداز ہے میرا ہمیشہ سے، پہلے آپ نے کبھی نہیں کہا۔“ اس نے تیوری چڑھا کر اُلٹا سوال داغا۔

”چلو آج تو پوچھ لیا۔“

”بہت شکریہ ماما، آپ کو خیال آیا۔“

”تانیہ! مجھے کیوں الزام دے رہی ہو؟ کیا خرم میری پسند تھا...؟“

”نہیں تھا تو بتایا ہوتا، ویسے میری تربیت کیوں نہیں کی...؟“

”بی ہیو تانیہ! میں نے کبھی خرم کو مرضی سے فیور نہیں کیا بلکہ آپ کی وجہ سے تو سب کی مخالفت مول لی ہے، کیا بتائوں کسی کو کتنی رقم کوٹھی کے

لیے ایڈوانس میں دی ہے اور نتیجہ صفر ہے۔ ٹھیک کہتی ہو میں ہی غلط ہوں۔“ وہ بچھ سی گئیں۔

”بس مجھے اتنا معلوم ہے کہ آپ نے وہ وقت نہیں دیا جو ہمیں ملنا چاہئے تھا، وہ سب باتیں، وہ سب اونچ نیچ کے معاملات، کیوں عادل کی فیور آپ نے نہیں کی...؟“

”تانیہ خدا کے واسطے الزام تراشی مت کرو، سمجھانے اور سکھانے والی باتیں کب آپ نے سُنیں، نانو بُری لگتی ہیں، وہ پرانی ہیں۔“

”اوکے! لیو اٹ... میری انسلٹ ہو چکی ہے، اب مجھے تنہا چھوڑ دیں۔“

”تانیہ! یہ مسئلے کا حل نہیں، بھائی کی شادی ہے، تیاری میں حصہ لو اور اپنے لیے شاپنگ کرو، اپنی پسند سے۔“ انہوں نے کچھ تحمل کا مظاہرہ کیا۔

”مجھے نہیں کرنی، آپ کو بیٹے کی شادی کی پڑی ہے۔“ وہ تلملائی۔

”تو میں کیا کروں؟ بولو کیا نہیں کیا میں نے اور کچھ کرنا ہے تو بتاؤ۔ میں تو یہ سوچ کر پشیمان ہوں کہ شادی میں بھائی میاں اور رفیعہ بھابی کو کس منہ سے بلاؤں گی...؟“ وہ خاصی شرمندگی سے بولیں تو وہ چپ ہو گئی۔ شاہدہ بیگم اس کی آنکھوں کے گرد پھیلے سیاہ حلقوں کو دیکھ کر دُکھی ہو گئیں۔ مگر پھر بنا کچھ کہے واپس آ گئیں۔

...☆☆☆...

خواجہ امتیاز علی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو چند لمحے متعجب سے وہیں کھڑے رہ گئے۔ وہ خاموش نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ نہ اس کی نگاہیں خوب صورت آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم کو دیکھنے میں مصروف تھیں نہ ہی کوئی شوق اور اشتیاق اسے مضطرب کیے ہوئے تھا۔ خوب صورت وجیہہ نوجوان ان کے سامنے تھا۔ وہ مسکرا کر قریب آئے تو وہ احتراماً کھڑا ہو گیا۔

”السلام علیکم...“

”وعلیکم السلام! جیتے رہو، بیٹھو۔“

”میری امی کی خواہش تھی کہ میں آپ سے ملوں۔“

”اچھا! بہت خوب ماں کے فرماں بردار بیٹے ہو۔“ خواجہ امتیاز علی کو خوشی ہوئی۔

”فرمائیے...“ وہ بولا۔

”عادل بیٹا! مجھے حیرت ہے کہ میاں افتخار نے...؟“

”پلیز! آپ کوئی حوالہ نہیں دیں گے، ماضی گزر گیا۔ اب میں آپ کے پاس آہی گیا ہوں تو کچھ پوچھنے کی گنجائش نہیں...“ وہ صاف گوئی سے انہیں مزید خوش کر گیا۔

”بیٹا! مجھے بہت خوشی ہے لیکن میرا مطلب وہ ہر گز نہیں، دراصل تانیہ میری کرن جیسی ہے کوئی زیادتی یا غلط فہمی نہ ہو جائے۔“ وہ سنبھل سنبھل کر بولے۔

”اس نے کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی، اس نے مجھے اپنے سوا سب کے لیے آزاد کر دیا تھا۔“ وہ خاصا تلخ ہو گیا تو خواجہ امتیاز علی گڑ بڑا گئے۔

”اچھا، چھوڑو، چھوڑو بس ٹھیک ہے، ہماری کرن نے آپ کو پسند کیا ہمیں بہت اچھے لگے ہو۔“ وہ بولے۔

”بس جیسا ہوں ویسا ہوں۔“

”گڈ...“

”اب اجازت...“

”بیٹا... چائے آرہی ہے، اتنی جلدی کیا ہے؟“ ان کے کہنے پر وہ چپ ہو گیا۔

کچھ ہی دیر بعد کرن اور ملازم ایک ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے،

چائے مکمل لوازمات کے ساتھ لیے... اس

نے کرن کے سلام کا جواب دیا اور نظریں جھکا لیں۔

پھر وہ چائے کے ساتھ ساتھ خواجہ امتیاز علی کے سوالوں کے دھیرے دھیرے جواب دیتا رہا۔ آخر میں جو نہی اس نے اجازت طلب کی تو وہ بولے۔

”عادل! ہمیں آپ پسند ہو، اپنی امی اور ابا کو بھیجو۔“

”جی، جی بہتر...“ وہ مختصراً جواب دے کر باہر نکل آیا، موٹر سائیکل کے قریب پہنچا تو کرن کی آواز آئی۔

”مبارک ہو...“

”جی...“ غیر متوقع بات پر اس کے منہ سے نکل۔

”آپ دادا جی کو پسند آگئے۔“ وہ اٹھلائی۔

”کوئی اہم بات نہیں...“ اس نے سرسری انداز اختیار کیا۔

”اچھا اگر وہ انکار کر دیتے تو...“

”تو میں اقرار کے لیے مجبور نہ کرتا، آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔“ اس نے

خاص لب و لہجے میں جتلیا اس کا اشارہ تانیہ کے لیے تھا۔

”جانتی ہوں...“

”خدا حافظ۔“ اس کا جواب سُنے بنا ہی موٹر سائیکل گیٹ سے باہر نکال لے گیا۔

...☆☆☆...

فہرست کے مطابق سب کو شادی کارڈ پہنچا دیئے گئے تھے۔ میاں افتخار نے بچھے بچھے دل اور افسردہ چہرے کے ساتھ یہ بتا کر کمرے کا رخ کیا۔ ان کی اداسی اور جامد سی خاموشی شاہدہ بیگم اور اماں جان نے واضح طور پر محسوس کی۔

”میاں افتخار کو پہلے کبھی ایسے نہیں دیکھا۔“ اماں جان نے کہا۔

”وہ، دراصل بھائی میاں کی وجہ سے پریشان ہیں۔“ وہ ٹال گئیں۔

”الہی خیر، کیا ہوا میاں ستار کو۔ شادی کارڈ پہنچا دیا۔“ وہ متفکر سی ہو کر بولیں۔

”نہیں، یہی تو فکر ہے۔“ وہ بے بسی سے دیکھنے لگیں۔

”عادل جیسا ہیرا گنوا یا، رشتے بگاڑے... کیا ملا؟“ انہوں نے تاسف سے کہا۔

”اماں جان! رشتے بگاڑنے کی پہلی اینٹ آپ نے رکھی تھی۔ یوں مجھے اپنے ساتھ رکھا؟ مجرم میں بن گئی۔“ پہلی بار شاہدہ بیگم نے ایسی بات کہہ دی کہ اماں جان لاجواب ہو گئیں اور ان کا منہ تکتے لگیں۔

”جو شکوہ تانیہ مجھ سے کر رہی ہے وہ میرا آپ سے ہے، آپ نے کیوں افتخار کو گھر داماد رکھنے کی شرط رکھی تھی...؟ وہ سب رشتے سرد پڑ گئے۔“ وہ مجرموں کی طرح اعتراف گناہ کر رہی تھیں۔

”مگر ہم نے تانیہ کی ایسی تربیت نہیں کی تھی۔“ وہ اتنا بولیں۔

”اماں جان! اثرات وہی ہیں، اب تانیہ کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی، کس طرح کارڈ دینے جاؤں؟“

”جیسے انکار کرنے گئی تھیں۔ عادل سے بات کرو، اس سے معافی مانگو شاید وہ راضی ہو جائے۔“

”نہیں اماں جان، اس کا سامنا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں۔“

”افتخار سے کہو بات کرے۔“

”یہ بھی ممکن نہیں...“

”تو پھر لاڈلی کو کہو کہ جو فصل بوئی ہے اسے خود کاٹو۔“ وہ چڑ گئیں۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کیا کریں...؟“

”ارے ہم چلے چلتے ہیں، منت سماجت کر لیں گے۔“ ماں تھیں فوراً رنجیدہ ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے، میں افتخار سے کہتی ہوں کہ رفیعہ بھابی کو بتائیں ہمیں آنا ہے۔“ وہ خوش ہو گئیں اور اپنے کمرے کی طرف گئیں۔ مگر افتخار سوئے ہوئے تھے، وہ واپس پلٹنے کو تھیں کہ وہ بولے۔

”بیگم صاحبہ! آپ پریشان ہوں اور میں سو جائوں یہ تو مرنے کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔“

”خدا نہ کرے، آپ پلیز رفیعہ بھابی سے بات کریں، میں اور اماں جان جائیں گی۔“

”کارڈ دینے...؟“

”ہاں...“

”میں دے آیا ہوں۔“

”اچھا! بھائی میاں اور بھابی کیسے ہیں؟“

”جس حوالے سے آپ پوچھ رہی ہیں وہ ٹھیک ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولے۔

”آپ کا مطلب ہے عادل نے کچھ نہیں بتایا۔“

”ہاں اس نے ہماری عزت رکھ لی، مجھے میرے بھائی سے الگ نہیں ہونے

دیا۔ وہ گھر میرا رہنے دیا، سارا الزام اپنے سر لے لیا۔“ وہ بولے۔

”کیا مطلب...؟“ وہ چونکیں۔



”کہ وہ تانیہ کو پسند نہیں کرتا، کرن کو پسند کرتا ہے، کرن سے اس کی شادی طے ہو چکی ہے۔ بھائی میاں شرمندگی سے بتا رہے تھے اور میں عادل کی عظمت کو سلام پیش کر رہا تھا۔“ وہ آنکھوں میں آنے والی نمی کو چھپاتے ہوئے بولے۔

”کیا، کرن، کون کرن...؟“ وہ بوکھلا گئیں۔

”خواجہ امتیاز کی پوتی کرن...“ وہ یہ بتا کر کروٹ لے کر لیٹ گئے اور شاہدہ بیگم کا صدمے سے بُرا حال ہو گیا۔ وہ بے چارگی اور بے بسی سے رونے لگیں، مگر میاں افتخار نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

کرن کا نام سنتے ہی وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ کرن کا نمبر ملایا تو پھٹ پڑی۔

”تو اس قلاش نے تمہارے گرین کارڈ پر ہاتھ صاف کر ہی لیا۔“

”ارے نہیں ڈیر وہ ایسا نہیں ہے۔“ کرن اس کا مطلب سمجھے بغیر ہی بولی۔

”جانتی ہوں میں، عادل ستار کو اچھی طرح۔“ اس نے دانت کچکچائے۔

”تانیہ! عادل بہت نائس ہے، اسے تو میں نے دعائوں سے حاصل کیا ہے؟“  
کرن کے لہجے سے عادل کے لیے رس ٹپک رہا تھا۔  
”یہ خیال کیے بنا کہ وہ میرا بھی کچھ لگتا ہے۔“

”کیا مطلب...؟“ کرن چونکی۔

”وہ میرا منگیترا تھا۔“ سخت طنزیہ اظہار تھا۔

”تھا، ہے تو نہیں۔“ کرن نے بھی صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

”اس فیصلے کا حق کس نے دیا؟“ وہ بگڑی۔

”دیکھو تانیہ، بلاوجہ مجھ سے تکرار نہ کرو، بہت ضروری ہے تو عادل سے بات کرو۔“ کرن نے جان چھڑائی۔

”دولت سے عادل کو خرید لیا۔“ وہ تمسخرانہ ہنسی ہنسنے لگی۔ کرن نے ناگواری

سے کہا اور فون بند کر دیا۔ ”عادل کو اتنا ہی جانتی ہو بس۔“

”ہنسہ! عادل سے بھی میں پوچھ سکتی ہوں۔“ غصے سے فون بیڈ پر پھینکا اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ پھر کچھ سوچ کر کمرے سے باہر نکلی اور شوکی کو آوازیں دینے لگی۔

”شوکی! شوکی...“ وہ سب کام کاج چھوڑ چھاڑ کے بھاگا آیا۔  
 ”جی...“

”رکشہ لے کر آؤ جلدی...“

”ہیں! مغرب کا وقت ہے کہاں جانا ہے؟“ اماں جان نے پوچھا۔

”عادل ستار کا دماغ ٹھیک کرنے جانا ہے۔“ اس نے چلا کر جواب دیا۔

”ارے پاگل ہو گئی ہو اب کیا دماغ ٹھیک کرو گی۔“ انہوں نے کہا۔

”نانو! پلیز آپ انٹر فیئر مت کریں، وہ سمجھتا کیا ہے، آپ سے کسی نے پوچھا۔“

”ارے واہ تانیہ بیٹی، چٹ بھی میری پٹ بھی میری، اسے دھتکارا بھی خود اور اب حق جتانے چلی ہو۔“ اماں جان کو ہنسی آگئی، رکشے کی آواز پر وہ تلملاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ناجی کو بھی ہنسی آگئی۔

”کیوں دانت نکل رہے ہیں، سفید چنے چُن کے بھگونے ہیں۔“ اماں جان اسے کہہ کر نماز پڑھنے کے لیے چلی گئیں اور ناجی بُرا سا منہ بنا کر کچن کی طرف چل دی۔

: ... ؟ ... :

حرف رنجش پہ کوئی بات ہو بھی سکتی ہے

یہ بھی ممکن ہے ملاقات ہو بھی سکتی ہے

وہ کائونٹر پر ایک بُکر کو آرڈر لکھوا رہا تھا کہ وہ بالکل اس کے سامنے جا کر غرائی۔

”عادل! پہلے میری بات سُنو۔“ وہ کسٹمز اور بالکل پاس کھڑے کمپنی کے بُکر کو دیکھتے ہوئے کچھ عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوا۔

”آپ کو شاپنگ کرنی ہے تو کیجئے۔“ وہ یکسر انجان بن کر بولا تو اسے پتہ لگ گئے۔

”تم سمجھتے ہو کہ میں اس گھٹیا اسٹور سے شاپنگ کرنے آئی ہوں۔“

”تو پھر...“ وہ بھی چلا پڑا۔ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایسے میں گوگی نے سچویشن سنبھالی۔

”باس... آپ باہر جاؤ، پلیز...“ گوگی کی بات مان کر وہ باہر نکل آیا، پیچھے ہی تانیہ بھی آگئی۔

”اب کیا چاہتی ہو تانیہ افتخار۔“ وہ غصہ ضبط کر کے بولا۔

”تم اس قدر لالچی ہو، میری سہیلی کے گرین کارڈ پر نظریں جمائیں۔“

”شپ اپ! آپ کو میں نہیں جانتا۔“

”ہاں کیوں جانو گے؟ میرے پاس گرین کارڈ نہیں ہے۔“

”جب جانتا تھا، مانتا تھا، کارڈ تو اس وقت بھی نہیں تھا۔“ وہ مسکرایا۔

”تم نے میری سہیلی کو پھنسایا، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔“ وہ خونخوار ہو کر بولی۔

”کرن، آپ کی سہیلی میرے عشق میں پاگل ہو گئی تھی۔ پاگل ہے۔“ وہ تفخرانہ انداز میں سینہ تان کر بولا۔

”کسی کے حق پر ڈاکہ ڈالنے کو عشق کہتے ہیں۔“

عادل نے گھوم کر اچھی طرح اسے سر سے پیر تک دیکھا اور کمال حیرت کا مظاہرہ کیا۔

”کون سا حق...؟“

”وہ جانتی تھی کہ تم میرے منگیتر ہو۔“ وہ کچھ شرمندگی سے بولی۔

”نہیں وہ جانتی تھی کہ میں تمہارا گھٹیا سا منگیتر تھا۔“

”سو وہاٹ!“

”تانیہ افتخار! بے کار بحث کی نہ اب ضرورت ہے اور نہ گنجائش، آئندہ کبھی مت آنا۔“ وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔

”تو تم کرن کو قبول کر چکے ہو۔“

”ہاں! تم نے اپنی آزادی مانگی تھی مجھے قید تنہائی کا حکم نہیں دیا تھا، جو تم نے کہا وہ میں نے قبول کر لیا۔ کہیں، کوئی کمی اور کسر نہیں چھوڑی۔“

”اس کا مطلب...؟“ وہ صدمے سے بولی۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم نے کسی اور کے قبول کرنے کی پابندی نہیں لگائی تھی۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”یو چیٹر، یو فراڈ...“ وہ ایک دم ہی جنونی انداز میں چلاتی ہوئی بھاگی۔ کچھ فاصلے پر کھڑے رکشے میں بیٹھ کر گھٹنوں میں منہ دے کر رونے لگی۔ عادل نے مدہم روشنی میں بھی اسے اس دگرگوں حالت میں دیکھا اور پھر کڑے ضبط کے ساتھ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر دھیرے دھیرے ٹہلنے لگا۔

واہ تانیہ افتخار! اتنی جلد حد جاناں سے گزری ہو کہ محبتوں کا پتا چل گیا۔ مجھے محبتوں کی نذر کر کے، تمہیں محبتوں کا پتہ چلا۔ جس کی خاطر میرے ارمانوں کو کفن دیا تھا، اس نے کس مقام پہ چھوڑا ہے کہ تمہیں محبت اور حق کا فسانہ یاد آگیا۔ ظلم کر کے بھی تم سمجھتی ہو کہ میں تمہارا ہوں۔ مجھے تمہارے ٹوٹ کے بکھرنے پر شادماں ہونے کا انتظار تھا۔ مگر آج اس وقت مجھ پر ملال کا موسم کیوں چھایا ہے؟ میں نے کہا تھا ناں کہ:

مجھ سے زیادہ اگر کوئی تمہیں چاہے تو

میرے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑا لینا

توڑ دینا پیار کی سب زنجیریں

مٹا لینا اپنے ہاتھوں سے سب لکیریں

مگر شرط یہ ہے کہ

مجھ سے زیادہ کوئی چاہے تو...!!

دل گرفتہ سا وہ کھویا کھویا بڑی دیر اس کی ذات سے باتیں کرتا رہا۔

...☆☆☆...

”عادل بیٹا...“ شاہدہ بیگم نے کپکپاتے لہجے میں فون پر مخاطب کیا۔

”چچی! آج پھر بیٹی کو سپورٹ کرنے کے لیے آپ نے فون کیا ہے، نہ آپ اس وقت درست مقام پر تھیں نہ آج ہیں۔ پلیز کب تک آپ نا سمجھ ماں کا کردار ادا کریں گی؟“ وہ اس قدر سمجھدار تھا کہ بنا کچھ کہے بھی ان کا مطلب بھانپ گیا۔ وہ شرمسار ہو گئیں۔ بیٹی کی حالت دیکھ کر ہول کھا رہی تھیں کہ کہیں غم و غصے میں وہ کوئی نقصان نہ کر بیٹھے اس لیے فون ملایا تھا۔

”چچی! جو ہونا تھا ہو گیا، آپ ذہن میں رکھیے کہ جو ہوا آپ کی تانیہ کی خواہش اور آپ کے حکم کے مطابق ہوا۔ آئندہ اس موضوع پر بات نہیں ہوگی۔“ دوسری طرف سے فون کھٹ سے بند ہو گیا۔ وہ ملامت سے ہاتھ ملتی رہ گئیں۔

”راکھ میں ہاتھ مت ڈالو، اب تو تانیہ کے اشاروں پر مت ناچو۔“ اماں جان کسی کام سے ان کے پاس آئی تھیں۔ اندازے سے بولیں۔

”اب ہوگا کیا...؟“ وہ بے بسی سے پوچھ بیٹھیں۔

”اللہ مالک ہے، کوئی مناسب رشتہ مل جائے گا۔“

”مگر...“ وہ اٹکیں۔

”مگر تانیہ کی سوئی اب عادل پر اٹکی ہے۔“

”ہاں! غصہ ہے کہ اس نے کرن کو پسند کیا ہے؟“

”ارے بھئی! وہ جو چاہے کر لے ہمارے حکم کا غلام ہے کیا؟“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں، خیر آپ بتائیے کیا بات ہے؟“

”وہ صبح سے سامعہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، چل کر دیکھو، بے چاری بچی تنہائی محسوس نہ کرے۔“ وہ بولیں، تو سچ مچ پریشان ہو کر کھڑی ہو گئیں۔

”میں نے تو زرتاشیہ کو بلوایا تھا، ناجی نے آکر کچھ اور کہانی سنا دی۔“



”ہزار بار افتخار کو سمجھایا ہے کہ لڑکی کا معاملہ ہے اپنے باس سے بات کریں مگر ان کے کان پر جُوں نہیں رہتی۔“ وہ باہر نکلتے ہوئے بولیں۔

”بس اللہ خیر خیریت رکھے۔“ اماں جان ان کے ساتھ ہی باہر آئیں۔ شاہدہ بیگم آگے نکل گئیں جب کہ انہوں نے شوکی کو پاندان سے پانچ سو روپے نکال کر دیئے کہ یہ فوراً صدقے میں کسی کو دے آؤ۔ الگنی سے کپڑے اتارتی ناجی کی حس ظرافت پھڑکی۔

”یہ تو خود صدقے کا مستحق ہے۔“

”کیوں تجھے مانگ لیا ہے کیا...؟“ اس نے بھی سوا سیر کا ہتھوڑا کھینچ مارا۔

”ارے تم دونوں کا دماغ چل گیا ہے، تمہارا بندوبست کرتی ہوں۔“ اماں جان کو تائو آگیا۔

”بڑی بیگم صاحبہ، ذرا جلدی کریں، صاحب بڑے وعدے کر کے مجھے

یہاں ملائے تھے۔“ شوکی نے ذو معنی نظروں سے ناجی کو گھورتے ہوئے لجا کر کہا۔

”اچھا! ہم بھی تو سُنیں وہ وعدے۔“

”مجھے کوارٹر میں اکیلے ڈر سا لگتا ہے۔“ وہ معصومیت سے بولا۔

”او بڑے رستم ہو، خوب سوچتے ہو۔ چلو جائو جاکر جلدی سے صدقہ دے کر آؤ۔“ اماں جان بات کی گہرائی تک پہنچ کر کچھ نرمی سے بولیں۔ ناجی شرما کر کمرے میں چلی گئی اور وہ تسبیح اٹھا کر زیر کی طرف چل دیں۔ اس وقت تو انہیں صرف سامعہ کی فکر دامن گیر تھی۔ بظاہر سخت مزاج تھیں، مگر سینے میں ممتا بھرا دل دھڑکتا تھا۔ اتنے عرصے سے سامعہ ساتھ تھی کہ اس سے اُنسیت سی ہو گئی تھی۔ خاص لگاؤ زرتاشیہ کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا کیونکہ زرتاشیہ کی تنہائی اور اُداسی کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔

...☆☆☆...

پرائیوٹ اسپتال کے اے کلاس کمرے میں، وہ پُر سکون سوئی ہوئی تھی یا انجکشن اور ڈرپ کا اثر تھا کہ اس کی خوب صورت بند آنکھوں پر گھنیری

پلکوں کا محاصرہ تھا۔ نرم و ملائم بے بی ٹاول میں لپٹا خوب صورت روئی کے گالے جیسا بیٹا اس کے برابر بے بی کاٹ میں تھا۔ شاہدہ بیگم، میاں افتخار، اماں جان بہت خوش اس پر جھکے تھے۔ میاں افتخار کی خوشی دیدنی تھی۔ لب تھر تھرا رہے تھے، آنکھیں چھلک اٹھیں، تو اماں جان نے ڈانٹا۔

”میاں افتخار! بھی خوشی کے موقع پر آنسو کس لیے؟ آپریشن کامیاب ہوا، سب خیر خیریت رہی۔ ورنہ اس کے شوہر کو کیا منہ دکھاتے؟“

”ہاں... ہاں یہ بچہ بہت اہم ہے، بہت پیارا ہے، اس کا نام میں رکھوں گا۔“ میاں افتخار نے جذباتی ہو کر بچے کو گود میں اٹھاتے ہوئے کہا تو شاہدہ بیگم کو تعجب ہوا۔

”آپ کیوں رکھیں گے؟ سامعہ نے سوچ رکھا ہوگا، یا پھر اپنے باس کو اطلاع دیں بچے کی مبارک باد دیں۔“

”کوئی ضرورت نہیں، ہم خود رکھیں گے نام، میرا مطلب ہے اب یہ ہمارا بچہ ہے۔“ وہ بولتے بولتے سنبھل کر بولے۔

”آپ تو بچے بن گئے ہیں۔ اب چلیں یہاں زرتاشیہ اور ناجی کو بھیج دیتے ہیں۔“ شاہدہ بیگم نے کہا۔

”ہاں! میاں چلو چل کر شکرانے کے نفل بھی پڑھنے ہیں اور یحییٰ بھی تو بنا کر بھیجی ہے۔“ اماں جان نے بھی تائید کی۔

”ٹھیک ہے آپ لوگ چلو... میں ذرا کاونٹر سے ہو کر آتا ہوں۔“ میاں افتخار نے کہا۔ وہ دونوں باہر نکل گئیں تو انہوں نے جلدی سے فرحان کا نمبر ملا کر کہا۔

”یار! جلدی سے آجاؤ، ہم جارہے ہیں اور ہاں محتاط رہنا۔“ وہ ایک بار بے بی کو چوم کر باہر نکلے، مگر سامنے سے فرحان فرط اشتیاق سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

”بہت مبارک ہو، اللہ نے صاحب اولاد کیا۔“ انہوں نے اسے گلے سے لگا کر سرگوشی کی۔

”تھینک یو بابا! سامعہ تو ٹھیک ہے۔“

”ہاں! بالکل ٹھیک، جاکر مل لو، بیٹا بالکل تمہارے جیسا ہے۔“ وہ بولے۔

”بابا! اب تو مجھ پر رحم کر دیں، اب میں کیسے سب برداشت کر سکتا ہوں؟“  
وہ بولا تو وہ خاموش ہو گئے۔

”بولیں نا، بابا...!“

”یار! فی الحال خوشی کا موقع نہ گنواؤ، اللہ بہتری کرے گا۔“ وہ اس کا کندھا دبا کر آگے بڑھ گئے تب وہ کمرے میں داخل ہوا۔ دل کی دھڑکنیں بے قرار تھیں۔ آنکھیں خوشی سے نم تھیں۔ اس کی سامعہ نے اسے مکمل کر دیا تھا۔ اس لمحے وہ آنکھیں بند ضرور تھیں مگر وہ جانتا تھا کہ ان میں بھی خوشی کے جگنو چھپے ہوں گے۔ اس قدر پیارا تحفہ دے کر اسے ڈھیروں خوشیاں دی تھیں۔ وہ پہلے بے بی کاٹ پر جھکا۔ اس کا بیٹا بھی سویا ہوا تھا۔ اس نے اٹھا کر اپنے گالوں سے اس کا چہرہ لگایا تو وہ کسمسایا۔ کافی دیر وہ اسے سینے سے لگائے چومتا رہا۔ مزید ڈھیر سارا وقت وہ اسی کیفیت میں گزار دیتا کہ سسٹر نے مسکرا کر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”آپ کو بیٹا مبارک ہو اور بیوی کی زندگی مبارک ہو۔“ وہ چونکا۔

”سسٹر! سامعہ ٹھیک ہے نا...“

”جی، بالکل، مگر ابھی آپ انہیں ڈسٹرب نہیں کریں گے، انیتھزیا کے اثرات ختم ہونے کے بعد۔“ سسٹر چارٹ پر درج دوائیاں اور انجکشن دیکھتے ہوئے بولی۔

”اوکے...!“ اس نے کہا اور بچے کو کاٹ میں لٹا دیا۔

”یعنی یہاں جانوں...“ کچھ توقف کے بعد پوچھا۔

”جی، بے فکر ہو کر جائیں، ہم ہیں ناں ان کے پاس۔“ سسٹر بہت خوش اخلاق تھی۔ وہ مطمئن ہو کر سامعہ پر نظر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا۔

...☆☆☆...

یہ زندگی ترے ساتھ ہو

یہ آرزو دن رات ہو

میں ترے سنگ سنگ چلوں

تو ہر سفر میں مرے ساتھ ہو

بس یہ زندگی ترے ساتھ ہو

”ہاں سامعہ اور کچھ نہیں چاہئے، پلیز مجھے اپنا ساتھ بخش دو۔“ شدت جذبات سے مغلوب ہو کر وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ سامعہ کے خشک ہونٹ ہلکے سے پھیلے، اس کی سو جھی سو جھی نیم وا آنکھیں

مسکرائیں مگر بہت مختصر سے وقت کے لیے۔

”سامعہ! ہمارا بیٹا بہت پیارا ہے، اب ہمیں اس کے ساتھ رہنا ہے، سمیٹ لو سب فاصلے، واپس لے لو وہ سب جملے، سب الفاظ جو ہمیں بانٹ رہے تھے... سامعہ بولو...“

”اب تو اور بھی اچھا ہے میرے لیے، میرے پاس ہمارا بیٹا رہے گا۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”نہیں یہ اب نہیں ہوگا۔“ وہ منکر ہو گیا۔

”فرحان! قول سے مت پھرو۔“ وہ بگڑ کر بولی۔

”سامعہ! ظالم مت بنو۔“

”کیا ہو گیا آپ کو معلوم ہے کس موقع پر کیا کہہ رہے ہیں۔“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، میں اپنے بیٹے سے دور نہیں رہ سکتا۔“ وہ جذباتی ہو گیا۔

”پلیز! فرحان جائو یہ بہت مشکل وقت ہے۔“ اس نے گردن موڑ کر آنکھوں سے پانی گزرنے کا راستہ بنایا۔

”میری طرف دیکھو! میں تمہیں اور اپنے بیٹے کو کہیں لے جا کر رکھ سکتا ہوں۔ وہ گردن گھما کر یقین دہانی کرانے کے لیے بولا۔

”اور گھر میں اس وجہ سے کیا قیامت آئے گی یہ سوچا آپ نے۔“ وہ بولی۔  
”کیوں نہیں سمجھتیں...؟“

”آپ جائو، اس سے پہلے کہ کمزور لمحے مجھے بے بس کر دیں جائو۔“ وہ منت آمیز لہجے میں بولی۔

”جان ہو، جان بن کر سوچو، مرے پیار پر بھروسہ کرو۔“ وہ اس پر جھکتے ہوئے بولا۔

”فرحان! خدا کے واسطے جائو کہ جان جاتی ہے، مجھے اپنے احساس کے ساتھ رہنے دو، آپ کا نام میرے نام سے جڑا رہے میرے لیے یہی کافی ہے۔“ وہ دل گرفتہ سی ہو کر بولی۔ تب اسے غصہ آگیا۔

”مری چاہت کو اتنی بڑی سزا بنا رہی ہو، مرنے سے پہلے موت کا فیصلہ ہے یہ، میری ہر خوشی تم سے وابستہ ہے اور تم یہ اوروں پر لٹا کر خوش رہنا چاہتی ہو۔ سامعہ! میں تمہارے ہاتھوں کی لکیروں میں شامل ہوں، کیوں مجھے جدا کرنا چاہتی ہو۔“

”فرحان! پلیز آپ اپنے عہد کا پاس کریں، بیٹے کی آمد نے آپ کو کیا بنا دیا ہے؟“

”یہ ہمارا پیار ہے، یہ میری زندگی ہے میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے یہ یوں بے قرار کر دے گا۔“ وہ دیوانہ وار بیٹے کو اٹھا کر چومنے لگا۔ اس کی شدید محبت پر معصوم سا بچہ رونے لگا۔ عین اسی وقت سسٹر اندر آگئی۔ اس سے بچہ لے کر کٹ میں لٹاتے ہوئے بولی۔

”سسٹر فرحان! اب آپ باہر جائیں بچہ کو فیڈ کرانا ہے۔“ وہ بادل نخواستہ سامعہ کو دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ سامعہ نے ہاتھ سے بھیگی آنکھیں رگڑ کر صاف کیں اور خود سے بڑبڑانے لگی۔

”فرحان! کاش... تم جان سکتے، کاش! میں بتا سکتی کہ تمہیں دل و نظر سے کچھ دیر بھی جدا نہیں رکھنا چاہتی، میری خواہش نہیں کہ تمہیں خفا رکھوں، کبھی جو میرا اختیار ہو جائے تو میں اپنا نام محبت اور تمہارا وقار رکھتی۔ مگر میری جان مجھ سے خفا نہ ہوں۔ میں اپنے خواب کی تکمیل میں زرتاشیہ کی آنکھوں کے جگنو نہیں چرا سکتی اور اب تو بہت دیر ہو گئی۔ سب کی محبتوں کا قرض سود در سود چڑھ چکا ہے مجھ پر۔“



وہ گھر آئی تو بڑے والہانہ انداز میں اس کا اور بچے کا استقبال ہوا۔ اماں جان نے پیسے وار کے غُرباء میں بانٹنے کے لیے شوکی کو پکڑائے۔ شاہدہ بیگم نے جلدی سے ان کے پیار کرنے سے پہلے بچے کو لپک کے چومنا شروع کر دیا۔ سامعہ مسکراتی ہوئی اماں جان کے تخت پر بیٹھ گئی۔ ناجی اس کا مختصر سا سامان جو اسپتال سے آیا تھا وہ لے کر زبیر احمد کی طرف چلی گئی۔ اس کو زرتاشیہ نے روکا اور کہا۔

”رُکو... میں پہلے اپنے نئے مہمان کے لیے کمرہ سجاؤں گی پھر آند۔“ یہ سُن کر سب مسکرا دیئے۔

”پہلے نئے مہمان کا نام سنتی جاؤ۔“ میاں افتخار چہکے تو وہ رُک گئی۔

”یہ ہے ہمارا احتشام میاں۔“ میاں افتخار نے نعرہ لگایا تو سب چونکے خاص کر شاہدہ بیگم نے حیرت سے دیکھا۔

”میاں، سامعہ کی مرضی سے بچے کا نام رکھو، باپ نہیں ہے تو ماں تو ہے۔“ اماں جان نے کہا۔

”اللہ باپ کو سلامت رکھے وہ بھی ہے، ہاں سامعہ بیٹی کو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔“ میاں افتخار پر تو گویا دیوانگی طاری تھی وہ اپنی خوشی کو بیان کرنے میں اب بھی کچھ کمی محسوس کر رہے تھے۔

”انکل نام رکھیں اس سے بڑی خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے۔“ سامعہ نے جلدی سے ان کی بھرپور تائید کی۔

”مبارک ہو جیتی رہئے۔“ اماں جان نے اپنے ہاتھ سے سونے کی چوڑی اُتار کے اس کو پہناتے ہوئے کہا... سامعہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔ تانیہ اسی وقت کمرے سے باہر آئی تھی۔ اس نے بھی سامعہ کو مبارک باد دی۔ تو شاہدہ بیگم کو فوراً فرحان کا خیال آگیا۔

”فرحان نظر نہیں آ رہا۔“ انہوں نے پوچھا۔

”وہ اسے میں نے حلوائی ہدایت اللہ کے پاس بھیجا ہے، شاندار پیڑے بنوائے ہیں، پورے محلے میں اماں جان بانٹیے۔“ میاں افتخار نے بچے کی پیشانی چوم کر اسے سامعہ کی گود میں دے دیا۔

”میں آپ سب کی شکر گزار ہوں۔“ سامعہ رو دی۔

”ارے نہیں بیٹا شکریہ کس بات کا...؟“ شاہدہ بیگم نے حسب عادت بہت مہر و محبت کا مظاہرہ کیا۔ انہیں اپنی وضع داری اور مروت کا احساس ہمیشہ رہتا تھا، صرف تانیہ اور فرحان کی وجہ سے ڈسٹرب ہو جاتی تھیں۔ جب کہ سامعہ کے اندر اس وقت ساون کی جھڑی گر رہی تھی۔ اس کا بیٹا اپنوں کے درمیان اجنبی تھا، وہ اسے دور کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ جو نہی سب دائیں بائیں ہوئے تو میاں افتخار نے اس کی کیفیت بھانپ کر پوچھا۔

”جو کرنا چاہتی ہو، کر پائوگی، احتشام کے بعد بھی۔“

”بابا! مت کریں یہ سوال، میں نے مشکل سے فرحان کو ٹالا ہے۔“

”بند باندھنے سے سیلاب کے ریلوں کا رخ نہیں بدلتا۔ کیا ہوگا آگے؟“ وہ بولے۔

”کچھ معلوم نہیں، مجھے یہاں سے جانا ہوگا، پہلے تو اور بات تھی اب یہاں رہنا مشکل ہوگا۔“ وہ نظریں جھکا کر آہستہ سے بولی۔

”ہر گز نہیں، میں احتشام کو یہاں سے لے جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“ وہ اس سے پہلی بار کچھ سختی سے بولے، تو وہ انہیں تکتے لگی۔

”بابا! پھر میں کیسے جی پائوں گی...؟“

”میں اور فرحان کیسے جی پائیں گے...؟“

”وقت بدلے گا، زرتاشیہ خوشیاں لائے گی۔“

”مگر میرا احتشام کہیں نہیں جائے گا۔ اب شاید وقت آگیا ہے کہ مجھے یہ گھر چھوڑنا ہے۔“

”نہیں پلیز... بابا! میری خاطر۔“ اس نے منت آمیز اشک بار آنکھوں سے دیکھا تو وہ دُکھی ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ وہ ننھے احتشام کے کسمانے پر اسے لیے اپنے اقامتی حصے کی طرف چل دی... جہاں زرتاشیہ نے اس کے والہانہ استقبال کی تیاریاں کی تھیں... سب کی خوشی دیدنی تھی کیا ہوا جو اس کا دل اداس تھا۔ گھر میں تو پہلے ہی شادی کے ہنگامے شروع ہو چکے تھے۔ زرتاشیہ کے کمرے سے لے کر اس کے اور زبیر احمد کے کمرے تک سامان پھیلا تھا۔

ایسے موقع پر احتشام کی آمد نے مزید خوشی کا سماں بنادیا تھا۔ زرتاشیہ نے اس کا کمرہ اس قدر محبت اور توجہ سے سجایا تھا کہ اس نے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اسے گلے لگایا۔

”جزاک اللہ...“

”یہ تو پیارے سے گپلو کا حق ہے۔“ زرتاشیہ نے پیار سے احتشام کے گالوں پر پیار کرتے ہوئے محبت بھرا نام دیا تو سامعہ مسکرانے لگی۔

زبیر احمد نے احتشام کے پیدا ہونے کی خوشی میں سب کو باہر لہج کی دعوت دی اور اپنے پورشن میں آئے تو انہیں یاد آیا کہ زرتاشیہ کو زیورات کی شاپنگ کرانی تھی۔ وہ اس کے کمرے میں آگئے، کمرہ تاریکی میں ڈوبا تھا۔ وہ بیڈ پر فون کا ریسیور ہاتھ میں پکڑے رو رہی تھی۔ وہ بے قرار ہو گئے۔

”میری جان... کیا ہوا...؟“

”پپا! پپا... ماما کو بخار ہے، وہ غنودگی میں بول رہی تھیں، وہ مجھے بہت مِس کر رہی ہیں۔“ وہ بتاتے بتاتے رونے لگی۔

”تو ملنے آجائیں...“ وہ سنجیدگی سے بولے۔

”وہ بیمار ہیں...“

”بخار کوئی اتنی بڑی بیماری بھی نہیں، چلو اٹھو ہمیں مارکیٹ جانا ہے۔“ وہ دو ٹوک لہجے میں بولے۔

”پپا! کیا میں ایک بار، صرف ایک بار انہیں مل لوں۔“ اس نے اچانک غیر متوقع سوال کیا، زبیر احمد نے غور سے اسے دیکھا۔

”مجھے مجرم ٹھہرا رہی ہو۔“

”نو... نہیں پپا! میرا یہ مطلب نہیں، ایک بار مل آؤں پھر تو موقع نہیں ملے گا۔“ وہ شرمساری سے بولی۔

”نہ میں نے پہلے روکا تھا نہ اب روکوں گا۔“

”پپا! وہ بدل گئی ہیں۔“ اس نے صفائی پیش کی۔

”یہ ایک دم آپ کو کیا ہو گیا ہے۔“ انہوں نے پُر تشویش لہجے میں پوچھا۔

”بس وہ رو رہی تھیں تو میں رونے لگی۔“ اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

”اب تو دن ہی نہیں ہیں اماں جان خفا ہوں گی، بہت سے کام پڑے ہیں۔“  
وہ بولے۔

”میں صرف ایک یا دو دن کے لیے جانا چاہتی ہوں، پلینز پپا!“  
”زرتاشی جان! سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”وہ میری ماما ہیں۔“ اس کے اس جملے میں دباؤ تھا۔

”ہاں! جانتا ہوں میں، مگر اب اچانک آپ کو معلوم ہوا ہے۔“

”پپا! میں نے ماما سے وعدہ کیا پلینز...“ وہ بولی۔

”اوکے! میں ڈرائیور کا بندوبست کرتا ہوں۔“ وہ ہار گئے۔

”میری جہاز سے سیٹ کرا دیں وقت بچ جائے گا۔“ اس نے مشورہ دیا، تو  
انہیں مشورہ مناسب لگا۔

”ٹھیک ہے آپ تیاری کرلو، میں کراتا ہوں، مگر شاپنگ...؟“ وہ بولے۔

”پپا! پیسے دے دیں ماما کرا دیں گی۔“

”اوکے! ریلیکس...“ وہ مسکرا کر کمرے سے باہر نکل گئے تو وہ آنکھیں مل  
کے جلدی سے اٹھی اور وارڈ روب سے کپڑے نکالنے لگی۔

’...مئی... رُ

زبیر احمد کے منہ سے نکالنے کی دیر تھی کہ اماں جان سخت جلال میں  
آگئیں۔ شاہدہ بیگم نے بھی شدید رد عمل کا مظاہرہ کیا۔

”واہ بھئی! بیوی ساتھ رہتی نہیں مگر شوہر کو سب رسمیں نبھانی یاد  
ہیں۔“

”آپا! یہ بات نہیں ہے دراصل زرتاشیہ کو میں نے خود کہا ہے ایک بار ماں  
سے مل آئے کل کو یہ نہیں کہے گی کہ کسی نے کہا ہی نہیں۔“ زبیر احمد  
نے ساری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔

”ارے کہتے سنتے غیروں کو ہیں، نرگھس ماں ہے اور ماؤں کو بیٹیوں کی شادی میں دعوتیں دے کر نہیں بلاتے۔ بچی کو مایوں بٹھانے کے وقت گھر سے بھیج دینا، کہاں کی شرافت ہے...؟“ اماں جان نے کھری کھری سُناڈالیں۔

”کیا قیامت آگئی اگر ماموں جان زرتاشیہ کو اسلام آباد بھیج رہے ہیں۔“ تانیہ کچھ فاصلے پر بیٹھی میگزین کی ورق گردانی کرتے ہوئے جھنجلا کر بولی۔

”تم تو چپ ہی رہو تانیہ بی، خبردار جو بڑوں کے معاملے میں ٹانگ اڑائی،“ اماں جان نے خاصے درشت لہجے میں تانیہ کو جھڑکا۔

”ہنسنہ! یہ گھر نہیں جیل ہے۔“ تانیہ تڑخ کر بولی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

”جیسا گھر چاہتی ہو وہ زمین پر تو ملے گا نہیں۔“ اماں جان ہاتھ نچا کر بولیں، مگر وہ سُنی ان سُنی کر کے چلی گئی۔

”زبیر! ابھی ڈھیروں کام پڑے ہیں۔ یہ موقع نہیں ہے، نرگھس کو بلاؤ۔“ شاہدہ بیگم نے کہا۔

”مجھے نرگھس کی نہیں اپنی بچی کی خواہش کا احترام ہے۔“ زبیر احمد ڈٹے ہوئے تھے۔

”حد کردی بھی، ہم تو تمہیں بہت سمجھدار سمجھتے تھے۔“ اماں جان جھلا کر بولیں۔

”جانے دیں اماں جان! زبیر خود ذمہ دار ہیں، نرگھس نے کوئی بدمزگی کی تو یہ خود جواب دیں گے۔“ شاہدہ بیگم نے نرمی سے کہا۔

”مگر...“

”صرف دو دن کی بات ہے، جہاز پر بھیج رہا ہوں۔“ زبیر احمد نے ماں کے گٹھنے پکڑ لیے۔

مگر وہ مطمئن نہیں تھیں۔ بُرا سا منہ بنا کر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔

زبیر احمد کو دلی طور پر تو یہ سب اچھا نہیں لگا لیکن کیا کرتے زرتاشیہ کی خوشی بھی تو زندگی سے بڑھ کر عزیز تھی۔ اس سے وعدہ بھی کر چکے تھے۔

نرگھس سے تو اب دلچسپی رہی نہیں تھی۔ جو معمولی سا رشتہ ناتا رہ گیا تھا وہ



بھی زرتاشیہ کی شادی تک رہنا تھا۔ کیونکہ انہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ فرحان سے زرتاشیہ کی شادی نرگھس کو کبھی پسند نہیں آئے گی۔ مگر یہاں بھی زرتاشیہ کی خوشی مقدم تھی۔ فرحان کے نام پر ہی اس کے چہرے پر گلاب کھل اُٹھتے تھے۔

وہ اس کی سیٹ کنفرم کرانے کے لیے باہر نکل گئے۔ شاہدہ بیگم نے کمرے میں آکر یہ بات میاں افتخار کو بتائی تو انہیں ہلکا سا تعجب ہوا، مگر پھر بڑے سرسری انداز میں بولے۔

”اچھا ہے ماں سے مل آئے، حرج ہی کیا ہے...؟“

”نرگھس خود سر اور ضدی ہے اسے فرحان سے رشتہ ہونا پسند نہیں تھا وہ کوئی فتنہ نہ پیدا کر دے۔“ شاہدہ بیگم خوف زدہ سی تھیں۔

”تو رشتہ ختم کر دیتیں، ہمارے فرحان کے لیے کوئی رشتے کی کمی تھی کیا...؟“ وہ ہنس کر بولے۔

”کیوں... اس کو من مانی کی اجازت کون دیتا؟“

”چلو، چھوڑو اب تو زرتاشیہ جا رہی ہے، خون نہ جلاؤ۔“

”کبھی کبھی مجھے آپ کے رویے پر حیرت ہوتی ہے۔“ وہ تمللا سی گئیں۔

”ایک آپ کو ہی نہیں ہوتی، ہمیں بھی ہوتی ہے کہ ہم کیا سے کیا بن گئے؟“ انہوں نے مزید چڑایا۔

”یہ آپ اتنا ڈھیر سارا سامان کیا خرید لائے ہیں؟“ انہوں نے بڑے بڑے شاپنگ بیگز کی طرف اشارہ کیا۔

”یہ، یہ احتشام کے کپڑے، کھلونے ہیں، باس نے دیئے ہیں۔“ وہ ہکلا کر جھوٹ بول گئے۔

”باس کو یہ بھی کہیں کہ اب سامعہ کا کچھ کریں۔“ وہ بولیں۔

”کیوں...؟ کیا ہوا...؟“

”میرا مطلب ہے اسے زندگی بھر یہاں رکھنے کا ارادہ ہے کیا...؟“ انہوں نے

اُلٹا سوال داغا۔

”تو ٹھیک ہی ہے، احتشام کی وجہ سے رونق سی آگئی ہے۔“ احتشام کے تصور سے بھی ان کی آنکھوں میں خوشی رقص کرنے لگی۔

”ہاں، لیکن اب یہ خوشی اللہ ہمارے گھر میں بھی لائے گا۔“ وہ مسکرائیں۔

”کیا مطلب... بیگم اس عمر میں لوگ کیا کہیں گے...؟“ انہوں نے شرارت سے کہا تو وہ جھینپ گئیں۔

”خدا کا نام لیں، میں فرحان اور زرتاشیہ کے بچے کی بات کر رہی ہوں، وہ ہمارا بچہ ہوگا۔“

”یہ بھی ہمارا بچہ ہے، ہمارا مطلب ہے بچے تو اپنے ہی ہوتے ہیں۔“ وہ کہتے کہتے ٹال گئے۔

ض ظ... ژض

سامعہ کو سخت تشویش تھی۔

اسے زرتاشیہ اور زبیر احمد کا فیصلہ پسند نہیں آیا تھا، مگر چپ تھی اس کی ایسی حیثیت نہیں تھی کہ وہ زرتاشیہ کو روک سکتی۔ تاہم جانے سے کچھ دیر پہلے وہ اس کے کمرے میں آکر ننھے احتشام کے کاٹ پر جھکی اس سے کھیل رہی تھی تب سامعہ نے دل کی بات کہہ دی۔

”زرتاشیہ! یہ فیصلہ ٹھیک ہے کیا...؟“

”سب فیصلے ٹھیک ہوتے ہیں، اگر انسان بروقت کریں تو۔“ اس نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”میں آپ کے اسلام آباد کے حوالے سے بات کر رہی ہوں۔“

”سامعہ جی! میں ایک بار اپنی ماں کو اس گھر سے قطع تعلقی سے پہلے ملنا چاہتی ہوں، انہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میری شادی ہو رہی ہے۔“ وہ نم آلود آنکھوں کے ساتھ دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں آنٹی سے بات کرتی ہوں۔“ سامعہ کا دل پانی ہو گیا۔

”نہیں، وہ تو میں کئی بار کرچکی ہوں، بس ایک بار جانا چاہتی ہوں۔“

”مگر...“

”صرف دو دن کی بات ہے۔“

”اوکے! خدا کرے تم آنٹی کے ہمراہ آؤ۔“ اس نے خلوص دل سے دعا کی۔

”(آمین) مگر آپ نے دعا کرنی ہے اور چھوٹو کا بہت خیال رکھنا ہے۔“ وہ

خوش ہو کر پھر سے احتشام کو پیار کرنے لگی۔

”میری سب دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“

”پپا کا بھی خیال رکھنا۔“

”یہ کہنے کی ضرورت ہے کیا...؟“ سامعہ شاکی ہو گئی۔

”ارے میرا مطلب ہے شادی کے بکھیڑوں میں وہ آرام بالکل نہیں کر رہے

۔“

”ٹھیک ہے، اب تیاری پکڑو، انکل آتے ہی ہوں گے۔“ سامعہ نے کہا۔

”اوکے اوکے! یہ بتائیں آپ کے لیے کیا لے کر آؤں؟“

”بس پیاری سی زرتاشیہ کو لے آنا۔ ہم اُداس رہیں گے۔“ سامعہ نے اسے

گلے سے لگا کر کہا۔

”سامعہ جی! وہ کپڑے ٹیلر سے منگوانے ہیں اور ڈائر سے دوپٹے منگوانے ہیں

پلیز۔“ وہ یہ یاد دہانی کراتی ہوئی تیزی سے باہر نکل گئی۔ کیونکہ پپا کی گاڑی

کی آواز آرہی تھی۔ فلائٹ کا ٹائم ہوچکا تھا۔ اس کے جانے سے وہ اُداس سی

ہو کر احتشام کے لیے فیڈر بنانے لگی۔ عین اس لمحے جب وہ احتشام کو کاٹ

سے اٹھا رہی تھی فرحان آگیا۔ وہ آتے ہی احتشام کی طرف جھپٹا اور تقریباً

چھین کر اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

”سامعہ! میں اپنے احتشام کو لے کر دور جا رہا ہوں، فکر نہ کرنا میں اسے

تمہاری کمی کا احساس نہیں ہونے دوں گا۔“ وہ قطعی اجنبی لہجے میں اطلاع

دے رہا تھا، پہلے تو سامعہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، مگر جب سمجھی تو پریشان

ہو گئی۔

”فرحان! آپ ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔“

”کیوں؟ کیوں نہیں سوچ سکتا؟ کیا میں انسان نہیں...؟“ وہ دانت بھیج کر بولا۔

”پلیز! فرحان، ابھی تک آپ نے کمپرومائز نہیں کیا۔“ وہ ہراساں سی بولی۔

”ہاں نہیں کیا، کیونکہ میں کر نہیں سکتا، میں کمزور ہوں۔“ اس نے تسلیم کیا۔

”نہیں، نہیں فرحان آپ میرا کہا ٹال نہیں سکتے۔“

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ چلنا ہے تو مرے ساتھ چلو۔“

”مگر، کیسے...؟“

”چپ چاپ چلو، کوئی نہیں ہے۔“

”مذاق نہ کرو، لوگ کیا کہیں گے...؟“

”تو ٹھیک ہے لوگوں کے لیے مجھے، ہمیں چھوڑ دو۔“ وہ سختی سے کہہ کر

دروازے کی طرف بڑھا، تو وہ تقریباً دیوانوں کی طرح رونے لگی۔

”پلیز، پلیز فرحان یہ ظلم نہ کرو۔“

”تو چلو مرے ساتھ۔“

”نہیں، یہ خود غرضی ہے۔“

”تو پھر صبر کرلو۔“

”آپ احتشام کو بے شک لے لیں مگر فیصلہ بدلنے پر اصرار نہ کریں۔“ وہ

رُودی۔ وہ کچھ دیر متاع عزیز کو اشکبار دیکھتا رہا پھر جھٹکے سے احتشام کو بیڈ پر

لٹا کر باہر نکل گیا۔ اس نے تڑپ کر احتشام کو سینے سے لگالیا۔ وہ معصوم سی

مسکراتی نظروں سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔

ضضض

میاں افتخار ننھے احتشام سے کھیل رہے تھے۔ سامعہ موقع دیکھ کر ان کے پاس

کمرے میں آگئی۔

”بابا! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ چاروں طرف دیکھتے ہوئے سامعہ نے بہت دھیمے سے کہا تو وہ ہنستے مسکراتے احتشام کو بیڈ پر لٹاتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”کہو بیٹا!“

”بابا! فرحان کو ہینڈل کرنا مشکل ہو گیا ہے، زرتاشیہ کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہوگی۔“ وہ ذرا دیر کو رُکی۔

”پھر؟“

”پھر یہ کہ آپ مجھے باس کے پاس چھوڑنے کا کہہ کر چند دن ایاز بھائی کی طرف چھوڑ آئیں۔ پھر میں مسز جیری سے بات کر کے باہر چلی جاؤں گی۔“ وہ بڑے پُر اعتماد لہجے میں بولی، مگر میاں افتخار تو جیسے بھڑک اُٹھے۔

”سامعہ بیٹا! فرحان جوان ہے اس کے دل میں تو شاید کچھ گنجائش ہو مگر میرے بوڑھے کمزور دل میں اتنی طاقت نہیں، مجھ سے مت کھیلو، میں احتشام سے دور ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جو قیامت فرحان کی خاموشی میں

چھپی ہے وہ میں ابھی اسی وقت برپا کر سکتا ہوں، میرا صبر احتشام کے لیے کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔“

”بابا! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ وہ حیران سی ان کا منہ دیکھنے لگی۔

”سامعہ جانو، مت پریشان کرو، جو کچھ فرحان آپ کے کہنے پر کر رہا ہے، وہ بھی شاید اب میں برداشت نہ کر سکوں۔ غور سے دیکھا ہے فرحان کو، ان دنوں وہ کیسے زندہ ہے؟ اسے سب سے بڑی سزا تو

آپ نے دی ہے۔ میرا فرحان میری طرح بزدل نہیں ہے۔“

”بابا! بہادر تو میں بھی نہیں ہوں، پر کیا کروں؟“ وہ رو دی۔

”بس بات اتنی سی ہے کہ ہم سب کو خوش رکھنے کی فکر میں کسی کو بھی خوش نہیں رکھ پاتے۔ آپ نے یہ سمجھ لیا ہے کہ آپ نے یہ گھر سر پر اٹھا رکھا ہے، ایسا نہیں ہوگا تو زرتاشیہ مرجائے گی، زبیر کو سکتہ ہو جائے گا یا شاہدہ بیگم سب کو کھا جائیں گی۔“ وہ بولتے چلے گئے۔



”میں نے ایسا کب کہا؟“

”جاؤ سامعہ بیٹا، میرا دماغ پھٹ جائے گا، جو ہو رہا ہے ہونے دو۔“

”بابا! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔“

”غلط فرحان اور میں بھی نہیں ہوں یا پھر کچھ بھی ہو جائے میاں افتخار اپنے احتشام سے دور نہیں ہو سکتے۔“

انہوں نے صاف صاف جواب دے کر اسے رخصت کر دیا اور خود پھر سے احتشام کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ کھیلتے کھیلتے سو گیا تھا۔ وہ اس کے قریب ہی آنکھیں موند کر بیٹھ گئے۔ تبھی شاہدہ بیگم آ گئیں۔

”کون کہہ سکتا ہے کہ ٹھیک پانچ دن بعد اس گھر میں شادی ہوگی۔“ انہیں فارغ بیٹھا دیکھ کر وہ بولیں۔

”میں پلے کارڈ لے کر چھت پر کھڑا ہو جاتا ہوں۔“ وہ جل کر بولے۔

”یہ کس نے کہا...؟“

”دُہن اپنی اماں کو ملنے پانچ دن پہلے جاسکتی ہیں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔“ وہ بولے۔

”افتخار! آپ نے کچھ پیسوں کا بندوبست کرنا تھا۔“ وہ ان کا مذاق ٹال گئیں۔

”شاہدہ بیگم! بندہ حاضر ہے، نیلامی میں شاید کچھ پیسے مل جائیں۔“

”کیسی بے ٹکی باتیں کرتے ہیں۔“ وہ چڑ گئیں۔

”تو کیا کروں؟ کہاں سے لائوں؟“

”لیکن بہت خرچہ باقی ہے۔“

”ضروریات محدود کر لو، کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بہتر ہے۔“ وہ بولے۔

”سب مسئلے ہی مسئلے ہیں میرے لیے۔“ وہ بڑ بڑائیں۔

”ناچیز کی وجہ سے؟“ انہوں نے شرارتاً پوچھا۔

”بیٹی کی بھی خبر لے لیا کریں۔“

”چلیں ابھی لے لیتے ہیں۔“ وہ ایک دم راضی ہو گئے۔

”اب وہ کرن اور خرم کی دشمن بن گئی ہے۔“

”ہنسہ! اس کو کہتے ہیں کمہار پر بس نہ چلے تو گدھیا کے کان مروڑ لو۔“ وہ ہنس کر بولے۔

”افتخار! ویسے کرن نے بہت چھوٹی حرکت کی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

”لیکن تانیہ سے بھی تو اس نے عادل کے لیے فرمائش نہیں کی۔“ وہ طنزیہ بولے۔

”آپ ہی عادل کو سمجھائیں، تانیہ کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“ وہ اب بیٹی کے غم پر آنسو بہانے لگیں۔

”شاہدہ! بہت دیر ہو چکی ہے، وہاں تو عجلت میں کارڈ بھی نہیں چھپ سکے ہیں۔ تانیہ کو سمجھائو۔“ وہ بہت سنجیدگی کے ساتھ بولے۔

”پھر اسے زہر دے دیں۔“

”کیسی بچکانہ باتیں کرتی ہیں آپ، اس کے اندر کا زہر نکلنے کا وقت آیا تو یہ ہنگامہ برپا کر دیا ہے، سمجھائو۔“

”مجھے خرم سے یہ امید نہیں تھی۔“ وہ خود سے بولی۔

”سب کیڑے دوسروں میں ہی دکھائی دیتے ہیں، ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں مارنے کی تعلیم کس نے دی اسے؟“ وہ پوچھ رہے تھے، وہ نادام سی ہو گئیں۔

...☆☆☆...

مجھ سے ملتا ہے تو ملتا ہے چرا کر آنکھیں

پھر وہ کس کے لیے رکھتا ہے سجا کر آنکھیں

میں اسے دیکھتا رہتا ہوں جہاں تک دیکھوں

ایک وہ ہے کہ جو دیکھے نہ اٹھا کر آنکھیں

اس جگہ آج بھی بیٹھا ہوں اکیلا یارو

جس جگہ چھوڑ گیا تھا وہ ملا کر آنکھیں

مجھ سے نظریں وہ اکثر چُرا لیتا ہے فراز

میں نے کاغذ پہ بھی دیکھی ہیں بنا کر آنکھیں

اُتر پورٹ سے لے کر مین روڈ تک وہ مضطرب، بے چین اور کھوئی کھوئی سی تھی، آنکھیں بند کیے وہ جانے کیوں افراسیاب کو اچھی بھی لگ رہی تھی اور پرانی بھی۔ گاڑی کی رفتار معمول سے بھی کم تھی۔ راستہ خود بخود طویل ہو گیا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اس سے یوں اچانک آنے کی وجہ پوچھے، مگر وہ چپ تھی۔

”یہ آنے کی خوشی کا اظہار ہے یا کسی کی جدائی کا احساس؟“ مجبور ہو کر ایک کینے کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کو کیا لگ رہا ہے؟“ اس نے آنکھیں بند کیے ہی پوچھا۔

”آنکھیں کھول کر دیکھو۔“ ہاتھ کے اشارے سے اس نے دو گلاس جوس کا آرڈر دیا اور سرسری انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

اس نے سرخ جلن زدہ آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر بولی۔ ”بند آنکھوں سے میں تصور کر رہی تھی کہ اچانک مجھے دیکھ کر ماما کتنی خوش ہوں گی؟“

”اچھا! اس لیے آنکھیں سرخ ہیں اور مسکراہٹ غیر معمولی ہے۔“

”آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں؟“

”کچھ نہیں، کیوں کہ محو حیرت ہوں پانچ روز بعد جس کی شادی ہے وہ سجنے سنورنے کی تیاریاں چھوڑ کر یہاں چلی آئی۔“ وہ بہت دھیرے سے کہہ کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں ماما سے ملنے آئی ہوں۔“ وہ مختصر سا جواب دے کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔

”اللہ کرے یہ سچ ہو۔“ لڑکا جوس لایا، وہ گلاس تھامتے ہوئے بولا تو وہ سرد سی آہ بھر کے رہ گئی۔

”کیا یہ سچ ہے زرتاشیہ؟“

”پتا نہیں...“ وہ کہہ بیٹھی تو افراسیاب ٹھٹکا۔

”اس کا مطلب یہ جھوٹ ہے اور اس کے پیچھے کوئی دوسری کہانی ہے۔“

”میں چاہتی ہوں، میری ماما اور پاپا میں صلح ہو جائے، ماما گھر چلیں۔“

”وہ ایسا ہر گز نہیں کریں گی۔“

”میں کچھ ایسا کروں گی جس سے وہ ایسا کریں گی۔“ اس نے بڑی سرعت

سے جواب دیا۔

افراسیاب نے اس کی طرف دیکھا، مگر وہ پھر سے آنکھیں بند کر چکی تھی۔

افراسیاب نے بل دیا، خالی گلاس پکڑائے اور گاڑی اسٹارٹ کی منٹوں کا فاصلہ

لمحوں میں طے کرنے کے لیے رفتار میں اضافہ کرتا چلا گیا۔ وہ بند آنکھوں

کے کنارے بھی بار بار صاف کرتی رہی۔ افراسیاب کو اندازہ تھا کہ اتنے عرصے کے بعد ماں سے ملنے آئی تھی تو دل کی کیفیت ایسی ہی ہو سکتی ہے۔

...☆☆☆...

وہ ماں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کے رو رہی تھی۔ نرگھس دیوانہ وار اسے چوم رہی تھی۔ حقیقی معنوں میں آج پہلی بار اس کے اندر ماں بیدار ہوئی تھی، اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کیسے پیار کرے۔ باقی سب یہ منظر دیکھ کر آبدیدہ تھے۔ افراسیاب کی پلکیں بھی نم آلود سی تھیں مگر وہ خوشی کے باعث تھیں وہ اپنے کمرے کی طرف چلا گیا، انجم نے بھیگی آنکھیں صاف کیں اور اس کے لیے کچھ لانے کی خاطر باورچی خانے کی طرف چلی گئیں۔ جب کہ گلریز صاحب بھی خوش خوش سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

”یہ دیکھو! میں نے بیگ تیار کیا تھا، میں آرہی تھی۔“ نرگھس نے ایک

طرف رکھے بیگ کی جانب اشارہ کیا۔

”مما! اب آپ ہمارے ساتھ رہیں گی، میرے پپا کے ساتھ وہ بہت اکیلے ہیں۔“ وہ روتے روتے بولی تو نرگھس نادم سی ہو گئی۔

”مجھے معاف کر دو، بس بھول ہو گئی۔“

”بس مما اب ہمیں تنہا نہ کرنا۔“ وہ اور شدت سے اس سے لپٹ گئی۔

”زرتاشیہ! کاش! زبیر کبھی تو میری بات مان لیتے، تمہاری شادی سے پہلے تم سے ملنا چاہ رہی تھی۔“ نرگھس نے پیار سے اس کے بال سنوارے۔

”آپ نے سوچا اور میں آگئی۔“ بھیگی آنکھوں سے ان کی جانب دیکھا۔

”لیکن تمہیں تو مایوں کے لیے دادو کو بٹھانا چاہئے تھا۔ انہوں نے آنے کیسے دیا؟“ نرگھس کو حیرت ہوئی۔

”پپا نے اجازت دی اور میں آگئی۔“

”اچھا کیا، واپس بھی جلدی جانا پڑے گا؟“

”مجھے نیند آرہی ہے۔“ وہ آنکھیں موند کر بولی۔ نرگھس نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں اور وہ ان کی نظروں میں سوتی بن گئی، مگر نرگھس کی آنکھوں سے ممتا بھرے آنسو ٹپاٹپ گرنے لگے، زرتاشیہ ان کی حدت اور تڑپ محسوس کرنے کا مزہ لے رہی تھی، اسی وقت افراسیاب اس طرف آنکلا، اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے جو اس نے چار چھ ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ڈسٹ بن میں ڈالے، نرگھس نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”پو! اب ان کاغذات کی جگہ ڈسٹ بن میں ہی تھی، مجھے خوشی ہے کہ میں نے جلد بازی سے کام نہیں لیا، گرد بیٹھ ہی گئی، اب آپ زرتاشیہ کے ساتھ جاکر زندگی وہیں سے شروع کریں جہاں سے چھوڑ کر آئی تھیں۔“

”مگر...“

”پلیز! نو اگر، نو مگر۔“ اس نے دو ٹوک انداز میں کہا۔

”اس کا مطلب میں یہ شادی...“



”قبول و منظور کر لیں، بلکہ جا کر خود سب کریں، زرتاشیہ آپ کو دراصل لینے آئی ہے۔“ اس نے بہت رمان سے جواب دیا۔ نرگھس خاموش ہو گئی۔

”پو! رشتے وہی سچے ہوتے ہیں جو تسلیم کیے جائیں۔“

”کاش! کاش...“ وہ بڑبڑائی۔

”فی الحال تو میں چلا جاؤں گا آپ کچھ نہ سوچیں۔“ وہ بہت آہستہ آہستہ سے بولا... نرگھس نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ انجم آگئیں۔

”نرگھس! آپ کے بھیا یہ چیک دے گئے ہیں، زرتاشیہ کے لیے اچھی سی شاپنگ کرو، جو زرتاشیہ کو پسند ہو۔“ انجم نے چیک نرگھس کو دیتے ہوئے کہا۔ نرگھس پہلی بار بھابی سے لپٹ گئی۔

”کمال ہے دلہن سو رہی ہے، پو! یہ یہاں سونے کے لیے آئی ہے کیا؟“ افراسیاب نے شرارت سے کہا تو اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

”جی ہاں...“ زور دار انداز میں جواب دیا گیا۔

”اُف تو بہ! کتنی لڑاکا ہو، کیا بنے گا بے چارے فرحان کا؟“ افراسیاب ہنس کر کہتا ہوا باہر چلا گیا تب وہ مسکرا دی۔ جانے فرحان کے خیال سے یا اس کی شرارت پر۔

...☆☆☆...

رنگ کا کام مکمل ہوتے ہی صفائی، دھلائی اور چیزوں کو ترتیب سے رکھنے کا مرحلہ آگیا، ناجی کے لیے سب سے ناگوار وقت پرانے بھاری بھاری برتنوں کو مانجھنے اور اسٹور میں رکھنے کا تھا، وہ حیران رہ گئی جب اماں جان نے آکر برتنوں میں سے چھانٹی شروع کر دی۔

”کیا کر رہی ہیں؟“

”یہ برتن زرتاشیہ کے جہیز میں دینے ہیں۔“

”کیا؟ یہ برتن...؟“ ناجی کے منہ سے بے اختیار نکلا تو اماں جان کو تائو آگیا۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”وہ، وہ اسی گھر میں تو آرہی ہیں، پھر...“

”ہاں! لیکن ایک دفعہ تو اسے پتا چل جائے کہ یہ آدھے برتن اس کے ہیں اور آدھے تانیہ کے۔“ وہ کچھ نرمی سے بولیں۔ تانیہ کے نام پر ناجی کو ہنسی آگئی۔

”تانیہ بی بی کی شادی اور یہ برتن...“

”اپنی منحوس زبان بند کر، اللہ وہ دن جلد لائے گا۔“

”کہاں سے لائے گا؟“ عین اسی وقت شاہدہ بیگم نے آکر کہا۔

”بھئی اب بیٹی کے اشاروں پر نہ ناچو بلکہ دائیں بائیں دیکھو، ربانی صاحب کی بیوی رشتہ کراتی ہیں، ان سے کہا ہے میں نے۔“ اماں جان نے محلے دار ربانی صاحب کی بیوی جنت کا ذکر کیا۔

”اماں! اب وہ شادی کے لیے راضی نہیں۔“

”عادل کے سوا یا...؟“ انہوں نے کریدا۔

”لگتا تو ایسا ہی ہے کہ عادل کو ضد بنالیا ہے۔“

”تو سمجھا دو، کچھ نہیں بچا۔“

”بس اب تعلیم کے لیے باہر جانا چاہتی ہے۔“ شاہدہ بیگم نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

”واہ بھئی! ایک نئی کہانی شروع ہوگئی، پھر تم نے گردن جھکادی ہوگی۔“ وہ جھلا کر بولیں۔

”تو کیا کروں...؟“

”جو، جی میں آئے کرو، اب بھی سمجھانے سے قاصر ہو اس کو؟“ وہ ڈسٹر سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی جانے لگیں۔

”آپ نے زرتاشیہ کا مایوں کا جوڑا دیکھ لیا، زبیر کے لان میں اریخمنٹ کرارہے ہیں۔“

”ہاں! ماشاء اللہ بہت خوب صورت جوڑا ہے، کھانے کا کس کو کہا ہے اور یہ زبیر کہاں ہے، بیٹی کی خبر لیں آج رات کو آنا ہے یا کل صبح؟“ اماں جان نے پوچھا۔

”زبیر کیٹرنگ والوں کی طرف گیا ہے اور افتخار میرے ساتھ جارہے ہیں، بہت ساری چھوٹی موٹی چیزیں لینی ہیں۔“

”سامعہ کو بھی لے جاؤ، اسے بھی کچھ لینا ہوگا۔“

”جی بہتر...“

”میں آپ کا کمر سیٹ کر دوں؟“ ناجی نے پوچھا۔

”ہاں! لیکن بھاری سامان شوکی کے ساتھ مل کر رکھوانا۔“ انہوں نے ہدایت کی۔

”وہ ہزار نخرے دکھاتا ہے۔“

”تو اٹھائو اس کے نخرے، اٹھانے تو ہیں۔“ اماں جان نے ڈپٹ کر کہا۔

”واہ، یہیں ماس کی نوکر نہیں ہوں۔“ وہ ہاتھ نچاتی ہوئی چلی گئی۔

”لو بھی چھاج تو چھاج، چھلنی بھی اُچھلنے لگی۔“ اماں جان نے کہا تو شاہدہ بیگم کو ہنسی آگئی۔

”تم وقت سے جاؤ اور آؤ، میں نے محلے میں چار چھ گھروں میں کل کے مایوں کے لیے کہنا ہے۔“ اماں جان اُٹھ کر چادر تخت سے اٹھا کر کندھوں پر پھیلاتی ہوئی باہر کی طرف چلی گئیں۔ شاہدہ بیگم نے اپنے کمرے کا رخ کیا، ابھی میاں افتخار نہیں آئے تھے۔ وہ ان کے انتظار میں ایزی چیئر پر بیٹھ گئیں۔ بہت سے کام کرنے والے تھے، مگر طبیعت ہشاش نہیں تھی، جانے کیسا بجھا بجھا دل تھا۔

...☆☆☆...

خواجہ امتیاز علی مہمانوں کی فہرست بنا رہے تھے کہ فون بجنے لگا۔

”ہیلو ابا...“ بیٹے کی آواز سن کر وہ خوش ہو گئے۔

”ارے ابھی تک پاکستان نہیں پہنچے؟“

”ابا! بس ٹکٹس اوکے ہو گئی ہیں، یہ بتائیں یہاں سے کچھ لانا ہے۔“

”بیٹا! یہاں سب کچھ ملتا ہے، اللہ نے ہمیں سب نعمتیں دے رکھی ہیں، اگر

حکمران یہ سب چھوڑ دیں عوام کے لیے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، آپ کرن سے پوچھ لیں۔“

”بیٹا! سب کچھ بن گیا ہے، پیسے سے جو چاہو گھنٹوں میں خرید لو، لیکن عادل

بیٹا بہت مختلف ہے، اس نے ہر چیز کے لیے انکار کر دیا ہے، شادی بہت

سادگی سے ہوگی۔“ انہوں نے تفصیل بیان کی۔

”لیکن پھر بھی ابا! ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔“

”جی ہاں! ایک ہی پوتی ہے میری، اس کی اپنی بھی عادل سے الگ کوئی

رائے نہیں۔ بچوں کی خوشی اگر عین فطری اور اسلامی ہو تو مان لینی چاہئے۔“

”چلیں جیسے آپ مناسب سمجھیں۔“

”بس جلدی پہنچو۔“ انہوں نے کہا، مگر دوسری طرف سے شاید لائن ڈراپ

ہو گئی۔ کرن بے تاب تھی، ماں باپ سے بات کرنے کے لیے خواجہ امتیاز

علی کو اندازہ ہوا تو چپکار کر بولے۔

”ارے میرا بچہ، اداس نہ ہو، وہ دونوں جلدی آرہے ہیں۔“

”مگر میں نے کچھ کہنا تھا۔“ وہ ٹھنکی۔

اس سے پہلے کہ وہ اسے کچھ سمجھاتے ملازم نے میاں افتخار کی آمد کی اطلاع

دی۔ خواجہ صاحب نے انہیں وہیں بھیجنے کو کہہ دیا۔

”کرن بیٹا! اچھی سی چائے اور کچھ کھانے کے لیے بھجوائو۔“ کرن باورچی

خانے کی طرف چلی گئی۔ میاں افتخار کے ہمراہ شاہدہ بیگم کو دیکھ کر وہ احتراماً

کھڑے ہو گئے، بڑے تپاک سے ملے، مگر وہ دونوں خاصی پھیکی سی مسکراہٹ

لیے ہوئے تھے۔

”اچھے وقت پر آئے ہو، یہ دیکھو مہمانوں کی لسٹ میں سب سے اوپر تمہارا

نام لکھا ہے۔“ خواجہ صاحب نے ہنس کر فہرست دکھائی۔

”خیریت...“ میاں افتخار نے دانستہ پوچھا۔

”بھئی کرن کی شادی ہے، اس ماہ کی پچیس تاریخ کو۔“ خواجہ صاحب نے انتہائی مسرت کے ساتھ اطلاع دی، شاہدہ بیگم اور میاں افتخار نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”مبارک ہو، اتنی جلدی میں۔“ شاہدہ بیگم نے کہا۔

”بس کرن کے ویزے کے مطابق ہی تاریخ رکھی ہے، شادی کے فوراً بعد اسے جانا ہے ہمیشہ کے لیے۔“

”اچھا، اچھا!“ میاں افتخار نے کہا۔

”ویسے میاں ستار صاحب نے آپ کو نہیں بتایا کیا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”بتانے کے لیے رشتوں کا برقرار رہنا ضروری ہوتا ہے، یہاں بچا ہی کچھ نہیں۔“ میاں افتخار حد درجہ اضطراب کے ساتھ بولے۔

”بھائی صاحب، آپ کو کرن کی شادی مبارک ہو، مگر ایک بار آپ یہ جان لیتے کہ عادل سے تانیہ کی نسبت بچپن میں ہی ٹھہرائی گئی تھی۔“ شاہدہ بیگم کے دل میں جو درد اور دکھ حسرتوں کی صورت کروٹیں لے رہا تھا اس نے یہ کہنے پر مجبور کر دیا۔

”بھابی! اس کی ضرورت تو تب پڑتی جب عادل اور تانیہ کا رشتہ کرن کی وجہ سے ٹوٹا، یہ تو بالکل نیا رشتہ ہے۔“ خواجہ صاحب نے خاصے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

”مگر تانیہ...“

”اوہو! چھوڑو کیا قصہ لے بیٹھیں؟ خواجہ صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں، اللہ مبارک کرے۔“ میاں افتخار نے کچھ عجیب سے لہجے میں بیوی کو مخاطب کیا۔

”مجھے خواجہ صاحب سے کوئی شکوہ نہیں، آپ کے بھائی میاں سے ہے جنہوں نے جھوٹے منہ آپ کو پوچھا تک نہیں۔“ شاہدہ بیگم کو غصہ آگیا۔



”کیا پوچھتے وہ؟ کہ ہم نے کیسے عادل کو بے عزت کیا ہے؟ اس قصے کو چھوڑ دو، ہم یہاں کل کی مایوں کی تقریب کے لیے کرن بیٹی کو انوائٹ کرنے آئے ہیں۔“ میاں افتخار نے حسب معمول نرم اور دھیمے لہجے میں ٹالنے کی کوشش کی۔

ملازم چائے کی ٹرالی لے آیا تو خواجہ صاحب نے ان کے موڈ کی بحالی کے لیے خوش دلی سے چائے آفر کی۔

”بھابی! کرن ضرور آئے گی اور یہ مت سمجھیں یہ کرن نے غلط کیا ہے، یہ بھی آپ کی تانیہ جیسی ہے، اگر ذرا بھی ایسا کچھ ہوتا تو میری کرن کبھی ایسا فیصلہ نہیں کرتی۔ تاہم مجھے افسوس ہے ایسا ہوا ہی کیوں تھا؟“ انہوں نے بات ایسے جملے پر آکر ختم کی کہ شاہدہ بیگم پہلو بدل کر رہ گئیں۔

”خواجہ صاحب! آپ کیوں شرمندہ کر رہے ہیں، ہماری تانیہ کو عادل پسند نہیں تھا۔ بس!“ میاں افتخار نے کلیئر کیا اور چائے پینے لگے۔ شاہدہ بیگم کو بھی

مکمل ناکامی کے بعد چائے کا کپ لبوں سے لگانا پڑا۔ درحقیقت وہ اور ہی مقصد سے آئی تھیں مگر یہاں تو بات ہی اور سے اور نکلی۔

...☆☆☆...

”سنا ہے نیند تو درد کے بستر پر بھی آجاتی ہے پھر تم کیوں مضطرب سی رات کو آنکھوں میں بسر کرنے کی کوشش کر رہی ہو؟“ اس کے کمرے کی لائٹ آن دیکھ کر افراسیاب آگیا۔ وہ نم آلود آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی، بولی کچھ نہیں، بے اختیار ہی آنسو ٹوٹنے لگے۔

”بولو، کیا بات ہے؟“ افراسیاب پریشان ہو گیا۔

”کچھ نہیں، بس صبح جانے کا سوچ کر دل بھر آیا۔ کاش ماما بھی ساتھ چلتیں۔“

”پہلے سوچ تو رہی تھیں، مگر تمہارے آنے سے بات وہیں آگئی۔“

”اسی لیے تو نیند نہیں آرہی۔“ اس پر رقت طاری تھی۔

”زرتاشیہ! یہ بارش اندر مت گرنے دو، باہر نکالو یہ نمکین پانی۔“ وہ قدرے جذباتی ہو کر بولا۔

”یہ بارشیں بھی مجھ جیسی ہیں، برس جائیں تو بہار اور اگر ٹھہر جائیں تو قرار ہیں، کبھی بے سبب آجاتی ہیں، کبھی شور برپا کرتی ہیں، کبھی چپ سی ہو کر پتلیوں سے چپک جاتی ہیں۔“ وہ بوند بوند برسی۔ افراسیاب مضطرب سا ہو گیا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“

”پتا نہیں...“

”کچھ تو ہے۔ بتاؤ؟“ وہ مصر ہو گیا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آرہا، کس کو کہنا ہے؟ اور کیا کہنا ہے؟“ وہ بے بسی سے رودی۔ افراسیاب کی بے تاب دھڑکنیں جو اس کے نام سے آباد تھیں، قیامت برپا کرنے لگیں۔ وہ سوچتا سوچتا دور نکل گیا۔

کہہ دینا کبھی جو احساس ہو

آپ کو مرے احساس کا

میرے جنوں کا

میری محبت کا

فقط اتنا کر دینا

مجھے آپ اپنا

کہہ دینا!!!

”افراسیاب! مجھے تم سے کچھ کہنا ہے، صرف تم سے۔“ وہ اس کی سوچ کے کنارے کنارے جانے کیسے اندر تک اتر کر جان گئی کہ وہی کہہ دیا جو وہ سوچ رہا تھا۔

”ہُنہ، ہاں! بولو۔“

”پلیز! پپا کو کہہ دیں کہ مجھے ماما پپا چاہئیں، مجھے فرحان نہیں چاہئے۔“ وہ سسکیاں لیتے ہوئے گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ افراسیاب کے دماغ میں جھگڑ چلنے لگے۔ انتہائی غیر متوقع، نامناسب بچکانہ فیصلہ وہ مشتعل سا ہو گیا۔

”نادان ہو، مگر اس قدر بے وقوف ہو، یہ مجھے اندازہ نہیں تھا۔ یہ غیر منطقی فیصلہ اس موقع پر جب کچھ وقت نہیں بچا۔“

”افراسیاب! مجھے آپ سے ہی یہ امید تھی، اس لیے میں آگئی۔ کیا میری ماما کی خواہش تم پوری نہیں کر سکتے؟“ وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تو وہ مزید اشتعال میں آ گیا۔

”زرتاشیہ! ہوش سے کام لو، پپا ہارٹ پشینٹ ہیں فکر ہے کچھ؟ وہ وہاں شادی کی تیاری میں مصروف ہیں، یہ بے یگی بات اپنے ہی اندر دفن کر لو۔“ وہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کے رودی۔

...☆☆☆...

اس نے تو اس کے حواس چھین لیے تھے... وہ بے کل، بے قرار کمرے کے نیم روشن اُجالے میں ٹھل رہا تھا، کس قدر غیر متوقع، غیر معمولی اور اچانک کہا تھا اس نے، جس کو دل کے تہہ خانے میں تہہ در تہہ اتر کر ملنا پڑتا تھا، وہ ایک دم اڑ کر کسی ننھی منی تتلی کی طرح ہتھیلی پر آ بیٹھے گی، یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

”افراسیاب! یہ پاگل لڑکی فرحان سے محبت نہیں کرتی، فرحان اس قدر بے معنی ہے اس کے لیے۔ ماں باپ کے لیے اتنا جذباتی فیصلہ۔“ اس کا سر درد سے پھٹنے لگا۔ نیند تو کہیں روٹھ کر بھاگ گئی تھی۔ انجم نے کمرے کی کھڑکیوں سے مدہم روشنی دیکھ کر کمرے کا رخ کیا تو بیٹے کو الجھا پایا۔

”افراسیاب، اب تک جاگ رہے ہو؟“

”ہنہ! بس نیند نہیں آرہی۔“

”صبح بہت جلد ہمیں ملتان کے لیے نکلنا ہے، زرتاشیہ کو ائر پورٹ ڈراپ کرنے۔“ انجم نے کچھ دیر پہلے ہونے والے فیصلے سے مطلع کیا۔

”فضول ہے، سب فضول ہے۔“

”کیا مطلب؟ یہ تو بہت بُری بات ہوگی کہ ہم سگے ماموں مامی بھی نہ جائیں۔“ انجم نے کہا۔

”اچھا صبح بات کریں گے۔“ وہ حد درجہ بیزار تھا۔

”تو پھر سو جائو۔“ انجم یہ کہہ کر چلی گئیں تو وہ گویا خود سے باتیں کرنے لگا۔

”ابھی کہاں، ابھی تو رات باقی ہے، یہ ڈھل جائے اور گھڑی بھر کودل ناداں سنبھل جائے تو شاید میں سو سکوں، یہ رات ٹل جائے تو سو جائوں گا مگر اس کا ٹلنا ہی محال ہے۔ وہ بھی جاگتی ہوگی، روتی ہوگی، کروٹیں بدل رہی ہوگی۔

فرحان کو چھوڑنا اتنا آسان تو نہیں ہو سکتا اس کے لیے۔ یہ کیسے مان لوں کہ اسے فرحان سے چٹکی بھر محبت تھیکہ وہ اسے چھوڑ کر آگئی۔ شادی کا لباس

خریدنے اور بنائو سنگھار کے لوازمات جمع کرنے کے بعد؟ نہیں! بات کچھ اور ہوگی، مجھے زبیر انکل سے پوچھنا چاہئے۔“ ایک دم ہی اس کے ذہن میں امید

کا جگنو چمکا، وہ فون کی طرف لپکا۔ زبیر انکل کا نمبر ملا کر وال کلاک کی طرف دیکھا تو بہت وقت ہو گیا تھا، سوچا ڈسٹرب نہ کرے، مگر پھر ڈسٹرب کرنا ضروری سمجھا۔ مسلسل چوتھی بیل پر زبیر انکل کی نیند سے بوجھل آواز آئی۔

”ہیلو...“

”ہیلو انکل! میں افراسیاب۔“

”ہاں ہاں اچھا، جی بیٹا خیریت؟“ وہ تقریباً جھٹکے سے اٹھ بیٹھے۔

”بس خیریت ہے۔ آپ سے کچھ پوچھنا تھا۔“ وہ شرمندہ سا بولا۔

”ہاں! ہاں! بولو، زرتاشیہ تو ٹھیک ہے نا؟“ وہ پریشان سے ہو گئے۔

”جی بالکل خیریت سے تو نہیں کہہ سکتے۔“

”کیا مطلب؟“

”انکل! کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“

”کیسی بات؟“ وہ سخت فکر مند ہو کر بولے۔

”انکل! وہ کہتی ہے کہ اسے ماما چاہئیں، پاپا چاہئیں، فرحان کی وجہ سے یہ جھگڑا ہے اور وہ فرحان سے شادی نہیں کرے گی۔“ اس نے لفظ بہ لفظ دہرا دیا۔

”کیا...؟ دماغ چل گیا ہے زرتاشیہ کا، نرگس نے اس کا برین واش کیا ہوگا، میں اسی لیے اسے بھیجنا نہیں چاہتا تھا۔ آج تک وہ مجھ سے محبت کرتی تھی، اب ماں کی زبان بولنے لگی ہے۔“ وہ سخت مشتعل ہو گئے۔

”انکل! پلیز آپ سنجیدہ نہ ہوں، میں ٹیکل کر لوں گا، بس آپ سے پوچھنا تھا کہ کوئی ایسی بات تو نہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں سب ٹھیک ہوگا۔“ اس نے بھرپور تسلی دی، وہ ہارٹ پشٹ تھے، ان کو مزید دُکھ نہیں دیا جاسکتا تھا۔

”افراسیاب بیٹا! اسے کہو ماں کے نقش قدم پر نہ چلے، وہ جانتی ہے کہ نرگس بے وجہ ضد پر یہاں سے گئی ہیں، فرحان سے انہیں اللہ واسطے کا بیر ہے۔“

”اوکے! بی ریلیکس!“

”شب بخیر۔“ وہ افراسیاب پر بھروسہ کر کے مطمئن ہو گئے تھے۔ فون بند کر کے افراسیاب کافی دیر مسئلے کے حل پر غور کرتا رہا، پھر فوراً اس کے کمرے کے دروازے پر پہنچا، ہلکی سی دستک دی۔

”کون...؟“ بھیگی آواز میں پوچھا۔

”میں ہوں...“

”مجھے نیند آرہی ہے۔“

”یونہی خالی پلکیں جھکا دینے سے نیند نہیں آتی، سوتے وہی لوگ ہیں جن کے لیے کوئی جاگ رہا ہو۔“

بس میں کوشش کر رہی ہوں۔“ بنا دروازے کھولے ہی جواب آیا۔

”زرتاشیہ! تم نے صبح جانا ہے، اپنے پاپا کے لیے، اپنے فرحان کے لیے،

اوکے! اس سے پہلے کچھ ہے نہ بعد میں کچھ۔“ بڑا حاکمانہ انداز تھا۔ بھاری



قدموں کی آواز پیدا ہوئی۔ وہ جا چکا تھا۔ وہ اور زیادہ رونے لگی۔ کوئی اس کی بات سمجھنے والا نہیں تھا یہاں، نہ افراسیاب، نہ ماما اور نہ ماموں، ماما۔

...☆☆☆...

اسے اُر پورٹ چھوڑنے کی ذمہ داری اس کی تھی۔

وہ چاہتا تو نہیں تھا کہ اسے چھوڑنے جائے مگر پو اور امی کے حکم پر راضی ہونا پڑا تھا۔ کیونکہ اس کی نمناک آنکھیں دیکھ کر جس طرح وہ سمجھا کر راضی کر سکا تھا یہ بھی کڑا امتحان تھا۔ اس نے دانستہ نظریں چرا رکھی تھیں۔ ایک دم ہی اس نے غیر متوقع سوال کر دیا۔

”آپ کسی سے محبت کرتے ہیں؟“

”ہُنسہ، ہاں...“

”کیسی محبت کرتے ہیں؟“ وہ ہنس کر بولی۔ اس کی ہنسی کے جلت رنگ میں

فرحان سے جدائی کا دُکھ موجود تھا۔

”جب ہاتھ دعا کو اُٹھتے ہیں

الفاظ کہیں کھو جاتے ہیں

بس دھیان اسی کا رہتا ہے

اور آنسو بہتے رہتے ہیں

ہر خواب اس کا پورا ہو

اس رب کی منت کرتا ہوں

”میں ایسی محبت کرتا ہوں“

یہ کہہ کر وہ خود میں گم سا ہو گیا۔

”محبت نہ ملے تو؟“

”زرتاشیہ! فارگاڈ سیک۔ بی پازیٹو، خوشی خوشی جا کر نئی زندگی شروع کرو۔“ وہ

اتنی دیر میں پہلی بار اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”زندگی کب شروع ہوتی ہے اور کب ختم؟“ وہ بڑ بڑائی۔

”تمہارے ماما پاپا اکٹھے ہو جائیں گے، اس وقت یہ سوچنے کی بجائے کل کا سوچو۔“ اس نے بہت اپنائیت سے سمجھایا۔

اُترپورٹ آچکا تھا۔ گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے، رسٹ وایج پر نگاہ ڈالی، فلائٹ کا وقت ہو چکا تھا۔ وہ تیزی سے اُترا اسے بھی جلدی کا کہا۔ پسینہ لائونج میں جانے سے پہلے وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”آپ اداس ہیں؟“

”نہیں، میں خوش ہوں کہ تم اپنے فرحان کے پاس جا رہی ہو۔“ وہ مسکرایا۔  
”لیکن...“

”کچھ نہیں، جانو...“

وہ چلی گئی۔

اُترپورٹ کی فضا سے باہر نکل کر گاڑی سے پشت لگائے کافی دیر وہ کھویا کھویا سا کھڑا رہا۔ جہاز فضا میں بلند ہوا تو نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھا کر دیکھا، بے

خیالی میں ہاتھ لہرا کر اسے رخصت کیا۔ آج ایسا لگ رہا تھا کہ وہ آکر دور ہو گئی ہے۔ پہلے کبھی اس طرح اسے محسوس کرنے کا موقع جیسے آیا ہی نہیں۔ اب آکر جانا تو کرب کی صورت چاٹ رہا تھا۔ بڑی ہمت کر کے وہ گاڑی میں بیٹھا اور واپسی کے لیے گاڑی کو اسٹارٹ کیا۔ اسی گاڑی پر کچھ دیر بعد ابا، امی نے ملتان کے لیے نکلنا تھا۔

...☆☆☆...

میاں افتخار آج معمول سے زیادہ واک کر کے گیٹ تک ہی آئے تھے کہ زبیر کو باہر منتظر دیکھ کر ٹھٹکے۔ کچھ پوچھنا چاہا مگر ان کے خاموش رہنے کے اشارے پر عمل پیرا ہو کر دبے قدموں ان کے کمرے تک پہنچے۔

”سالے صاحب! خیریت تو ہے، اس قدر پُر اسراریت؟“

”افتخار بھائی! کیا فائدہ اس عبادت کا جو ہمیں حق سچ کے اظہار کی توفیق نہ دے، ہم جان بوجھ کر گناہ کا ارتکاب کرتے رہیں اور تلافی تو بہ سب کے راستے بند کرتے جائیں۔ آپ بھی افتخار بھائی! خاموشی کے باعث چار زندگیاں

تباہ کرنے جارہے ہیں۔“ زبیر احمد نان سٹاپ بولتے چلے گئے پہلے تو میاں افتخار کچھ نہ سمجھے، مگر آخری جملے پر شاک لگا۔

”کیا؟ کیا مطلب؟“

”ابھی بھی وضاحت کی ضرورت ہے؟ بے چاری سامعہ کی مجبوری سے ہم فائدہ اٹھاتے رہے اور فرحان، زرتاشیہ کی شادی کا ڈھونگ کرنے جارہے ہیں۔“

”میں نہیں زبیر، آپ کی والدہ اور آپا کی مرضی اور خواہش یہی تھی۔ میں تو سامعہ سے نظر ملانے کا بھی حق دار نہیں رہا مگر یہ سب۔“ وہ کچھ خوشی اور کچھ حیرت کے ساتھ بولے۔

”میری بیٹی نے میرا سر فخر سے بلند کر دیا ہے، اس نے مجھے ابھی فون پر فقط اتنا کہا ہے کہ پاپا! احتشام کی ولدیت کا خانہ، خالی نہیں ہے۔ اس کی پیدائش کی اسپتال شیٹ میں فرحان کا نام درج ہے،

سے گمنام نہ بنائیں۔ یہ سب جان کر کیسے تین زندگیوں کو وہ برباد کرے۔“ زبیر احمد نے رقت بھری آواز میں کہا۔ میاں افتخار کھل اُٹھے۔

”اس نے سچ کہا ہے، احتشام ہمارا ہے، میرے جگر کا ٹکڑا ہے، جسے سامعہ لے جانا چاہتی ہے۔“

”ہاں! وہ ہم سب کا ہے، بروقت یہ پتا چل گیا، مگر آپ کو یہ سب چھپانا نہیں چاہئے تھا۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو، مگر بات کچھ سے کچھ ہوتی چلی گئی، میری حیثیت ہے ہی کیا؟“ میاں افتخار نے شرمندگی سے تسلیم کیا۔

”نہیں بھائی جان! ایسی بھی کیا بات کہ بچوں کے جائز اور درست فیصلے بھی ہم تسلیم نہ کریں، آپ کو آپا سے بات کرنی چاہئے تھی، یا کم از کم مجھے بتانا چاہئے تھا۔“

”محبت نے مجھ پر ایسا سحر پھونک رکھا ہے کہ میں کیا سے کیا بن گیا؟“

”بہر کیف! شکر ہے اللہ نے میری زرتاشیہ کو سب سمجھا دیا، احتشام کا آنا مبارک ثابت ہوا۔ اس نے آپریشن کے اجازت نامے پر فرحان کے دستخط بھی دیکھے اور بڑے حوصلے سے وقت گزارا۔“ زبیر احمد خود بڑے حوصلے سے کہہ رہے تھے، یہ جان کر بھی کہ زرتاشیہ فرحان کو بے حد پسند کرتی ہے۔ مگر اس پر بھی اس نے اتنا کہا کہ

”پپا! میری محبت سامعہ جی کی محبت کے سامنے کچھ بھی نہیں، وہ فرحان کو پا کر دے رہی تھیں، میں نے تو بنا پائے ہی چھوڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔“ وہ زرتاشیہ کو سوچ کر مسکرا دیئے۔

”پھر اب کیا ہوگا؟“ میاں افتخار نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، وہ سب پہنچ رہے ہیں، زرتاشیہ کو ائر پورٹ سے لینے جا رہا ہوں، شادی بھی ہوگی، خوشیاں بھی ہوں گی، پکوان بھی تیار ہوں گے۔ میں خود سب کی موجودگی میں بات کروں گا، سامعہ ہماری بہو ہے۔ پوری سچ دھج سے اسے قبول کریں گے۔“ زبیر احمد بہت خوشی سے بولے۔

”یار! کاش تمہاری آپا میں بھی تھوڑا سا اثر تمہارے جیسا ہوتا، تو میں اس قدر بے بس تو نہ ہوتا۔“ میاں افتخار کی رگِ ظرافت پھڑکی۔

”آسان تو نہیں ہوگا، آگ کا دریا پار کرنا ہے۔“ زبیر احمد کو ماں اور بہن کے مزاج کا بخوبی اندازہ تھا۔ مگر اس وقت وہ بہت خوش تھے۔

”اپنی آپا کو یا اماں جان کو بتادیا؟“

”نہیں، ابھی تو زرتاشیہ کا فون آیا ہے، اس نے نہ آنے کی وجہ یہی بتائی اور مجھ سے وعدہ لے کر سب کچھ بتایا ہے، سب کو آکر بتائوں گا۔“

”اس کا مطلب میں بھی چپ رہوں؟“ میاں افتخار نے پوچھا۔

”جی ہاں! ویسے بھی بھائی جان! آپا نے آپ کو برسوں پہلے چپ کروا دیا تھا۔“ زبیر احمد نے ہنس کر مذاق کیا تو میاں افتخار کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

زبیر احمد جلدی جلدی جوتے پہننے لگے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ...

بری کے جوڑے، زیور دکھانے کے بعد رفیعہ بیگم نے سوٹ کیس بند کر کے میاں ستار کی طرف دیکھا۔

”سب ٹھیک ہے۔“ وہ بولے۔

”آج کرائے والے گھر میں شفٹ ہونا ہے، کل پرسوں سے مہمان آنا شروع ہو جائیں گے۔“ رفیعہ بیگم نے کہا۔

”بھئی یہ کرائے کے مکان والی پنچ سمجھ میں نہیں آتی۔ ولیمہ کلب میں ہے، تھوڑے سے مہمان یہیں رہتے، ہلا گلا یہاں ہوتا، دُہن یہیں لاتے، مگر...“ میاں ستار نے کچھ ناپسندیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

”ٹھیک ہے ابا! میں منع کر دیتا ہوں، کوئی مسئلہ نہیں۔“ عادل نے باپ کو سعادتمندی کا ثبوت دیا۔ میاں ستار خوش ہو گئے۔

”ارے نہیں بیٹا! میرا شیر جوان اور اس کی ماں غلط فیصلہ نہیں کرتے، یہ تو افتخار کے نصیب بُرے تھے، ہیرا گنوا دیا۔“ وہ سینہ بھلا کر بولے تو رفیعہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

”ایسے نہ کہئے، اللہ تانیہ کا نصیب اچھا کرے، بس یہ قسمت کے فیصلے ہیں۔“

”چھوڑو، افتخار مردود ہے اسی کا کیا دھرا ہے سب، زندگی بھر اس کا منہ نہیں دیکھوں گی۔“ ان کو غصہ آگیا، سانس پھولنے لگی تو عادل جلدی سے پیٹھ سہلانے لگا۔

”امی! کیوں ان کا ذکر لے بیٹھی ہیں، بس نہیں ضرورت کسی کی۔“

”بیٹا! یہ رشتے ٹوٹتے نہیں ہیں، آج مایوں کی رسم ہے۔ میں نے جانا ہے، پھر تمہاری شادی میں شرکت کی دعوت دینی ہے۔“ رفیعہ بیگم نے تحمل سے سمجھایا۔

”پاگل ہو گئی ہو رفیعہ بیگم! کس مٹی سے بنی ہو؟“ ستار صاحب حیرت سے بولے۔

”آپ آرام کریں، اماں جان کے منہ کو ہی جانا پڑے گا، ان کی پوتی کی شادی ہے، نواسے کے ساتھ۔“ وہ سچ مچ برف زدہ مٹی سے بنی تھیں۔



”فی الحال ضروری سامان اکٹھا کر لیں، میں گاڑی بھیجتا ہوں، وہ سامان لے جائیں گے۔“ عادل نے کہا اور موٹر سائیکل کی چابی گھماتا ہوا باہر نکل گیا۔ رفیعہ بیگم اُٹھ کر سامان سمیٹنے لگیں، تبھی میاں ستار کی رقت آمیز آواز ابھری۔

”ایک ہی بھائی تھا، جیتے جی چھوٹ گیا۔“

”کیا ہو گیا آپ کو، اللہ سلامت رکھے دونوں کو، اس بے چارے کا کیا قصور ہے؟ آج کل بچے ہی خود سر ہو گئے ہیں۔“ رفیعہ بیگم نے دیور کی وکالت کی۔

”اس نے زندگی کو غلط انداز پر برتا ہی کیوں؟“ وہ بولے۔

”چلیں معاف کر دیں، بھائی نہیں، وہ ہماری اولاد ہے۔ تانیہ کی خوشی میں ہم خوش ہیں۔“ رفیعہ بیگم نے انتہائی محبت سے ان کا غم و غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

”یہی تو صدمہ ہے، مہینوں شکل نہیں دکھاتا۔“

”اب تو وہ شرمندگی کی وجہ سے نہیں آتا، میں آج کان کھینچ کر آؤں گی۔“ رفیعہ بیگم نے ان کو بہلانے کی عمدہ اداکاری کی تو وہ خاموش ہو گئے اور وہ پھر سے کام کاج میں مصروف ہو گئیں۔

...☆☆☆...

”تانیہ! تانیہ...“ وہ اسے پکارتی ہوئی کمرے میں آ گئیں۔

”جی فرمائیے...“ اس نے خلاف توقع نرمی سے جواب دیا۔

”بیٹا! اُٹھو، ناشتا کرو، آج خاص دن ہے، رضیہ خالہ، انوار چچا کے بچے بس کچھ دیر تک پہنچے والے ہیں اور زرتاشیہ کو لینے آپ کے ماموں اُر پورٹ گئے ہیں، بہنیں بھائیوں کو سجاتی ہیں اور آپ بستر میں گھسی ہو۔“ شاہدہ بیگم نے تواتر سے بولتے ہوئے کھڑکیوں کے پردے ہٹائے۔

”بس میرا جی نہیں چاہ رہا۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟ اٹھو کپڑے نکالے کہ نہیں؟ اور ہاں اپنے پارلر والی روشنی سے بات کرو، زرتاشیہ کو لے کر جانا۔“

”اما! میں کہیں نہیں جا رہی اور میرے کپڑے کوئی خاص نہیں ہیں، جو میں پہنتی ہوں، وہی شام میں پہنوں گی۔“

”کیا! جینز اور ٹی شرٹس، یا پھر وہ اسکرٹ؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا۔  
 ”آپ نے ہی پہننے کی ترغیب دی، مجھے ایسے کپڑوں کی عادت ہے۔“ وہ بے زاری سے بولی۔

”ہر الزام میرے سر۔ میں ہی مجرم ہوں سب کی، ابھی باہر میری اپنی ماں نے مجھے جانے کیا کچھ کہا ہے اور یہاں بیٹی کو سب قصور میرے نظر آرہے ہیں۔“ شاہدہ بیگم کا گلا رُندھ گیا۔

”شاہدہ بیگم! بھئی زرتاشیہ آچکی ہے اور ہاں، زیر آپ کو بلا رہے ہیں۔“  
 میاں افتخار نے آکر کہا، مگر بیگم کا چہرہ دیکھ کر اور تانیہ کے تیور دیکھ کر وہ بہت کچھ سمجھ گئے تھے۔

”کیا کہانی ہے؟“

”کچھ نہیں، سنبھالیں لاڈلی کو، میں تو بُری ماں ہوں۔“ شاہدہ بیگم روتے ہوئے کہہ کر جانے لگیں مگر میاں افتخار نے ان کی کلائی تھام کر روکا۔  
 ”ایک منٹ بیگم! آج پوچھ ہی لینے دو، مجھے کچھ کہہ لینے دو۔“ وہ خاصے سنجیدگی سے بولے۔

”تانیہ کیا جرم ہے اس ماں کا، جو اچھی ماں بننے کی کوشش میں اپنی ذات کی، میری سب کی نفی کرتی رہی۔“

”بابا! جو تربیت ہمارے بگڑنے کا سبب بنی وہ کس کھاتے میں ڈالیں گے آپ؟“ وہ دُور بدو ہو گئی۔

”خسارہ ہی خسارہ ہے، شاہدہ بیگم کی زندگی اس میں ہی ڈال دو۔“ وہ بولے۔  
 ”بابا! بے کار بحث کے موڈ میں نہیں ہوں، مجھے ہائر اسٹڈیز کے لیے باہر جانا ہے۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

”جانتی ہو ہم کتنے خالی ہیں اس وقت۔“ شاہدہ بیگم نے مداخلت کی۔

”ہم آپ کو جلد آپ کے گھر رخصت کرنا چاہتے ہیں۔“

”مجھے باہر جانا ہے، بابا!“ وہ زور دے کر بولی۔

”مگر آج تو اس بحث میں نہ پڑو۔“ شاہدہ بیگم نے چڑ کر کہا۔

”مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں، آپ جا کر اپنے کام کریں۔“ وہ کمبل میں منہ دے کر لیٹ گئی۔

”بیگم صاحبہ! چلیے، آپ کی اماں جان باہر آپ کو تلاش کر رہی ہیں، زیر سے مل بھی لیں۔“ وہ برداشت کر کے باہر نکل گئے، شاہدہ بیگم بھی دل گرفتہ سی باہر نکلیں۔

”اب دل جلانے سے کیا حاصل! کچھ تو کرنا ہے، جب تک کوئی مناسب رشتہ نہیں ملے گا، اسے تعلیم حاصل کرنے دو۔“ باہر آکر میاں افتخار نے کہا۔

”مگر ... کیسے؟“

”کچھ تو کریں گے۔“

”افتخار! میں کتنی بد قسمت ہوں۔“ وہ ایک بار پھر رو دیں۔

”نہیں۔ آپ بہت خوش قسمت ہیں، ابھی آپ کو اندازہ ہی نہیں۔“ وہ کچھ سوچ کر مسکرائے اور انہیں لیے زیر احمد کی طرف چل دیئے۔

”ارے میاں! ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے کہاں چل دیئے؟“ اماں جان نے باورچی خانے سے ہانک لگائی۔

”اور بھی غم ہیں غم ناشتے کے سوا۔“ میاں افتخار نے مذاقاً کہا اور آگے بڑھ گئے۔

...☆☆☆...

”اوائے میری جان، سوٹو!“ زرتاشیہ احتشام سے کھیل رہی تھی۔ سامعہ ہینگر میں زرد چمکتا دمکتا سوٹ لیے اندر آگئی۔ زرتاشیہ دانستہ انجان سی بن گئی۔

”یہ دیکھو! میں نے بڑے پیار سے گوٹا لگایا ہے۔“ سامعہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو وہ بنا تاثر کے مسکرا دی۔

”بہت اچھا ہے، پہن کر بھی دکھادیں۔“

”یہ آپ پہن کر دکھائیں، مجھے آنٹی کو جاکر دکھانا ہے۔“

”سامعہ جی! اگر میں یہ پہننا نہ چاہوں تو؟“ اس نے پوچھا۔

”کیا مطلب...؟“ وہ چونکی۔

”یہی کہ مجھے یہ نہیں پہننا۔“

”زرتاشیہ! اتنا فضول مذاق مت کرو۔“ سامعہ نے ہینگر کرسی پر رکھتے ہوئے

کہا۔

”یہ مذاق نہیں ہے سامعہ جی!“

”زرتاشیہ...!“

”آپ کیا سمجھتی ہیں کہ آپ ہی بہت عظیم اور باوفا ہو سکتی ہیں؟“ وہ عجیب سے انداز میں اسے دیکھتی ہوئی بولی۔

”زرتاشیہ! جو کہنا ہے، صاف کہو۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔

”ہاں! میرا سوال ہے آپ سے، کیا آپ کسی خاص جہاں سے آئی ہیں، کوئی

خاص مٹی سے بنائی گئی ہیں اور آپ ہی امتحان میں سو فیصد نمبر لے سکتی

ہیں؟“ وہ اس کے ہاتھ تھام کر وہیں کرسی پر بٹھاتے ہوئے خود فرش پر بیٹھ

کر پوچھ رہی تھی۔

”زرتاشیہ! کیوں اُلجھا رہی ہو؟ مجھے بہت سے کام کرنے ہیں۔“ وہ گڑ بڑا سی

گئی۔

”سامعہ جی! زرتاشیہ زبیر احمد کو انڈر اسٹیمپٹ کیا ہے آپ نے۔“

”زرتاشیہ! پلیز کیا مسئلہ ہے تمہارا؟“ وہ جھنجھلا سی گئی۔

”سامعہ جی! میں بھی فیاض ہوں، میں بھی بانٹ سکتی ہوں، فرحان بھی۔“

اس نے آخری لفظ پر زور دے کر جو نہیں کہا تو وہ ہونق سی رہ گئی۔

”چونکی ہیں نا آپ؟ آپ نے غلط نہیں سنا کہ میں بھی فرحان کو چھوڑ سکتی ہوں، میری محبت بھی عبادت سے کم نہیں۔“ وہ بڑے حوصلے سے بولی مگر سامعہ کے تو کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل سی ہونے لگیں۔

”اب آپ میرا نذرانہ قبول کر لیں، سمجھ لیں زندگی کے اس کھیل میں،

فرحان آپ کی طرف لوٹ آیا۔“

”زرتاشیہ! لیکن کیوں یہ سب کہہ رہی ہو؟“ وہ چلا پڑی۔

”سامعہ جی! چلائیں مت، اور کتنی عظمت چاہئے آپ کو، اب اس معصوم کا

خیال کر لیں۔ آپ گمنام زندگی بسر کر سکتی ہیں لیکن یہ معصوم باپ کے ہوتے

ہوئے گمنام کیوں رہے؟“ وہ بہت نرمی اور پیار سے احتشام کو بانہوں میں بھر

کے بولی۔

”اس کا مطلب...؟“

”مجھے اسپتال سے سب پتا چل گیا تھا۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”اوہ! مگر پلیز زبان بند کرلو، قیامت آجائے گی۔ کسی کو پتا نہ چلے۔“ وہ ایک

دم منت سماجت پر اتر آئی۔

”زرتاشیہ! اب کوئی موقع نہیں ہے، تیاریاں ہو چکی ہیں، یہ صدمہ کوئی

برداشت نہیں کر سکے گا۔“

”میرے پپا نے برداشت کر لیا، باقی کسی اور کی مجھے پروا نہیں۔“ وہ بڑی

سادگی سے کہہ کر اطمینان سے باہر کی طرف جانے لگی۔

”پلیز! اب کیا ہوگا؟“ سامعہ نے تقریباً روتے ہوئے اس کا بازو پکڑا۔

”کچھ نہیں، آپ اور فرحان ننھے احتشام کے ساتھ رہیں گے۔“ وہ پلٹ کر

بولی اور سرعت سے باہر نکل گئی اور وہ سخت مضطرب سی دروازے سے لگ

کر آنے والے حالات کے بارے میں سوچنے لگی۔ اسے زرتاشیہ کی آنکھوں



میں تیرتی نمی بے قرار کر رہی تھی۔ آسانی سے فرحان کو بانٹ کر وہ آگے بڑھ گئی تھی۔

”سامعہ! یہ تو سچ مچ تم سے زیادہ عظیم نکلی۔“ اس نے سوچا اور بے اختیار ہی آنسو بہانے لگی۔

...☆☆☆...

صوفے پر ٹیڑھا ترچھا وہ بے سدھ سو رہا تھا۔ ایاز نے آکر جھنجوڑ ڈالا۔

”فرحان! گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہے ہو، یہ دیکھو موبائل مسلسل بج رہا ہے۔“ وہ ایاز سے ملنے آیا تھا مگر ایاز واش روم میں تھا تو وہ صوفے پر بیٹھا بیٹھا سو گیا۔ صائمہ اپنے میکے گئی ہوئی تھی۔ گلزاری نے چائے بنا کر رکھی تھی جو کہ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

”بند کردو، پھینک دو اس فون کو۔“ وہ سرخ انگارہ آنکھیں کھولتے ہوئے چیخا۔

”گھر سے آئی ہیں سب کالز، بات تو کرلو۔“

”نہیں کرنی بات وات، مرگیا ہوں میں۔“

”فضول باتوں کی اب گنجائش نہیں، چلو میرے ساتھ، آج تمہاری مایوں ہے۔“ ایاز نے اسے جتایا۔

”مجھے نہیں جاننا۔“ وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔

”یار! اب بے ضرورت ٹینشن مت دو، سب پریشان ہو رہے ہیں۔“

”کوئی پریشان نہیں ہوگا، میری تو بیوی کو پریشانی نہیں۔“ وہ طنزیہ ہنسا۔

”تو تم سمجھ سکتے ہو بیوی کی مجبوری؟“ وہ چڑ گیا۔

”کیا سمجھوں؟ وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتی۔“

”اب اس غیر حاضری سے کیا ہوگا؟“

”کچھ ہو جائے اب فرحان نے یہ سوچ لیا ہے۔“

”اللہ کے بندے پھر ہمت سے کام لو، چلو چل کر اعلان کرو، میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ ایاز نے خاصے تحمل سے کہا۔

”کردو فون پر انکار، کہہ دو میں مرچکا ہوں۔ میں سامعہ سے کیا پیمانہ نہیں توڑ سکتا، مر تو سکتا ہوں۔“

”ایسی باتیں نہیں کرتے، اٹھو سب پریشان ہو رہے ہوں گے۔“ ایاز نے پیار سے بازو پکڑ کر ہلایا۔

”یار! میں وہاں جاتا ہوں تو احساس جرم بڑھ جاتا ہے ایک طرف میں سامعہ کا مجرم بنتا ہوں، دوسری طرف زرتاشیہ کو دھوکا دینے کا گناہ گار، اور میرا بیٹا تو کبھی مجھے معاف ہی نہیں کرے گا۔“ وہ مٹھیوں میں دونوں ہاتھوں سے بال نوچتے ہوئے بولا۔

”تو سب جرائم سے بچنے کے لیے ایک گناہ کیوں نہیں کر لیتے؟“ ایاز نے زچ ہو کر کہا۔

”مثلاً...“

”ابھی فون پر ہی آنٹی کو کہہ دو، یا پھر زرتاشیہ کو بتادو، وہ آچکی ہوگی۔“ ایاز نے تجویز دی۔

”اس سے کیا ہوگا؟ سامعہ ناراض ہوگی۔“ وہ بے بسی سے بولا۔

”تو پھر چپ چاپ گھر چلو، دوپہر ہو چکی ہے۔“

”تم احتشام کو لے آؤ، میں یہاں سے دور چلا جائوں گا۔“ وہ بولا تو ایاز کو پتنگے لگ گئے۔

”ہنہ چلا جائوں گا اور وہ سامعہ بھابی... ان کا مقصد کیا ہے؟“

”اچھا کچھ تو سوچنے دو۔“ وہ بولا، اسی وقت فون دوبارہ بجنے لگا تو ایاز نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف سامعہ تھی۔ اس نے جلدی سے فون ریسیو کر کے اسے تھما دیا۔

”ہیلو، ہیلو فرحان۔“ بہت بے تابی سے پکارا گیا۔

”ہنہ بولو۔“ وہ کچھ پریشان سا ہوا۔

”فرحان! پلیز جلدی آجاؤ، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

”کیا مطلب؟ احتشام تو ٹھیک ہے؟“

”ہاں! لیکن گھر میں خیریت نہیں ہے، سب غلط ہو گیا ہے، پلیز آجاؤ۔“ وہ

باقاعدہ رونے لگی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ تقریباً دوڑ پڑا۔

اماں جان اشکبار تھیں، شاہدہ بیگم سسکیاں بھر رہی تھیں۔ زبیر احمد ماں سے

جھاڑ کھا کر سر تھامے بیٹھے تھے۔ میاں افتخار اس موقع پر نچلا ہونٹ دانتوں

میں دبائے بیوی کو دیکھ رہے تھے۔ کافی دیر گزر گئی۔

”اماں جان! اب بس بھی کریں، حالات سے سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔“ زبیر احمد

نے مجبوراً زبان کھولی تو وہ پھٹ پڑیں۔

”ارے خاک سمجھوتا کریں، اتنے اُلو گدھے تم ہی ہو سکتے ہو، نہ بیوی کی

چالبازیاں سمجھ سکے اور نہ بیٹی کو کنٹرول کر سکے۔“

”اگر زرتاشیہ نہ جاتی، پھر بھی یہی سچ بتاتی تو ہم کیا کر لیتے؟“

”سارا فساد تو اس شاہدہ کی اولاد کا ہے، نہ بیٹا ہی سنبھالا اور نہ بیٹی۔ بتاؤ کس

قدر سلیقے سے ہماری آنکھوں میں مرچیں ڈالی ہیں۔“ وہ براہ راست شاہدہ

بیگم پر برس پڑیں۔

”شکر ہے اماں جان! سلیقے سے مرچیں ڈالی ہیں ورنہ آپ کو زیادہ غصہ آتا۔“

میاں افتخار نے پھلجڑی چھوڑی تو وہ اور زیادہ بھڑکیں۔

”واہ میاں! خوب مذاق اڑاؤ، یہی کسر رہ گئی تھی۔ کیسے محلے میں، عزیزوں

میں ہماری عزت خاک میں ملائی ہے، آج پنڈال اسی لیے سجوایا تھا۔ ہائے

میرے اللہ! کیسے سامنا کریں گے سب کا۔“

”اماں جان! اب خدارا خاموش ہو جائیں۔ یہ بھی خوشی ہے ہم سب کو اس

خوشی میں شریک کر رہے ہیں۔“ زبیر احمد نے سمجھایا۔

”زبیر! زبیر! کیا عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں؟ فرحان کی خوشی منائیں ہم، لوگوں

کو بتائیں کہ خفیہ شادی میں شرکت کریں اور ہماری ناک کے نیچے سب

ہوتا رہا، ہمیں پتا نہ چلا۔“ شاہدہ بیگم کو ماں کا ساتھ دینے کے لیے جذباتی ہونا پڑا۔

”دھیرے بولیں آپا! فرحان خفیہ نہیں رکھنا چاہتا تھا، مگر ہماری پابندیوں کی وجہ سے ہمارے بچے بے بس ہو جاتے ہیں، میرے خیال میں تو بچپن میں رشتے طے ہی نہیں کرنے چاہئیں۔ آنے والے حالات کا علم کس کو ہوتا ہے؟“ زبیر احمد نے خاصی سنجیدگی سے کہا۔

”بزرگوں کے طور طریقے فضول قرار دے دو، مگر جیسی قیامت اس گھر میں شاہدہ کے بچوں نے برپا کی ہے، ویسا کہیں نہیں ہوتا۔ ہمارا منہ اور نہ کھلوانو، جائو ہمارا دل بیٹھا جا رہا ہے۔“ بچے نہ سنبھالنے آئے۔“ اماں جان بستر پر دراز ہو گئیں۔ زبیر احمد نے میاں افتخار کو اٹھنے کا اشارہ کیا، مگر شاہدہ بیگم ان سے پہلے روتی ہوئیں اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔ میاں افتخار اور زبیر احمد باہر نکلے تو ناجی نے گلریز صاحب اور انجم کے آنے کی اطلاع دی، زبیر

احمد جلدی سے اپنی طرف چلے گئے۔ میاں افتخار اپنے کمرے میں آگئے۔ شاہدہ بیگم بیڈ پر لیٹی اشک بہا رہی تھیں۔

”شاہدہ بیگم! خدا کی قسم! آپ غیر ضروری قیمتی آنسو بہا رہی ہیں۔“ وہ ان کے قریب بیٹھ گئے۔

”مجھے تو کوئی زہر دے دو، مجھے میرے بیٹے نے دھوکا دیا اور اماں جان کی نظروں میں کیا مقام رہ گیا میرا؟“

”اماں جان کی نظروں میں مقام تھا ہی کب اور اب ذہن پر بوجھ نہ ڈالو، سامعہ بہت پیاری بچی ہے اور وہ ہمارا پوتا ہے۔“

”اصل مجرم تو آپ ہیں، آپ کے باس کی بیٹی تھی، جھوٹ مجھ سے آپ نے بھی بولے۔“ وہ دُکھ سے رو دیں۔

”بیٹے کو تنہا تو نہیں چھوڑ سکتا تھا پھر خود سوچو، بے چاری سامعہ کا کیا قصور ہے؟“

”آپ نے مجھے دھوکا دیا۔“ وہ شدت جذبات سے ہچکیاں لینے لگیں۔

”دھوکا نہیں تھا، بس موقع ہی تلاش کرتے رہے، آپ کو سمجھانا اونٹ کو رکشے میں بٹھانا تھا۔“ وہ معصوم سی شکل بنا کر بولے۔ انہیں روتے روتے ہنسی آگئی۔

”شکر ہے۔“

”کون ہے؟ کہاں سے آئی؟ پہلے سے دو شادیاں کرنے والی کو میرے بیٹے نے قبول کر لیا۔“

”ایسے مت کہو، یہ سر چھپانے کی ردا اللہ نے عورت کو دی ہے، کس چیز کی کمی ہے سامعہ میں، غور کرو کن حالات میں، کس طرح اس نے محبت نبھائی، شادی کی لاج نبھائی اور قربانی کا جذبہ دیکھو، اپنا شوہر اس گھر پر قربان کرنے کو تیار تھی، اسے آپ کی زندگی، زرتاشیہ کی خوشی عزیز تھی۔ قدر کرو۔“ میاں افتخار نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں کہا۔ وہ چپ سی ہو گئیں۔

”شاہدہ بیگم! فرحان نے مایوس نہیں کیا، اس نے کتنے صبر شکر کے ساتھ

اپنی محبت کو اپنے سے جدا رکھا، سامعہ کے کہنے پر زرتاشیہ کے لیے ہاں کر دی، یہ سوچ کر آپ کو ذہنی صدمہ نہ ہو اور کاروبار سیٹ کر چکا ہے۔ میں تو فرحان کو الزام نہیں دے سکتا۔“ وہ بڑے فخریہ انداز میں بولے۔

”مگر...“

”مگر کچھ نہیں شاہدہ بیگم! دل بڑا کرو پہلے ہی رشتوں کا بہت سائقصان کر چکے ہیں، اب فرحان بھی ہمیں چھوڑ کر چلا گیا تو میں تو مرجائوں گا۔“ وہ آبدیدہ سے ہو کر اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔

”اللہ نہ کرے، افتخار آپ کو میری بھی عمر لگ جائے، آپ ہی تو میری متاع حیات ہو۔“ انہوں نے بے ساختہ ان کے لیے خود سے کہا اور دوپٹے کے پلوں سے آنکھیں صاف کر لیں۔

...☆☆☆...

گلریز صاحب اور انجم کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔



زبیر احمد نے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اپنے کمرے میں ہی چائے منگوائی تھی۔ دھیرے دھیرے سارا قصہ ان کے گوش گزار کیا تو حیرت کا ہونا یقینی امر تھا۔

”سمجھ میں نہیں آرہا اس موقع پر کیا کہوں؟“ انجم نے بے بسی کا اظہار کیا۔  
 ”زبیر! ہم لوگوں کو اب یہ بچپن میں بچوں کے رشتے طے کرنے کی روایت بدل دینی چاہئے، ہمارے دور میں اور آج کے دور میں بہت تبدیلی آچکی ہے۔“ گلریز صاحب نے اپنی رائے دی۔

”ہاں! کیونکہ بچوں پر یہ فیصلہ کم از کم ٹھونسنا نہیں چاہئے اور جب دل پر اختیار ہی نہیں رہتا تو بے جا سختی کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ آپ کے دونوں بچوں نے یہ فیصلہ مسترد کر دیا۔“ زبیر احمد نے کہا۔

”لیکن فرحان کو کم از کم ماں کو تو بتانا چاہئے تھا، ایک طرح سے تو وہ یہ شادی کر کے سب کو دھوکا ہی دے رہا تھا۔“ انجم نے کچھ تنقیدی انداز اختیار کیا۔

”وہ بہت کھرانو جوان ہے، افتخار بھائی نے خود معاملہ سلجھانے کے چکر میں دیر کردی اور یہ شادی فرحان صرف سامعہ کے کہنے پر کر رہا تھا۔“

”اب ہماری زرتاشیہ بیٹی کے لیے کیا سوچا آپ نے؟“ انجم نے پوچھا۔

”کچھ نہیں بھابی، میری بساط ہی کیا، اللہ کا چاہا پورا ہوتا ہے، بس میں خوش ہوں میری بچی سامعہ کی آہ سے بچ گئی۔“

”ہاں! ایک غلط قدم اٹھانے سے بچت ہو گئی۔“ گلریز صاحب نے بھی تائید کی۔

”بہت بہادر ہے میری زرتاشیہ۔ گھر میں آگ بھڑکنے سے پہلے سمجھداری سے کام لیا۔“ زبیر احمد بیٹی کی تعریف کرتے نہ تھک رہے تھے۔

”چلو اللہ بہتری کرے گا۔“ گلریز صاحب نے کہا تو انجم بولیں۔

”نرگھس کو فون کر دیجئے، وہ خوش ہو جائے گی۔“

”ہاں! لگتا ہے اس نے شادی نہ ہونے کے لیے جائے نماز سنبھال رکھی ہے۔“ زبیر احمد نے ہنس کر کہا تو گلریز صاحب بھی مسکرا دیئے۔

”میں اسے کہتی ہوں کہ فوراً آجاؤ، زبیر بھائی نے ہار مان لی ہے، جہاں تم چاہو گی وہیں زرتاشیہ کی شادی ہوگی۔“ انجم نے فون کرنے کی غرض سے اُٹھتے ہوئے بتایا۔

”نہیں بھابی! نرگھس کو یہاں آنے کے لیے بیساکھیوں کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے، زرتاشیہ کی شادی کوئی شرط نہیں، کوئی بازی نہیں، اب یہ فیصلہ زرتاشیہ کو کرنا ہے اور میرا خیال ہے، اسے کافی وقت لگے گا واپس آنے کے لیے۔“ زبیر احمد نے ایک دم سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے انجم کو روک دیا۔

”زبیر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ نرگھس اپنے گھر آئے سب باتیں بھول کر۔“ گلریز صاحب نے بھی بیوی کو منع کر دیا۔

”چلیں آنے کو تو کہہ دیں۔“ انجم نے آخری ٹکڑا لگایا۔

”اس کا دل چاہا ہے تو...“ زبیر احمد نے مجبوراً اجازت دی۔ وہ باہر چلی گئیں تو گلریز صاحب بولے۔

”ویسے اب نرگھس تبدیل ہو چکی ہے اور یہ سارا کمال افراسیاب کا ہے۔“

”افراسیاب بہت لائق اور اچھا بیٹا ہے۔“ زبیر احمد نے جواباً بڑھ کر افراسیاب کی غائبانہ موجودگی میں تعریف کی۔

ضضض

فرحان بدحواس سا سیدھا زبیر احمد کے پاس آیا۔ سامعہ نے خود کو کمرے تک محفوظ کر رکھا تھا۔ وہ کمرے میں گھستا چلا آیا۔ احتشام سویا ہوا تھا، سامعہ اس کے قریب بیڈ پر نیم دراز تھی... اسے دیکھ کر حرکت میں آئی۔

”کیا ہوا؟“ وہ بیقراری سے بولا۔

”وہی کچھ، جس کا ڈر تھا۔“

”کچھ تو بتاؤ... اور ماموں ٹینٹ وغیرہ کیوں اتروا رہے ہیں؟“ فرحان نے پریشانی سے پوچھا۔

”سب گرٹ بڑ ہو گئی، میں بہت شرمسار ہوں۔“ وہ ایکدم ہی رونے لگی۔

”سامعہ! پلیز کچھ تو بولو۔“ وہ اور زیادہ ڈسٹرب ہو گیا۔

”زرتاشیہ کو سب علم ہو گیا۔“ وہ کچھ سمجھ نہ سکا۔

”کیا...؟“

”آپ کے اور میرے بارے میں۔“

”یعنی...؟“ غیر یقینی کی سی کیفیت میں اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”اس لیے ہی ماموں سامان واپس بھیج رہے ہیں۔“ وہ خوفزدہ سی بولی۔ جبکہ وہ

قہقہے لگانے لگا۔ قہقہے اتنے بلند تھے کہ اس نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ

رکھ دیا۔

”ہوش کیجئے۔“

”کم آن یار! ہنسنے دو۔ کتنی مدت کے بعد ہنسنے کا موقع ملا ہے۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔“

”نہیں، سوچو زرتاشیہ پر کیا گزر رہی ہوگی اور آنٹی کا سامنا کرنے کا تو مجھ میں

حوصلہ ہی نہیں۔ مہمان آچکے ہیں۔“ وہ سچ مچ کپکپا رہی تھی۔

”سامعہ! ہر چیز پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا، ہونے والا کام ہو کر رہتا ہے۔“

وہ بڑے اطمینان سے آنکھوں کے گوشے انگوٹھے سے صاف کرتے ہوئے

بولا۔

”فرحان! آپ کو دل لگی سو جھ رہی ہے؟“

”سامعہ! خدا را اب تو خوش ہو جاؤ۔ معلوم ہے تم پر خوشی بہت سجتی ہے۔ اب

بیکار ہے یہ اداسی اور پریشانی، آگے کی بات کرو۔“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس

انگوٹھی پر انگلی رگڑنے لگا جو شادی کے بعد اسے پہنائی تھی۔

”فرحان! آگے کی تو کوئی خبر ہی نہیں مجھے، پلیز جا کر بابا سے پوچھو، مجھے

پریشانی ہے۔ ماما سے بات کرو۔“ وہ بولی۔

”تو آؤ میرے ساتھ چل کر پوچھتے ہیں۔“ وہ یکدم اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔

”وہ، وہ، سب کیا سوچیں گے؟“ وہ ہکلائی۔

”درد کی شدت میں کمی آگئی ہوگی۔“ اس نے حوصلہ بڑھایا۔

”پہلے بابا سے مل آؤ۔“

”سامعہ! مجھے کیا سمجھتی ہو، باہر جو کچھ ہوا تو کیا میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟“ اس نے سختی سے پوچھا۔

”مگر میں کوئی ناگواری نہیں چاہتی۔“

”سامعہ! سامعہ اب کم از کم کانٹوں کا رستہ چھوڑ دو۔“ وہ تقریباً چلا اٹھا۔

”اوکے، چلو، لیکن احتشام اکیلا ہے۔“

”سامعہ جی! آپ جایئے میں ہوں ناگیلو کے پاس۔“ اسی لمحے زرتاشیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ فرحان نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور نظریں جھکا لیں۔

”فرحان آپ مت گھبرائیں۔“ وہ فرحان سے مخاطب ہوئی۔

”سوری زرتاشیہ!“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”کس بات کی سوری؟“ وہ سرخ سرخ آنکھوں کو چراتے ہوئے بولی۔

”اور میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔“ وہ اس کے سوال کو یکسر ٹال کر بولا۔

”فرحان یہ سچ ہے کہ مجھے تم سے محبت تھی اور شاید ہے لیکن محبت وچاہت کے لیے وفا شرط ہے، اس خود غرضی کے دور میں وفا ہر کوئی نہیں کر سکتا،

کیونکہ وفا کانٹوں کا رستہ ہے، آتش کا کھیل ہے، یہ کھیل صرف سامعہ جی

کھیل سکتی تھیں۔ وفا میں خود کو مٹانے کا فن مجھے نہیں آتا۔“ وہ سب کچھ بول

کے ایسے خاموش ہو گئی جیسے جسم سے روح نکل گئی ہو۔ فرحان کو ندامت نے

گھیر لیا۔

”زرتاشیہ! لیکن سچ تو یہ بھی ہے کہ میری قسمت سے مجھے محبت میں کمالات کرنے والے لوگ ملے ہیں۔ یہ میرا بخت ہے کہ بن مول انمول لوگ ملے ہیں۔“ فرحان نے اتنی دیر میں پہلی بار اس کی طرف دیکھتے ہوئے اظہار کیا۔  
زرتاشیہ جھوم اٹھی۔

”فرحان! میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ تم نے میری محبت کو اپنے دل میں محسوس تو کیا ہے۔ میں تو جی اٹھی ہوں۔“

”زرتاشیہ! یہ ڈھیر سارا احسان کیسے اتار سکیں گے۔“ سامعہ نے وفور جذبات سے اس کے ہاتھ تھام کر چوم لیے۔

”بہت آسان ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”کیسے...؟“

”آپ دونوں، بلکہ تینوں یہیں ہمارے ساتھ رہو گے۔“

”شکریہ۔ ابھی تو یہ فیصلہ دور ہے، ماما سے مل کر آتے ہیں۔“ فرحان نے بھی مسکرا کر جواب دیا اور سامعہ کو ساتھ لیے کمرے سے باہر نکل گیا۔

...☆☆☆...

”کیا حیثیت ہے شاہدہ بیگم تمہاری؟ کس مقام پر ہو؟“

”رشتوں کو نبھانے میں کیا کھویا اور کیا پایا...؟“

”خالی، خالی وجود سا کیوں ہو گیا ہے اور وجود کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں بکھر سے گئے ہیں؟“

اس کمرے سے باہر سارا گھر خانوں میں بٹ گیا۔

کیا ہو تم...؟“

آئینے کے سامنے اسٹول پر بیٹھی وہ خود سے سوال و جواب کرنے میں اتنی محو تھیں کہ ان دونوں کے کمرے میں آنے کا پتہ نہیں چل سکا۔

”ماما!“ شانوں پر فرحان کے دونوں ہاتھوں کا دبائو پڑا، وہ چونکیں۔



”ماما! پلیز یوں خود کو سزا نہ دیں۔“ فرحان نے شاید پہلی بار دل کی گہرائیوں سے انہیں ماما کہا تھا کہ وہ حیران ہو گئیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ بیٹا اتنا قریب ہو کر مخاطب ہوا تھا۔

”یہ کس کا کمال ہے اے خدا! اس آنسو بہاتی سامعہ کا یا میری ممتا کا؟ انہوں نے اللہ سے پوچھا۔

”سوری ماما! میں نے آپ کو بہت دکھ دیا ہے۔“ کندھوں سے ہاتھ ہٹا کر گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے اپنا چہرہ ان کے سر پر رکھ کر بولا تو وہ بے قرار ہو گئیں۔

”فرحان! یہ کیسا معجزہ ہے، آج میں ماں بنی ہوں۔“

”سوری ماما!“ وہ کچھ نہ سمجھ کر شرمندگی سے بولا۔ سامعہ نے بھی ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے گٹھنے پکڑ لیے۔

”مجھے معاف کر دیں، میں نے مزاج سے ہٹ کر آپ کو صدمہ پہنچایا۔“ سامعہ نے روتے ہوئے کہا۔

”فرحان! پلیز میں بہت ڈسٹرب ہوں، باہر مہمان ہیں اور میں کیسے کچھ سوچوں۔“ وہ شاید حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئی تھیں۔

”مجھے احساس ہے، مگر ہمیشہ کی طرح اپنی نرم سی محبت کی آغوش میں چھپا کر سب کو ٹال دیں۔“ وہ بولا۔

”نہیں، مجھے پہلی بار اپنے اندر ماں دکھائی دی ہے اور تم پھر مجھے نادان سی شاہدہ بنانا چاہتے ہو۔“ وہ تقریباً رو دیں۔

”پلیز ماما! ہمیشہ کی طرح چھپالیں، نانو کو کہہ دیں، زبیر ماموں کو سمجھا دیں۔“ وہ بولا۔

”فرحان! مجھے وہ مت بننے کو کہو، میں شفیق مہربان ماں بن کر معاف کرنا چاہتی ہوں، چشم پوشی، عیب پوشی کرنا نہیں چاہتی۔ ہمیشہ سب کو ناراض ہی رکھا۔ اب مجھے اپنا صحیح کردار ادا کرنے دو۔“ وہ کافی جذباتی ہو کر اٹھیں اور فرحان کو گلے لگا کر چومنے لگیں۔

”شکریہ ماما! ہم غلط تھے، آپ کی محبت اور نرمی سے فائدہ اٹھاتے رہے۔“ فرحان بھی رقت بھرے لہجے میں بولا۔

”بچے تو نادان ہوتے ہیں، مجھے اپنا کردار ادا کرنا نہیں آیا۔ اماں جان ٹھیک کہتی تھیں، کاش میں توازن رکھتی تو آج تانیہ کے لیے بھی بہتر ہوتا۔“ وہ پشیمانی سے بولیں۔

”ماما! ایسا نہ کہیں، والدین کبھی غلط نہیں ہوتے۔“

”فرحان! مجھے خوشی ہے کہ میرے بیٹے نے میرا مقام بحال کر دیا۔ ہمیں ایسے فیصلے کرنے ہی نہیں چاہئیں۔“ ان کا اشارہ اس کی اور زرتاشیہ کی منگنی کی طرف تھا۔

”ماما! میں نے زرتاشیہ سے معافی مانگ لی ہے۔ وہ بہت عظیم ہے۔“ وہ بولا۔

”سامعہ تم یہ بات پہلے بتادیتیں تو اچھا تھا۔“ انہوں نے سامعہ سے شکوہ کیا۔

”ماما! میں تو بہت پہلے آپ کو سب کچھ بتانا چاہتی تھی لیکن حالات ہی کچھ سے کچھ ہوتے گئے۔“ سامعہ نے ندامت سے جواب دیا۔

”مجھے اپنے بھائی کی فکر ہے، اس کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟“

”ماموں مجھے معاف کر دیں گے؟“

”معاف تو وہ کر چکا ہے، بڑا حوصلہ ہے اس کا لیکن پھر بھی۔“ وہ بھائی کے خیال سے آبدیدہ ہو گئیں۔ وہ دونوں شرمسار ہو کر ان سے لپٹ گئے۔

”اچھی ماما! سب سنبھال لیں، ہمارے لیے، اپنے احتشام کے لیے۔“ فرحان نے جذباتی انداز میں ضرب کاری لگائی، تو وہ سچ مچ خوشی سے مسکرا دیں۔

...☆☆☆...

افراسیاب کو پہلی بار بہت غصہ آیا۔۔۔ نرگھس کے چہرے پر خوشی دیکھ کر وہ دکھ سے بولا۔

”پو! آپ نے آخر تیر چلا ہی دیا، اس کے معصوم ذہن کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر لیا۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ چونکی۔

”کوئی مطلب نہیں، مطلب تو آپ کو تھا، سو پورا ہو گیا، زرتاشیہ کو یہاں بھیج کر زبیر انکل نے غلطی کی تھی۔“

”افراسیاب! کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”پو! پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔“ وہ سنجیدگی سے کہہ کر الماری سے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔

”میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیا سمجھ رہے ہو؟“ نرگھس پر بوکھلاہٹ طاری تھی۔

”آپ کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ زرتاشیہ نے فرحان کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا ہے۔“

”ہاں تو یہ خوشی کی بات ہے۔“ وہ تقریباً جھومتے ہوئے بولیں۔

”ٹھیک ہے تو جائیے خوشیاں منائیے، آپ کو تو دوسروں کو دکھ دے کر خوشیاں منانے کی عادت ہے۔“ اپنے تین چار گرم سوٹ ہینگروں سے اتارتے ہوئے تحمل سے بولا۔

”اس میں میرا کیا عمل دخل ہے؟“ وہ تعجب سے بولیں۔

”آپ نے زرتاشیہ کو استعمال کیا ہے۔ شادی کے دن اس نے انکار کر دیا اور آپ کے کہنے سے کیا ہے؟ آپ نے زبیر انکل کو شکست دینے کے لیے گھٹیا حربہ استعمال کیا ہے۔“

”غلط، بالکل غلط، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا، زرتاشیہ کی تو عین وقت پر آنکھوں کی پٹی اتر گئی ہے۔ وہ فرحان پہلے سے شادی شدہ ہے۔ بڑا ناز تھا زبیر کو شاہدہ آپا کے فرحان پر۔“ نرگھس نے چبا چبا کر خاصی طنزیہ زبان استعمال کی تو افراسیاب حیرت سے چلا اٹھا۔

”کیا...؟“

”جی ہاں وہ جو لڑکی گھر میں رکھی ہوئی تھی زبیر صاحب نے وہی فرحان کی بیوی ہے، سب نے مل کر میری معصوم بچی کو بیوقوف بنایا، پتہ تو اب چلا ہوگا زبیر احمد کو کہ میں غلط نہیں کہتی تھی۔“ نرگھس بولتی چلی گئی، مگر افراسیاب حیران سا بیڈ پر بیٹھ گیا۔

”یہ کہانی میری سمجھ سے باہر ہے۔“

”بس شکر ادا کرو میری زرتاشیہ دھوکے سے بچ گئی۔“

”لیکن زرتاشیہ کیسے جی پائے گی؟“ وہ بڑبڑایا

”کیا مطلب...؟“

”وہ فرحان سے محبت کرتی ہے، اس پر کیا گزر رہی ہوگی؟“ وہ دکھی سا ہو گیا۔

”وہ بہت خوش ہے کہ دھوکے سے بچ گئی، زندگی جہنم بن جاتی، بیوی بچے کے ساتھ فرحان کا اچار ڈالنا تھا کیا؟“

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔“ وہ سر تھام کر بولا۔

”اللہ نے میری سن لی، اب میں اپنی زرتاشیہ کی شادی خود کروں گی۔“ وہ بہت خوشی سے بولیں۔

”اس کا مطلب آپ جارہی ہیں؟“

”ہاں، بلکہ ہم دونوں جارہے ہیں۔“

”ہم دونوں سے مطلب...؟“

”بھئی تم اور میں، بڑے بھیا کا حکم ہے۔“

”مگر میں نے کچھ ضروری کام نپٹانے ہیں، یہ کپڑے دھلائی کے لیے دینے ہیں، ہفتے کو میری فلائٹ ہے۔“

”تو کینسل کرادو، تم فی الحال کہیں نہیں جارہے، سن لیا، میں جلدی سے پیکنگ کر رہی ہوں، تم ڈرائیور سے کہو گاڑی تیار کرے۔“ وہ یہ کہہ کر چھپاک سے باہر نکل گئیں اور افراسیاب کے اندر جیسے طوفان آگیا۔ کافی دیر

سوچنے کے بعد اس نے امی کا فون نمبر ملایا اور حال احوال پوچھنے کے بعد، اصل حقیقت معلوم کی۔ پھر نرگھس کو سمجھانے کو کہا۔

”تو آپ آجائو۔“ انجم نے کہا۔

”میں نہیں آنا چاہتا“ میرے اپنے ضروری کام ہیں۔“ وہ بولا۔

”گلریز ناراض ہوں گے، آجائو ایک دن کے لیے۔“ انجم نے سمجھایا۔

”مگر...“

”کیا مگر؟ فرحان اور اس کی بیوی کے لیے دعوت ہے اور ناجی کی شادی بھی اماں جان کر رہی ہیں۔“ انجم نے مکمل تفصیل دی۔

”تو آپ لوگ ہیں تو۔“

”نرگھس کے اکیلے بھیجنے سے گلریز ناراض ہوں گے، آپ آجائو۔“ انجم نے اصرار جاری رکھا، فون رکھ کے وہ ذہنی طور پر تیار ہونے لگا۔ نرگھس اسے دیکھنے کے لیے آئی تو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر پوچھا۔

”کیا بات ہے، تیار نہیں ہوئے؟“

”پو! آپ کے اندر کیا ہے؟“ بے ساختہ اس نے پوچھا۔

”مطلب...؟“

”کچھ تو ایسا ہے جو شاید میرے لیے قابل قبول نہ ہو۔“

”یعنی تمہیں میرا فیصلہ قبول نہیں؟“

”ہر فیصلہ قابل قبول نہیں ہوتا۔“

”میری خواہش پوری ہونے کا وقت آیا ہے تو...“

”میں، اور میری، سے باہر نکل کر بھی سوچا کریں۔“

”یعنی تمہیں میری زرتاشیہ پسند نہیں؟“

”سچ یہ ہے کہ میں زرتاشیہ کی پسند نہیں۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو کہ فرحان ہے اس کی پسند؟“



”جی ہاں۔“

”فرحان کی اصلیت جاننے کے بعد بھی...؟“

”محبت اندر ہی اندر اس طرح پھیل جاتی ہے کہ اسے نکالنا آسان نہیں ہوتا۔“

”افراسیاب! بس تم بیکار بحث چھوڑ کر میرے ساتھ چلو۔ میں زرتاشیہ سے

پوچھ کر کوئی فیصلہ کروں گی۔“

”مجھے ایسی بستی میں داخل نہیں ہونا جہاں سے محبت کی فصل اتر چکی ہو۔

زرتاشیہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔“ وہ یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

”اور آپ؟ آپ بتائو افراسیاب۔“ نرگھس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے

ہوئے پوچھا۔

”میری آنکھوں میں جواب موجود ہے۔“ وہ بڑی متانت سے بولا۔

”نظر آرہا ہے کہ آپ زرتاشیہ کو پسند کرتے ہیں۔“

”تو پھر...؟“

”پھر یہ کہ ہم جارہے ہیں اور وہاں آپ کی اور زرتاشیہ کی شادی کا فیصلہ

سنائیں گے۔“ نرگھس نے شانِ تفاخر سے گردن اکڑا کر کہا۔

”پو! محبت قلعہ نہیں کہ آپ اسے فتح کر لیں گی۔“

”پلیز افراسیاب میرا دماغ مت خراب کرو۔ چلو اٹھو تیاری پکڑو۔“ وہ جھنجلا کر

بولی۔

”میری ایک شرط ہے۔“

”ہاں بولو، پو صدقے، پو واری۔“ نرگھس نے محبت سے کہا۔

”آپ کوئی ایسی بات نہیں کریں گی، جب تک میں زرتاشیہ سے اس کی

مرضی معلوم نہ کر لوں۔“

”منظور ہے۔“

”چلیں، میں دس منٹ میں تیار ہو کر آتا ہوں۔“

...☆☆☆...

ناجی کو اماں جان نے زرتاشیہ کے پاس مایوں کا جوڑا پہنا کر رہنے کے لیے بھیج دیا تھا۔ اس کی شادی کی اتنی گہما گہمی تھی جتنی زرتاشیہ کے لیے تھی۔ ننھے احتشام کو گود میں اٹھائے وہ نہال پھر رہی تھیں، سامعہ، فرحان کی طرف سے سب شکوے دور ہو چکے تھے۔ اسے گلے لگاتے ہی اپنا سونے کا کنگن پہنایا اور دعائیں دیں۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے گھر کی خاموشی میں بہاریں اتر آئی ہوں ایسے میں تانیہ بھی سوگوار سی کمرے سے باہر آگئی تھی۔ طے یہی پایا تھا کہ ناجی اور شوکی کے نکاح کے بعد ہوٹل میں محدود لوگوں کے لیے شاندار سا کھانا ہوگا جو سامعہ فرحان کا ولیمہ اور ناجی کی شادی کا کھانا ہوگا۔ سامعہ کو شاہدہ بیگم نے اپنے کمرے میں آرام کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ زرتاشیہ اس کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ زبیر احمد، فرحان اور میاں افتخار باہر کے کاموں میں مصروف تھے، تقریباً سب مہمان گلریز، انجم سمیت زبیر کی طرف قیام پزیر تھے۔

کچھ دیر کے لیے زبیر اپنے کمرے میں آئے تو گلریز صاحب اور انجم وہیں آگئے۔

”زبیر! نرگھس اور افراسیاب آرہے ہیں۔“

”جی... جی اچھا۔“ زبیر چونک کر رکے اور پھر بولے۔

”یار! ہماری نادان بہن کو معاف کر دینا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔“

گلریز صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”بھائی صاحب! آپ فکر نہ کریں۔“

”بس سب گلے شکوے بھلا دیں۔“ انجم بولیں۔

”بھابی! آپ کو شرمندگی نہیں ہوگی۔“ وہ وثوق سے بولے۔

”نرگھس نے بہت دکھ دیا ہے لیکن اسے ہدایت مل گئی ہے۔“

”میں نے نہ نرگھس کو جانے کا کہا تھا اور نہ آنے سے منع کیا۔“

”جانتا ہوں سب اس کی اپنی خود سری اور ضد تھی، اب خاصا سبق مل گیا ہے۔“ وہ بولے۔

”بس اسے اماں جان سے معافی مانگنی ہوگی۔“

”ہاں! کیوں نہیں، یہ تو ضروری ہے۔“ انجم نے تائید کی۔

”بلکہ شاہدہ سے بھی معافی مانگے، بڑی نند ہیں۔“ گلریز صاحب نے کہا۔

”ایسا تو شاید ہی نرگھس کرے۔“ زبیر احمد نے کہا۔

”نہیں نہیں، اطمینان رکھو، اب وہ پہلے والی نرگھس نہیں رہی۔ صلح پسند ہوگئی

ہے۔ رشتوں کی قدر و قیمت جان گئی ہے۔“ گلریز صاحب نے یقین دلایا۔

”سچ پوچھئے تو میری زرتاشیہ نے بہت یاد کیا ہے ماں کو۔“

”کیوں نہیں کیا ہوگا، یہ رشتہ ہی ایسا ہے۔“

”چلیں اب بھولے کو بھولانہ کہیں، اللہ بہتری کرنے والا ہے۔“ انجم نے

خوشی سے کہا۔

”میں کچھ دیر کے لیے فرحان کے ساتھ کام سے جا رہا ہوں، پھر واپسی پر بات ہوگی۔“

وہ گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے بولے اور باہر نکل گئے، جبکہ انجم گلریز صاحب سے مخاطب ہوئیں۔

”افراسیاب کو بڑی مشکل سے آنے کے لیے راضی کیا ہے۔“

”اگر نہیں آنا چاہتا تھا تو منع کر دیتیں۔“ گلریز صاحب وہیں بیڈ پر دراز ہوتے ہوئے بولے۔

”نرگھس کی خواہش تھی۔“

”بیگم! یہ پھر نرگھس کی خواہش آگئی؟“ وہ کچھ بگڑ کر بولے۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے، آپ کو تو معلوم ہے کہ افراسیاب اسے بہت عزیز ہے۔“ انجم سنبھل گئیں۔

”یہ ایک الگ بات ہے۔“

”بس اب آپ نے پریشان نہیں ہونا۔ اگر مناسب ہوگا تو کچھ سوچیں گے۔“  
انہوں نے تسلی دی۔

”مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ نازک معاملات میں سوچ سمجھ کے حصہ لیتے ہیں۔“ انہوں نے پھر بھی احتیاط پسندی کا ثبوت دیا۔  
”مجھے معلوم ہے، میرا بیٹا تو خود بہت سمجھدار ہے۔“

”اب فرحان اور سامعہ کو کیا تحفہ دینا ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”وہی جو زرتاشیہ اور فرحان کے لیے لائے ہیں۔“ انجم نے خوشدلی کا مظاہرہ کیا۔

”گڈ! یہی میرا بھی فیصلہ تھا۔“ وہ خوش ہو گئے۔

”آپ میرا امتحان لے رہے تھے؟“

”نہیں، امتحان تو اس کا لیتے ہیں جسے جانتے نہیں۔“

”میں اس طرف جارہی ہوں، اماں جان نے تو اپنی اکلوتی ملازمہ کو بھی مایوں بٹھا دیا ہے۔“

”ارے! اس بچی کو، کیا نام ہے ناجی، ناجی کو بھی تو کچھ دینا ہے۔“ انہیں یاد آگیا۔

”آپ بے فکر رہیں، اسے بھی اچھا ساتھ دے دیں گے۔“ انجم نے مسکرا کر کہا۔  
”ٹھیک ہے آپ جانیے۔“ انہوں نے کہا تو وہ چل دیں۔

...☆☆☆...

موٹر سائیکل سے اتر کر رفیعہ بیگم سیدھی اماں جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئیں، جبکہ وہ چابی گھماتا ہوا ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا دیکھ کر اندر آگیا۔ مگر اگلے ہی لمحے جھٹکا سا لگا، تانیہ گھٹنوں میں منہ دیئے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ہلکی سی سرسراہٹ پر اس نے سر اٹھایا اور وہ تیزی سے پلٹا تو اس نے پکارا۔  
”رکو۔“ وہ رک گیا۔ وہ صوفے سے اٹھی، وہ اپنے ہی قدموں پر جمارہا۔

”کیا میں سمجھ لوں کہ تم آئے ہو؟“ ایک عجیب سی لرزش اس کے لہجے میں محو رقص تھی۔

”آپ کے لیے نہیں آیا۔“ بڑا نپاتلا اور کھرا جواب دیا گیا۔

”اوہ!“ وہ آہ کھینچ کر رخ موڑ کے کھڑی ہو گئی۔

”معاف کرنا، آپ کو ڈسٹرب کیا۔“

”ڈسٹرب کو اور کیا ڈسٹرب کرنا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں، یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔“ وہ باہر کے لیے آگے

بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ وہ بولی۔

”جانتی ہوں عادل ستار کا مسئلہ اب کرن ہے۔“

”تانیہ افتخار کو ابھی تک میرا اور میری منگیتر کا نام یاد ہے۔“ خاصے تعجب سے

پوچھا گیا۔

”مت جتاؤ۔“ وہ چلا اٹھی۔

”کہنا کیا چاہتی ہو؟“ وہ ایڑیوں کے بل گھوما۔

”ہنہ، میں نے کیا کہنا ہے؟“

”تو بار بار راستہ کیوں روکتی ہو؟“

”تم تو میرے راستے سے کب کے نکل چکے ہو۔“ بہت کربناک سالب ولہجہ تھا۔

”نکالا گیا تھا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ اس نے تسلیم کر لیا۔

”عجب بات ہے مس تانیہ افتخار، نکالتے وقت لہجہ اور تھا، آج یاد کرتے وقت

اور ہے۔“

”شاید...“

”ویسے میں ذرا جلدی میں ہوں صرف امی کو چھوڑنے آیا تھا۔“ وہ قطعی

اجنبی بن کر بولا۔



”تو جاؤ، کس نے روکا ہے؟“ وہ تلخ ہو گئی۔

”میں نے کب کہا کہ مجھے روکو۔“

”جاؤ، تم جاؤ، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔“ وہ یکدم ہذیبی انداز میں بولی۔

”آرام سے! یہ آواز صرف اپنے لیے سنبھال کر رکھو۔ اللہ حافظ!“ وہ بے دردی سے کہتا ہوا باہر نکل گیا۔

”ہاں! جاؤ جاؤ میں بھی چلی جاؤں گی۔“ وہ زور سے بولی اور پھر سے صوفے پر گھٹنوں میں منہ دے کر بیٹھ گئی۔

دراصل، شاہدہ، افتخار اور اماں جان حد درجہ مصروف تھے۔ وہ اپنے اندر جنگ لڑ رہی تھی۔ نہ کمرہ اچھا لگ رہا تھا اور نہ سب کے درمیان رہنا بھار تھا، اس لیے ڈرائنگ روم میں خود کو قید کر رکھا تھا۔ کسی کو اس کے لیے فرصت نہیں رہی تھی۔ ایسے میں سامعہ نے عادل کو جاتا دیکھنے کے بعد اس کے پاس آنے کا فیصلہ کیا۔

”تانیہ!“ سامعہ نے دھیرے سے پکارا۔

”ہوں۔“

”ایسے کیوں بیٹھی ہو؟“ سامعہ نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

”ویسے ہی۔“

”کیوں مضطرب اور تنہائی میں ہو، باہر اتنی گہما گہمی ہے۔“ سامعہ نے بہت مدھم سے لہجے میں کہا تو وہ طنزیہ سی ہنسی ہنس دی۔

”مجھے میری ماں نے تنہا کر دیا ہے، اپنے بیٹے اور ملازمہ کی خوشی انہیں بہت عزیز ہے۔“ وہ تیکھے انداز میں بولی۔

”ایسے نہیں سوچتے تانیہ ڈیر! میرے پاس ماں نہیں تھی تو میں نے کن قیامتوں کا سامنا کیا، کاش! میں بتا سکتی۔“ وہ اپنی ماں کو یاد کر کے افسردہ سی ہو گئی۔

”سامعہ جی! میرے پاس کچھ نہیں آپ کے پاس سب کچھ ہے، میرے بھائی کی محبت ہے۔ میرے ماں باپ کی محبت مل گئی ہے۔“

”پہلی بات تو یہ کہ میں آپ کی بھابی ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی کہ آپ مجھے اسی طرح پکارو۔ دوسری بات یہ کہ ماما نے آپ کی خوشی کے راستے کبھی روکے نہیں۔ آپ نے جو چاہا وہی کیا۔“

”تو بھابی جی! وہ روکتیں مجھے، مگر وہ تو صرف اپنی اماں کو راضی رکھنے کی فکر میں رہیں۔“

”نہیں، وہ بہت اچھی ماں ہیں۔ اپنے دل سے پوچھو اور بہت پریشان ہیں کہ کاش! وہ کچھ کر سکتیں۔“ سامعہ نے اس کے دل سے میل صاف کرنے کے لیے سمجھایا۔ وہ چپ رہی۔

”عادل نے کیا کہا؟“ کچھ دیر بعد اس نے نرمی سے پوچھا۔

”کہ وہ جاچکا ہے۔“ اس کا گلا رندھ گیا۔

”متانہ! یہ نقصان آج کی بات نہیں، بلکہ یہ تو وہ نقصان ہے جس کا احساس آپ کو تاحیات رہے گا۔ اس کا جانا سچ ہے تو دل سے قبول کر کے خوش رہنے کی کوشش کرو۔“

”جانتی ہوں، اسی لیے باہر جانا چاہتی ہوں۔“ وہ شکستہ سی بولی۔

”شباباش! میں بھیجوں گی وہاں جہاں ماں جیسی محبت اور توجہ ملے گی، جب تک چاہو وہاں رہنا۔“ سامعہ مسز جیری کے خیال سے سرشار ہو کر بولی۔

”کیا مطلب...؟“ وہ بولی۔

”مطلب بعد میں، فی الحال اٹھو اور تیار ہو جاؤ۔ ناجی کی خوشی ہم نے ہی منانی ہے۔“

”مگر میرے دل میں خوشی بچی ہی نہیں۔“

”دیکھو تانی! جو ہونا تھا ہو گیا، عادل آپ کی گم گشتہ محبت ہو چکا ہے۔ اب خوشی کہیں اور تلاش کرنی ہوگی۔“

”دکھ یہ ہے کہ مجھے تو محبت کا دعویٰ نہیں تھا، مگر عادل تو یہ کہتا تھا، پھر بھی اس نے مجھے بھلا دیا؟“

”محبت کی زبان ہوتی ہے کہ کھونا نہیں، جس کو مل جائے خوش نصیب ہے وہ، کھودو تو پھر رونا نہیں، محبت کی فصل دوبارہ اگاؤ تو دوبارہ پھول دیتی ہے، مگر پتھریلی زمین میں محبت بوئی نہیں جاتی۔ عادل کے پتھر دل میں محبت اب کہاں بچی ہے، یہ بھی تو اس کی محبت ہی تھی کہ اس نے آپ کے لیے آپ کو چھوڑ دیا۔“ سامعہ نے اس کی بھیگی پلکیں صاف کرتے ہوئے کہا تو وہ ہونٹ چبانے لگی۔

”پتہ نہیں کیوں، وہ میری محبت بن گیا ہے، جتنا بھولنا چاہتی ہوں، اتنا ہی قریب محسوس کر رہی ہوں۔“ پہلی بار اس نے اعتراف محبت کیا۔

”بس جانو! یہ معاملاتِ عشق کچھ ایسے ہی ہیں، شکر ہے یہ تو پتہ چل گیا کہ تمہیں عادل سے محبت ہے۔ محبت احساس بھی کھودے تو عمر بھر شرمندگی

رہتی ہے۔“ سامعہ نے حسبِ عادت اسے سنبھالنے کی کوشش کی تو وہ بت کی مانند اسے دیکھتی رہی اور سوچنے لگی۔

”ہاں! یہ ٹھیک ہے کہ مجھے ٹوٹ کر یہ احساس ہو گیا ہے... میں عادل سے محبت کرتی ہوں۔“

☆☆☆☆...

رفیعہ بیگم کو اماں جان نے فرحان اور سامعہ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ رفیعہ بیگم کو ہلکی سی حیرت ہوئی مگر حسبِ عادت خوش ہو کر بولیں۔

”بہت بہت مبارک ہو۔“

”رفیعہ! تم سمجھتی ہو کہ یہ خوشی کا سماں ہے لیکن ادھورا اور نامکمل ہے۔“ اماں جان نے بہت دھیرے سے کہا تو وہ کچھ نہ سمجھیں۔

”کیا مطلب؟“

”میری تانیہ اداس ہے، میری شاہدہ دلگیر ہے۔“ ان کی آواز بھراگئی اور آنکھوں میں نمی آگئی۔

”کس وجہ سے...؟“

”کیا ممکن نہیں کہ تانیہ کے لیے ہم عادل مانگیں...“ ایکدم ہی انہوں نے پوچھا۔

”اماں جان! جانے کن مراحل سے گزر کر تانیہ کو چھوڑنے کا فیصلہ قبول کیا اور بڑی مشکل سے میاں ستار کو سمجھایا بچھایا۔ بھائی کو بھائی سے جدا نہ کرنے کے لاکھ جتن کیے، مگر اب وہ ممکن نہیں...“ رفیعہ بیگم ان کا ارادہ بھانپ کر بولیں۔

”دیکھ لو رفیعہ بی! عادل تانیہ کی بچپن کی مانگ ہے۔“

”کاش! وہ فیصلہ تانیہ اور شاہدہ نہ بدلتیں۔“

”ارے وہ تو نادان ہیں، تم ہم سے بات کرو۔“

”اماں جان! شرمندہ نہ کیجیے۔ کرن کو تانیہ ہی سمجھیں، سب تیاری ہو چکی، زبان کوئی چمڑے کی شے نہیں اور جو رشتے بھرپور نفرت سے ختم کیے جائیں ان میں کوئی حرارت نہیں بچتی۔“ رفیعہ بیگم نے خاصی دانشمندی سے سمجھایا۔

”بس، ہماری تو دونوں بچیوں کے نصیب ہی خراب نکلے۔“ ان کا اشارہ زرتاشیہ اور تانیہ کی طرف تھا۔

”آپ فکر مند نہ ہوں، اللہ ان کا اچھا سا سبب بنائے گا۔ ویسے بھی یہ فیصلے آسمان پر ہوتے ہیں۔“

”کہتی تو سچ ہو... مگر...“

”اگر مگر کو چھوڑیں، اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ خوشی کا موقع ہے، بھرپور طریقے سے خوشی منائیں۔“

”رفیعہ! کیا کریں، ماں ہیں۔ شاہدہ اور زبیر کے دکھ کو اپنے اندر محسوس کر رہے ہیں۔“

”اللہ بہتری کرے گا۔ اگر انیس بیس کی بھی گنجائش ہوتی تو میں عادل کو سمجھا بچھا لیتی، مگر اب لڑکی والوں کی عزت کا سوال ہے۔ مجھے معاف کر دیں۔“

رفیعہ نے بہت خلوص سے ان کے ہاتھ تھام کر کہا۔

”ارے نہیں، کاہے کی معافی؟ بچوں کی خوشیاں دیکھنی مبارک ہوں۔ اللہ مبارک کرے۔“

”بس آپ کی دعائیں چاہئیں۔“

”بس دعائیں ہی ہیں۔ ہماری بہو بیگم آج آرہی ہیں، اللہ نے ہماری دعائیں قبول کر لیں۔ انہیں ہدایت کا راستہ دکھادیا۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، دیکھیں کسی افسردگی کے ساتھ کوئی نہ کوئی خوشی بھی جڑی ہوتی ہے۔“ رفیعہ بیگم نے مسکرا کر کہا۔

”بڑی بیگم صاحبہ! زرتاشیہ بی بی آپ کو بلا رہی ہیں۔“ شوکی نے آکر کہا تو وہ بولیں۔

”ارے تو وہاں کیا کر رہا تھا؟ بہانے بہانے سے ناجی کو دیکھنے جاتا ہے؟“

”وہ... نہیں... وہ“ وہ بوکھلا گیا۔

”جانتے ہیں ہم تمہاری وہ، وہ کو، جائو، خبردار جو اب وہاں پھٹکے بھی۔“

انہوں نے لتاڑا وہ بھاگ نکلا۔ رفیعہ بیگم بات سمجھ کر ہنسنے لگیں۔

”اب کل رات کو ناجی کی شادی ہے اور فرحان کا ولیمہ ہے، سب نے آنا ہے۔“ اماں جان نے یاد دہانی کرائی۔

”کیوں نہیں۔“

”بس دل صاف کرلو، رشتے انمول ہوتے ہیں۔“ وہ بولیں۔

”اللہ کرم کرے گا، سب رشتے برقرار رہیں گے۔“ انہوں نے بھی جواباً کہا۔

...☆☆☆...

وہ احتشام کو سلا کر کمرے سے باہر آنے کی تیاری کر رہی تھی کہ زرتاشیہ آگئی۔ اس نے بہت سا سامان اٹھا رکھا تھا۔



”یہ کیا...“ اس نے پوچھا۔

”یہ آپ کا ڈریس، یہ جیولری اور یہ چوڑیاں اور پرس۔“ زرتاشیہ نے بیڈ پر ایک ایک کر کے سب چیزیں رکھتے ہوئے کہا۔

”مگر یہ سب چیزیں آپ کے لیے آئی ہیں۔“ سامعہ نے بڑی سادگی سے کہا۔

”بات تو ایک ہی ہے سامعہ جی۔“ وہ ادا سے بولی۔

”نہیں، بات ایک نہیں ہے۔“

”کیسے...“

”ان سب چیزوں میں تمہارے خواب سچے ہوئے ہیں۔“

”جب حقیقت میں کچھ نہیں تو خوابوں کا کیا...؟“

”یہ لباس تم نے ہی پہننا ہے۔“ وہ ٹال گئی۔

”نہیں، یہ میری خوشی ہے۔ کیا آپ میری خوشی کا احترام نہیں کریں

گی؟“ زرتاشیہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”دیکھو، مجھے اور شرمندہ نہ کرو۔“

”سامعہ جی! اگر آپ سمجھ رہی ہیں کہ میں یہ شرمندہ کرنے کے لیے کر رہی ہوں تو بہت افسوس کی بات ہے۔“ وہ دکھی ہو گئی۔

”زرتاشیہ! ایسی بات نہیں ہے یہ سب چیزیں تم نے بہت چاہ سے بنوائی ہیں۔“

”چاہت نہ رہی تو چاہ سے بنی ان چیزوں کا کیا کروں؟“

”پلیز، زرتاشیہ میں بہت نادم ہوں۔“

”کیوں؟ بھی؟ یہ تو مقدر کی بات ہے، محبت مقدر سے ملتی ہے میں بہت

خوش ہوں کہ آپ کی محبت آپ کو مل گئی۔ آپ میری خوشی کو غلط معنی

دے رہی ہیں۔ آپ قیمتی ہیں یا یہ چیزیں؟ مجھے خوشی ہوگی کہ آپ یہ پہنیں۔“ وہ بہت پیار سے اس کے گلے لگ گئی۔

”زرتاشیہ! آپ بہت عظیم ہیں۔“ اس نے سرگوشی کی۔

”صرف عظیم، عظیم الشان کہئے جناب۔“ وہ ہنس دی۔

”ہاں عظیم الشان۔“

”اچھا! اب آپ میرے پاس آجائیں۔ ناجی کو ابٹن لگائیں۔ مہندی لگانی ہے اور... اور...“ وہ رک گئی۔

”اور...؟“

”اور میری ماما آرہی ہیں، ان کے لیے اچھی اچھی چیزیں بنانی ہیں، پاپا کا کمرہ تو ٹھیک سے سیٹ کرادیا ہے میں نے۔“

”اچھا! اس لیے بہت خوش ہو۔“

”ہاں، ایک ساتھ اتنی ساری خوشیاں مل رہی ہیں۔“ پلکوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے وہ بولی۔

”اللہ آپ کی خوشیوں کو ہر بری نظر سے بچائے۔ آمین۔“ اس نے دعا دی۔

”جزاک اللہ۔ اب چلیں۔“

”آپ ایسا کرو، تانیہ کو بھی ساتھ لے کر چلو۔ میں احتشام کو اماں جان کے

کمرے میں سلا کر آتی ہوں۔“

”تانیہ... تو...“

”اس کو کمپنی کی ضرورت ہے۔ بہت تنہا ہے، اسے بہلاؤ۔“ سامعہ نے کہا۔

”اوکے! میں کوشش کرتی ہوں۔“ زرتاشیہ جھپاک سے باہر نکل گئی اور

سامعہ بیڈ پر بیٹھ کر ان سب چیزوں کو دیکھنے لگی جو زرتاشیہ نے چن چن کر

خریدی تھیں۔ عروسی جوڑا، بڑی شرمیلیں مسکراہٹ کے ساتھ پسند کیا تھا۔

”اوہ! سب الٹا ہو گیا۔ معصوم سی زرتاشیہ...“ وہ بھیگی آنکھوں کے ساتھ سوچ کے رہ گئی۔

...☆☆☆...

رات کھانے کے بعد گرما گرم بات چیت کا سلسلہ جاری تھا کہ فرحان سب کے درمیان سے کھسک کر سامعہ کے پاس آ پہنچا۔

”آپ۔“

”جی! بہت مہمان داری ہو گئی، اب آپ اپنے کمرے میں چلیے۔“

”فرحان! گھر میں مہمان جمع ہیں، کیا سوچیں گے؟“ وہ موقع کی نزاکت سمجھانے لگی۔

”سامعہ! میں کسی کی پروا کرنے والا نہیں، تم میرے ساتھ چلو۔“

”آپ اتنے ضدی ہو گئے ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”ایک بار کہو آنا ہے یا نہیں۔“ وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

”آجائوں گی، مگر...“

”مگر کیا یار۔“ وہ جھنجھلایا۔

”ماما خود کہیں گی، مجھے شرم آتی ہے۔“ وہ کہتے کہتے منہ بنا کر چپ ہو گئی۔

”کس بات کی شرم؟“

”بس مجھے نہیں پتہ، ماما سے آپ بات کر لیں۔“ وہ بولی۔

”اوکے! میں بلاتا ہوں ماما کو۔“ وہ چھلاوے کی مانند گیا اور اس کی حیرت ختم

بھی نہیں ہوئی تھی کہ وہ شاہدہ بیگم کو لیے آ گیا۔

”سامعہ! فرحان ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ وہ بولیں۔

”وہ... وہ...“ وہ ہکلائی۔

”آپ کی جگہ وہیں ہے، ایسا کرو احتشام کو یہیں رہنے دو، ہمارے پاس۔“

”نہیں، یہ آپ کو ڈسٹرب کرے گا۔“

”یہ ہماری پیاری سی جان ہے۔“ شاہدہ بیگم احتشام کے اوپر جھک کر بولیں۔  
”سو سوئیٹ ماما۔“ وہ خوش ہو گیا۔

”ماما! میں ذرا باہر کام وغیرہ کا جائزہ لے لوں۔“ سامعہ نے کہا تو فرحان کو پتنگے لگ گئے۔

”جی ہاں! لے لیں اور پھر باہر ہی آرام فرمائیے گا۔“ وہ باہر نکل گیا تو شاہدہ بیگم کو ہنسی آگئی۔

”سامعہ! میں خود دیکھ لیتی ہوں، میرے بیٹے کو ناراض نہ کرو۔“ انہوں نے کہا تو وہ گلرنگ سی ہو کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

...☆☆☆...

نرگھس کے لیے سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ اتنے عرصے میں بھی کچھ نہیں بدلا تھا۔ سب نے اس کی دل سے آؤ بھگت کی تھی۔ اماں جان نے، شاہدہ بیگم

نے اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔ اس کی ہر بھول معاف کر دی۔ زبیر احمد کو بھی معاف کر دینے کا حکم دیا۔ زبیر احمد صرف گردن ہلا کر کمرے میں آگئے تو نرگھس نے بڑی ہمت کی، کمرے میں آکر دھیرے سے انہیں پکارا۔

”زبیر مجھے معاف کر دیں۔“ وہ پلٹے۔

”کس کو کہہ رہی ہو؟“

”آپ کو... مجھے معاف کر دیں۔“ وہ منمنائیں۔

”کمال ہے، مجھے ظالم جابر انسان سمجھتی ہو۔“

”یہ نے بہت بڑی غلطی کی۔“

”تو آپ کی واپسی اس کی تلافی ہے۔“ وہ بولے۔

”پھر بھی میں بہت شرمندہ ہوں۔“

”دیکھو! اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی کہ غلطی کرنے والے کو غلطی کا احساس بھی ہو گیا۔ میں تو ویسا ہی ہوں جیسا چھوڑ کر گئی تھیں۔ البتہ مجھے یہ

ندامت ضرور ہوتی تھی کہ جوان بیٹی کی نظروں کا سامنا کیسے کروں؟“

”زبیر! آپ نے مجھے منایا بھی تو نہیں۔“ اس نے گلہ کیا۔

”مجھے ناراض ہونے کی وجہ معلوم ہوتی تو منالیتا۔“

”بس مجھے معلوم ہے کہ آپ نے ضد لگائی۔“

”میں ضدی نہیں، مجھے اتنا تو سمجھا ہوتا۔“

”بس زرتاشیہ کی وجہ سے۔“ وہ احساسِ ندامت کے باعث ہکلا کر بولیں۔

”اچھا، میرے لیے نہیں، بیٹی کے لیے آئی ہو۔“ وہ بھی شکوہ کر بیٹھے۔

”پھر لڑائی والی بات...؟“

”خدارا، ابھی تو معافی مانگی ہے اور پھر لڑائی۔“ انہوں نے یاد دہانی کرائی۔

”سوری! اب میں لڑائی ہر گز نہیں کروں گی۔“ وہ ایکدم دھیمے سے لہجے میں بولیں۔

”نرگھس! لڑائی کرو، لڑائی بھی زندگی کا احساس ہے، لیکن لڑائی میں زندگی کو

بھول جانا بری بات ہوتی ہے۔“ زبیر احمد نے پورے اعتماد سے اس کے

کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ کھل اٹھیں۔

”کاش! پہلے ایسے سمجھاتے۔“ شکوہ اور آرزو ایک ساتھ مل گئے۔

”میرا خیال تھا کہ تم سمجھدار ہو، اور میں ٹھہرا ان رومانٹک آدمی۔“ انہوں

نے بھولے پن کا مظاہرہ کیا۔

”مجھے افراسیاب نے بہت سمجھدار بنایا ہے۔“

”ہاں! افراسیاب سے تو مل لوں، کہاں رہ گیا بچہ؟“ زبیر احمد کو یکدم خیال

آیا۔

”باہر ہی، آپ سے بات کرنی ہے۔“



”بولو۔“

”افراسیاب باہر جا رہا ہے۔ میرا دل ہے کہ زرتاشیہ کے لیے۔“

”دشش، بالکل خاموش رہو، زرتاشیہ خود فیصلہ کرے گی۔“ انہوں نے انگلی

ان کے ہونٹوں پر رکھ کر خاموش کیا اور باہر چلے گئے تو نرگس نے اپنے

کمرے کی ہر چیز کو پیار بھری نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ زرتاشیہ نے ماں

کی خوشی کی خاطر سب محبتیں جمع کر کے سجادی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر

وارڈروب کھولی تو اس میں وہ سب کپڑے موجود تھے جو وہ جاتے وقت چھوڑ

گئی تھیں۔ الماری بند کر کے پلٹیں تو زرتاشیہ کو پشت پر مسکراتے ہوئے کھڑا پایا۔

”مما! سوئیٹ ممما!“ وہ گلے لگ گئی۔

”میری جان میری گڑیا!“ نرگس نے چومتے ہوئے کہا۔

”بس ایسے ہی ہم رہیں۔“ وہ اٹھلائی۔

”اللہ آپ کو ہر خوشی دے آمین۔“ ایکدم ہی وہ کچھ سنجیدہ سی ہو گئی تو

زرتاشیہ سمجھ گئی کہ وہ ایسا کیوں کہہ گئیں۔

”آپ ہیں، پیپا ہیں مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“

”زرتاشیہ! پلیز میری ایک بات مان لو۔“

”جی ممما۔“

”افراسیاب باہر چلا جائے گا، اگر کہو تو میں۔“

”پلیز ممما! محبت قربان تو کی جاتی ہے مگر بدلی نہیں جاتی۔“

”فرحان نے تم سے محبت نہیں کی؟“

”ہاں! مگر میں کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی۔“

”کوئی زبردستی نہیں ہے۔ افراسیاب بھی بالکل ایسا نہیں چاہتا، وہ بھی پہلے تم

سے بات کرے گا۔“

”اس کا مطلب آپ نے افراسیاب سے ایسی بات کی؟“

”نہیں وہ... دراصل مجھے اس کے جانے سے پریشانی ہے۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی جھوٹ بول گئیں۔

”پلیز! مجھے قابل ہمدردی نہ بنائیں۔“

”اچھا! موڈ ٹھیک کرو، چلو باہر چلتے ہیں۔ ڈھولک کی آواز آرہی ہے۔“ وہ ٹال گئیں۔

”ہاں محلے کی لڑکیاں آگئی ہیں، ناجی کو مہندی لگ رہی ہے۔“ وہ بھول بھال کر خوش ہو کر بولی تو نرگھس کو اس کی خاطر مسکرا ناپڑا۔

...☆☆☆...

رات کے آخری پہر ہی سب سوئے تھے اور اس پہر بھی زرتاشیہ کمرے میں خاموشی سے اشک بہا رہی تھی۔ کھڑکی میں سے سب کے سونے کا اندازہ کر کے افراسیاب نے کمرے سے باہر قدم رکھے اور ہولے سے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ وہ روتے روتے چونکی، چند لمحے دستک ہوئی پھر افراسیاب کی آواز آئی۔

”زرتاشیہ، نیند کا کھیل میرے ساتھ مت کھیلو۔“ وہ نادام سی ہو کر اٹھ بیٹھی۔

”اندر آجائیں۔“

”شکریہ۔ یہ سخت نامناسب وقت ہے کسی کو بے آرام کرنے کا، لیکن جو پہلے سے بے آرام ہو، اسے آرام دینے کا بھی یہی مناسب وقت ہے۔“ بڑے تحمل سے وہ بولا تو وہ کچھ نہ بولی۔ بس نچلا ہونٹ چبانے لگی۔

”مجھے نئی جگہ نیند مشکل سے آتی ہے، لیکن آپ تو اپنے کمرے میں، اپنے بستر پر ہو۔“ بڑا نوکیلا سا سوال تھا جو اس کا دل چھید گیا۔

”دل اداس ہو تو...؟“

”اس کا مطلب ہے آپ اداس ہو، اپنے فیصلے کے بعد؟“ ایک اور تیکھا سوال کیا گیا۔

”پلیز! غلط نہ سمجھئے۔ بس ویسے ہی اداس تھی۔“

”اور ویسے ہی رو بھی رہی تھیں؟“

”میں کیوں روؤں؟“ وہ صاف مکر گئی۔

”جھوٹ، جھوٹ بھی بولتی ہو؟“

”آپ پلیز مجھے سونے دیں۔“ وہ چڑ گئی۔

”محبت کو حوصلے سے قربان کرتے ہیں۔“

”کون سی محبت؟“ وہ مضطرب سی بولی۔

”پہلی محبت۔“

”آپ کیوں جرح کر رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ مجھے آپ کو سوچنے کا پروگرام دیا گیا ہے۔“ وہ بھی تیزی سے بولا۔

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ ٹال گیا۔

”آپ میری وجہ سے فکر مند ہیں، میں پروگرام ہوں آپ کے لیے؟“ وہ تقریباً تلملا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ہاں! اسی لیے جاننا چاہتا ہوں۔“ غیر ارادی طور پر جو منہ سے نکل گیا وہ واپس لینا مشکل تھا۔

”کیوں، کس لیے، کس نے دیا آپ کو یہ ہمدردی کا پروگرام؟ آپ جس سے محبت کرتے ہیں اسے ہی سوچیں۔“ وہ خاصا کچھ کہہ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

”مجھے کیا کرنا ہے، اچھی طرح معلوم ہے۔“

”توپلیز! مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں، مجھے مہربانی کی ضرورت نہیں۔“ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو وہ غصے ہو گیا۔

”میں کسی کی ذات میں دلچسپی نہیں لیتا، آپ کی ماما اور میری امی کی مرضی ہے یہ۔“

”اچھا تو ان کے کہنے پر آپ مجھ سے ہمدردی فرمائیں گے۔“ وہ اور زیادہ

برامنہ بنا کر بولی۔

”ہنہ! تم احمق اور نادان ہو۔“ وہ ضبط نہ کر سکا تو جل کر یہ کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا، حالانکہ کیا کہنا چاہتا تھا، کیا تھا دل میں یہ بتانے کی حسرت تھی، زرتاشیہ نے موقع ہی نہیں دیا۔ جبکہ زرتاشیہ کو اس بات نے ہی رلا دیا کہ افراسیاب کو حکماً میرا خیال رکھنے کو کہا گیا ہے۔ یعنی اسے مجبور کیا گیا ہے کہ وہ مجھ پر رحم کھائے۔ کیوں؟“ وہ شدت غم سے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

”مما، کیا آپ افراسیاب سے میرے لیے محبت مانگ رہی ہیں؟ ان کے اور میرے درمیان تو کبھی ایسا کچھ خیال میں بھی نہیں آیا پھر آپ نے کیوں انہیں یہ کہا کہ وہ میرے لیے سوچیں...؟“ روتے روتے وہ ممّا سے سوال جواب کر رہی تھی۔

...☆☆☆...

آج کا دن بہت مصروفیت کا تھا۔

ناشتے کے بعد میاں افتخار شوکی کو لے کر مارکیٹ چلے گئے، اسے دلہا کا لباس جوتا وغیرہ دلوانے کے لیے، جبکہ ایاز اور فرحان بھی اسی مقصد سے چلے گئے۔ ناجی اور سامعہ کو پارلر لے جانے کی ذمہ داری تانیہ اور زرتاشیہ نے لے لی تھی۔ سب کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ افراسیاب حد درجہ ڈسٹرب کمرے میں بند تھا۔ انجم، بیٹے کو اچھی طرح سمجھتی تھیں، وہ اس کے پاس آگئیں۔

”کیا بات ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“

”کچھ تو ہے، بجھے بجھے سے ہو۔“

”بجھا ہوا ہوں، محض آپ کی اور نرگھس پو کی وجہ سے۔“ وہ بھڑک اٹھا۔

”کیا مطلب؟“

”امی! زرتاشیہ کی نظروں میں میرا مقام رہنے دیں پلیز۔“

”مقام دینے کو کہا ہے، اسے چاہتے ہو تو اس کے مقام پر رکھو بھی۔“ انجم کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولیں۔

”کیسی باتیں کرتی ہیں آپ، مقام کوئی بازار سے خریدی گئی چیز نہیں، زرتاشیہ مجھے نہیں چاہتی، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

”آپ تو اس سے محبت کرتے ہو، سچ یا جھوٹ، ایک بات کرو۔“

”وہ اور بات ہے۔“

”اور بات نہیں ہے، آپ اسے ہمیشہ سے چاہتے ہو، میں ماں ہوں، اچھی طرح جانتی ہوں۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وہ تو مجھ سے محبت نہیں کرتی۔“ وہ بچھ سا گیا۔

”افراسیاب! بیٹا اسے اپنی محبت کا احساس دلاؤ۔ نرگھس اس کے لیے فکر مند ہے اور پھر آپ کی خوشی میرا ارمان ہے۔“ انجم نے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”امی! وہ غلط سمجھ رہی ہے۔“

”تو اسے ٹھیک سے سمجھاؤ۔“

”کیسے؟“ وہ جھنجلا گیا۔

”محبت سے۔ اسے اپنی محبت کا یقین دلاؤ۔“

”تو آپ کے خیال میں وہ محبت کو کرائے کا گھر سمجھ کر بدل لے گی؟“

”دیکھو، فرحان کو اس نے سامعہ کے لیے چھوڑا ہے، وہ آپ کو قبول بھی کر سکتی ہے۔“

”محبت بھیک نہیں، میں اس سے محبت مانگوں۔“

”بھئی کون کہہ رہا ہے؟“



”اچھا! پلیز فی الحال مجھے ڈسٹرب نہ کریں۔“

”چلو موڈ ٹھیک کرو، باہر نکلو، گپ شپ کرو۔“ انجم نے اس وقت موضوع بدلنا مناسب سمجھا۔

”آپ جائیں، میں آتا ہوں۔“

”اچھا ساتیار ہونا ہے۔“ انجم نے پیار بھری تاکید کی۔

”اوکے۔“ وہ مسکرا دیا۔

”بیٹا! اتنی محبت کرتے ہو، اس محبت کا ہی نتیجہ ہے کہ اللہ پاک نے زرتاشیہ کسی اور کو نہیں دی۔“ انجم نے رک کر کہا۔

”مگر افراسیاب جب تک زرتاشیہ کے لبوں سے اپنے لیے محبت کا لفظ نہیں سنے گا تب تک کچھ قبول نہیں کرے گا۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولا۔

”چلو یونہی سہی۔“

”ابو کہاں ہیں؟“

”وہ زبیر بھائی کے ساتھ کہیں گئے ہیں۔“

”اچھا۔“

”اب باہر آجاؤ۔ شاباش۔“

”کچھ دیر تک آتا ہوں۔“

انجم باہر چلی گئیں تو وہ صوفے پر آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ زندگی کہاں اور کس موڑ پر آکر اظہار کا اصرار کر رہی تھی۔

...☆☆☆...

وہ بیوٹی پارلر میں تھی کہ صائمہ نے اپنا موبائل فون اسے لا کر بات کرنے کے لیے دیا۔

”تھینک گاڈ! ڈارلنگ تم کو من چاہا لائف پارٹنر مل گیا، سوٹ ہوم کے واسطے جتنی پرابلمز ہوئیں، سب اچھی ہو گئیں۔“ مسز جیری کی محبت میں ڈوبی آواز سن کر وہ حیران و پریشان سی جذباتی ہو گئی۔

”مسز جیری! اوہ! اس وقت میں بہت خوش ہوں، آپ نے اس وقت مجھے فون کیا؟ سچ مجھے ماں کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔“

”جھوٹ! فون پر تو صائمہ بیٹی نے سب کچھ بتایا۔“ انہوں نے چھیڑا۔

”میں نے اور فرحان نے رات فون کرنا تھا، آپ کو آج کی فوٹوز میل کرنی تھیں، میرا یقین کریں۔“

”آئی نو، مائی ڈاٹر، مجھے چھوٹو کی فوٹو ضرور میل کرو۔ فرحان کے واسطے بہت سا پیار... گاڈ تمہیں اپنا پیار دیتا رہے۔“

”کاش! آپ یہاں ہوتیں۔“ اسے رونا آگیا۔

”اوں، کاہے کو روتا، اچھا سا تیار ہو کر جائو اور تینوں میرے پاس آنا، پورے سکس منٹھ کے واسطے۔“ مسز جیری کا اپنا گلا بھی رندھ سا گیا۔

”اوکے، اپنا خیال رکھئے گا۔“

”اوکے، بائی! سوئیٹ ہارٹ۔“ مسز جیری نے بھی جواباً! کہا اور فون بند ہو گیا۔ اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں تو صائمہ نے ڈانٹا۔

”یہ کیا، سارا میک اپ خراب کر دیا۔“

”صائمہ بھابی! مسز جیری رو رہی تھیں۔“

”میں جانتی ہوں، مگر وہ خوشی کے آنسو تھے۔“

”کاش! کاش اس خوشی کے دن وہ میرے ساتھ ہوتیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ آپ سچ مچ کاہنی مون منانے کے لیے ان کے پاس چلے جانا۔“ صائمہ نے شرارت سے کہا تو وہ شرمائی۔

”ہمارا بیٹا ہے اور اب ہنی مون...؟“

”بیٹا، دادا، دادی کو دے کر جانا۔“

”اور مسز جیری کو ہم سے زیادہ احتشام کا انتظار ہے۔“

”یہ تو ہے کیونکہ وہ باقاعدگی سے احتشام کے لیے ای میل کرتی تھیں۔ ایاز اپنی طرف سے انہیں جواب دیتے تھے۔“

”سامعہ! اب آپ بالکل نہیں روئیں گی پلیز۔“ بیوٹیشن نے سامعہ کو مسکرا کر تاکید کی تو اس نے اثبات میں گردن ہلادی۔

دوسری کرسی پر ناجی کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ ایک بیوٹیشن اس کا ہیئر اسٹائل بنا رہی تھی۔ آئینہ دیکھ کر ناجی خود کو پہچان نہیں پا رہی تھی۔ اپنی خوش قسمتی پر اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ اماں جان نے اس کے لیے ہلکا پھلکا سونے کا سیٹ، خوب صورت کپڑے سب بنا رکھے تھے۔ وہ سچ سنور کر بے حد حسین لگ رہی تھی۔

”شوکی تو غش کھا کر گر جائے گا۔“ زرتاشیہ نے چھیڑا تو ناجی گلرنگ ہو گئی۔

”شوکی کون ہے؟“ بیوٹیشن نے پوچھا۔

”اجی وہ ان دلہن صاحبہ کے دلہا صاحب ہیں مسٹر شوکت عرف شوکی۔“ تانیہ نے خاصی شوخی کا مظاہرہ کیا۔ سامعہ نے خوشی محسوس کی۔ ہلکی سی گردن گھما کر سبزی مائل شلوار سوٹ میں آئی لائزر لگاتی تانیہ کو دیکھا۔

”اور سامعہ جی کے دلہا صاحب کا کیا نام ہے؟“ اسی بیوٹیشن نے بے خیالی میں پوچھ لیا تو زرتاشیہ کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

”وہ میرے بھائی ہیں فرحان۔“ تانیہ نے بتایا۔ زرتاشیہ نے خاموشی سے پارلر سے باہر کا راستہ اختیار کیا۔

”صائمہ بھابی!“ سامعہ نے بہت دھیرے سے پکارا۔  
”ہوں۔“

”پلیز! آپ زرتاشیہ کے پاس جائیں۔“ اس نے دھیرے سے صائمہ کے کان میں کہا۔ وہ سمجھ گئیں۔

”اوکے! تم فکر نہ کرو۔“ صائمہ نے کہا تو اسے کچھ اطمینان ہوا۔

صائمہ اسی طرف چلی گئی جس طرف سے زرتاشیہ گئی تھی۔

کتنی عجیب بات تھی کہ اس موقع پر دو خوش تھے اور دو ناخوش۔ سامعہ اور فرحان کی پائیدار محبت کی تکمیل کا دن تھا۔ ناجی اور شوکی کی رفاقت کا دن تھا، جبکہ تانیہ اور زرتاشیہ کے دکھ اور اضطراب کی شدید مگر دبی دبی تکلیف کا دن تھا۔ سامعہ کو ان دونوں کی دلی کیفیت کا بخوبی اندازہ تھا، وہ جانتی تھی کہ تانیہ کے دل میں عادل کی جدائی نے کیا قیامت برپا کر رکھی ہے اور وہ کس طرح اندر ہی اندر گھل رہی ہے۔ زرتاشیہ تو کھلی کتاب تھی، اس کے لبوں پر مسکان تھی تو نین کنول پانیوں میں تھے۔ سب سے کٹھن گھڑی اور تکلیف دہ مرحلہ زرتاشیہ کی زندگی کا ہی تھا۔ بچپن کی محبت، کس قدر اعلیٰ ظرفی کے ساتھ سامعہ کی جھولی میں ڈال دی تھی۔ سامعہ کے وجوہ پر اتری اس بہار کا سہرا زرتاشیہ کو ہی جاتا تھا۔ زرتاشیہ نے دل ہی دل میں اس کے لیے پروردگار سے ڈھیروں دعائیں کر ڈالی تھیں۔

...☆☆☆...

سب ہوٹل جانے کے لیے تیار تھے۔

صرف ناجی اور شوکی کے نکاح کی وجہ سے سب گھر میں موجود تھے۔ جو نہی نکاح خواں رخصت ہوا تو مبارک، مبارک کے شور میں کسی کو کسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ زرتاشیہ کی پلکیں بری طرح بھیگ گئیں۔ نظر بچا کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ افراسیاب تیار ہو کر وہاں سے نکل رہا تھا کہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

”سوری!“ وہ بولا۔

”کوئی بات نہیں۔“ وہ آنکھیں چرا کر اندر کی طرف چلی گئی۔ کچھ لمحے وہ وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا پھر اس کے پیچھے ہی آگیا۔

”زرتاشیہ! میں اندر آجائوں۔“ دھیرے سے دروازے سے لگ کر پوچھا۔

”جی فرمائیے۔“ آنکھیں صاف کر کے بڑے اعتماد سے دروازہ کھول کر بولی۔

”بڑا کام کرنے والے آنکھیں تو تر نہیں کرتے۔“ اس کے سبے سنورے سراپا

پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے کون سا بڑا کام کیا ہے؟“

”دوبیہار کرنے والوں کو ملایا ہے‘ یہ چھوٹا کام تو نہیں۔“ وہ دھیرے سے

بولا۔

”وہ ایک دوسرے کے لیے ہی بنے تھے‘ میں تو یک طرفہ محبت کی دعویٰ دار

تھی۔“

”یک طرفہ محبت‘ دو طرفہ محبت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔“

”پتہ نہیں۔“

”ویسے یک طرفہ محبت کا مستقبل کیا ہونا چاہیے؟“

”نہیں معلوم۔“ وہ بے چین سی ہو گئی۔

”اسے اپنی طرح کی یک طرفہ محبت ہی تلاش کرنی چاہیے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب‘ جو تمہیں چاہے صرف تمہیں۔“ وہ عالم جذب میں کہہ گیا۔

”پتہ نہیں کیا ٹھیک ہے کیا غلط؟“ وہ بوکھلا گئی۔

”زرتاشیہ! ٹھیک تو یہ ہے کہ تم فرحان اور سامعہ کو صرف خوش رہ کر یہ

بتاؤ کہ محبت کتنی عظیم ہوتی ہے۔“

”میں بہت خوش ہوں‘ چلیں دیر ہو رہی ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی

آنکھیں نم ہو گئیں اور گلا رندھ گیا۔

”اچھی بات ہے‘ خوش نظر آرہی ہو ذرا کاجل ٹھیک کرلو۔“ اس نے کہا تو

اس نے چونک کر شیشے کی طرف دیکھا... سچ مچ کاجل پھیل چکا تھا۔

”شکریہ! اور رات کے لیے معذرت...“ وہ بولی۔

”رات گئی بات گئی۔“

”میں نے جانے کیا کچھ کہہ دیا۔“



”کوئی بات نہیں، شاید ہمیں آپ کے کچھ کہنے کا انتظار ہے۔“ وہ ذومعنی انداز میں اسے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا اور وہ ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کرنے لگی۔ جب دوپٹہ سیٹ کر کے مڑی تو افراسیاب کے جسم سے اٹھتی پرفیوم کی خوشبو نے اس کے احساس کو تازہ کر دیا۔

زرتاشیہ! اتنے اچھے انسان کو اس طرح تو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ کتنی غیر اخلاقی حرکت کی... کتنا برا سوچ رہے ہوں گے۔ سچ ہی تو کہا ہے کہ میں فرحان اور سامعہ کی محبت کی تکمیل کے موقع پر ناخوش کیوں ہوں؟ انہیں دکھ تو نہیں پہنچانا چاہتی۔ وہ دونوں محبت کرتے ہیں اور میری محبت تو تھی ہی یک طرفہ... افراسیاب نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ مجھے اب فرحان کو بھولنا چاہیے۔ کچھ دیر کھڑی وہ سوچتی رہی کہ باہر سے ماما کی آواز آئی۔

”زرتاشیہ! جلدی آؤ، دیر ہو رہی ہے، سب چلے گئے ہیں۔“

”جی آئی ماما!“ وہ بولی اور باہر نکلی، باہر ماما اور افراسیاب اس کے منتظر تھے۔

...☆☆☆...

مہمانوں سے بھرے ہال میں رنگ و روشنی کا سیلاب تھا۔ سب کے درمیان باعثِ توجہ صرف سامعہ اور فرحان تھے۔ مگر عروسی لباس میں جس قدر خوب صورت سامعہ لگ رہی تھی۔ اس کا اظہار تقریباً ہر زبان پر تھا اور ہر آنکھ میں تھا۔ مگر کچھ لوگوں کے تنقیدی، حاسدانہ جملے بھی صاف سنے گئے لیکن شاہدہ بیگم اور اماں جان نے ثابت کر دیا کہ وہ اعلیٰ روایات اور اقدار کے فروغ کے لیے شرمندہ ہونے کے بجائے فاخرانہ انداز میں سلامیاں وصول کرا رہی تھیں۔ سامعہ کی نگاہوں میں اس وقت شاہدہ بیگم کے لیے حد درجہ محبت اور پیار تھا۔ قسمت اس طرح پلٹا کھائے گی یہ اس نے چاہا ضرور تھا مگر نہ ہونے پر بھی صبر و شکر کا ایمان اس کے اندر موجود تھا لیکن آج سب سچ ہو چکا تھا۔ وقت اور حالات نے تسلیم کرا دیا تھا کہ اسے گھر اور چاہنے والے رشتے مل گئے ہیں۔ میاں افتخار کے بازوؤں میں احتشام تھا۔ اس کے سوا انہیں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

کھانا شروع ہوا تو سامعہ اور ناجی کو اماں جان نے اپنے قریب بٹھالیا۔ شاہدہ بیگم نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو تانیہ ایک طرف چیونگم چباتی موبائل فون سے کھیلتی دکھائی دی۔ زرتاشیہ مہمانوں کے ساتھ رابطے میں مصروف تھی۔ اماں جان نے تانیہ کے لباس پر کڑی تنقید کی۔

”یہ آج کے دن پہننے والا لباس تھا۔ اس لڑکی کو ہدایت کون دے گا؟“ شاہدہ بیگم خاموش ہو گئیں۔ تو وہ مطمئن سی ہو گئیں۔ کیونکہ عادل اور کرن کی موجودگی بھی اس پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

”ہیلو تانیہ!“ کرن نے اسے پکارا تو وہ چونکی۔

”ہیلو!“ مختصراً کہا۔

”تانیہ! مجھ سے خفا ہو؟“ کرن نے دھیرے سے پوچھا۔

”مطلب کی بات کرو۔“

”دیکھو! میری دوستی پر شک مت کرو، اگر عادل آج بھی تمہیں چاہے تو میں خوشی سے اسے چھوڑ سکتی ہوں۔“

”کیوں! میں تمہارا احسان کیوں اٹھائوں؟ میں عادل کے بغیر بھی جی سکتی ہوں۔“ وہ مشتعل ہو گئی۔

”جھوٹ بولتے ہوئے پلکیں جھکا لیا کرو، سچ یہ ہے کہ عادل کے بغیر تم جی نہیں سکتیں۔“ کرن بولی۔

”تو میں مر جاؤں گی مگر تمہارا احسان نہیں اٹھائوں گی۔“ وہ تیکھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”دیکھو...!“

”فار گاڈ سیک! جاؤ، اپنا کام کرو۔“ وہ چلائی۔ ارد گرد کے مہمانوں نے محسوس کیا۔ عادل بھی اس کے تیور دیکھ کر قریب چلا آیا۔

”کرن! میرے ساتھ آؤ۔“ وہ کرن سے مخاطب ہوا۔

”ہنسہ! جائو کرن عادل کی بات سنو۔“ تانیہ نے طنزیہ ہنس کر کہا۔

”تانیہ! یہ ملال کی کسک ایسی ہی ہوتی ہے اس لیے ہم مائنڈ نہیں کریں گے۔“ عادل نے بڑے تحمل سے کہا۔

”عادل! پلیز تانیہ کے جذبات کو سمجھو۔“ کرن نے عادل کو ٹوکا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ تانیہ جل کر بولی۔

”اب وقت گزر چکا ہے۔“ عادل نے کافی نرمی سے کہا۔

”مجھے تم سے نفرت ہے عادل!“ تانیہ زور سے چلائی۔

”تو، تم تانیہ افتخار مجھ سے محبت کرتی ہو، شدید محبت۔“ عادل نے غصے سے

کہا تو وہ پتھرا سی گئی۔ آنکھوں سے برسات شروع ہو گئی۔

”پلیز تانیہ! خود پر قابو رکھو۔“ کرن پریشان ہو گئی۔ عادل چلا گیا تانیہ کرن کو

وہیں چھوڑ کر ہال سے باہر نکل گئی۔

”تانیہ! تانیہ!“ کرن اس کو آوازیں دیتی رہ گئی۔ تب عادل نے آکر کرن کا ہاتھ پکڑا اور کہا۔

”تمہیں کس نے یہ حق دیا کہ مجھے تانیہ افتخار سے بے عزت کرائو۔“

”عادل! وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔“ کرن بولی۔

”محبت میں نفرت کا مقام بھی آتا ہے۔“ اس نے مجھ سے نفرت بھی کی ہے۔“

”پلیز...!“

”کرن! تماشا نہ بنائو۔“ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ کرن ملول سی اپنے دادا

کی طرف بڑھ گئی۔ شاہدہ بیگم دور سے ہی یہ سب دیکھ کر رنجیدہ ہو گئیں۔ ان

کے اختیار میں نہیں تھا کہ وہ بیٹی کی خوشی کہیں سے چھین کر یا خرید کر

لے آتیں۔

...☆☆☆...

بہت تاخیر سے گھر واپسی ہوئی۔

سب تھکے ہوئے تھے۔ ناجی اور شوکی کو سبے سچائے کمرے میں بھیج کر شاہدہ بیگم نے سامعہ اور فرحان کو پیشانی چوم کر ان کے کمرے میں بھیجا۔ میاں افتخار ننھے احتشام کو لے کر اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔ تانیہ نے اپنا کمرہ اندر سے بند کر لیا تھا۔

زبیر احمد کے پورشن میں گلریز صاحب، انجم اور افراسیاب اپنے اپنے کمروں میں جا چکے تھے۔ نرگھس چیخ کر کے کمرے سے باہر نکلیں تو زبیر احمد بیڈ پر دراز تھے۔ وہ کچھ الجھی الجھی سی تھیں۔ زبیر احمد بھانپ گئے۔

”کچھ مسئلہ ہے؟“

”زرتاشیہ کے لیے فکر مند ہوں۔ وہ چپ ہو گئی ہے۔“

”ہاں قربانی جو بہت بڑی دی ہے۔“ وہ بھی اندر سے بیٹی کے لیے دکھی تھے۔

”اس کا مجھے اندازہ تھا۔“

”چھوڑ دو اندازے، گزر گیا وقت۔“

”افراسیاب، بڑے بھائی، بھابی صبح ہی چلے جائیں گے۔ آپ زرتاشیہ سے بات کر لیں۔“

”بچوں جیسی باتیں کرتی ہو یہ کیا طریقہ ہے؟“

”افراسیاب بھی چلا گیا تو...!“

”یہ فیصلہ زرتاشیہ کو کرنا ہے۔“ انہوں نے درمیان میں ٹوکا۔

”اسے سمجھایا جا سکتا ہے۔ ویسے اس کے رویے میں تبدیلی ہے۔“

”مطلب...؟“

”وہ افراسیاب کے لیے سوچ سکتی ہے۔“

”جلدی مت کرو اسے سوچنے دو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے کروٹ لی تو وہ چپ ہو کر خود بھی لیٹ گئیں۔

...☆☆☆...

مگر بیڈ پر ساکت نظروں سے چھت گھورتی زرتاشیہ کے لیے یہ لمحات سوہان  
روح تھے۔ فرحان کے بعد زندگی یکسر بے رنگ ہو گئی تھی۔ محبت کا جہان  
ویران ہو چکا تھا۔ بس ایک ہی خوشی تھی کہ وہ خود  
غرض بن کر سامعہ کی محبت لوٹنے سے بچ گئی تھی۔

”فرحان تمہارا تھا ہی نہیں، بلکہ وہ تمہارے لیے بنا ہی نہیں تھا۔ بس کچھ  
عرصے تمہاری محبت نے اس کی حفاظت کی اسے پرستش کر کے صنم بنا دیا۔“  
آنکھوں سے بہتے آنسو تکیے میں جذب ہو گئے۔ جانے آنکھوں کی جلن کب ختم  
ہو گئی اور کب وہ سوئی کچھ پتا نہیں چلا۔

صبح فجر کی اذان پر ہمیشہ کی طرح آنکھ کھل گئی۔ وضو کر کے نماز پڑھی اور باہر  
آگئی۔ باورچی خانے کی لائٹ آن تھی۔ وہ اس طرف آگئی۔ اندر افراسیاب اپنے  
لیے چائے بنا رہا تھا۔ اسے یوں دل کی خواہش کے مطابق سامنے دیکھ کر وہ

دل ہی دل میں خوش ہوئی، مگر سنجیدگی طاری رہی۔

”آپ مجھے کہہ دیتے۔“ اس نے آگے بڑھ کر ساس پین سے ابلتی ہوئی  
چائے مگ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”ایک ہی بات تھی۔“ وہ وہیں کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ایک ہی بات...؟“ اس نے مگ اس کے سامنے رکھا۔

”رات بھر نہ تم سو سکیں اور نہ میں اس لیے۔“ اس نے گرم گرما چائے کی  
چسکی لیتے ہوئے ایسا سچ بول دیا کہ وہ متحیر سی رہ گئی۔

”بیٹھو، بلکہ یہ چائے آدھی آدھی کر لیتے ہیں۔“ اس نے جلدی سے خالی مگ  
میں آدھی چائے انڈیل کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ”چسکی شدہ“ چائے۔ وہ  
چپ چاپ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

”وہ“ میں وہ...!“ اس کے حلق میں الفاظ اٹک سے گئے۔



”زرتاشیہ! گھر خالی ہو جائے تو نیند مشکل سے آتی ہے اور اگر گھر میں رہنے والے آنے کو آمادہ ہو جائیں تو بھی نیند نہیں آتی۔“ وہ بولا۔

”آپ کو ایسا کیوں لگ رہا ہے؟“

”میرا یقین تو نہیں لیکن میرا وہم بھی نہیں، آپ ڈسٹرب ہو؟“ وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کر گیا تو وہ گڑبڑا گئی۔

”میں چلتی ہوں۔“

”زرتاشیہ! چلے تو میں نے بھی جانا ہے۔ مگر کچھ لبوں میں دبا کر مت جائو۔“ وہ اس کے جملے کی گہرائی میں چند لمحے بنا پتوار کے اتری۔ پھر مضطرب سی آگے بڑھ گئی۔

”زرتاشیہ! کچھ کہا ہوتا، کچھ پوچھا ہوتا تو بتا کر جاتا کہ اب تک تو خیر تیری تمنا میں وقت گزر گیا، اگر تو مل جائے تو سوچتا ہوں میں کیا کروں گا؟“ چائے کا خالی مگ گھورتے ہوئے اس نے گویا خود سے کلام کیا اور کسی نے فوراً ہی اس کے کان میں کہا۔

”اگرچہ دو کناروں کا کہیں سنگم نہیں ہوتا۔ مگر اک ساتھ چلنا بھی تو کوئی کم نہیں ہوتا۔ ہزار فاصلے رہیں پھر بھی چراغِ عشق کی لو عشق ہونے کا احساس دیتی ہے۔ کبھی مدہم نہیں ہوتی۔ جو نہیں کہا وہ دل کی پہنائیوں میں اپنے ساتھ ہی لے جائو کہ آگے کٹھن راستوں میں اس چراغ کی لو کام آئے گی۔“ یہ سن کر اس کے بے قرار دل کو قرار سا آگیا۔

...☆☆☆...

ناشتے کے بعد فوراً ہی گلریز صاحب نے جانے کا اعلان کر دیا۔ اماں جان متعجب ہو گئیں۔ زبیر احمد اور نرگھس نے ایک روز مزید رکنے کی خواہش ظاہر کی مگر گلریز صاحب نے ضروری کام کے باعث رکنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ افراسیاب تو پہلے سے ہی پرواز کے لیے پر تول رہا تھا۔ گلریز صاحب نے گاڑی میں سامان رکھوا دیا۔ سب سے مل جل کر سب سے پہلے گاڑی میں بیٹھے۔ انجم سے نرگھس کچھ کہنا چاہتی تھی مگر موقع ہی نہ ملا۔ افراسیاب کمرے سے باہر

نکلا تو برآمدے میں زرتاشیہ کو کھڑا دیکھ کر اس کے قریب کچھ دیر کو رکا۔  
نگاہیں باہم ملیں اور جھک گئیں۔

”آپ صبح کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔“ وہ کچھ خفت سے بولی۔ تو وہ ہولے سے مسکرایا مگر کرب ناک سی مسکراہٹ۔

”کچھ لوگ میری دنیا میں خوش بو کی طرح ہیں۔ محسوس تو ہوتے ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔“ یہ کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا باہر نکل گیا۔ زرتاشیہ پر کچھ دیر بعد لفظوں کا سحر کھلا تو وہ آبدیدہ ہو گئی۔ ایک دم ہی ایسا لگنے لگا کہ اس کے چاروں طرف ویرانی اور اداسی اتر آئی ہے۔ بہت دیر تک وہ پچھلے باغیچے میں درخت سے ٹیک لگائے سوچتی رہی۔ کندھے پر چوڑیوں والے ہاتھ کی حرارت اتری تو مڑ کے دیکھا۔ سامعہ رو برو تھی۔

”سامعہ جی!“

”زرتاشیہ! دل کے بدلے دل مل جائے تو سودا نفع کا ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”فرحان کے بدلے افراسیاب کی بے پناہ چاہت رد مت کرو۔“

”آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں؟“

”اس لیے کہ آپ کی ماما اور پاپا یہی سوچ رہے ہیں افراسیاب کے چہرے پر یہی کچھ لکھا ہے۔ زندگی میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہمیں چاہت کے بدلے چاہت چہرہ بدل کر ملتی ہے۔ آپ افراسیاب کی

محبت ہو، سمجھنے کی کوشش کرو۔“

”سامعہ جی! میں نے افراسیاب کے لیے کبھی ایسا نہیں سوچا۔“ وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

”آپ نے فرحان کے لیے بھی تو ایسا نہیں سوچا تھا۔ فرحان کو چاہنے کے باوجود اس کی محبت نہ مل سکی۔ افراسیاب بہت چاہتا ہے اسے نہ جانے دو۔“  
سامعہ نے بہت خلوص سے اس کے کندھوں پر اپنے ہاتھوں کا دبائو ڈالا۔  
”کیا کروں میں...؟“

”اسے یقین دلا دو کہ اس کی محبت قبول ہے۔ میرے ذہن پر بوجھ ہے۔ میری خوشی کی خاطر۔“ سامعہ نے اس طرح اسے گھیرا کہ وہ بے اختیار اس کے ہاتھ چومنے لگی۔

”آپ کو مجھ سے اب بھی کوئی خطرہ ہے کیا...؟“

ارے! نہ... نہیں... نہیں...! یہ بات نہیں ہے بس بوجھ ہے کہ میری وجہ سے تمہاری محبت جدا ہو گئی۔“

”نہیں، فرحان سے مجھے محبت نہیں تھی۔ بچپن کا فیصلہ اور انسیت تھی۔“ وہ بڑ بڑائی۔

”زرتاشیہ! افراسیاب اچھا ہے۔“

”میں نے کب برا کہا ہے؟“ وہ ہنس دی۔

”پھر کیا امر مانع ہے؟“

”کچھ نہیں، آپ تو ماما کی ہم زبان ہو گئیں۔“

”زرتاشیہ! یہ درخت سے ٹیک لگانا۔ اداس اور مضحل سا ہونا بلا وجہ نہیں ہے۔“

”چھوڑیں آپ، یہ بتائیں ہمارا چھوٹو کہاں ہے؟“ وہ یکسر ٹال گئی۔

”بابا کے پاس۔“

”چلیں اس کے پاس۔“ وہ مسکرائی۔

”زرتاشیہ!“

”سامعہ جی! کچھ وقت تو چاہیے ہوتا ہے زخموں کے مند مل ہونے میں۔“ وہ درد سے مسکرائی۔

”کہیں دیر نہ ہو جائے۔“

”چھوڑیں وہم نہیں کرتے۔“ وہ آگے آگے چلنے لگی۔

”زرتاشیہ! سوچنا ضرور۔“

”کوشش کا وعدہ نہیں کر سکتی۔“ اس نے کہا۔

...☆☆☆...

گاڑی ڈرائیو کرتے وقت وہ حد درجہ خاموش تھا۔

گلریز صاحب برابر بیٹھے اسے غور سے دیکھ رہے تھے۔ معاملے کی تہہ تک نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ پیچھے سے انجم ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”کیسی ماں ہو؟ بیٹے کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔“ گلریز صاحب نے اچانک کہا۔ انجم چونکیں افراسیاب پھر بھی محو رہا۔

”میرے بیٹے کا ایسا کوئی مسئلہ نہیں کہ میں جانوں۔“

”افراسیاب کو آج سے پہلے تو میں نے بھی نہیں جانا۔“ گلریز صاحب نے بلند آواز میں کہا تو وہ کچھ متوجہ ہوا۔

”کیا بات ہو گئی؟“

”یہی تو پوچھا جا رہا ہے۔“

”کچھ نہیں میرے بیٹے کے پاس فارغ وقت نہیں۔“ انجم نے جلدی سے سب کچھ چھپانے کی کوشش کی۔

”افراسیاب!“ اب انہوں نے اسے پکارا۔

”جی!“

”زرتاشیہ نے اگر مسترد کیا ہے تو اپنے ساتھ ظلم کیا ہے۔ کچھ لوگ صرف نام تک ہوتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے سورج شام تک رہتا ہے۔“ گلریز صاحب جانے کیسے اصل بات کی تہہ تک پہنچ گئے۔ افراسیاب شرمندہ سا ہو گیا۔ سامنے سڑک پر نظریں مرکوز کیے وہ سوچنے لگا۔

”کسی کو کیا بتائیں دل بیچنے آئے تھے اس کے بازار کی طرف، مگر دیکھتے رہے حسرت سے اس انجان خریدار کی جانب۔ کیسا یہ اصرار تھا اس کی شوخ نظر کا۔ انکار کی جانب تھا نہ اقرار کی طرف۔ ہزار چہروں میں اس کی مشابہت دکھائی دیتی ہے پر دل کی مرضی ہے کہ اگر وہ نہیں تو اس جیسا بھی کوئی نہیں چاہیے۔“

”افراسیاب!“ گلریز صاحب نے پکارا تو وہ چونکا۔

”جی! جی۔“

”میں گاڑی چلاتا ہوں، آپ تھک گئے ہو۔“

”نہ، نہیں تو...!“ وہ نادام سا ہو گیا اور مسکرا کر اپنے مستعد ہونے ثبوت فراہم کیا۔

”میرا بیٹا جوان ہے۔“ انجم نے پشت سے اس کا حوصلہ بڑھایا تو وہ مسکرا کر بولا۔

”آپ دونوں جو سوچ رہے ہیں۔ میں اس کیفیت سے نکل آیا ہوں۔“

”یہ کی ہے نا جوانوں والی بات۔“ گلریز صاحب نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”محبت تو مقدر سے ملتی ہے ملے نہ ملے۔ بس اک راحت سی ضرور مل جاتی

ہے۔ اسے یاد کرنے سے۔ وہ خوش رہے۔“ اس نے دل میں سوچا اور پوری

توجہ صرف سیاہ چمکیلی بل کھاتی شاہراہ پر مرکوز کر لی۔ ابھی تو بہت سا سفر باقی تھا۔

...☆☆☆...

شادی میں شرکت کے بعد سے اس پر کچھ حزن و ملال کی کیفیت طاری تھی۔ کمرے میں الماری کھولے وہ اس گفٹ پیک کو تک رہا تھا۔ جو اس نے تانیہ کے لیے بڑی چاہ سے خریدا تھا۔ اسے فراموش بھی کر دیا تھا۔ مگر تانیہ کی موجودہ حالت دیکھ کر اسے شدت سے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ اس کے لیے تنہا ہے۔ اس کے لیے بکھری بکھری ہے۔ اس کی یہ مضطرب سی حالت دیکھ کر رفیعہ بیگم کو تشویش سی ہو گئی۔

”کاش! تانیہ تم نے مجھے یوں توڑا نہ ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے تمہیں تمہارے لیے چھوڑا تھا۔ یہ حقیقت بھی اب معلوم ہوئی ہے کہ ہماری بے خودی کا حال اگر پوچھو تو فقط اتنا ہے کہ ہوش ہے تو صرف اتنا کہ تمہیں یاد



کرتے ہیں“ وہ خود سے ہم کلام تھا مگر رفیعہ بیگم کے کانوں میں شاید اس کی آواز اتر گئی تھی کہ وہ ٹھٹکیں۔

”اب ان یادوں کا موسم گزر چکا ہے۔“ وہ بولیں تو اس نے چونک کر الماری بند کر کے پلٹ کر دیکھا۔

”عادل! سفر تو شروع ہو چکا ہے سوچ کو بھی بد دیانت مت کرو۔“ انہوں نے بہت گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

”امی! ایسا کچھ نہیں سوچا میں نے بس یہ خیال آرہا تھا کہ تانیہ ڈسٹرب ہے۔“ اس نے صفائی پیش کی۔

”یہ فیصلہ بھی تو اس نے خود ہی کیا تھا۔ مجھے تانیہ سے ہمدردی ہے مگر کرن ہماری عزت ہے۔“

”مجھے معلوم ہے لیکن کرن خود بھی تانیہ کی وجہ سے خاصی پریشان ہے۔“

”اسے اچھی طرح سمجھا دو کہ شادی کوئی کھیل نہیں ہے۔ چلو جا کر شادی کارڈ دے کر آؤ۔“ وہ خاصے تحکم سے کہہ کر چلی گئیں۔ عادل کو حیرت تھی کہ پہلی بار انہوں نے اتنا سنجیدہ اور سخت لہجہ اختیار کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ شادی کے اس موقع پر کسی قسم کی رنجیدگی پیدا ہو۔ اس نے ماں کے حکم کے مطابق کمرے سے باہر نکلنے کا ارادہ کیا مگر اسی وقت موبائل فون بجنے لگا۔ کرن کا نمبر دیکھ کر اس نے اٹینڈ کر لیا۔

”عادل! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔“ کرن کی الجھی الجھی سی آواز آئی۔

”ہاں بولو!“

”میں رات سو نہیں سکی۔“

”کرن! ہم کوئی فلم نہیں بنا رہے کہ جو چاہیں سین جوڑ دیں۔“ وہ اس کی بات سن کر بالکل اسی طرح بولا جس طرح کچھ دیر پہلے رفیعہ بیگم بول کر گئی تھیں۔

”میری بات تو سنیں۔“ اس نے منت کی۔

”کرن! عادل کو جوا سمجھ کر مت کھیلو اور ہاں ایک بات اور...! مجھ سے زیادہ تانیہ کے لیے مت سوچو۔“ وہ ہتھ سے اکھڑا۔

”میری بات تو سن لو پلیز۔“ وہ جذباتی ہو گئی۔

”کچھ نہیں کہنا سننا اگر تانیہ سے شادی کا لباس بدلنے کی تمنا ہے تو چپ چاپ میری دنیا سے نکل جاؤ مگر مجھے تانیہ کے لیے کچھ مت کہنا۔“ اس نے انتہائی سختی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔ مگر اگلے ہی لمحے فون دوبارہ بج اٹھا۔

”کرن! جو چاہتی ہو اپنے دادا سے کہو۔“

”پلیز عادل میری بات سنو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم اسے معاف کر دو۔ اس سے اس کا درد بانٹ لو۔“

”معافی تلافی کہاں سے آگئی؟ تانیہ نے یہ صفحہ رہنے ہی نہیں دیا۔ میں نے جو کیا اس کے کہنے پر کیا۔“

”عادل!“

”دیکھو، بے کار وقت ضائع نہیں کرو۔ تماشائے مت بنائو۔“ اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اس کے بعد کرن نے فون نہیں ملا یا۔

وہ چند لمحے خود کو نارمل کر کے کمرے سے باہر آیا۔

...☆☆☆...

سنگ میں کھانے کے برتن جمع کر کے ناجی نے مہندی رچے ہاتھوں میں پلیٹ اٹھائی ہی تھی کہ اماں جان آگئیں اور اسے پیار سے ڈپٹ پلائی۔

”ارے بچی! کوئی غیروں میں ہو جو دوسرے دن ہی برتن دھونے شروع کر دیے؟“

”بڑی بیگم صاحبہ! کام کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ شوکی بھی میاں صاحب کے ساتھ بازار گیا ہے۔“ وہ مدہم لہجے میں بولی۔

”شوکی کو چھوڑو، وہ تو مرد ہے۔ تم تو دلہن ہو چلو ہٹو۔“ اماں جان نے بہت اپنائیت سے کہا تو ناجی کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”آپ کی محبت ہے، میری ماں سے بڑھ کر میرا خیال کیا...!“

”ارے تم اس گھر میں رہتی ہو، پھر خیال کوئی باہر سے رکھنے کے لیے آتا کیا؟“

”میں کیا کروں اب؟“ اس نے معصومیت سے پوچھا۔

”جاؤ، آرام کرو۔“ وہ بولیں۔

”اور کام کون کرے گا؟“

”کام میں اور شاہدہ کر لیں گی۔“

”دادو! پیپا کہہ رہے ہیں کہ رات کا کھانا سب نے ہمارے ساتھ کھانا ہے۔“

اسی وقت زرتاشیہ نے آکر کہا۔

”لو سن لو ناجی! کام ختم۔“ اماں جان نے ہنس کر ناجی سے کہا۔ وہ باہر چلی

گئی تب انہوں نے زرتاشیہ کو غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور

چہرہ ستا ہوا سا...! ”زرتاشیہ۔“

”جی دادو!“ اس نے کھیرا چھیل کر کھاتے ہوئے کہا۔

”کیا بات ہے، رات سوئی نہیں۔“

”بس تھکن تھی سوئی تو تھی۔“ وہ ٹال گئی۔

”بچے! جو خواب بانٹ دیے ان کا احساس بھی اتار دو۔ اسی طرح ہنستی

مسکراتی نظر آؤ جیسی تم تھیں۔“

”دادو! میں وہی ہوں۔ آپ سب کو کیوں لگ رہا ہے کہ میں بدل گئی

ہوں؟“

”بیٹا عظیم شخص وہی ہوتا ہے جو اپنے قد میں رہے پُر خلوص لوگوں کو منزل

نہیں ملتی مگر وہ رستا دکھانے والے ہوتے ہیں۔“

”یہ نے کیا ایسا کہا ہے کہ میرے خلوص پر سب کو شبہ ہو رہا ہے؟ میں بہت

خوش ہوں۔“ وہ زبج ہو کر بولی۔

”پھر خود کو سنبھالو۔“ انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”میں جا رہی ہوں۔“ وہ یہ کہہ کر چلی گئی۔

اماں جان بہت دیر تک اس کے لیے کڑھتی رہیں۔ ایک دم ہی انہیں تانیہ کا خیال آگیا تو اور زیادہ بے کل ہو گئیں۔ اس گھر میں دونوں بیٹیاں ہی اپنی اپنی جگہ پریشان اور رنجیدہ تھیں۔

انہوں نے باورچی خانے سے نکل کر شاہدہ بیگم کے کمرے کا رخ کیا۔ شاہدہ بیگم انہیں دیکھ کر بیڈ سے اٹھیں۔ طبیعت خراب تھی۔ اس لیے لیٹی تھیں۔

”ہماری بیٹیوں کی بھی کیا قسمت ہے؟“ انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”خیریت؟“ وہ کچھ نہ سمجھ سکیں۔

”زرتاشیہ! تانیہ دونوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی مجھ سے۔“

”اللہ ہی بہتر کرنے والا ہے۔“

”کیسے؟“

”میں کیا بتاؤں؟ فی الحال توتانیہ کی ضد ہے کہ پڑھنے کے لیے باہر جانا چاہتی ہے۔ افتخار نے بھی اجازت دے دی ہے۔ زرتاشیہ کو افراسیاب کے لیے فیصلہ کرنا چاہیے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔“

”مگر شاید اس نے کبھی افراسیاب کے لیے سوچا نہیں۔“

”کوئی ضروری تو نہیں کہ ہم جیسا سوچیں ویسا ہو جائے۔“

”افراسیاب کے لیے زرتاشیہ راضی نہیں تو تانیہ کے لیے سوچ لو۔“

”نہیں اماں جان! یہ کیسے ممکن ہے؟ نہ تانیہ اس کے لیے راضی ہوگی اور نہ افراسیاب۔“ شاہدہ بیگم نے جلدی سے کہا۔

”مطلب...؟“

”مطلب یہ کہ افراسیاب زرتاشیہ میں دلچسپی رکھتا ہے۔“

”پھر تو نرگھس اور زبیر کو فوراً ہاں کرنی چاہیے۔“

”زرتاشیہ بھی تو ایسا سوچے نا۔“ وہ بولیں۔

”بہت اچھا لڑکا ہے۔“ اماں جان نے افراسیاب کی تعریف کی۔

”جی صحیح کہا آپ نے۔“

”چلو اللہ مالک ہے۔ میں زبیر سے بات کروں گی۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

...☆☆☆...

خواجہ امتیاز علی اس کی بات سن کر سکتے میں رہ گئے اور سختی سے بولے۔

”کرن! عادل نے جو کہا ٹھیک کہا۔ عادل کو کیا سمجھا ہے آپ لڑکیوں نے؟“

”دادا! تانیہ بھی تو غلط نہیں ہے۔ میں بھی غلط نہیں ہوں۔“

”کرن! شہر میں اس بوڑھے ریٹائرڈ آدمی کی کوئی عزت ہے۔ اس کا خیال رکھ

لو۔“ وہ بہت برہمی سے بولے۔ کرن کو امید ہی نہیں تھی کہ دادا جان اس

قدر سخت لہجے میں بھی بات کر سکتے ہیں۔

”تانیہ کو ہمدردی کی ضرورت ہے۔“

”وہ کسی کی ہمدردی کی مستحق نہیں۔“

”دادا جان! وہ عادل کے لیے پریشان ہے۔“ اس نے اصرار کیا۔

”کرن بے کار بحث مت کرو۔ عادل کو اس نے باقاعدہ مسترد کیا تھا۔ بے جا طرف داری مت کرو اور یہ بتاؤ اس سے کیا حاصل ہے؟ ضروری نہیں کہ جیسا ہم چاہیں ویسا ہی ہو۔“

”مگر...!“ وہ افسردہ ہو گئی۔

”کہاں گئی آپ کی عادل کے لیے محبت؟“ ایک دم ہی انہوں نے خاصے تلخ انداز میں پوچھا۔

”محبت اپنی جگہ ہے لیکن قربانی کی اپنی حیثیت ہے۔“

”میرا سر نہ کھائو۔ جا کر اپنے کپڑے دیکھو، ٹیلر نے بھجوائے ہیں۔“ وہ یکسر اس کی بات نظر انداز کر کے بولے۔

”میں خود کو عمر بھر مجرم سمجھتی رہوں گی۔“ وہ بے بسی سے بولی۔



”گناہ گار سکون سے ہے اور یہاں غیر ضروری بحث...!“

”دادا جی! آپ ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔“ اس نے دکھ بھرا اظہارِ حیرت کیا تو انہیں سوچنا پڑا۔

”میرے جگر گوشے! کچھ فیصلے انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ تانیہ نے پہلے جو کیا۔ اسے بھول جاتے ہیں تو اب تانیہ قربانی سمجھ لے۔“

”دادا! وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے۔“

”میرے پاس کوئی علاج نہیں، خاموشی سے اپنے کام کرو بھول کر بھی باپ کے سامنے یہ سب کچھ نہ کہہ دینا کہ...!“ انہوں نے سمجھایا۔ تو وہ خاموش ہو کر وہاں سے اٹھ گئی۔

کمرے میں بڑے بڑے شاپنگ بیگ بیڈ پر رکھے تھے۔ مگر اس کا دل بجھا بجھا

سا تھا۔ بے بس اور بے اختیار تھی۔ نہ عادل کو قائل کر سکی تھی اور نہ دادا

جی کو سمجھا سکی تھی۔ شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں کو پونی کی قید سے

آزاد کرتے ہوئے اپنی آنکھوں میں جھانکا تو دور دور تک عادل ہی دکھائی دیا۔

جس کا مطلب یہی تھا کہ سمجھا تو وہ خود کو بھی نہیں سکی تھی۔ عادل تو سانس کے ساتھ اپنے ہونے کے احساس کا نام تھا۔ اس کے بنا جینے کا تصور تو اس کے لیے بھی محال تھا۔

”تانیہ! میں بے بس ہوں۔ میں نے پہلی بار محبت عادل سے ہی کی ہے۔ میں

عادل سے جدا ہو کر مر جاؤں گی۔“ اس نے تانیہ سے کہا اور طویل پُر

سکون سانس بھر کے اپنا لباس دیکھنے لگی۔ جو اس کے لیے تیار ہو کر آئے

تھے۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ وہ خوش ہو گئی۔ تانیہ اور تانیہ کے

حوالے سے ہونے والی اداسی ایک دم ہی اطمینان بھری خوشی میں بدل گئی۔

یہ وہ وقت تھا جب دل نے کہا کہ عادل کو میری مرضی کے خلاف چھوڑ

نے کا اختیار تمہیں کس نے دیا؟“

...☆☆☆...

اس کو بیگ پیک کرتا دیکھ کر انجم کے دل میں درد کی لہر سی اٹھی۔ برداشت

نہ کر سکیں تو جھنجلا کر بیگ لے کر پٹختے ہوئے بولیں۔

”کہیں نہیں جارہے تم۔ ماں کو دکھی کر کے خوش رہ سکو گے وہاں؟“

”میں بزنس کے لیے جا رہا ہوں آجائوں گا۔“ اسے تعجب ہوا۔

”کہانا کہ اس حالت میں کہیں نہیں جانا۔“ وہ بولیں۔

”کس حالت میں؟ کیا ہوا ہے؟“ وہ بولا۔

”افراسیاب! مجھ سے پوشیدہ ہے تمہارے دل کی کیفیت زرتاشیہ کے لیے کتنے ڈسٹرب ہو۔ اپنا چہرہ دیکھو۔ کیا جسے اتنا چاہتے ہو اس سے دور جا کر رہ سکو گے؟“

”نہیں معلوم۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”محبت کرتے ہو اس سے اور معلوم نہیں۔“ انہیں غصہ آیا۔

عشق صحرا ہے کہ دریا وہ بھی تو کبھی سوچے

اس سے میرا کیا ناتا ہے وہ بھی تو کبھی سوچے

میں تنہا ہوں مجھے اعتراف ہے، مگر

وہ خود بھی کتنی تنہا ہے وہ بھی تو کبھی سوچے

”یہ دیکھیں بند ہے اس ڈائری کے صفحات میں وہ۔“ اس نے بولتے بولتے

بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز سے سیاہ ڈائری نکال کر ان کو تھمائی۔ وہ صفحے پلٹنے لگیں۔

”امی! اسے میں نے آواز لکھا، چاند لکھا، پھول لکھا اور جانے محبت کے کتنے

نام اس کے لیے لکھے۔ میں نے اسے لفظوں کی حرارت دے کر سوچا۔ کتنا

سوچا کبھی وہ بھی تو کچھ سوچے کچھ کہے۔“ وہ بہت جذباتی ہو کر ایک دم ہی

افسردہ ہو کر صوفے پر گر سا گیا۔ تو انجم کو اس پر بہت پیار آیا۔ اس کی پیشانی

چوم لی۔ بالوں میں محبت سے انگلیاں پھیریں۔

”اتنی محبت کا ہی اثر تھا کہ وہ فرحان کی نہ ہو سکی۔ اب یقین کا دامن کیوں

چھوڑ کر جارہے ہو؟“

”وہ اب بھی فرحان کو چاہتی ہے۔“

”مگر اب تو ایسا نہیں ہے۔“

”ایسا ہی ہے۔ وہ میرے لیے وہ سب نہیں کہہ سکتی اور میں زبردستی کیوں کروں؟“ وہ بڑے تحمل سے کہہ کر دوبارہ سے پیکنگ میں مصروف ہو گیا۔

”اپنے دل سے پوچھ کر کہہ رہے ہو؟“ وہ ماں تھیں بیٹے کے بے قرار دل کی حالت پر کڑھ رہی تھیں۔

”اس قدر قیمتی تو نہیں ہے میرا دل، میرا چین و قرار...!“ وہ ہنسا۔

”میرا بیٹا کیا ہے یہ کوئی مجھ سے پوچھے۔“

”اب مسئلہ کیا ہے؟“

”افراسیاب! تم ایسے نہیں جاسکتے۔ زرتاشیہ کو مانگ لوں پھر چلے جاندا۔“ ایک دم ہی ان کے ارادے میں مضبوطی اور بے باکی آگئی۔

”گویا آپ اپنے بیٹے کو تماشا بنائیں گی؟“ اسے پسند نہ آئی ان کی بات۔

”رشتا مانگنا تماشا تو نہیں ہوتا۔“

”زرتاشیہ کو مانگنا تماشا لگانے کے برابر ہے۔“

”کیوں؟“

”وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی۔“

”اسی فی صد شادیاں بنا محبت کے ہوتی ہیں۔“ وہ اپنے محاذ پر ڈٹی رہیں۔

”نہیں، اسے ڈسٹرب نہ کریں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

”میرا حکم ہے کہ تم رشتا طے ہونے کے بعد ہی جائو گے۔“ وہ یہ کہہ کر باہر چلی گئیں تو وہ بڑی دیر تک ماں کے حیرت انگیز بدلتے تیوروں کے بارے میں سوچتا رہا۔

یک دم ہی انہوں نے ضد سی کیوں باندھ لی تھی؟

...☆☆☆...

شادی کا ہنگامہ سرد پڑ چکا تھا۔

شاہدہ بیگم، میاں افتخار اور فرحان نے دفتر جانا شروع کر دیا تھا۔ زبیر احمد کی طبیعت کچھ ناساز تھی اس لیے وہ گھر پر ہی تھے۔ نرگس باورچی خانے میں

مصرف تھیں کہ فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ڈسٹر سے ہاتھ صاف کر کے کمرے کا رخ کیا۔ کیونکہ زبیر احمد اسی کو فون سننے کے لیے آوازیں دے رہے تھے۔ دوسری طرف انجم بھابی تھیں۔

”ہیلو بھابی!“

”نرگھس! پلیز میری زرتاشیہ سے بات کرادو۔“ انہوں نے منت بھرے انداز میں کہا۔

”خیریت...؟“ نرگھس پریشان ہو گئی۔

”بس مجھے اس سے کچھ کہنا ہے۔“

”اچھا کراتی ہوں۔“ نرگھس جلدی سے فون لے کر زرتاشیہ کے کمرے میں پہنچ گئیں۔

”زرتاشیہ! یہ لو بات کرو انجم بھابی ہیں۔“

”ہیلو، جی مامی!“ وہ بولی۔

”زرتاشیہ تمہیں بس یہ بتانا ہے کہ افراسیاب جا رہا ہے دکھی اداس دل کے ساتھ۔“ وہ رقت بھرے لہجے میں بولیں۔

”کیا مطلب؟“ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ الجھ سی گئی۔

”زرتاشیہ! اس کی خوشی اپنے دل میں محسوس کرو۔ وہ جو نہیں کہہ سکا۔ وہ تم اسے کہہ دو۔“

”مامی! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟“ وہ عجیب سی کیفیت سے دو چار ہو گئی۔ نرگھس نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر بات کی۔

”بھابی! کیا بات ہے؟“

”نرگھس! میرا بیٹا بہادر ہے۔ زرتاشیہ کی پرستش کرتا رہا مگر زرتاشیہ کی خوشی کے سامنے چپ رہا۔ اب وہ اداس سا جا رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ زرتاشیہ اسے حوصلہ بخش دے۔“ انجم بھابی نے کہا۔ نرگھس بالکل چپ ہو گئیں۔ فون بند ہو گیا۔ نرگھس اسے دیکھ کر باہر نکل گئیں اور وہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کے کانوں میں انجم مامی کے جملے گونج رہے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔

دروازہ کھلا، قدموں کی آہٹ پیدا ہوئی تو پلٹ کر دیکھا تو فرحان بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آ... آپ...؟“ وہ ہکلائی۔

”زرتاشیہ! محبت کسی کی بھی ہو، قابل احترام ہوتی ہے۔ افراسیاب کی محبت تو عشقِ بلا خیز ہے۔ جس میں جل جل کر وہ کندن بن گیا ہے اس کا عشق تمہاری محبت کا انعام ہے۔ اسے یوں پامال نہ کرو۔“ فرحان نے ویسا ہی کہا جیسا نرگس مامی اور سامعہ نے کہا۔

”آپ افراسیاب کے وکیل ہیں؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ طنز کر بیٹھی۔

”نہیں، میں محبت کا سفیر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ محبت ٹھکرانے کی شے نہیں۔“

”آپ سے یہ سب کس نے کہا۔“

”یہ چھوڑو میرا کہا کافی نہیں کیا؟“ وہ خاصی نرمی سے بولا۔ وہ گنگ ہو گئی۔

”بولو زرتاشیہ، کیا میرا کہا کافی نہیں؟“ وہ مد مقابل آکر پوچھ رہا تھا۔ وہ بے تاب ہو کر پیچھے ہو گئی۔

”پلیز آپ جائیں۔“

”زرتاشیہ! محبت تو ایسی خوش بو ہے جو دل میں محسوس ہوتی ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہیں کوئی اتنی شدت سے چاہتا ہے۔“

”مگر...!“

”فرحان کی قدر و قیمت تمہاری نظروں میں ہے کہ تم اگر مگر کرو؟“ وہ اپنے پرانے مخصوص لہجے میں کہتا تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ اسے بے بسی سے صرف پھوٹ پھوٹ کر رونا آیا۔ ”فرحان نے اسے افراسیاب کے لیے مانگا؟“ وہ بستر پر گر کے بڑی دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔ بہت دیر بعد دھند چھٹی تو فرحان پر آنے والا غصہ محبت میں بدل گیا۔ افراسیاب کا چہرہ نگاہوں میں پھرنے لگا۔



”کچھ لوگ میری دنیا میں خوش بو کی طرح ہیں جو محسوس تو ہوتے ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔“ افراسیاب کا ذو معنی جملہ کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگا۔

”مما! میں کیا کروں؟ مجھے اس طرح کیوں مجبور کیا جا رہا ہے؟“ چوبیس گھنٹے مسلسل خود سے جنگ لڑنے کے بعد اس نے نرگھس کے سامنے بے بسی سے کہا۔

”مجبور نہیں کیا جا رہا بلکہ یاد دلایا جا رہا ہے کہ محبت میں ایسا مقام بھی آجاتا ہے کہ رسم دہرائی جاتی ہے۔“ نرگھس سے پہلے قریب بیٹھی سامعہ نے کہا۔

”افراسیاب نے کچھ نہیں کہا۔ بس بھابی کے اپنے احساسات ہیں۔ انہوں نے اس کی ڈائری پڑھ لی ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ ان کے اکلوتے بیٹے کو اس کی محبت مل جائے۔“ نرگھس نے وضاحت سے جواب دیا۔

”محبت یوں کہنے سے دی جاسکتی ہے۔“ وہ دھیمے سے بولی۔

”ہاں، زرتاشیہ! آپ یہ تجربہ کر چکی ہو، میں یہ تجربہ چاہتی تھی۔ مگر آپ نے ساری کی ساری محبت اٹھا کر میرے دامن میں ڈال دی۔“ سامعہ نے یاد دہانی کرائی تو وہ خاموش ہو گئی۔

”سامعہ! اسے سمجھائو۔“ نرگھس کہہ کر باہر چلی گئیں۔

”زرتاشیہ افراسیاب کو فون کرو۔ اسے فقط یہ یقین دلا دو کہ جب لوٹے گا تو تم اس کی منتظر ہو گی۔“ سامعہ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے کہا۔

”لیکن...!“

”وہ لیکن سے بہت آگے کے مقام پر ہے۔ اسے آنکھ بھر کر دیکھو۔“

”کتنا عجیب لگتا ہے۔“ وہ کچھ الجھن کا شکار ہوئی۔

”کچھ عجیب نہیں بس ایک فون ہی کرنا ہے۔“

”سامعہ جی! یہ میرے لیے ممکن نہیں ہے۔“ وہ کچھ عجب سے انداز میں سر جھکا کر بولی۔

”کیوں؟“

”میں یہ کیسے کر سکتی ہوں؟“

”ویسے ہی، جیسے کہنا چاہیے۔“ سامعہ نے گرم لوہا دیکھ کر چوٹ لگائی۔

”بس جو کہنا ہے، وہ کہیں...!“ وہ بولی۔

”افراسیاب نے تو سمجھ لو کہہ دیا۔“

”بس پھر جو سب چاہیں وہ کریں۔“ وہ ہتھیار پھینک کر جانے والی تھی کہ

سامعہ نے گھیر لیا۔

”جی نہیں، ایسے تو افراسیاب نہیں مانے گا۔“

”تو کیا کروں۔“

”پیار سے فون کر کے کہہ دو کہ...!“

”پلیز سامعہ جی! مجھے معاف کر دیں۔“ اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

”چلو افراسیاب فون کر لے تو کہہ دینا۔“

”سامعہ جی! فرحان نے حکم تو دے دیا آپ کو کہ آپ مجھے راضی کریں مگر

یہ نہیں سوچا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے؟“

”سب جانتے ہیں اس کام کی بنیاد تو آپ نے رکھی ہے پھر کیا برا ہے کہ

افراسیاب جیسا چاہنے والا مل جائے؟“

”اچھا بابا! اب میرا پیچھا چھوڑ دیں۔“ وہ یہ کہہ کر چلی گئی تو سامعہ خوش

ہو گئی۔ وہ نرگھس کو بتانے کچن کی طرف بڑھی۔

زرتاشیہ نے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے مڑ کر یہ دیکھ لیا تھا۔ کمرے میں

آتے ہی اس نے ایک طویل سرد آہ بھر کے اپنے اندر کی بے چینی باہر نکالی

اور اطمینان اندر بھر لیا۔ شاید یہ سب کی خوشی کا اثر تھا یا افراسیاب کی

خاموش پرستش کا کمال کہ وہ اس کے لیے مدھم سوچ کے ساتھ پُر سکون

سی ہو گئی تھی۔

یہ اس کے اقرار کا اثر تھا کہ تین چار روز تک پھر کسی نے اس سے اس موضوع پر بات نہیں کی وہ خود حیران تھی۔

...☆☆☆...

سب عادل کی بارات میں شرکت کے لیے گئے تھے۔  
”گھر میں ناجی“ شوکی اور تانیہ تھے دوسری طرف زرتاشیہ کو فلو تھا۔ وہ بھی نہیں گئی تھی۔ اپنے لیے چائے کا کپ بنا کر کمرے میں آکر ابھی بیٹھی تھی کہ کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

”آجائو ناجی!“ اس نے ناجی کے خیال سے بنا دیکھے کہہ دیا۔

”آہم... آہم۔“ گلا صاف کرنے پر وہ چونک کر پلٹی تو دنگ رہ گئی۔ گرے شلوار سوٹ میں ایک بالکل نئی شخصیت کے ساتھ افراسیاب اس کے سامنے تھا۔

”آپ؟“ وہ بھونچکا سی رہ گئی۔

”فون پر زیادہ پیسے خرچ ہو جاتے اس لیے میں جہاز پر آگیا۔“ بڑے متبسم و پُر مزاح لہجے میں بولا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی لجا سی گئی۔

”اس کی کیا ضرورت تھی۔“ اس نے پوچھا۔

”سنا تھا کہ میں فون کروں گا تو آپ کچھ فرمائیں گی۔“

”نہیں، وہ تو کسی نے کہا اور میں نے مان لیا۔“

”تو پھر میں چلتا ہوں کسی کا کہا سننے تو میں نہیں آیا۔“ وہ مڑنے لگا تو اسے غلطی کا احساس ہوا۔

”سب شادی میں گئے ہیں۔ آپ بیٹھیں میں کچھ لاتی ہوں۔“ وہ پریشان ہو کر بولی۔

”زرتاشیہ! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں تو یہ سننے آیا ہوں کہ تم کیا کہتی ہو؟“ وہ خاصا قریب ہو کر بولا۔

”مجھے، مجھے نہیں آپ کو کچھ کہنا تھا۔“ وہ گڑ بڑا گئی۔

”چلو یونہی سہی۔ جو میرے دل کی دیواروں پر لکھا ہے۔ وہ پڑھ کر سنا دیتا ہوں۔“

وہ خاصے جذب کی حالت میں بولا۔

”کہیے۔“

”زرتاشیہ! پلیز جان لو کہ تم میری پہلی دھڑکن ہو، میں نے تمہاری پرستش کی ہے۔“

میں ویران ہوں، وصل میں تشکیل کردو مجھے

مجھ سے پیار کر کے ذرا تبدیل کردو مجھے

مجھے چھو کر میرے وجود کو تجلی سی بخش دو

میری زندگی اندھیری رات ہے قندیل کردو مجھے

وہ بے خودی میں اس کا ہاتھ تھام کر پیار کی انتہا تک پہنچ گیا۔ وہ صرف سوچتی رہ گئی کہ یہ سب افراسیاب نے کہنا تھا۔ تو میں نے فرحان سے یہ امید کیوں لگائی... مگر اس کے سامنے ہر سوال کا جواب موجود تھا۔

”بولو! مجھے مکمل کرو گی؟“ اس نے پھر سوال کیا۔

”میرا کہنا ضروری تو نہیں۔“

”کہو گی نہیں تو میں چپ چاپ لوٹ جاؤں گا۔“

”میرے کہنے کی کوئی اہمیت ہے؟“ اس نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ہاں! جو تم کو ہو پسند وہی بات کہیں گے۔“

”آپ کب آئیں گے؟“

”میں گیا ہی کب ہوں؟“

”نہیں، آپ باہر سے کب آئیں گے؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”صرف ایک ماہ بعد۔“

”پھر ٹھیک ہے۔“ وہ یکسر ٹال گئی۔ تو افراسیاب کچھ نہ سمجھ کر بھی جھوم اٹھا۔

”پھر سے کہو، کہو کہ سب ٹھیک ہے۔“ وہ اس سے نظریں چرا گئی۔

”اب چلیں باہر ٹی وی لائونج میں۔“

”اوہ! کہہ دو! زرتاشیہ ورنہ میں جائوں گا کیسے؟“ بڑی معصوم سی صورت بنا

کر اس نے پوچھا تو وہ ہاتھ چھڑا کے باہر بھاگی۔ وہ پیچھے سے بلند قہقہہ لگا کر

لطف اندوز ہوا۔ آج سارے جہاں کی خوشی اسے حاصل ہو گئی تھی۔ اسے چاہا

اور پھر فرحان کی امانت جان کر احترام کیا۔ یہ ناقابل یقین محبت نہیں تھی۔

بس مزاج ہی ایسا تھا کہ امانت میں خیانت نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ مقدر کا انعام

تھا کہ وہ اس کے لیے راضی ہو گئی تھی اور امی نے اسے فوراً جہاز پر سوار

ہونے کا حکم دے دیا تھا۔ وہ حیران پریشان ماں کا حکم مان کر سچ مچ آگیا۔ مگر

زرتاشیہ ابھی بھی سات پردوں میں چھپی تھی۔ کھل کر نہ اعتراف کیا تھا نہ

انکار۔ وہ اس کے پیچھے باہر آیا مگر وہ کچن میں تھی۔ کچن کے دروازے پر وہ  
جم کر اسے دیکھنے لگا۔

”افراسیاب! آپ کو مجھے آزمانے کے لیے یوں اچانک نہیں آنا چاہیے تھا۔“

کافی کے مگ لے کر مڑتے ہوئے وہ بولی۔ تو وہ کچھ غیر معمولی سنجیدگی سے

دیکھتے ہوئے بولا۔

”سچ کہا تم نے، مگر اس میں میرا قصور زیادہ نہیں ہے۔“

”میں نے فرحان کو سامعہ کی محبت سمجھ کر انہیں دیا ہے اس کا مطلب یہ

کیوں لیا جا رہا ہے کہ میں کوئی خالی سیٹ ہوں، بہت جلد مجھے آپ کے لیے

فیصلہ کرنا چاہیے۔“ وہ یہ کہہ کر جواب کی منتظر تھی کہ وہ کافی کی بھاپ

گھورتے ہوئے فقط یہ بولا۔

”تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں یہاں کافی پینے آیا ہوں؟“ یہ کہہ کر مگ

اس کو تھما کر آندھی اور طوفان کی طرح باہر نکل گیا۔ جھٹکا لگا۔ کچھ کہنا چاہا

بتانا چاہا مگر جیسے حلق میں آواز اٹک گئی۔ لب آپس میں چپک گئے۔ وہ جا چکا



تھا۔ کچھ دیر تک اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اسے روکے یا آواز دے... لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ کافی کا مگ ٹھنڈا ہو چکا تھا مگر وہ وہیں کھڑی پریشانی سے سوچ رہی تھی کہ اب کیا ہوگا؟ اس کا آنا اور لوٹ جانا جس کو بتایا جائے؟ یہ جواب میں کس کس کو دوں گی؟“ کافی کا مگ کچن میں رکھ کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ اب ایک اور نئی الجھن کا آغاز ہو گیا تھا۔

...☆☆☆...

موٹر سائیکل کی آواز پر تانیہ نے ناجی کی طرف دیکھا اور ناجی نے اس کی طرف۔

”یہ تو عادل صاحب کی موٹر سائیکل کی آواز ہے۔“ ناجی نے اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے یقین سے کہا تو تانیہ نے اسے دیکھنے کا اشارہ کیا۔

”تانیہ بی بی! باہر عادل صاحب آئے ہیں۔“ ناجی کے جانے سے بھی پہلے شوکی نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بتایا۔

”آپ کو بلا رہے ہیں۔“

”انہیں یہیں لے آتے۔“ ناجی نے شوکی سے کہا۔

”کہا تھا“ انہوں نے کہا کہ جلدی میں ہوں بس چھوٹا سا کام ہے بلا دو۔“ شوکی نے ایک روایتی شوہر کی طرح ناجی کو گھور کر اپنی ذہانت کا ثبوت دیا۔

”مگر مجھے نہیں ملنا۔“ اس نے صاف انکار کیا۔

”مگر مجھے ملنا ہے۔“ وہ کمرے میں بے خوفی سے داخل ہوتے ہوئے بولا۔ تو وہ ساکت رہ گئی۔ وہ دولہا کے لباس میں ہاتھوں میں ایک چمکیلا سا ڈبہ لیے اندر آچکا تھا۔

ناجی اور شوکی کچھ سمجھ کر باہر نکل گئے۔

”تانیہ! میں اپنی بیوی کو مہمانوں کے درمیان چھوڑ کر، سب کی نظروں سے بچ کر وہ امانت دینے آیا ہوں۔ جو صرف تمہاری تھی۔“

”اوہ! یہ نیا ڈراما ہے۔“ وہ دکھ اور افسردگی میں شامل طنز نہ چھپا سکی۔

”کوئی ڈراما ہے نہ فلم، یہ تمہارے لیے لا کر اپنے کمرے میں محفوظ رکھا تھا کہ تم کو...!“

”بس، بس یہ جا کر اپنی بیوی کو ہی دے دو۔“ اس نے جملہ اچک کر رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”اب تم نے کہا ہے تو ایسا ہی کروں گا۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔

”پھر میرا دل جلانے آئے ہو؟“

”نہیں، میں اپنے اور کرن کے درمیان کوئی خیانت نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے تمہاری امانت کمرے سے نکال لایا ہوں۔“ اس نے چبا چبا کر کہا تو وہ شدتِ غم اور صدمے سے رو پڑی۔

”تم میری بے عزتی کرنے آئے ہو؟ مجھے دکھی کرنے کا کوئی طریقہ نہیں تھا تمہارے پاس؟“

”کیوں؟ کیوں...؟ میں تانیہ افتخار بے عزت اور دکھی کرنے کے معنی صرف تمہیں معلوم ہیں؟“

”تو پھر کہہ دو کہ انتقام لینے کے لیے آئے ہو۔“

”نہیں، میں نئی زندگی بد گمانی اور شک کی بھینٹ نہیں چڑھانا چاہتا یہ میری محبت کی نشانی ہے اسے تحفہ سمجھ کر اپنے پاس رکھ لو۔“ وہ کافی سنجیدگی سے وہ ڈبا اس کے بیڈ پر رکھ کر بولا۔

”کون سی محبت؟ آج اس لباس میں بتانے آئے ہو۔“ پہلی بار وہ رو برو آکر پوچھ رہی تھی۔

”چھوڑو، وہ غریب عادل ستار کی گم گشتہ محبت تھی۔ بس ختم ہو گئی۔“ وہ پیٹھ موڑ کر کہتا ہوا جانے لگا تو وہ پھٹ پڑی۔

”جائو، یہ باتیں اسے سنائو جو یقین کرے میں نہیں۔“

”اپنا خیال رکھنا میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔“ وہ یکسر ضبط کر کے کہتا ہوا آگے بڑھا تو وہ سامنے آگئی۔

”میں، کبھی معاف نہیں کروں گی۔“ وہ چپ رہا۔

”سنا تم نے؟ میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔“

”تم تو بہت بدل گئی ہو تانیہ! مجھے خوشی ہے کہ اب جو تمہیں چاہے گا وہ بھی خوش نصیب ہوگا اور جسے تم قبول کرو گی وہ بھی خوش بخت ہوگا۔ ہم کو دعا دو کہ ہم نے تمہیں محبت کرنا سکھادی۔ تم سچ مچ بدل گئی ہو۔ میں خوش ہوں کہ اب تمہیں منزل کے رستے آسان لگیں گے۔“ اس نے بڑی محبت سے اس کے کندھے تھام کر وفور محبت سے دھیرے دھیرے کہا تو وہ ایک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے مضبوط ہاتھوں کا دباؤ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ مگر وقت کا احساس کر کے وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اپنے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ کے اس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرنے کی کوشش میں بے بسی نے توڑ ڈالا۔

”عادل! میں نے تمہیں کھو دیا مگر سن لو اب کوئی تمہاری جگہ نہیں لے سکتا۔

میں پھر سے ٹوٹے ہوئے پتوں کا سہارا لے کر

وحشت دل کسی جگنو سے ادھار لے کر

دشت دنیا میں امیدوں کا کنارہ لے کر

صرف یاد کروں گی ایک عمر دوبارہ لے کر

اک عمر دوبارہ لے کر

خود سے بین کرتے کرتے وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر گئی۔

ناجی نے دروازے کی اوٹ سے اس کی دل گرفتگی کا حال دیکھ کر دکھی دل کے ساتھ دروازہ بند کر دیا اور باہر چلی گئی۔

...☆☆☆...

مہکے مہکے کمرے کے خواب ناک سے ماحول میں وہ دونوں بظاہر تو موجود تھے مگر دونوں ہی شاید ایک دوسرے کو تلاش کر رہے تھے۔ عادل کی پتلیوں پر اس کا روپ نظر آرہا تھا اور اس کی حسین دبیز میک اپ سے بوجھل آنکھوں میں خاموش سناٹا تھا۔ انگوٹھی پہنا کر وہ ایسے اجنبی سا ہو گیا جیسے اسے جانتا بھی نہ ہو۔

”خوش نہیں ہو؟“ وہ مدہم لہجے میں بولی۔

”ہوں... کیوں؟“ وہ چونکا۔

”صاف نظر آرہا ہے اور اسی لیے میں نے کہا تھا؟“

”کیا، کیا کہا تھا؟ اور کیا صاف نظر آرہا ہے؟“ وہ اکھڑ سا گیا۔

”یہی کہ تانیہ کے لیے...!“ وہ ادھورا جملہ چھوڑ کر چپ ہو گئی کیونکہ اس کی آنکھوں میں اتری وحشت دیکھ چکی تھی۔

”تانیہ، تانیہ! اس تکرار کے لیے مجھ سے شادی کی ہے؟“

”عادل! مجھے لگ رہا ہے کہ آپ ناخوش ہیں۔“

”چھوڑ دو یار! یہ فضول بحث۔“ وہ چلا پڑا۔

”پھر آپ کہاں ہیں؟“ اس نے بھی بھرپور شکوہ کیا۔

”یہیں تمہارے پاس تم سے سب کچھ شیر کرنے کے لیے تمہارے

قریب...!“ وہ اس کی بات کا اشارہ سمجھ کر کچھ نرم پڑ گیا۔

”سوری!“

”کرن! وہ بہت اجنبی ہو گئی ہے میرے لیے، تم سمجھ لو

الفت میں خدا سے اور کچھ نہیں مانگا

بس یہ دعا ہے کہ اسے دعائوں کی

محتاجی بھی نہ ہو۔“

”آمین۔“ کرن نے خلوص سے کہا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”کرن! میں آج تانیہ سے مل کر آیا ہوں۔ اس کے لیے اس کمرے میں ایک نشانی موجود تھی۔ وہ تمہارے یہاں آنے سے پہلے اسے دے آیا ہوں۔ جانتی ہو کیوں...؟“ اس نے تکیے کے سہارے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

”آپ تانیہ کے پاس گئے تھے؟“ اس کے سوال میں حیرت تھی یا افسوس عادل نے توجہ نہ دی۔ بات جاری رکھی۔

”تاکہ وہ ہم دونوں کے درمیان نہ رہے۔ اس لیے اب آج کی رات کے بعد تانیہ کا ذکر کبھی نہ کرنا۔“ وہ ایک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

”تانیہ سے میرا خونی رشتا برقرار رہے گا۔ وہ بار بار ملے گی۔ آئے گی، ہم جائیں گے لیکن وہ احساس نہ تمہارے دل میں جاگے گا اور نہ میرے دل میں۔“ اس نے کرن کو نرمی سے اپنے قریب کرتے ہوئے ہدایت کی۔ اس نے پلہ سے باندھ لی۔

”وعدہ عادل؟“ وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر بولی۔

”تمہیں حیرت ہوگی کہ تانیہ اب ویسی تانیہ نہیں رہی۔ اسے محبت کرنی آگئی ہے۔ فقط بڑے نقد سودے کے بعد۔“ وہ طویل سرد سانس بھر کے رہ گیا۔ وہ چپ رہی تو وہ بولا۔

”مجھ سے محبت کرتی رہنا بس شک کبھی نہ کرنا۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا تو وہ شرما گئی۔

پھر انہوں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سارے فاصلے یک دم مٹا دیے۔

☆☆☆☆...

صبح تک تانیہ میں غیر معمولی تبدیلی آئی تھی۔ وہ عادل کے بقول تبدیل ہو گئی تھی۔ سامعہ نے مسز جیری کو ایک میل کر کے ساری صورت حال بتائی۔ اس کے جواب میں انہوں نے تانیہ کو جلد بلانے کا وعدہ کیا مگر یہ سن کر شاہدہ بیگم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”شاہدہ بیگم! خوش ہو جاؤ بیٹی کی خوشی پوری ہو جائے گی۔“ میاں افتخار نے کہا۔



”میری تانیہ بھی خوش اور آباد ہو جاتی تو مجھے زیادہ خوشی ہوتی۔“

”بس کچھ فیصلے قسمت کے ہوتے ہیں۔ انہیں قبول کرنا پڑتا ہے۔“

”عادل نے اچھا نہیں کیا۔“

”بس کرو اب عادل شادی شدہ ہے اور کرن اس کی زندگی میں شامل ہو گئی

ہے۔“ میاں افتخار نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”آپ تو بھتیجے کی وکالت ہی کریں گے۔“

”بس! پھر وہی شاہدہ بیگم آگئیں۔“ میاں افتخار نے اس طرح کہا کہ انہیں

ہنسی آگئی۔

”شکر ہے آپ مسکرائیں تو۔“

”بس میری تانیہ...!“ وہ پھر سے دکھی ہو گئیں۔

”بس اس کی پرورش میں جو کمی رہ گئی اس نے یہ حال کیا ہے۔“ اماں جان

کسی ضروری کام کے سلسلے میں آئی تھیں۔ ان کی بات سن کر بولیں۔

”اماں جان! بس اسی طرح غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ جیسے آپ سے بھی شاہدہ کی

پرورش میں غلطی ہو گئی۔“ میاں افتخار سادگی اور برجستگی سے کہہ گئے۔ تو اماں

جان بالکل برہم نہ ہوئیں۔

”ٹھیک کہتے ہو میاں! ہم بھی خطا وار ہیں۔ بیٹی کو رخصت کرنے کے بجائے

ہم نے گھر داماد رکھنے کی خواہش اپنی پوری کی۔ تمہارے رشتے دور ہوئے اس

خرابی کی ذمہ دار اکیلی شاہدہ بھی نہیں ہے۔ کاش ہم سمجھ سکتے کہ بیٹی

دوسرے گھر جا کر رشتے مضبوط بناتی ہے۔“ وہ بولتی چلی گئیں۔ میاں افتخار کو

شوخی سو جھی۔

”کاش میں ماضی میں لوٹ سکتا اور آج کے دن شاہدہ سے شادی کرنے

آتا۔“

”بہت شوق ہے شادی کا؟“ شاہدہ بیگم نے گھور کر پوچھا۔

”ارے ایک شادی ہی حلق میں اٹکی ہوئی ہے۔“ وہ بولے۔

”ارے میاں جانے دو تمہیں کسی نے گھاس ڈالی ہوتی تو تم یہ ارمان پورا کرتے۔ یہ تو میری شاہدہ کی مہربانی ہے۔“ اماں جان اپنے مخصوص کڑک لہجے کی طرف لوٹ گئیں۔ تو میاں افتخار نے جلدی سے کہا۔

”خدارا! اتنی جلدی تو خوش فہمی دور نہ کریں۔“

”اچھا اب باہر جاؤ تو یہ سامان لیتے آنا۔“ انہوں نے سامان کی لسٹ انہیں تھما دی۔

”پھر اہلی...!“ وہ ہکلائے۔

”ہاں! زرتاشیہ کے جہیز کے برتن دھلوا کر رکھنے ہیں۔“

”کیا وہ برتن؟“

”میں نے ناجی کو کہہ دیا ہے۔“ وہ بولیں۔

”بے چاری ناجی اور ہائے زرتاشیہ۔“ میاں افتخار کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ تو اماں جان نے ڈپٹ کر کہا۔

”کیا پر نکل آئے ہیں ناجی کے؟“

”نہیں بالکل نہیں۔ وہ تو بے چاری پر کٹی ہے۔“ میاں افتخار معصومیت سے بولے۔

شاہدہ بیگم مسکرا دیں اور اماں جان کمرے سے باہر چلی گئیں۔

...☆☆☆...

انجم سے فون پر بات کرتے ہی نرگس نے حیرت سے زبیر احمد اور زرتاشیہ کو دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“

”حیرت کی بات ہے، افراسیاب یہاں اب تک پہنچا کیوں نہیں؟“ ماما کی بات سن کر زرتاشیہ کے حلق میں ٹوسٹ پھنس گیا اور نظریں جھک سی گئیں۔

”ہیں!“ اب کہ زبیر احمد کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”میں نے بھابی کو کہہ دیا ہے کہ کہیں راستے میں رک گیا ہوگا۔ ماشاء اللہ سمجھ دار ہے۔“ نرگھس نے تسلی آمیز انداز اختیار کیا۔ زرتاشیہ نے وہاں سے اٹھنا چاہا تو نرگھس نے کہا۔

”زرتاشیہ! ناشتا چھوڑ کے آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”مما! میں نے ناشتا کر لیا ہے۔“

”کچھ پریشان ہو؟“ زبیر احمد نے بیٹی سے پوچھا۔

”نن... کچھ نہیں۔“

”اپنی حالت دیکھو، بیٹھ جاؤ ناشتا ختم کرو۔“ نرگھس نے تنبیہ کی تو وہ بیٹھ گئی۔

”ویسے سوچنے کی بات ہے کہ افراسیاب واپس آیا اور یہاں نہیں آیا۔“

زبیر احمد نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

”کیا کہہ سکتے ہیں؟ ویسے آیا تو وہ نیک ارادے سے تھا۔ مگر اب اس کا فون بھی بند ہے۔“ نرگھس چپ کر گئی۔ زرتاشیہ جزبز ہو کر وہاں سے اٹھی اور اپنے کمرے میں آگئی۔ اس نئی صورت حال کا تو اسے گمان تک نہیں تھا۔ وہ کسی کو کیا بتاتی کہ افراسیاب کے ساتھ کیا سلوک کیا اور وہ غصے سے چلا گیا۔ مگر کہاں؟ ذہن نے سوال کیا۔ اب اس کا فون بھی بند ہے۔

”یا خدا! میں کیا کروں کیسے بتائوں کہ وہ یہاں آیا تھا۔ پھر چلا گیا۔“ وہ بڑ بڑائی۔ وہ کمرے میں بند تھی۔ ذہن حد درجہ وسوسوں کا شکار تھا۔ ایک مجرم کی سی کیفیت طاری تھی۔

سامعہ احتشام کو لے کر اس کے کمرے میں آئی تو وہ بجھی بجھی سی مسکراہٹ کے ساتھ احتشام کے ساتھ کھیلنے لگی۔

”یہ افراسیاب والا کیا ماجرا ہے؟“ سامعہ نے پوچھا نہیں البتہ ذکر کیا تو وہ چونکی۔

”کیوں؟“

”باہر آنٹی انکل نے بتایا ہے، انجم آنٹی اور گلریز انکل بہت پریشان ہیں۔ آپ کو نہیں معلوم؟“ سامعہ نے ساری تفصیل اسے انجان سمجھ کر پیش کر دی۔ تو وہ سچ بچ انجان ہی بن گئی۔

”اچھا، لیکن اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“

”ہیں! کسی کا جوان بیٹا گھر سے آیا اور وہاں نہیں پہنچا تو والدین کے لیے فکر کی بات نہیں؟“ سامعہ نے تعجب سے سوال کیا۔

”وہ کوئی دودھ پیتے بچے ہیں کیا؟“ وہ چڑ گئی۔

”زرتاشیہ! آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ تو بہت نرم اور مہربان دل رکھتی ہیں۔

ایسی لا تعلقی اور بے زاری...؟“ سامعہ نے اسے یاد دلایا تو وہ شرمسار ہو گئی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ سامعہ کو کیا بتاتی کہ اس

نے کیا کیا ہے اور افراسیاب یہاں سے کیوں چلے گئے ہیں۔ وہ چپ ہو گئی تو سامعہ نے پھر کہا۔

”زرتاشیہ! آج کل ملکی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ اغوا، لوٹ مار، قتل و غارت اور ڈکیتی عام ہے افراسیاب کا فون بند ہے اور کوئی اتا پتا نہیں تو سب کی پریشانی بجا ہے۔“ سامعہ کی اس دلیل کے بعد تو اس حساس لڑکی کی آنکھیں خوف سے کھلی رہ گئیں اور دل جیسے پسلیوں سے باہر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ افراسیاب کا چہرہ نظروں میں آگیا اور آخری ملاقات کے جملے کانوں میں گونجنے لگے۔ اس متغیر سی کیفیت میں اسے دیکھ کر سامعہ کو کچھ اندازہ ہو گیا۔ ”دیکھو! وہ بہت اچھا اور پیارا انسان ہے۔ اللہ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے لیکن کوئی بات تو ہے نا۔“

وہ سنی آن سنی کر کے احتشام سے کھینے لگی۔

”زرتاشیہ! افراسیاب نے پچھلے چوبیس گھنٹوں میں آپ سے رابطہ نہیں کیا؟“

”ہیں، ہاں، نہیں مجھ سے کیوں...؟“ وہ ہکلائی۔

”زرتاشیہ! جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، افراسیاب یہاں آیا تھا۔ شوکی نے

بتایا ہے۔ تم نے اس سے کیسا سلوک کیا کہ وہ چلا گیا۔“ نرگس نے آندھی

اور طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوتے ہوئے صاف صاف کہہ دیا وہ  
بھونچکا سی رہ گئی۔

”زرتاشیہ! افراسیاب یہاں آیا تھا؟“ سامعہ نے سخت حیرت سے سوال کیا۔  
”ہاں‘ ہاں‘ ہاں۔“ وہ رو پڑی۔

”اور پھر...؟“ نرگس نے طیش میں آکر پوچھا۔

”آئی! پلیز آپ باہر جائیں میں زرتاشیہ سے پوچھ کر آپ کو بتاتی ہوں۔“  
سامعہ نے نرگس کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے جاتے ہی زرتاشیہ پھوٹ  
پھوٹ کے رونے لگی۔

”پلیز! روئیں نہیں، آرام سے بتائیں کہ وہ کیوں چلا گیا؟ اور آپ نے کیوں  
چھپایا؟“

”میں نے جانے کو نہیں کہا تھا؟“ وہ روتے روتے معصومیت سے بولی۔

”لیکن ماحول ایسا بنا دیا ہوگا کہ وہ ناراض ہو کر چلا گیا؟“

”نہیں، میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”زرتاشیہ! وہ تو میلوں کا سفر طے کر کے یہاں پہنچا تھا۔ آپ نے اسے جانے  
دیا؟“ سامعہ دکھی ہو کر بولی۔

”تو کیا کرتی؟“ وہ جھلائی۔

”وہ اجنبی تو نہیں تھا۔ رہ سکتا تھا۔ آئی انکل کے آنے تک۔“

”سامعہ جی! آپ بات نہیں سمجھ رہیں۔“

”زرتاشیہ! محبت کرنے والے کے بارے میں، میں کیا سمجھوں...؟ مجھے ہر  
بات کا اندازہ ہو گیا ہے۔ افراسیاب کے آنے اور جانے کی وجہ صرف آپ  
ہیں“ سامعہ نے کھلے لفظوں میں کہا۔

”میں ہی بُری ہوں۔“ وہ بچوں کی طرح بولی۔

”اوہو، اس وقت سوچنا یہ ہے کہ افراسیاب کہاں گیا؟“

”مجھے نہیں معلوم، پلیز مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔“



”زرتاشیہ! محبت کو یوں بے سائباں نہیں کرتے، وہ آپ سے سچی محبت کرتا ہے۔ آپ سے یہی کہنے آیا تھا۔“

”ہاں، میں نے سن لیا تھا۔“

”تو پھر...؟“

”تو پھر وہ صبر کر کے رک سکتے تھے۔“

”تو آپ کہہ دیتیں۔“

”میں نے تو کہنے کی کوشش کی تھی۔“

”صرف کوشش...؟ پاگل لڑکی، دل سے کہتیں۔“

”اچھا اب آئے گا تو کہہ دوں گی۔“ وہ نرمی سے بولی۔

”سچ۔“

”ہوں۔“

”پھر اسے ڈھونڈتے ہیں۔ فی الحال تو اس کا نہ ملنا پریشانی کی بات ہے۔“  
سامعہ نے کہا۔

”سامعہ جی! پپا سے کہیں کہ تمام ہوٹلرز کی استقبالیہ سے پتا کریں۔“

”ہوں، اچھا آئیڈیا ہے۔“ سامعہ کو تجویز پسند آئی۔ وہ احتشام کو اس کے پاس چھوڑ کر زبیر احمد کو بتانے کے لیے باہر چلی گئی۔

...☆☆☆...

اماں جان کو پہلی مرتبہ زرتاشیہ پر بہت غصہ آیا۔

”میں تو تانیہ کو نادان اور احمق سمجھتی تھی، مگر زرتاشیہ تو اس سے بھی چار

ہاتھ آگے نکلی۔ لو بھلا اتنی بد تہذیبی... جانے کیا کچھ کہا ہوگا؟ وہ لڑکا

شرمندگی سے یا غصے سے جانے کہاں چلا گیا۔ وہ مسلسل بول رہی تھیں اور

زرگھس، شاہدہ بیگم خاموش بیٹھی سن رہی تھیں۔ سامعہ نے ان کا غصہ کم

کرنے کے لیے احتشام کو ان کے بستر پر چھوڑ دیا تو وہ سچ مچ اس کی طرف

متوجہ ہو گئیں۔

”مجھے تو انجم بھابی کی فکر کھا رہی ہے۔ کل افراسیاب کی فلائٹ ہے اور وہ یہاں سے لا پتا ہے۔ بڑے بھیا کی طبیعت سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔“  
نرگھس نے سخت پریشانی سے کہا۔

”ویسے یہ افراسیاب کی حماقت ہے۔ زرتاشیہ نے کچھ بھی کہا۔ وہ تو سمجھ داری کا ثبوت دیتا۔ ہمیں تو بتانا مل کر جاتا۔“ شاہدہ بیگم نے بھتیجی کو اخلاقی مدد فراہم کی۔

”اللہ سب خیر کرے گا۔ افراسیاب کوئی نا سمجھ نہیں ہے۔ آپ لوگ پریشان نہ ہوں، بابا اور زبیر انکل گئے ہیں معلومات کے لیے۔“ سامعہ نے کہا۔

”زرتاشیہ سے پوچھا تھا کہ اس نے کیا کہا۔“ اماں جان کو پھر خیال آیا۔

”بس کچھ خاص نہیں۔ دراصل انجم آنٹی کو افراسیاب کو فی الحال یہاں نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ زرتاشیہ ابھی شاید اس فیصلے کو قبول کرنے کی کیفیت میں نہیں تھی۔ اسے وقت چاہیے۔“

”ارے بس کرو، یہ کل کی بچیاں ہمیں آنکھیں دکھانے لگی ہیں۔ کون سا وقت؟ اچھا لڑکا ہاتھ سے نکل جائے گا۔ تب فیصلہ ہوگا۔ ایک تو تانیہ کی فکر کھا رہی ہے اوپر سے زرتاشیہ نے مشکل کھڑی کر دی ہے۔“ اماں جان نے خوب کھری کھری سنائیں۔

”میں ذرا تانیہ کو دیکھوں، اسے بخار ہے۔“ شاہدہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔  
”ڈاکٹر کے پاس لے جانا تھا۔“ نرگھس نے مشورہ دیا۔

”ماما! میں نے تانیہ کو بخار اتارنے کی گولیاں دی ہیں۔ بخار جلد اتر جائے گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“ سامعہ نے کہا تو شاہدہ بیگم نے ممنونیت سے سامعہ کو دیکھا۔

”جیتی رہو۔“ اماں جان نے محبت بھرے لہجے میں سامعہ کو دعا دی۔

”بڑی بیگم صاحبہ! بینگن کاٹ دیے ہیں۔ آلو اُبلنے کے لیے رکھ دیے اور چاول بھگو دیے۔“ ناجی نے آکر روبورٹ کی طرح دوپہر کے کھانے کی جزئیات بیان کیں۔

”اچھا، چلو میں آتی ہوں۔“

”میں دیکھ لیتی ہوں آپ آرام کریں۔“ شاہدہ بیگم نے کہا مگر انہیں اپنے ہاتھ سے کام کرنے کی عادت تھی۔ فوراً انکار کر دیا۔

”بھئی بگھارے بینگن تمہارے بس کا روگ نہیں۔“

”میں بھی قیمہ فریج سے نکال کر آئی تھی۔ جا کر دیکھتی ہوں۔“ نرگھس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”اللہ اس بچے کو خیر رکھے۔“ اماں جان نے جاتے جاتے کہا۔

”آمین!“ نرگھس نے فوراً کہا۔

”افراسیاب بہت سمجھدار ہے۔ آجائے گا۔“ شاہدہ بیگم نے ہمت بندھانے کی کوشش کی۔

”مگر آپا کل اسے لندن جانا ہے۔“ نرگھس پُر تشویش انداز میں بولیں۔

”یہ افراسیاب کو بھی پتا ہے۔ ہم کیا کر سکتے ہیں؟“

”میرے دل میں وسوسے آرہے ہیں کہیں اغوا تو...!“ وہ درمیان میں ہی رک گئی۔

”اللہ نہ کرے، اللہ پر بھروسہ رکھو۔“

”بس اللہ ہمیں سرخرو کر دے۔ افراسیاب خیریت سے لوٹ آئے۔“ نرگھس کے دل سے دعا نکلی۔ مگر آنکھیں بھیگ گئیں۔

...☆☆☆...

رات کو سب ناکام تھک ہار کے لوٹے تو فرحان نے زرتاشیہ کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ اداس متفکر سی آنکھیں موندے صوفے پر بیٹھی تھی۔ جھٹکے سے دروازہ کھلنے کی آواز پر آنکھیں کھولیں تو گڑ بڑا گئی۔

”کتنے مزے سے ہو؟ ایک پیارے سے انسان کو نا کردہ گناہ کی سزا دے کر۔“

”آپ بھی ایسا سوچ رہے ہو۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”کیوں میں سانس نہیں لیتا۔ میں حس سے عاری ہوں؟“ وہ الٹا سوال کر کے اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”مگر یہ الزام میرے سر کیوں لگایا جا رہا ہے؟“

”اس لیے کہ ایک سمجھ دار، ہوشیار انسان کہاں گیا ہے؟“

”یہ اسی سے پوچھیے گا۔“

”وہ چھوٹی سی بات پر ناراض نہیں ہو سکتا۔“

”کمال ہے، کوئی یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ اس کا اپنا بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔“ وہ سراپا احتجاج بن گئی۔

”اس کا مسئلہ تم بن گئیں، مگر تم تو تمام عمر مجھ پر یہ احسان رکھنا چاہتی ہو کہ میری وجہ سے کنواری رہ گئیں۔ یہ عظیم احسان میرے لیے احساس ندامت بنا رہے، یہی چاہتی ہو تم؟“ وہ شعلہ بار آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ تو وہ مارے غم و غصے کے تلملا اٹھی۔

”فرحان! بس کرو، میں اور توہین برداشت نہیں کر سکتی۔“

”جی ہاں! آپ دوسروں کی توہین کر سکتی ہیں۔“

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“

”دیکھو، یہ تو اس کے ملنے پر ہی پتا چلے گا۔ ویسے مجھے تم جیسی محبت قربان کرنے والی لڑکی سے یہ امید نہیں تھی کہ محبت کی یوں ناقدری کرو گی۔“ وہ خاصی بلند آواز سے کہہ کر باہر نکلا تو زبیر احمد نے اپنے کمرے سے باہر نکل کر اس کو جاتا دیکھا۔ پھر وہ زرتاشیہ کے پاس آگئے۔ وہ ساکت سی بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ پپا کو دیکھ کر وہ چیخیں مار کے روئی اور ان سے لپٹ گئی۔

”ارے میرے جگر گوشے! کیوں ایسے رو رہی ہو؟“ انہوں نے اس کے سر پر بوسہ دے کر پچکارا۔

”پپا! سب مجھے قصور وار سمجھ رہے ہیں۔“ وہ ہچکیوں کے ساتھ بولی۔

”نہیں، نہیں میرا بچہ تو بالکل بے قصور ہے بس اتنی سی بات ہے کہ اس سارے مسئلے میں یہ پتا چل گیا ہے کہ افراسیاب اچھا ہے۔ آپ کو اچھا لگنے لگا ہے۔“ زبیر احمد نے بڑی سادگی سے اسے غیر محسوس طریقے سے کہا تو کچھ توقف کے بعد وہ چونکی۔

”پپا! یہ جانتے ہوئے بھی کہ...!“

”سب کچھ جانتے ہوئے بھی یہ حقیقت ہے کہ اب وہ اچھا لگنے لگا ہے میں نے پہلے کی بات نہیں کی۔“

”لیکن، وہ میں نے...!“ وہ الجھ سی گئی۔

”بس کچھ نہیں۔ آپ کا جواب مجھے مل گیا ہے۔ اس احمق کو ملنے دو میں خود اسے بتا دوں گا کہ ہماری زرتاشیہ کو تو تم بہت پسند ہو۔“ زبیر احمد نے بڑی معصومیت سے اسے وہ سچ ذہن نشین کرایا۔ جس کے لیے اس نے کسی کو کچھ نہیں کہا۔ وہ پپا کا منہ تکتی رہ گئی۔ وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے تو وہ اس عالم بے بسی میں خود کو ہی برا بھلا کہتی رہی۔ یہ سب کچھ خلاف توقع ہو گیا تھا۔

...☆☆☆...

”کچھ لوگ میری دنیا میں خوش بو کی طرح ہیں۔“ رات کے تیسرے پہر کروٹیں بدلتے وقت جملہ اس کے کانوں میں گونجنے لگا۔ تو وہ اس خوش بو کے احساس میں سر سے پیر تک نہا گئی۔ اس کے چاروں اطراف اس کے وجود کی مہک نے حصار قائم کر دیا۔

”اس کی یاد شاخِ گلاب ہے، جو ہوا چلی تو مہک اٹھی۔“

اس نے خود کو بتایا اور اٹھ بیٹھی۔ پیروں میں سلیپر ڈال کر غیر ارادی طور پر چلنا شروع کر دیا۔ کمرے کی کھڑکی کا پردہ سر کا کر سامنے والے کمرے کی طرف دیکھا۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں افراسیاب نے قیام کیا تھا۔ آج اس کی کھڑکیاں بے نور تھیں۔ اس کی نگاہیں وہ روشنی ڈھونڈ رہی تھیں، جو اس کی یاد سے وابستہ تھی۔ پردہ برابر کر کے کھڑکی سے ٹیک لگا کر وہ اس کے بارے میں ہی سوچنے لگی۔ وہ دور ہو کر قریب بلانے کے مقام پر آ گیا تھا۔ اس نے



جانے کس کو کہا کس کو پیغام دیا کہ جا کر دل مضطرب کا فسانہ اسے سنائو۔ جو شاید خفا ہو گیا ہے۔

اسے کہنا بچھڑنے سے محبت تو نہیں مرتی۔

بچھڑ جانا محبت کی صداقت کی علامت ہے۔

محبت آئینِ فطرت ہے۔

اور فطرت کب بدلتی ہے۔

اسے میرے نام سے اتنی دلی عقیدت ہے مجھ سے دور جا کر بھی دل میں میری محبت ہوگی۔

محبت تو بچھڑ کر بھی سدا آباد رہتی ہے۔

اگر مجھ سے محبت ہے تو یاد ہوگی محبت بھول کا نام نہیں۔ مگر اس کے دل سے اٹھنے والے جذبوں کو افراسیاب تک پہنچاتا کون؟

”یا اللہ! اس کو میرے جذبوں سے آگہی عطا کر دے کہ وہ لوٹ آئے۔ میں اسے یہ کیسے بتائوں کہ مجھے اس کی محبت پر اعتبار آگیا ہے۔“ اس نے خلوص دل سے دعا کی اور بستر پر گر کے پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ ٹوٹ کے رونے کے بعد چین سے سوئی۔ دل کا زہر چشم تر سے نکلا اور سکون کی نیند نے اسے آغوش میں لے لیا۔ کئی دنوں کی تکلیف جیسے ختم ہو گئی۔

صبح وہ ہلکے پھلکے ذہن کے ساتھ اٹھی۔ مگر خاموش تھی نرگس نے اس کی خاموشی نوٹ کی اور زبیر احمد کو مخاطب کیا، وہ اخبار پڑھنے میں محو تھے۔

”کتنے بے حس ہیں آپ دونوں۔“

”کیا مطلب۔“ زبیر احمد چونکے۔

”آج افراسیاب کی فلائٹ تھی، انجم بھابی کا رو کر برا حال ہے۔ اور آپ

اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔“

”تو میں کیا کروں؟ کہاں اسے تلاش کروں؟“

”مما! افراسیاب کوئی دودھ پیتے بچے نہیں ہیں۔“ زرتاشیہ بہت مدہم لہجے میں اطمینان سے کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔ زبیر احمد نے بیٹی کی بات کی تائید کی۔

”زرتاشیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔“

”کمال ہے، افراسیاب یہاں سے آکر غائب ہو گیا۔“

”بھئی گھر کے باہر وہ کہاں گیا؟ کس کے ساتھ گیا؟ غیب کا علم ہمیں نہیں آتا۔“ زبیر احمد بڑے سکون سے بولے۔

”لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں میں وہاں کیا جواب دوں؟ میری خود سر بیٹی نے اسے بُرا بھلا کہہ کر گھر سے نکال دیا؟“ زرگھس نے رقت آمیز لہجے میں کہا تو زبیر احمد بے بسی سے بولے۔

”خود سوچو، ہم کیا کریں؟ موبائل بھی اس کا بند ہے۔ کہتی ہو تو تھانے میں رپورٹ درج کرادیتا ہوں۔“

”بڑے بھیا سے مشورہ کر لیں۔“

”میں بات کرتا ہوں۔“ وہ بولے۔

”افتخار بھائی سے بھی پوچھ لیں۔“

”اچھا! دیکھتا ہوں لیکن وہ تو آفس جا چکے ہیں۔“ اچانک یاد آیا تو کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”پپا! آپ بس انہیں ڈھونڈ لیں۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا پھر بھی میں شرمندہ ہوں۔ افراسیاب نے میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“

زرتاشیہ نے آکر زبیر احمد سے بات کی۔

”آپ کو افراسیاب پسند تو ہے؟“ انہوں نے عینک کے شیشوں کے پیچھے سے اس کی آنکھوں میں دور، دور تک جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”وہ اچھے ہیں۔“ وہ بری طرح ہکلائی۔

”میں افراسیاب کے کان کھینچتا ہوں۔“ زبیر احمد مسکرائے اور بڑے اطمینان سے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

...☆☆☆...

گرما گرم شامی کباب اور چائے کا دور چل رہا تھا۔

ایاز فرنیچ فراڑ کی پلیٹ لیے کمرے میں آیا تو فرحان کی حس ظرافت پھڑکی۔

”جورو کے غلام صاحب! اگر ہماری مامی کو پتا چل جائے کہ تم نے ان کے

ہونے والے داماد اور لاڈلے بھتیجے کو پناہ دے رکھی ہے تو وہ تمہیں سیدھا

اوپر پہنچا دیں گی۔“

”صرف ایک داماد نہیں، پہلے کے متوقع داماد اور اس کی بیگم کو بھی پناہ دینے

کی سزا دیں گی۔“ ایاز نے اضافہ کیا۔ فرحان اور افراسیاب ہنس پڑے۔

”تمہارا گھر تو جائے پناہ بن گیا۔ صائمہ بھابی کا حوصلہ ہے۔“ فرحان نے کہا۔

”یار! دوستوں کے لیے جان بھی حاضر ہیں لیکن بس اب یہ ڈراما ختم کر دینا

چاہیے کیونکہ بزرگ پریشان ہو رہے ہیں اور آج تو افراسیاب کی امی بہت

پریشان ہوں گی۔“ ایاز نے کہا۔

”ہاں! ایاز بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میری امی بہت پریشان ہوں گی۔ مجھے

فون کرنا چاہیے۔“ افراسیاب ماں کے ذکر پر بے تاب ہو گیا۔ وہ شاید ایسا کر

ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ تو فرحان کی ضد اور میاں افتخار، زبیر احمد کا مشورہ تھا۔

”چلو فون کرلو، ویسے بھی اب زرتاشیہ ٹھیک ہو گئی ہے“ فرحان نے ہنس کر

کہا۔

”ویسے اس بے چاری کے ساتھ فرحان نے اچھا نہیں کیا۔“ ایاز کو زرتاشیہ

سے ہمدردی تھی۔

”بس، بس ہم اس کے دشمن نہیں ہیں۔“ فرحان بولا۔

”میں ذرا امی کو فون کر لوں۔ ابھی آتا ہوں۔“ افراسیاب موبائل فون لے کر

کمرے سے نکل گیا۔

”ہیلو!“

”ہیلو! افراسیاب بیٹا تم۔“ دوسری طرف سے انجم کی بھیگی بھیگی سی آواز آئی تو وہ بہت رنجیدہ ہو گیا۔

”جی! امی! میں ٹھیک ہوں۔ آپ کو سب کچھ بتائوں گا مگر واپس آنے پر۔“ اس نے جلدی سے انہیں کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔

”افراسیاب! یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میرے دماغ میں کچھ نہیں آرہا۔ آج تو تمہاری فلائٹ تھی۔ فون کیوں بند تھا؟“ انہوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

”میں کسی ضروری کام سے رک گیا ہوں۔ فون بھی کسی وجہ سے بند تھا۔ باقی ملاقات پر بتائوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔“

”کہاں ہو؟ زرگھس، زبیر سب کتنے پریشان ہیں۔“

”میں وہیں جا رہا ہوں۔ دلچسپ کہانی ہے، کل آکر سنائوں گا اور لندن کی فلائٹ فی الحال آج میں نے کینسل کرادی ہے۔“

”جان! آپ کے ابو بہت پریشان ہیں۔“

”آپ بتا دیں بے شک کچھ دیر بعد میری بات کرا دیجیے گا۔“ وہ بولا۔

”اوکے! جب پوکے پاس جائو تو میری بات کرانا۔“ انجم نے تاکید کی وہ فرمانبردار بیٹا بن کر بولا۔

”بے فکر ہو جائیں میں آپ کے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔“

”کیا زرتاشیہ نے ہاں کر دی؟“ بے ساختہ ہی ان کے منہ سے نکلا۔

”ہاں ہی ہاں ہے۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”اچھا! اللہ کا شکر ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔“

”اللہ حافظ۔“

”اللہ حافظ۔“ اس کے ساتھ ہی فون بند کر دیا۔

...☆☆☆...

اماں جان شدید جاہ و جلال میں تھیں۔

وہ سب ان کے سامنے مجرموں کی مانند سر جھکائے کھڑے تھے۔ نرگھس، شاہدہ بیگم بھی اماں جان کی ہم خیال تھیں کیونکہ افراسیاب کے بارے میں میاں افتخار، زبیر احمد اور فرحان با خبر تھے۔ بلکہ انہوں نے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ تینوں نے مل کر افراسیاب کو چھپنے کا مشورہ دیا اور تینوں پل پل کی خبر اسے ایاز کے گھر دے رہے تھے۔

”افتخار میاں! تم سے ہم توقع کر سکتے ہیں۔ فرحان سے کر سکتے ہیں۔ لیکن ہمیں تو زبیر احمد پر تعجب ہو رہا ہے کہ اسے نہ ماں کی پریشانی کا خیال آیا نہ بیوی بیٹی کا۔ یہ چالاکیاں کہاں سے سیکھیں؟“ وہ براہ راست میاں افتخار کے بعد زبیر احمد پر برس پڑیں۔

”اماں جان! میں نے اپنی بیوی سے ہی تو یہ چالاکیاں سیکھی ہیں۔“ زبیر احمد کی رگ ظرافت پھڑکی تو نرگھس نے گھور کر دیکھا۔

”اچھا!“ اماں جان کے ’اچھا‘ میں بہت گہرا طنز تھا۔

”ہم سب نے صرف زرتاشیہ اور افراسیاب کے لیے ہی ایسا کیا؟“ فرحان نے صفائی پیش کی۔

”بس، بس سب جانتے ہیں تمہیں زرتاشیہ کا کتنا خیال ہے؟“ اماں جان نے فرحان کو آئینہ دکھایا تو وہ شرمندہ سا ہو کر وہاں سے چلا گیا۔

”اماں جان! اس میں فرحان کی نیک نیتی شامل تھی۔ افراسیاب کو بھی سوچنے کا موقع مل گیا اور زرتاشیہ کو بھی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گئی۔“ زبیر احمد نے ماں کے ہاتھ تھام کر چومتے ہوئے کہا۔ تو وہ چپ ہو گئیں۔

”اب ہم بیٹھ جائیں؟“ میاں افتخار نے معصوم صورت بنا کر پوچھا۔

تو اماں جان کے لبوں پر ہنسی کھل گئی اور بیٹھنے کا اشارہ کر دیا۔

”معاف کر دیں پلیز۔“ افراسیاب نے بہت ندامت اور احترام کے ساتھ اماں جان کو مخاطب کیا۔

”جیتے رہو، اب ایسی حرکت کبھی نہ کرنا۔“ انہوں نے تنبیہ کی۔



”توبہ، توبہ۔ اب تو مسئلہ ہی حل ہو گیا ہے۔“ اس نے کان پکڑ لیے۔

”واہ! کیا خوب قسمت پائی ہے اماں جان آپ نے...!“ میاں افتخار نے بڑے رشک بھرے انداز میں کہا۔

”کیا مطلب؟“

”سب داماد ایسے ہی ملے ہیں جیسے میاں افتخار آپ کو ملے تھے۔“ بڑا ذو معنی جملہ کہا تو شاہدہ بیگم نے شوہر کو گھور کر دیکھا۔

”ارے دو داماد ہیں، تیسرا تو ابھی وہم و گمان میں بھی نہیں۔“ اماں جان کب آسانی سے چھوڑنے والی تھیں۔ تانی کے لیے اشارہ کر ہی دیا۔

”تیسرا بھی آہی جائے گا۔“ میاں افتخار پُر امید تھے۔

”پو، پھوپھا جی! مجھے اجازت دیجیے۔“ افراسیاب نے اجازت طلب کی تو سب ایک ساتھ ہی بول پڑے۔

”ہیں! بنا کسی بات چیت کے ہونا تو یہ چاہیے کہ انجم اور گلریز آکر تاریخ لے جائیں۔“

”اماں جان! آپ اجازت دیں تو میں تاریخ کے ساتھ زرتاشیہ کو لے جاؤں۔“ افراسیاب نے کمال کی شوخی کا مظاہرہ کیا۔

”واہ بھئی! ہماری بیٹی ایسی بھاری ہے کیا؟ ہم اتنی جلدی شادی نہیں کر سکتے۔“ نرگھس نے بھیتجے کو چھیڑا۔

”رات یہیں آرام کرو، کل صبح سویرے نکلنا۔“ زبیر احمد نے کہا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

...☆☆☆...

سکون ملتا ہے جب اس سے بات ہوتی ہے

ہزار راتوں میں وہ ایک رات ہوتی ہے

نگاہ اٹھا کے وہ دیکھے کبھی جو میری طرف

وہ اک نگاہ میری کائنات ہوتی ہے

کھانے کے بعد وہ سب کے لیے قہوہ بنا رہی تھی کہ افراسیاب وہیں آکر اس کے کان میں جذبوں کا رس گھول گیا۔ وہ گھبرا سی گئی۔

”آپ وہیں آگئے ہیں جہاں سے گئے تھے۔ اس بار گئے تو میں بلانے والی نہیں۔“

”اس کا مطلب تم نے مجھے بلالیا اور میں چلا آیا۔“ اس کے جملے میں سوال تھا۔

”بے وجہ خوش فہمی کا شکار نہ ہوں؟“

”اب تو کہہ دو جو کہنے کے لیے بلا یا ہے۔“

”آپ کو یہ کس نے کہہ دیا کہ مجھے کچھ کہنا ہے۔“ چائے کے کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے بولی۔

”زرتاشیہ! آج میں ایسے ٹلنے والا نہیں۔“ اس نے چینی کا چمچ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”پھر کیا کروں؟“

”پلیز کہہ دو زرتاشیہ! میری طرف دیکھتے ہوئے۔“ اس نے بے اختیار ہاتھ تھام کر کہا تو وہ چند ساعت تو گنگ رہ گئی پھر لب کھلے۔

جن کی صداقتوں پر کوئی شک نہ کر سکے

تم بھی کتابِ دل کی ان ہی آیتوں میں ہو

وہ کہہ کر ٹرے اٹھا کر باہر کی طرف بھاگی۔

”شکریہ، شکریہ!“ پیچھے سے وہ زور زور سے بولا اور خوشی سے جھوم اٹھا۔

...☆☆☆...

نرگھس اور اماں جان نے دس کلو مٹھائی کا ٹوکرا جاتے وقت اس کے سامنے رکھا تو افراسیاب کو حیرت سے ہنسی آگئی۔

”کیا میں مٹھائی لینے آیا تھا یہاں؟“

”اور نہیں تو کیا۔ دل میں جھانک کر دیکھو بیٹا۔“ اماں جان نے بھی خوب کرارا جواب دیا۔

”میرا مطلب ہے میں یہ مٹھائی...!“ وہ لا جواب سا ہو کر ہکلا یا۔

”فی الحال تو مٹھائی لے جاؤ اگلی دفعہ اپنا جگر گوشہ دے کر بھیجیں گے۔“ اماں جان نے بہت خوشی سے نظریں جھکائے بیٹھی زرتاشیہ کو دیکھا۔

”مگر اماں جان! یہیں جہاز سے جا رہا ہوں۔“

”جیسے مرضی جاؤ، مٹھائی ساتھ جائے گی۔“ انہوں نے تحکم سے کہا۔

”چلو یہ مٹھائی ہم کسی کوریئر سروس سے بھیج دیتے ہیں مگر تمہیں ایک ماہ بعد واپس آنا ہے۔“ نرگس نے مسئلے کا حل پیش کیا۔

”آپ مٹھائی کی جگہ میٹھی چیز ساتھ بھیج دیں۔ میں جہاز میں لے جاؤں گا۔“ وہ شریر ہو گیا۔

”کیا؟ میٹھی چیز اتنی آسانی سے بھیج دیں؟“ شاہدہ بیگم نے اس طرف آتے ہوئے ٹکڑا لگایا۔

”میں دس پندرہ مزدور کر لیتا ہوں۔“

”اچھا! ہماری پھول سی بیٹی کو لے جانے کے لیے مزدور چاہئیں؟“ نرگس نے ڈپٹ کر پوچھا۔

”اوہ! پو میری فلائٹ مس ہو جائے گی۔“

”تو ہو جانے دو۔“

”اماں جان! میں جاؤں گا تو امی یہاں آئیں گی۔“

”ٹھیک ہے جاؤ، شرط ہے کہ بس ایک ماہ بعد بن سنور کے آنا۔“

”اوکے، مگر میری بھی ایک شرط ہے۔“

”ہیں؟“ سب چونکے۔ زرتاشیہ نے بھی چونک کر دیکھا۔

”زرتاشیہ سے کہیں کہ مجھے اتر پورٹ چھوڑنے چلے۔“ اس نے بہت سادگی سے فرمائش کی۔ زرتاشیہ وہاں سے کھسکنے لگی تو اماں جان نے اسے پکارا۔

”زرتاشیہ!“

”جی دادی!“

”جائو بیٹا! اپنے پیپا کے ساتھ افراسیاب کو اتر پورٹ چھوڑ آؤ۔“ نرگھس نے شرارت کی۔

”نہیں، مہربانی میں خود ہی چلا جائوں گا۔“ پیپا کے ساتھ والی بات پر وہ منہ بسور کر بولا۔ تو سب کھل کھلا اٹھے اور وہ آہ بھر کے اپنے چھوٹے سے سفری بیگ کی طرف بڑھا۔

”افراسیاب! آؤ میں سامعہ اور زرتاشیہ تمہیں چھوڑنے چلتے ہیں۔“ فرحان اور سامعہ بھی اس لمحے آن پہنچے۔ تو افراسیاب کو فرحان کی یہ ادا اچھی لگی۔

”ہاں، یہ بات ٹھیک ہے۔“ وہ خوش دلی سے بولا۔ تب زرتاشیہ کو ان کا ساتھ دینا پڑا۔ گاڑی تک پہنچنے سے پہلے ذرا سا قریب ہونے کا موقع ملا تو افراسیاب نے مسکرا کر کہا۔

”دل تو چاہتا ہے اڑا کر آج ہی لے جائوں۔“

وہ فقط گھور کر رہ گئی۔ سامعہ نے سن لیا۔ پلٹ کر بولی۔

”تھوڑا سا صبر کر لیں سرکار۔“

وہ سامعہ اور افراسیاب کی شرارت پر ہولے سے مسکرا دی۔ ان کی گاڑی پورچ سے باہر نکلی تو میاں افتخار نے ننھے احتشام کو شاہدہ بیگم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”بیگم! چلو چل کر بیٹی کی خبر بھی لے لو، وہ کچن میں ہے۔“ یہ سن کر شاہدہ بیگم تانیہ میں آنے والی اس تبدیلی پر ششدر رہ گئیں۔

سچ مچ تانیہ کچن میں تھی ناجی سنک میں جمع برتن دھو رہی تھی اور تانیہ ڈسٹر سے برتن خشک کر رہی تھی۔ بخار کی وجہ سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ شاہدہ بیگم کو بہت پیار آیا۔ آج یہ پہلا موقع تھا کہ تانیہ سادہ سی شلواری قمیص میں بالوں کی پونی بنائے کچن میں موجود تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ بہت عرصے بعد نرمی سے مسکرائی۔ شاہدہ بیگم کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اس کو آگے بڑھ کر گلے سے لگایا۔

”اما صدقے! میری تانیہ اتنی پیاری بیٹی ہے۔“

”اما! آپ آج ایک کام کریں۔“

”بولو میری جان۔“ وہ نہال ہو گئیں۔

”آپ اور بابا جائیں آج رات کے کھانے کی دعوت دے کر آجائیں۔“

”کہاں؟“

”تانیہ جی اور تائی امی کو عادل اور کرن کو...!“ وہ مسکرا کر بڑی بردباری سے بولی۔ تو شاہدہ بیگم ایک دم چپ سی ہو گئیں۔

”اما میں نے کچھ غلط کہا کیا؟“

”نہیں، میری تانیہ نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔“ اماں جان بھی تانیہ کی بات پر خوش ہو کر بولیں۔ بڑی دیر سے وہ باورچی خانے کے باہر سے ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر مسرور ہو رہی تھیں۔

”سچ نانو!“ تانیہ خوش ہو کر بولی۔

”بالکل سچ۔ شاہدہ جانو افتخار میاں کے ساتھ۔“

”مگر...!“

”کیا اگر مگر!“

”تانیہ! ابھی کچھ انتظار کر لیتے ہیں۔“ شاہدہ بیگم کچھ متامل سی تھیں۔ شاید

عادل اور کرن کی وجہ سے۔



”نہیں ماما! پھر کرن اور عادل باہر چلے جائیں گے دھند ہمارے رشتوں کے درمیان رہ جائے گی۔ تایا جی اور بابا بہت خوش ہوں گے۔“ تانیہ نے بہت سلیقے سے شاہدہ بیگم کو قائل کرنا چاہا۔

”تانیہ ٹھیک کہہ رہی ہے جب ہماری بچی اتنی سمجھ دار ہوگئی ہے تو تمہیں کیا قباحت ہے؟ اچھی بات ہے میاں ستار کے دل میں پڑی گرہ کھل جائے گی۔ تم پر بھائیوں کو جدا کرنے کا الزام ہے وہ دور ہو جائے گا۔“

”مجھے تو بس یہی اندیشہ ہے کہ تانیہ پریشان نہ ہو۔“ وہ بولیں۔

”ماما! میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ عادل کو جو میں نے کہا اس نے مانا اور جو اس نے کہا وہ میں نے مان لیا۔ قسمت کا یہی فیصلہ تھا۔ مجھے بہت مضبوط قدموں کے ساتھ تبدیلی کا سفر طے کرنا ہے۔“ تانیہ میں تو انقلابی روح بے دار ہوگئی تھی۔ اماں جان اور شاہدہ مارے حیرت کے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ناجی بھی حیرت زدہ سی منہ پر ہاتھ رکھے اس تند مزاج سی تانیہ کو دیکھ رہی تھی۔ جس سے پہلے کبھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

”ٹھیک ہے لیکن بھائی میاں راضی نہ ہوئے تو...؟“

”ان کی ان پر چھوڑ تم اپنی طرف سے اچھائی کرو۔“

”اچھا ٹھیک ہے میں افتخار کے ساتھ جاتی ہوں۔“ شاہدہ بیگم فوراً راضی ہو کر باہر چلی گئیں۔

”پھر میری تانیہ نے مہمانوں کے لیے کیا کیا بنوانا ہے؟“ اماں جان نے پیار سے پوچھا۔

”نانو! آپ کے اور سامعہ بھابی کے ساتھ مل کر بنوائوں گی۔“

”مثلاً کیا؟“

”یہ آپ ہی فیصلہ کریں کیونکہ آپ ہی کرتی ہیں۔“ تانیہ نے بڑی اپنائیت سے جواب دیا۔

”جیتی رہو، اللہ ڈھیروں خوشیاں نصیب کرے آمین۔“ انہوں نے پیشانی چوم کر دعا دی۔

”شکریہ نانو۔“

”ناجی! جلدی سے فریزر سے چائیں نکالو۔ انہیں مسالا لگانا ہے۔ میٹھے کے لیے دودھ، پستہ، بادام نکالو۔ سبزیاں اور پھل منگوانے کے لیے ٹوکری دو، شوکی سے منگواتی ہوں۔“ اماں جان نے ناجی کو ہدایات جاری کیں۔

”نانو! میں کیا کروں؟“

”تم چل کر آرام کرو، پیلی زرد ہوگئی ہو، ناشتا کیا تھا ٹھیک سے؟“

”بہت اچھی طرح۔“

”چلو پھر جا کر آرام کرو، بخار نچوڑ کے رکھ دیتا ہے۔“ وہ بولیں۔

تانیہ کے لیے یہ محبت، یہ اپنائیت، یہ احساس سب کچھ نیا تھا لیکن پائیدار تھا۔ ان نعمتوں کی شناخت اتنے عرصے کے بعد ہوئی تھی کہ وہ جی اٹھی تھی۔ آج

سب کچھ اس کا تھا۔ سب اس کے تھے بس یہ جاننے میں اسی سے کوتاہی ہوئی تھی یا پھر شاہدہ بیگم سے غفلت ہوگئی تھی۔ تاہم تبدیلی کا سفر خوش

آسند تھا۔ اعلیٰ تعلیم، حاصل کرنے کی خوشی بھی اس کی منتظر تھی۔ سامعہ نے اسے بہت مضبوط اور تحمل مزاج بنا دیا تھا۔

خدمتِ اللہ